DUE DATE

________________ Acc No ________________

Lat[illegible]ne **Re. 1.00** per day for first 15 days.
Rs[illegible]0 per day after 15 days of the due date.

۶۰ پیسے

۲۲ اگست ۱۹۷۰ء کو دہلی پبلک لائبریری میں انجمن ترقی اُردو کی شاخ دہلی کی طرف سے مشاعرہ جشنِ آزادی کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت جناب اندر کمار گجرال وزیرِ مملکت، وزارتِ اطلاعات و نشریات حکومت ہند نے کی۔
(تصویر میں) بیگم حمیدہ سلطان اور جناب بہار برنی اسٹیج پر تشریف فرما ہیں اور وزیرِ موصوف تقریر کر رہے ہیں۔
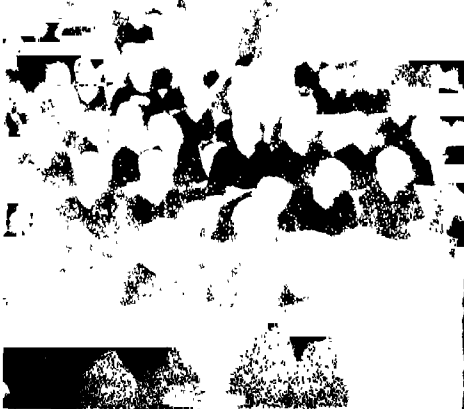
۲۹ اگست ۱۹۷۰ء کو غالب اکاڈمی نئی دہلی میں جناب بشیشور پرشاد منور لکھنوی کی یاد میں دہلی کی مختلف ادبی انجمنوں کی طرف سے ایک جلسہ کیا گیا جس کا افتتاح جناب بشیر حسین زیدی اور صدارت شری اندر کمار گجرال نے کی۔

۱۵ اگست ۱۹۷۰ء کو ماؤلنکر ہال نئی دہلی میں انجمن عروجِ ادب کی جانب سے جشنِ ساحر منایا گیا جس میں متعدد ادبا و شعرا نے شرکت کی۔
(اوپر) جناب وی شنکر جناب ساحر ہوشیارپوری کو ۲۱ ہزار روپے کا چیک پیش کر رہے ہیں۔
(نیچے) اس موقع پر ساحر ہوشیارپوری کے اُستادِ محترم اور اُردو کے بزرگ ترین شاعر جناب جوش ملسیانی کو اُن کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ایک سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ اُردو کے ممتاز محقق جناب مالک رام نے اُن کی خدمت میں یہ سپاسنامہ پیش کیا۔

آجکل

(نئی دہلی)

شہباز حسین

نند کشور وکرم

اکتوبر ۱۹۷۰ء

آشون کارتک ۱۸۹۲

ملاحظات

سالانہ چندہ ہندوستان میں
غیر ممالک سے
پاکستان میں

فی پرچہ ہندوستان میں
غیر ممالک سے
پاکستان میں

خط و کتابت سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر آجکل (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

ملاحظات

اقوام متحدہ کے ۲۵ سال

انجمن اقوام متحدہ کا قیام ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۵ء کو عمل میں آیا تھا۔ ابتدا میں اس کے ۵۰ ممبر تھے اور اس وقت ممبروں کی تعداد ۱۲۶ ہے۔ کمیونسٹ چین کے سوا دُنیا کا ہر آزاد ملک اس کا ممبر ہے۔ اس ملک کی وسعت اور آبادی سے قطع نظر ہر ملک کا ایک ووٹ ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ قوموں کی اس برادری میں سب برابر ہیں۔ گزشتہ پچیس برسوں میں اقوام متحدہ نے دُنیا کے ملکوں کو قریب لانے، شک وشبہ اور بے اعتمادی دُور کرنے اور پسماندہ ملکوں کی امداد کرنے کے سلسلے میں غیر معمولی کام انجام دیے ہیں۔

اقوام متحدہ اپنی بے شمار ذیلی انجمنوں کے ذریعے تمام بنی نوع انسان کی خدمت میں لگی ہے اور صحت، تعلیم، امن عالم، تجارت، انسانی حقوق، پسماندہ اقوام کی ترقی غرضیکہ ہر اُس میدان میں سرگرم کار ہے جو انسان کی فلاح وبہبود کے لیے ضروری ہے۔

یہ صحیح ہے کہ بعض موقعوں پر خصوصاً بعض لڑائیوں کو روکنے کے معاملے میں یہ ادارہ کوئی موثر قدم نہ اُٹھا سکا لیکن اس کی وجہ اس ادارے کی ناکامی نہیں بلکہ متعلقہ ملکوں کی اپنی مصلحتیں ہیں۔ تاہم اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ بعض معاملوں میں یہ ادارہ ناکام رہا تو بھی یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اس ادارے نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ اُس کی ناکامیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ اور بیش قیمت ہیں۔

قوموں اور ملکوں میں بٹی ہوئی یہ دُنیا دو عالمگیر جنگوں میں تبا[ہ] اور برباد ہو چکی ہے۔ دوسری عالم گیر جنگ کی ہولناکی اور تباہی نے ہی ایک عالم گیر ادارے کے قیام کی ضرورت اور اہمیت کا احساس دلایا تھا۔ قد[یم] زمانے سے ہی اوتار، پیغمبر، دانشور اور مفکر یہ پیغام دیتے آئے ہیں کہ [illegible] ونسل، مذہب، زبان اور جائے پیدائش کی بنیاد پر انسان اور انسان [illegible] امتیاز بالکل غلط اور غیر انسانی فعل ہے۔ ساری نسلِ انسانی ایک ہے [illegible] کسی قوم یا ملک کو یہ حق نہیں پہونچتا کہ وہ دوسری قوم کا استحصال کر[ے]۔ اقوام متحدہ کے قیام نے اس تصور کو نہ صرف عام کیا ہے بلکہ اس کو تقویت بھی پہونچائی ہے۔ اب کسی ایک ملک کے مسائل صرف اُس کے اپنے مسائل [نہیں] رہ گئے ہیں بلکہ ساری دُنیا کے مشترک مسائل بن گئے ہیں جن کو دُور کرنے میں ہر ملک، اقوام متحدہ کے وساطت سے ہاتھ بٹاتا ہے۔ یہ ادارہ وقت کی اہم ترین ضرورت تھی اور آج بھی اس کی اہمیت اور افادیت مسلم ہے۔

بین اقوامی تعلیمی سال

سماجی ترقی کے لیے تعلیم کی اہمیت بُنیادی ہے اور جہالت، بیمار[ی] اور غریبی کو دُور کرنے کیلئے وسیع پیمانے پر تعلیمی انتظامات ضروری ہیں۔ تعلیم علم [ہی] عطا نہیں کرتی، صحت مندی اور رواداری بھی پیدا کرتی ہے۔ واہموں کے [illegible] سے باہر لاتی ہے۔ اور تعقل پسندی کو فروغ دیتی ہے۔ تعلیم صحیح [معنی] میں انسان کو انسان بناتی ہے۔

دُنیا کا بڑا حصہ تعلیم کی دولت سے محروم ہے خصوصاً ایشیا اور افریقہ کے نوآزاد ملکوں میں تعلیمی ترقی کی رفتار تسلی بخش نہیں ہے اس لیے اقوام متحدہ نے ۱۹۷۰ء کو بین اقوامی تعلیمی سال قرار دیا ہے تاکہ دُنیا کے ممالک اپنے تعلیمی نظام کا جائزہ لیں اور تعلیمی سرگرمیوں میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس بات کو بھی دھیان میں رکھیں کہ اُن کا تعلیمی ڈھانچہ ایسا ہو جو مستقبل کی ضروریات کو مدِنظر رکھتے ہوئے بنایا گیا ہو تعلیمی ڈھانچے پر نظرِ ثانی کی ضرورت خاصی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ ترقی یافتہ ممالک میں بھی جہاں خواندگی کا تناسب تقریباً سو فی صدی ہے طلباء میں ہیجان اور بے چینی پائی جاتی ہے۔

آزادی کے بعد سے ہندوستان میں تعلیمی ترقی کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے اور خامیوں اور کمیوں سے قطع نظر اس میدان میں ہم نے قابلِ فخر ترقی کی ہے مثلاً چھ سے گیارہ سال کی عمر والے بچوں کے گروپ میں سے اب پانچ میں سے چار بچے اسکول جاتے ہیں جبکہ ۱۹۴۷ء میں اُن کا تناسب ایک اور تین کا تھا۔ ۱۱ سے ۱۴ سال کی عمر کے گروپ میں سے اب چار میں سے دو بچے اسکول جاتے ہیں جبکہ آزادی کے وقت یہ تناسب ایک اور نو کا تھا سیکنڈری درجوں میں تعلیم پانے والے طلباء کی تعداد دس لاکھ (۱۹۴۷ء) سے بڑھ کر اب ۷۰ لاکھ ہوگئی ہے۔ یونیورسٹیوں کی تعداد ۱۹ سے بڑھ کر ۸۷، ملحقہ کالجوں کی تعداد ۷۵۰ سے بڑھ کر ۳ ہزار اور طلباء کی تعداد ڈھائی لاکھ سے بڑھ کر ۲۵ لاکھ تک پہونچ گئی ہے۔ مجموعی طور سے خواندگی کا تناسب ۱۴ فی صد سے بڑھ کر ۳۰ فی صد تک پہونچ گیا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں تمام ذرائع سے تعلیمی اخراجات ۴۰ کروڑ روپے تھے جو اب نو سو کروڑ ہیں۔ دُنیا کے چند ہی ملکوں میں اتنی کم مدت میں اتنی بڑی ترقی ہوئی ہوگی۔

یہ اعداد و شمار ہم میں ہمت و حوصلہ پیدا کرتے ہیں کہ ہم تعلیم کا ایک قومی نظام تیار کرنے میں کامیاب ہوسکیں گے جو ہماری ضرورتوں اور امنگوں کو پورا کرنے میں مدد و معاون ہوگا۔

اجتماعی ترقی کی تحریک

ہندوستان کے شہروں اور گاؤں کی حالت میں بڑا واضح فرق ہے کیونکہ غیر ملکی حکومت نے گاؤں کی حالت سُدھارنے اور اُن کی حالت بہتر بنانے کی طرف کوئی توجہ نہ دی تھی۔ گاؤں کے اہل حرفہ، کاشتکار اور بے زمین مزدور اقتصادی بدحالی کا شکار تھے اور شہر کی صاف اور کھلی فضا سے نکل کر شہروں کی تنگ و تاریک فضا میں روزی کمانے آتے تھے۔ گاؤں سے شہر کی طرف یہ مراجعت اس وجہ سے تھی کہ کھیتی باڑی کا کام سال بھر نہیں ہوتا تھا۔ کھیتی باڑی کے علاوہ گاؤں میں روزگار تعلیم اور تفریح کے مشاغل برائے نام تھے۔ رسل و رسائل کی کمی اور پسماندگی نے گاؤں کو بے کیف اور ایک حد تک بے جان بنا دیا تھا۔ آزادی کے بعد اس صورت حال کا جائزہ لیا گیا اور گاؤں کی حالت کو بہتر بنانے کی متعدد تدابیر اختیار کی گئیں جن میں سب سے اہم اور مفید اجتماعی ترقی کی تحریک تھی جو ۲ اکتوبر ۱۹۵۲ء کو شروع کی گئی تھی۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ گاؤں کی ہمہ جہت ترقی ہو اور اس کی ترقی میں خود گاؤں والے شریک اور حصہ دار ہوں، ان میں اپنی مدد آپ کا جذبہ پیدا ہو اور آپسی تعاون کا رُجحان بڑھے۔ خود گاؤں والوں میں ایسی قیادت پیدا ہو جو اپنے مسائل خود حل کرسکے اور ہر معاملے میں حکومت کی مدد کی محتاج نہ ہو۔ ——— گاؤں انجمن امداد باہمی اور پنچایت کے ذریعے اس جمہوری ملک کی ایک اکائی بن جائیں اور بتدریج خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں۔

یہ سارے کام صرف گاؤں والوں پر نہیں چھوڑے گئے بلکہ ان کی مدد اور رہنمائی کے لیے حکومت نے مالی وسائل اور ٹیکنیکل عملہ دونوں مہیا کیا۔ اس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا ہے اور گاؤں والوں میں بیداری آئی ہے۔ اسکول جانے والے بچوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ مل جل کر کام کرنے سے فرقوں اور ذاتوں کی دیواریں ٹوٹی ہیں صفائی ستھرائی کا خیال پیدا ہوا ہے اور وبائی امراض میں خاصی کمی آئی ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہوئی ہے کہ گاؤں والوں نے کھیتی باڑی کے جدید طریقوں کو اپنایا ہے جس سے زرعی پیداوار میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔

ہندوستان میں تقریباً ساڑھے پانچ لاکھ گاؤں ہیں جن میں ملک کی ۸۰ فی صد آبادی رہتی ہے گاؤں کی ترقی صحیح معنوں میں ہندوستان کی ترقی ہے اور اجتماعی ترقی کی تحریک اپنی بعض خامیوں کے باوجود اپنے فرض کو بخوبی پورا کر رہی ہے۔

روحِ انسانیت

رفعت سروش

وہ مشعل،
وہ علم و ہدایت کی مشعل
جو روشن ہوئی تھی
غلامی،
جہالت،
نفاق اور حسد کے اندھیرے میں
ہر تیرگی کو مٹانے
عمل کے نئے راستے جگمگانے
وہی مشعل نور ہے خندہ زن آج بھی وقت کی تیرگی پر

وہ آواز،
وہ مشفق آواز،
جیسے ہو اک موج مہر و محبت کی،
اخلاص و انسانیت کی،
وہ آواز جس نے دیا درس تہذیب و وحدت
وہ آواز افشا کئے جس نے اسرارِ الفت،
وہ آواز اٹھی تھی جو سینۂ زندگی سے
اس آواز کی گونج شیریں سنائی ہے ہر اک دل کی
وادی میں اب بھی،

وہ دل
جو دھڑکتا تھا ہر بزم میں انسانیت سے
وہ دل جس میں ہندو مسلماں
ہر انساں کے واسطے پیار تھا،
جوشِ ایثار کا تھا۔
وہ دل جس میں خوفِ خدا،
جذبۂ بندگی تھا
وہ دل جس میں جلوہ نما
شعلۂ آگہی تھا
وہ دل جس کا ہر نغمہ تھا نغمۂ زندگانی
وہ دل جسمِ عالم میں گھر کر چکا ہے
وہ دل اب دھڑکتا ہے دنیا کے ہر پاک باطن کے
پہلو میں
ہر زندگی کے مجاہد کے سینہ میں اب بھی

وہ انسان
جو فخرِ انسانیت تھا
وہ انساں جو غازی تھا کردار کا
ایک پیکر تھا عزم و عمل کا
وہ انسان امن و اہنسا کی قوت پہ ایماں تھا جس کا
وہ انساں مقابل تشدد کے جس نے اٹھایا بغاوت
کا پرچم
قیادت میں جس کی بڑھا قافلہ ذہن اور دل کی
آزادیوں کا
وہ انسان فتح و نصرت نے قدم جس کے چومے،
وہ انساں امر ہو گیا ہے شہادت کا اک جام پی کر
امر ہے سدا تابہ وہ قوت
کہ تاریخِ تہذیب و آزادی میں نام ہے جس کا گاندھی
وہ گاندھی جو اک مشعلِ نور ہے۔
اک صدائے صداقت ہے
ہر دم دھڑکتا ہوا دل ہے۔
جو روحِ انسانیت ہے۔

جامعہ ملیہ اس پُرآشوب عہد میں وجود میں آئی جبکہ ہندوستان کے
عوام انگریزی حکومت کے غلبہ و تسلط سے نجات پانے کے لئے برسرپیکار
تھے۔ مہاتما گاندھی اور دیگر رہنماؤں کی قیادت میں پہلی جنگِ عظیم کے بعد
عوام میں جذبۂ حریت و آزادی تیز سے تیز تر ہوگیا تھا۔ اس نے مستقبل کے خطرے
کو بھانپتے ہوئے انگریزوں نے ہندوستان کی تحریک آزادی کو کچلنے کے لئے
رولٹ ایکٹ کا سہارا لیا۔ لیکن اس قانون کے نفاذ سے ہندوستانی
عوام غیظ و غضب سے بھر گئے اور انگریزی حکومت کی مخالفت میں زیادہ
شدت پیدا ہوگئی۔ انہی دنوں ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں جلیانوالہ باغ کے
قتلِ عام نے جلتے پر تیل کا کام کیا۔ اس کے ساتھ ہی ترکی میں خلافت
کے خاتمے کے امکانات نے ہندوستانی مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑا
دی تھی۔ علی برادران کی رہنمائی میں لاکھوں مسلمانوں نے انگریزوں کے
خلاف نفرت و حقارت کا اظہار کیا۔ اس تحریک کو مہاتما گاندھی کی تائید
و حمایت بھی حاصل ہوئی جس سے اسے مزید تقویت حاصل ہوئی۔
ساتھ ہی سودیشی چیزوں کا استعمال اور بدیشی چیزوں کی بائیکاٹ
کی تحریک نے بھی زور پکڑا۔ انگریزی لباس اور انگریزی طرزِ بود و باش
کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم دینے والے اسکولوں اور کالجوں کا بھی مقاطعہ
کیا گیا۔ علی گڑھ کے مدرستہ العلوم کو بھی قومی رنگ و روپ دینے کی کوششیں
کی گئیں کیونکہ اس وقت اس درسگاہ پر انگریزی اثرات نمایاں تھے۔

مولانا محمد علی شوکت علی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
کو نیشنل یونیورسٹی
بنانا چاہتے تھے لہذا
۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو
مولانا محمد علی نے آزادی
و حریت کے حامی
پُرجوش طلبا و اساتذہ
کی امداد سے دارالعلوم
علی گڑھ کی جامع مسجد
میں اعلان کر دیا کہ اب
یہ درسگاہ نیشنل مسلم

مولانا محمد علی

یہاں درس شروع ہوگا۔ نماز جمعہ کے بعد دیوبند کے سربراہ شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے اس مثالی ادارے کا افتتاح کیا اور وہ خطبہ دیا جسے جامعہ کی تاریخ میں خطبۂ تاسیس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن ولیس کی امداد سے ان پُرجوش نوجوانوں کو کالج کے احاطے سے نکال دیا گیا اور پھر ملک بھر کے تین صد طلبا اور اساتذہ نے کھلے میدان میں بے سروسامانی کے عالم میں مستقبل کی اس مثالی درسگاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو چند خیموں میں قائم کیا۔ حکیم اجمل خاں اس کے پہلے امیر جامعہ اور مولانا محمد علی پہلے شیخ الجامعہ مقرر ہوئے۔

اس طرح ایک قطعی آزاد قومی درس گاہ وجود میں آئی جس کا نصب العین مسلمانوں میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ایسی تعلیم سے بہرہ ور کرنا تھا جو صحیح معنوں میں تخلیقی اور عملی ہو اور جس سے دل و دماغ کو بیداری و بالیدگی حاصل ہو۔ نیز طلباء کو جسمانی اور ذہنی نشوونما کے مواقع حاصل ہوں اور اُن میں خود اعتمادی اور خودداری کے علاوہ خود کفالت کا جذبہ بھی پیدا ہو۔ اُن کی تعلیم ملی اور قومی ضروریات کے مطابق ہو اور انگریزی اثر و رسوخ سے آزاد یہ تعلیم گاہ ملی مصالح کی پابند ہو۔ وہ ملک کی آزادی و اتحاد میں مددگار و معاون ہو اور اس کی تعلیم میں اسلامیت اور قومیت دونوں کا امتزاج ہو۔ نیز تعلیم ایسی پُرمقصد ہو جس کے وسیع دائرے میں حکمت، صنعت، سیاست اور معیشت سب کچھ آجائے۔

جامعہ کے قیام کے فوراً بعد فاؤنڈیشن کمیٹی نے نصاب تیار کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی۔ جس کے ارکین کی مدد سے مولانا محمد علی نے ابتدائی تعلیم سے اعلیٰ تعلیم تک کا نصاب مرتب کیا۔ منظور شدہ نصاب کے تحت مسلمانوں کے لئے دینیات اور ہندوؤں کے لئے ہندو اخلاقیات کی تعلیم لازمی قرار دی گئی۔ چوتھی جماعت سے عربی اور انگریزی کو بھی لازمی قرار دیا گیا۔ نیز اُردو کو زبانِ اول کے طور پر اختیار نہ کرنے والوں کے لئے ہندی کا نصاب تیار کیا گیا اور ہندی کو زبانِ اول کی حیثیت سے اپنانے والوں کے لئے آسان اُردو سیکھنا لازمی قرار دیا گیا۔ خوشخطی کو بھی نصاب میں بڑی اہمیت دی گئی اور اس کے ساتھ ہی درجہ پنجم سے کسی حرفے کا سیکھنا بھی ضروری ٹھہرایا گیا تاکہ طلبا تعلیم کے ساتھ ساتھ کوئی حرفہ بھی سیکھ لیں اور حصولِ تعلیم کے بعد اپنا من پسند پیشہ اختیار کرسکیں۔

طباعت، فوٹوگرافی، جلد سازی، الیکٹروپلیٹنگ، پالش، بلاک بنانے، شارٹ ہینڈ اور ٹائپ رائٹنگ وغیرہ کی تعلیم کا بھی خاطر خواہ انتظام کیا گیا اور پھر قلیل مدت میں جامعہ ایک آزاد قومی درس گاہ کی شکل اختیار کرنے لگی، اور بہت سے اسکولوں نے اُس کے ساتھ اپنا الحاق کرالیا۔

ابتدا میں جامعہ کے زیادہ تر اخراجات خلافت کمیٹی برداشت کرتی تھی لیکن تین چار سال بعد جب یہ تحریک ٹھنڈی پڑ گئی تو جامعہ کو انتہائی مالی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے اُستادوں اور کارکنوں کو بڑی تنگ دستی کا سامنا کرنا پڑا اور طلبا کو بھی بہت سی تکالیف برداشت کرنی پڑی۔ یہاں تک کہ اکثریت نے درسگاہ کو بند کردینے کی رائے دی۔ اُس وقت ڈاکٹر ذاکر حسین جرمنی میں زیرِ تعلیم تھے۔ جب اُنہیں بذریعہ تار اطلاع دی گئی کہ مجلس امناء کے اراکین اسے بند کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں تو اس کے جواب میں ذاکر صاحب نے لکھا کہ وہ اور اُن کے چند ساتھی جامعہ کے لئے اپنی ساری زندگی وقف کریں گے لہٰذا اُن کی آمد تک کوئی ایسا قدم نہ اٹھایا جائے۔ اس دوران حکیم اجمل خاں کی ایما پر مجلس امناء کے اراکین نے جامعہ کو علی گڑھ سے دلی منتقل کرنے کا فیصلہ کیا اور جولائی ۱۹۲۵ء میں اس فیصلے کو عملی جامہ بھی پہنا دیا گیا اور قرول باغ (نئی دلی) میں جامعہ کا کام کرایہ کی عمارتوں میں شروع کیا گیا۔

فروری ۱۹۲۶ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر

حکیم اجمل خاں

مجیب اور ڈاکٹر عابد حسین کے ساتھ ہندوستان تشریف لائے اور آتے ہی ذاکر صاحب کو جناب طاہر الیس محمدی کی جگہ شیخ الجامعہ مقرر کردیا گیا پروفیسر مجیب تاریخ کے اُستاد بنائے گئے اور ڈاکٹر عابد حسین نے

مسکل کے علاوہ رسالہ جامعہ کی ادارتی ذمہ داری بھی سنبھال لی۔

جامعہ کو دہلی منتقل ہوئے ابھی تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ ۲۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کو حکیم اجمل خاں کا انتقال ہو گیا اور ان کی جگہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری امیر جامعہ مقرر ہوئے جب تک حکیم صاحب بقید حیات رہے وہ جامعہ کی مالی مشکلات کو حل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے اور جانے کہاں کہاں سے روپیہ فراہم کرتے رہے مگر ان کی موت کے بعد درسگاہ کی حالت بہت دگرگوں ہو گئی اور وہ کئی ہزار روپے کی مقروض ہو گئی۔ اس نازک دور میں ڈاکٹر ذاکر حسین اور جامعہ کے دیگر نوجوان کارکنوں نے 'انجمن تعلیم ملی'

ڈاکٹر ذاکر حسین شیخ الجامعہ کی حیثیت سے

کے نام سے ایک سوسائٹی قائم کی جس کے اراکین نے عہد کیا کہ وہ کم از کم ۲۰ برس تک جامعہ کی خدمت کرتے رہیں گے اور اس عرصے میں کبھی ۱۵۰ روپے سے زیادہ مشاہرہ نہیں لیں گے۔ حالانکہ بعد میں کئی بار ان نوجوانوں کو اپنے مقررہ مشاہرے سے بھی کم پر گزارہ کرنا پڑا اور مفلسی و عسرت میں دن کاٹنے پڑے۔ اتنا کرنے کے باوجود بھی جامعہ کی حالت نہ سدھری کیونکہ ایک تو سرکاری امداد اسے منظور نہ تھی دوسرے متمول طبقے سے بھی بہت کم رقوم ملتی تھیں۔ لہٰذا ۱۹۳۲ میں جامعہ کو اقتصادی بحران سے نجات دلانے کے لئے "ہمدردان جامعہ" کے نام سے ایک نئی تنظیم کی تشکیل کی گئی جس کے ممبر ماہانہ اور سالانہ رقم عنایت کرتے تھے۔ جلد ہی ان اراکین کی تعداد دس ہزار تک پہونچ گئی اور اس سے جامعہ کی مالی حالت سدھرنے لگی۔ مئی ۱۹۳۶ء میں ڈاکٹر انصاری انتقال کر گئے۔ ان کے بعد جناب عبدالمجید خواجہ کو امیر جامعہ مقرر کیا گیا اور چونکہ آہستہ آہستہ جامعہ کی مقبولیت و اہمیت کا احساس بڑھتا رہا لہٰذا اداروں کے سربراہوں نے بھی معقول مالی امداد دینی شروع کر دی جس سے جامعہ نے اوکھلا کے قریب جمنا کے قریب زمین خرید کر جامعہ نگر بسایا اور قرول باغ کے کرائے کی عمارتوں کے بجائے اسے اپنا مرکز بنایا۔ دھیرے دھیرے درسگاہ کی عمارتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور آج وہاں دارالعلوم کی متعدد دلکش اور خوبصورت عمارتوں کا جال بچھا ہوا ہے۔

ڈاکٹر مختار احمد انصاری

۱۹۴۸ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین علی گڑھ کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ ان کے بعد ان کے رفیق کار پروفیسر محمد مجیب کو شیخ الجامعہ مقرر کیا گیا اور گزشتہ ۲۲ سال سے یہ قومی دارالعلوم ان کی رہنمائی و قیادت میں ترقی کی منازل طے کر رہا ہے۔ ان ہی کے عہد میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن ایکٹ ۱۹۵۶ء کے تحت ۱۹ جون ۱۹۶۲ء کو اسے باقاعدہ یونیورسٹی تسلیم کر لیا گیا

محمد مجیب

شروع میں یہ تعلیمی ادارہ ابتدائی اسکول، ثانوی اسکول اور ایک کالج پر مشتمل تھا لیکن آہستہ آہستہ اس کا دائرہ درس و تدریس بڑھتا رہا۔ ۱۹۲۸ میں بنیادی مدرسوں کے اساتذہ کی تعلیم و تربیت کے لئے "استادوں کا مدرسہ" قائم کیا گیا اور اب بیسک ٹریننگ کے علاوہ بی ایڈ اور ایم ایڈ تک کی تعلیم کا انتظام ہے۔ ۱۹۵۱ء میں چھوٹے بچوں کے لئے نرسری اسکول کھولا گیا۔ ۱۹۵۲ میں دیہی تعلیم اور دیہی معاشیات اور سماجیات کے علیحدہ علیحدہ ادارے قائم کئے گئے۔ ۱۹۵۵ء میں ایک ریسرچ ٹریننگ اور پروڈکشن سنٹر کی بنا رکھی گئی جس کا مقصد نوخواندہ لوگوں کی تعلیمی ضرورتوں کا جائزہ لے کر انہیں مناسب امداد دینا ہے۔ یہی ادارہ بھی یہاں کا ایک قابل قدر ادارہ ہے۔ جہاں دیہی خدمات کے لئے تین سال کا کورس ہے۔ اس یونیورسٹی میں نرسری سے لے کر ایم اے تک کی کلاسوں کا خاطر خواہ انتظام ہے اور فوجی جوان جامعہ کے ملازمین اور خواتین ہر امتحان پرائیوٹ طور پر دے سکتے ہیں اس کے ساتھ ہی طلبار کو سائنس، فنون لطیفہ اور دستکاریوں کی تعلیم بھی دی جاتی ہے تاکہ مستقبل میں وہ معاشی پریشانیوں کا شکار نہ ہوں۔

چونکہ لائبریری درس گاہ کا ایک اہم جزو ہوتی ہے۔ اس لئے جامعہ نے اس طرف غیر معمولی توجہ دی ہے۔ اور اس وقت جامعہ کی مرکزی لائبریری میں تقریباً ۲۵ ہزار کتابیں موجود ہیں جو طلبار کی تعلیم و تحقیق میں بہت مفید اور مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ ان کتب کے علاوہ اردو اور عربی کے بیش بہا مخطوطات کا ایک گراں قدر ذخیرہ بھی موجود ہے مولانا محمد علی، شوکت علی اور حکیم اجمل خاں کے ذاتی مسودات اور تصنیفات بھی یہاں محفوظ ہیں۔
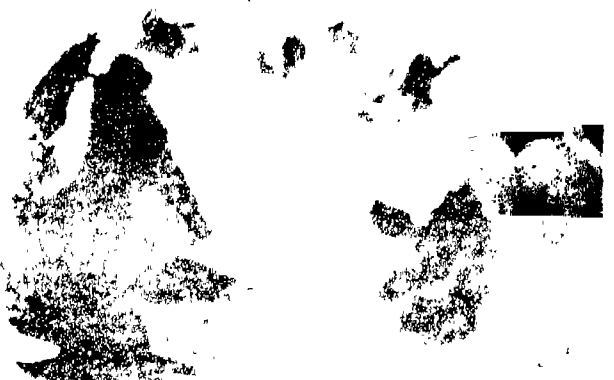
جامعہ کے قیام کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی کتابوں کی دکان کھولی گئی تھی جس نے بعد ازاں مکتبہ جامعہ کی شکل اختیار کرلی اور جو آج ایک بہت بڑا اشاعتی ادارہ ہے۔ تقسیم وطن کے بعد کے نامساعد حالات سے دوچار ہونے کے باوجود اس ادارے نے اپنا کام جاری رکھا اور اب یہ ہندوستان میں اردو کے چند اہم اشاعتی اداروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ حال میں مکتبہ نے حکومت جموں و کشمیر کی مالی امداد سے قدیم معیاری کتابوں کو صحیح متن اور حسن طباعت کے ساتھ آفسٹ میں شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، جنہیں کم از کم قیمت پر فراہم کیا جائے گا

اس سلسلے کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ اب تک یہ ادارہ ڈیڑھ ہزار کے قریب کتابیں شائع کر چکا ہے۔

کتابوں کے علاوہ جامعہ سے تین ماہنامے جامعہ، پیام تعلیم اور کتاب نما بھی شائع ہوتے ہیں۔ جامعہ اعلیٰ پائے کے ادبی اور تحقیقی مضامین سے آراستہ جریدہ ہے۔ پیام تعلیم بچوں کا رسالہ ہے اور انہیں سے متعلق دلچسپ اور معلوماتی مضامین، کہانیوں اور نظموں پر مشتمل ہوتا ہے۔ "کتاب نما" میں اردو میں شائع ہونے والی نئی کتابوں سے متعارف کرایا جاتا ہے اور اس سے لائبریریوں، کتب خانوں اور اردو میں دلچسپی رکھنے والے حضرات کو کتابوں کے انتخاب میں مدد ملتی ہے۔

جامعہ ہر سال تعلیمی میلہ منعقد کرتی ہے۔ جس میں بچوں کی دلچسپی کو خاص طور پر مد نظر رکھا جاتا ہے۔ بچے مشاعرہ، بیت بازی، کیمپ فائر اور طرح طرح کے دلچسپ کھیلوں میں حصہ لیتے ہیں اور اپنے اسٹال اور دکانیں بھی لگاتے ہیں۔ اس تقریب پر نمائش کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے جس میں بچوں کے فنون اور حرفوں کا مظاہرہ کیا جاتا

ہے۔ اس میلے میں بچوں اور اُن کے والدین کے علاوہ ہزاروں مہمان بھی شرکت کرتے ہیں۔

ہرچند کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ قوم پرست اور محب الوطن ہندُستانی مسلمانوں کے لئے قائم کی گئی تھی تاکہ انہیں اسلامیت اور قومیت کی بنیاد پر تعلیم دی جائے، لیکن دوسرے فرقوں کے طلبار کے لئے اُس کے دروازے کبھی بند نہیں ہوئے اور ہزاروں ہندو طلباء یہاں سے تعلیم حاصل کر چکے ہیں۔ اور آج بھی زیرِ تعلیم ہیں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ صحیح معنوں میں ایک ایسی درس گاہ ہے جس پر بجا طور پر ملک اور قوم کو فخر ہو سکتا ہے۔

اس اِدارے نے اپنی زندگی کے پچاس سال پورے کر لئے ہیں اور اس کا "جشنِ زریں" منایا جا رہا ہے۔ ۱۹۴۶ء میں جشنِ سیمیں کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر ذاکر حسین نے کہا تھا کہ یہ جوبلی ماضی پر فخر کرنے کا جشن نہیں ہے بلکہ مستقبل کے عزم کا موقع ہے۔ خدا ہماری مدد فرمائے؛ یقیناً خدا نے اُن کی مدد کی اور جامعہ اب گولڈن جوبلی منا رہی ہے اور یہ تاریخی جملے اس وقت بھی یاد کئے جائیں گے جب جامعہ کی ڈائمنڈ جوبلی منائی جا رہی ہوگی۔

آزاد ہندوستان نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کو پھلنے پھولنے اور ترقی کرنے کے مواقع فراہم کئے ہیں اور ہمیں امید ہے کہ آنے والے زمانے میں جامعہ ترقی کی مزید منزلیں طے کرے گی۔

آج کل نئی دہلی

عطا کاکوی

ہے زندگی بارِ دوش اس پر اگر ترا دسترس نہیں ہے
سمجھ لے اس راز کو کہ جینا فقط شمارِ نفس نہیں ہے

یہ تیلیاں تم جو دیکھتے ہو بنائیں گے آشیاں انہی سے
اگر ہے بال و پر سلامت تو پھر قفس یہ قفس نہیں ہے

سنبھالو جوشِ جنوں کو اپنے چمن کا بھی رنگ ڈھنگ دیکھو
پکار کر کہہ دیا خزاں نے بہار اب کے برس نہیں ہے

نہ کر پریشاں نظر کو اپنی صدائے دل پر بھی کر توجہ
رہے گا کب کارواں منظّم اگر نوائے جرس نہیں ہے

ہنسی کو میری ہنسی نہ سمجھو نہ اس کی اتنی ہنسی اُڑاؤ
یہ عشق کا خندۂ غم انگیں ہے گریۂ بوالہوس نہیں ہے

ہے عشق کے آتشیں نفس سے بنا ہوا اپنا آشیانہ
جلائے گی اس کو برق کیا، یہ نشیمنِ خار و خس نہیں ہے

بھروسے پر دوسروں کے جینا سہارا غیروں کا لے کے چلنا
ہزار بار اس سے موت اچھی جو زیست پر اپنا بس نہیں ہے

چلے ستم کی ہزار آندھی نہ یہ بجھی ہے نہ بجھ سکے گی
ہے عشق کی شمع دل میں روشن کوئی چراغِ ہوس نہیں ہے

تو آپ کر اپنی چارہ سازی فضول ہے یہ گلہ طرازی
پکارتا ہے عطا یہ کس کو کوئی بھی فریاد رس نہیں ہے

(۸)

اسلوب احمد انصاری

میں نے جب شعور کی آنکھیں کھولیں، ہندوستان میں ہندو مسلم سیاست بہت سے طوفانوں سے گزر چکنے کے بعد ایک نئے موڑ میں پہونچ گئی تھی، یعنی جداگانہ انتخابات کی مانگ ہر طرف سے کی جا رہی تھی، خلافت اور عدم تعاون کی تحریکیں اپنی اندرونی طاقت اور اپنا جواز کھو چکی تھیں۔ ہندو مسلم اتحاد کی صدائیں، صدائے طاق نسیاں بن چکی تھیں۔ اردو اور ہندی کی آویزش بھی شروع ہو چکی تھیں۔ گو اس میں جارحانہ رنگ ابھی پیدا نہیں ہوا تھا لیکن مجھے کبھی سیاست سے گہری دلچسپی نہیں رہی۔ میری ابتدائی تعلیم و تربیت ایک نیم مذہبی قدامت پسند گھرانے میں ہوئی جہاں مذہب پر عمل تو بہت زیادہ نہ تھا لیکن مذہبی اور اخلاقی قدریں دلوں میں گہرے طور پر پیوست تھیں۔ میرا گھرانہ پرانے طرز کا زمیندار گھرانہ تھا لیکن اس میں زمیندار گھرانوں جیسا ٹھاٹھ باٹھ، اکڑ اور نخوت، کسانوں پر ظلم اور زبردستی اور عیش و عشرت کا دور دور گزر نہ تھا۔ میرے والد معمولی طور پر تعلیم یافتہ اور ڈاک کے محکمے میں سرکاری ملازم تھے اور پنشن لینے کے بعد اپنی زمین اور جائیداد کے معاملات میں پوری طرح اُلجھے رہتے تھے۔ میری والدہ بھی اچھے خوشحال گھرانے کی تھیں اور دونوں میں جو بات مشترک تھی وہ ظاہری دینداری سے زیادہ نیت اور عمل، دل اور کردار کی پاکیزگی، طہارت اور دردمندی اور انسانیت تھی۔ مجھے یہ بات اچھی طرح یاد ہے کہ میرے والد مرحوم نے کبھی کسی حاجت مند کو مایوس نہیں لوٹایا۔ داد و دہش میں اُن کا ہاتھ بہت کھلا ہوا تھا اور اُن میں کینہ پروری کا جذبہ بدرجہ اتم تھا۔ یہی حال میری والدہ کا بھی تھا۔ خاموشی اور ہمدردی کے ساتھ ضرورت مندوں کی حاجت روائی غالباً اُن کے صحیفۂ اخلاق میں ایمان کا درجہ رکھتی تھی۔ مجھے اپنے بچپن میں طویل وقفوں کے ساتھ اپنے گاؤں میں بھی جو ضلع سہارنپور میں تھا، رہنے کا اتفاق ہوا اور میں نے کسانوں کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا۔ مگر گاؤں کی زندگی اور اُس کی فضا مجھے کبھی دلچسپ نہیں معلوم ہوئی۔ میری ابتدائی تربیت میں میرے سب سے بڑے بھائی کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ اُن پر مذہبی رنگ شروع سے غالب تھا اور آخر میں اس حد تک گہرا ہو گیا تھا کہ وہ ہر چیز کو اسی آئینے میں دیکھنا پسند کرتے تھے۔ بہت عرصے تک میرا دل اس گہرے مذہبی رویئے سے گھبراتا اور اکتاتا تھا مگر اُن کے کردار کی پختگی، اُن کی بے لوث محبت اور اُن کی نیت کے کھرے پن اور معاملات میں عدل اور سچائی کی میں دل سے قدر کرتا تھا۔ اور اُن کی زندگی

کو اپنے لئے ایک نمونہ سمجھتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ حضرت بابا فرید شکر گنج کا یہ قول دُہرایا کرتے تھے کہ سچا دوست وہ ہے جو اپنے دوست کو فائدہ پہنچانے کے بہانے ڈھونڈھتا رہے۔ اُن کی پوری زندگی ایک طرح سے اسی نصب العین کو عملاً برتنے میں صرف ہوئی۔

میں ۱۹۲۱ء میں دہلی میں پیدا ہوا۔ میرا بچپن شروع سے تنہائی میں گزرا، چونکہ میں اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا اور بہت چھوٹا تھا اسی لئے ہمیشہ بے حد دُلار اور پیار کا مرکز اور محور بھی رہتا اور اُن کی دلچسپیوں میں بھی شریک نہ ہو سکتا تھا۔ اپنے ہم عمر ساتھیوں میں آزادی کے ساتھ کھیلنے کودنے کے مواقع نہ ملنے کی وجہ سے میری طبیعت میں ابتدا ہی سے ایک طرح کی حزم و احتیاط، ایک طرح کا نامعلوم خوف و ہراس، تنہائی سے محبت اور حد درجہ کی دروں بینی پیدا ہو گئی۔ معمول کے خلاف میرا ذہنی ارتقا بھی کچھ عجیب طریقے سے ہوا۔ شروع میں مجھے ادب سے بالکل رغبت نہیں تھی۔ نہ قصے کہانیاں پڑھنے کا شوق، نہ نئی جگہوں سے لُطف اندوز ہونے کی رغبت، نہ دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے کی طرف میلان، اور نہ اپنے تخیل میں اچھوتی اور واہمہ کی دُنیائیں آباد کرنے کی صلاحیت جو صغر سنی میں اکثر بچوں میں عموماً ہوتی ہے۔ اس کے برعکس مجھے ریاضی سے بہت دلچسپی تھی۔ گھنٹوں اس میں غرق رہتا اور دُنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا۔ قصے کہانیوں سے زیادہ مجھے سوانح عمریاں اور خشک قسم کے علمی مضامین پڑھنے کا شوق تھا۔ مذہبی کتابیں بھی کبھی کبھی دیکھتا۔ البتہ تقریر کرنے کا شوق مجھے ہمیشہ سے رہا۔ ادعائے ذات کا شاید یہی واحد ذریعہ مجھے اپنے لئے نظر آتا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے تصویریں بنانے سے بے حد شغف تھا اور لکیروں اور رنگوں کی دل فریب کائنات میں ایک عجیب طرح کی ابدیت کا احساس ہوتا تھا۔ اس فن کی تحصیل میں میں نے اپنی زندگی کے بہت سے سال صرف کئے۔

میرے ماحول میں شاعری کا خاصا چرچا تھا۔ خاندان میں چھوٹے بڑے کوڑیوں شاعر تھے۔ ان میں سب سے زیادہ ممتاز میرے پھوپھا حکیم آزاد انصاری تھے۔ جب وہ ہمارے گھر آتے تھے، تو سب اُن کے ارد گرد جمع ہو جاتے اور شعر سنانے کی فرمائش کرتے اور وہ انتہائی سادگی کے ساتھ بلا تامل یہ فرمائش پوری کرتے۔ آزاد انصاری، جوش ملیح آبادی کے ہم عصر اور یارِ غار تھے۔ دونوں ایک زمانے میں میر عثمان علی خاں، والیٔ دکن کے لڑکوں کے اتالیق رہے، اور ساتھ ہی ریاست سے نکالے بھی گئے۔ شروع میں صاحبِ ثروت تھے مگر اپنی بے اعتدالیوں کی وجہ سے آخر میں اس حد تک تنگ دست ہو گئے تھے کہ جگرؔ اور اصغرؔ کی طرح چشمہ فروشی پر اُن کی معاش کا انحصار تھا۔ اس ماحول میں پرورش پانے کے باوجود غالباً مجھے شاعری سے کچھ دلچسپی اس لئے نہیں تھی کہ میں غزل کے رموز و علائم سمجھنے سے قاصر رہتا تھا۔ حکیم آزاد انصاری صرف کہنہ مشق غزل گو تھے بلکہ سہلِ ممتنع میں کمال رکھتے تھے۔ اُنہیں حالی سے فیضِ تلمذ حاصل تھا اور وہ اس پر اکثر فخر کیا کرتے تھے۔

۱۹۳۹ء میں دہلی سے ہائی اسکول کا امتحان امتیازی کے ساتھ پاس کرنے کے بعد میں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ میں داخل ہوا، اور ایک دم مجھے یہ احساس ہوا کہ تہہ خانے سے نکل کر باہر کھلی ہوا میں آ گیا ہوں۔ اب میری دلچسپیاں متنوع بھی ہوئیں، اور اُن کا مرکز و محور بھی بدلا۔ مصوری کا شوق باقی نہ رہ سکا، اور ریاضی کی تعلیم بھی ادھوری ہی رہ گئی۔ لیکن اُن کی جگہ منطق اور فلسفے نے لے لی۔ ادب سے اب ایک گونہ دلچسپی پیدا ہو گئی، جو برابر بڑھتی رہی۔ میری تنہائیاں البتہ بدستور باقی رہیں۔ یونیورسٹی میں آنے کے بعد فلسفہ اور ادب میرے باقاعدہ مضامین ہو گئے اور اب تک ہیں۔ اس منزل پر پہونچ کر میں نے اُردو کے کلاسیکی ادب کا بالاستیعاب مطالعہ شروع کیا۔ فارسی بھی میں بچپن سے برابر پڑھتا رہا۔ میں سرسید کی شخصیت سے بے انتہا متاثر ہوا۔ میں نے ان کی بیشتر تصانیف کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا اور اِس دوران میں دن بہ دن اُن کی بصیرت جذبے اور قوتِ عمل کا قایل ہوتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے راجہ رام موہن رائے کے خیالات اور کارناموں سے بھی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ انگریزی ادب کی پرکاری نے اب میرے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچنا شروع کیا۔ بی اے تک پہونچتے پہونچتے میں نے مختلف اصنافِ ادب میں اچھی اچھی چیزیں پڑھ ڈالیں اور انہیں اپنے کام و دہن کی تشنگی کو سیراب کرنے کا ذریعہ بنایا۔ سیاست سے میری دلچسپی زیادہ نہ بڑھ سکی گو نظری طور پر میں نے ہم عصری سیاست کے دھاروں سے اپنی واقفیت کو تازہ رکھا۔ ایم اے کے مرحلے پر پہونچ کر میں نے انگریزی ادب کا جم کر مطالعہ کرنا شروع کیا

اور بہت سی دُوسری چیزوں کو بُھلا دیا۔ میں نے اپنے شفیق اور فاضل اُستاد پروفیسر خواجہ منظور حسین صاحب کی رہنمائی سے جو علی گڑھ میں شعبۂ انگریزی کے صدر تھے بہت فیض حاصل کیا، خواجہ صاحب، بہت خوب رو، شستہ و شائستہ، نرم دل اور دلکش شخصیت کے مالک تھے خاص دلّی کے رہنے والے تھے۔ انگریزی اور اُردو ادب کا مطالعہ حیرت انگیز طور پر گہرا اور وسیع تھا، اُن کی زبان کوثر و تسنیم میں دُھلی ہوتی تھی۔ انگریزی گفتگو اور تحریر پر اُنہیں بے حد عبور تھا اور وہ اپنے شاگردوں سے بہت محبت اور تواضع سے پیش آتے تھے۔ مجھے ہمیشہ انہوں نے بہت عزیز رکھا مگر اُن کی غیر معمولی صلاحیتوں اور طبیعت پر کسی نفسیاتی اُلجھن کی وجہ سے ایک سایہ سا پڑا ہوا تھا جس کی وجہ سے اُن کی تخلیقی قوتوں کا کوئی نتیجہ سامنے نہ آسکا۔ البتہ روسی اور فرانسیسی کہانیوں کے جو تراجم انہوں نے شروع میں کئے تھے۔ اُردو میں وہ ابتک خاصے کی چیز سمجھے جاتے ہیں۔

اسی دَوران میں مجھے مشہور مفکر برٹرینڈ رسل کی کتابیں پڑھنے کا موقع ملا۔ تعلیم فلسفے اور سائنسی اندازِ فکر اور معاشرتی مسائل پر میں نے اُن کی بیشتر کتابیں پڑھ ڈالیں۔ مغربی فلسفے کی تاریخ پر اُن کی کتاب جو غالباً ۱۹۴۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ میں نے کئی بار پڑھی۔ گو میں رسل کی تشکیک پر پوری طرح ایمان نہ لا سکا اور نہ اخلاق کے معاملے میں ان کی عدم موافقت NON CONFORMISM مجھے اچھی لگی۔ لیکن اُن کے خیالات کی جدت اُن کے جذبے کی تندی اور ہمہ گیری اور سب سے بڑھ کر ان کی حریتِ فکر سے میں بے حد متاثر ہوا۔ اُس زمانے میں اُن کی امن پسندی کے فلسفے کا بڑا چرچا تھا اور آخر وقت تک انہوں نے جس بے جگری اور پامردی کے ساتھ اپنی منفعت اور تحفظ کو خطرے میں ڈال کر انسانیت کی بقا کے مسئلے کو سب سے زیادہ اہمیت دی۔ اس کا مجھ پر برابر اثر رہا۔ اسلحہ بندی کے خلاف انہوں نے اپنی مہم کو کبھی ایک لمحے کے لئے بھی ختم نہیں کیا۔ رسل کو میں نے ہمیشہ جری، حق گو، اور اپنے عقائد کی توانائی کے جذبے سے سرشار پایا۔ وہ یقیناً اِس دَور کے مفکروں میں ایک دیوزاد شخصیت کے مالک تھے۔ اس کے ساتھ ہی میرا یہ خیال بھی ہے کہ انگریزی زبان میں جو صفائی، تیقن اور لچک، ڈرائیڈن اور سوئفٹ نے پیدا کی تھی، اُسے بالآخر ایلیٹ، برنارڈ شا اور رسل نے انتہا تک پہونچانے کا کارنامہ سرانجام دیا۔ اس اعتبار سے بلاشبہ اِن تینوں کو جدید انگریزی نثر کے معماروں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

۱۹۴۲ء سے اُردو میں میری ادبی زندگی کا باقاعدہ آغاز ہوا، یعنی میں نے اُردو میں تنقیدی مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ چند سال تک میں نے ترقی پسند تحریک کا بھی دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیا اور علی گڑھ میں میں ۱۹۴۵ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا صدر منتخب کیا گیا لیکن رفتہ رفتہ مجھے اس تحریک کے مسلمات کی صداقت میں شبہ پیدا ہونے لگا اور میں نے اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اسی دوران میں شاید ردِ عمل کے طور پر مجھے جمالیات سے خاصا شغف پیدا ہو گیا۔ ۱۹۵۶ء میں بغرضِ تعلیم دو سال کے لئے آکسفورڈ چلا گیا۔ وہاں مجھے انگریزی ادب کے مشہور عالم اور نقاد مسٹر بیٹسن کے شاگرد ہونے کی سعادت حاصل ہوئی اور میں نے اُن سے بہت کچھ سیکھا۔ وہ جب کبھی ہمت افزائی کے طور پر میری تعریف کرتے تو میرا دل فخر اور غرور سے بھر جاتا تھا، لیکن وہ ہمیشہ مجھ پر کڑی نظر رکھتے اور میری خامیوں پر مجھے برابر ٹوکتے رہتے تھے۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ آکسفورڈ کے قیام کے دوران میں نے ادب میں جدید ترین تحریکوں کا مطالعہ کیا اور ہم عصری ادبی میلانات سے آگاہی کے ساتھ ہی انگریزی ادب کے بعض مشاہیر سے بھی فیض یاب ہونے کا اتفاق ہوا۔ مسٹر بیٹسن کے علاوہ جنہیں میری ذہنی تربیت میں خاصا دخل ہے مشہور انگریزی ناول نگار ای ایم فاسٹر سے ملاقات اور گفتگوؤں کی یاد ذہن میں اب تک تازہ ہے۔ کچھ عرصے تک میرا ذہن مخالف نظریوں کے بھنور میں گرفتار رہنے کی وجہ سے ایک طرح کے اضطراب، کشمکش اور غیر یقینی کا شکار رہا۔ لیکن ایسا لگا کہ گویا بادل چھٹتے جا رہے ہیں اور میرے نقطۂ نظر میں اعتدال، توازن اور ہم آہنگی پیدا ہونے لگی اور مجھے اِس کا یقین ہونے لگا کہ ادب زندگی سے ہر سمت اور ہر سطح پر متاثر ہونے کے باوجود اپنی ایک الگ کائنات رکھتا ہے، جو کسی طرح بھی دُوسرے علوم اور نظام ہائے فکر کے تابع نہیں ہے بلکہ ایک اندرونی نظم اور آزادی کا حامل ہے۔ ادب اور شاعری میں حقیقت پسندی کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن اعلیٰ ترین شاعری کی حدیں، موضوع کے اعتبار سے مابعدالطبیعات سے غیر ممیز ہوتی ہیں۔

میں نے اُردو فارسی اور انگریزی کے علاوہ اور زبانوں کے ادب کا بھی تراجم کے ذریعے خاصا مطالعہ کیا۔ ابتدائی دَور میں یعنی جب میں بی اے میں پڑھتا تھا۔ میں روسی ناول نگار دوستووسکی کے سحر میں پوری طرح اسیر رہا لیکن مختلف زبانوں کے ادب میں جہاں تک میری رسائی ہو سکی اُن میں جن دو مصنفین نے مجھے شدید اور گہرے طور پر متاثر کیا، وہ شیکسپیرؔ اور چیخوف ہیں۔ شیکسپیرؔ انسانی فطانت کی آخری حصہ کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ ایک نادر ترین مظہرِ فطرت ہے جسے خود فطرت نے ابتک نہیں دُہرایا۔ اُس کے ڈراموں میں جو جہانِ معنی پوشیدہ ہے، اُن میں مشاہدے اور تخیل کا جو حسین امتزاج ہے اور انسانی فطرت کے لاتعداد گوشوں اور امکانات کو اُس نے جس طرح اپنے نفیس، لطیف اور مرتعش ادراک کے ذریعے حرف وصوت کی پیچیدہ تنظیم میں ظاہر کیا ہے، اس کی مثال دُنیا کے کسی اور ادب میں تلاش کرنا غالباً فعل عبث ہوگا۔ چیخوف کے بارے میں اس سے زیادہ اور کیا کہوں کہ وہ برسوں میرا سب سے بڑا رفیق اور مونس رہا ہے اور میں نے اُس کی کہانیوں میں ایک حیرت انگیز ذہنی ترفع، ایک نہ بھلائی جانے والی جذباتی آسودگی پائی ہے۔ اِن دونوں کے بعد میں نے اقبال، حافظ اور غالب کے سامنے اپنی جبین نیاز خم کی ہے۔ انگریزی شاعروں میں مجھے سب سے زیادہ اٹھارویں صدی کے صوفی شاعر ولیم بلیک نے اپنی جانب کھینچا۔ میں اس کی شاعری کی پُرپیچ راہوں میں پچھلی چوتھائی صدی سے بھٹکتا رہا ہوں اور بس کبھی کبھی اس وسیع، کہر آلود اور مثالی فضائے بسیط میں روشنی کی چند کرنوں کو چند لمحوں کے لئے اپنے کفِ دست میں اسیر کر سکا ہوں۔ سینٹ آگسٹن کے "اعترافات" (CONFESSTONS) اِن کتابوں میں سے ایک ہے، جن کا میری زندگی پر بہت دُور رس اثر پڑا ہے۔ ہندوستانی مفکروں میں مجھے رادھا کرشنن سے بہت دلچسپی رہی ہے۔ انہوں نے ہندو مذہب کی جو فلسفیانہ تعبیر و تفسیر پیش کی ہے اُسے میں اس صدی کا بہت بڑا کارنامہ سمجھتا ہوں انہوں نے بالعموم، مذہب اور فلسفے کو جس طور پر تطبیق دیا ہے۔ اس سے ہندی فکر کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ لیکن ہندوستان کی ابدی رُوح کا سب سے پاکیزہ، سب سے لطیف اور قابلِ احترام پیکر مجھے مہاتما گوتم بدھ کی شخصیت میں نظر آتا ہے وہ یقیناً تاریخ انسانی کی عظیم ترین شخصیتوں میں سے ایک ہیں۔ اُن کے نام کام اور پیام کا ذکر کرکے دل فرطِ عقیدت سے جھک جاتا ہے اور روح میں ایک عجیب طرح کا اہتزاز، اور سکون پیدا ہوتا ہے۔ میں نے یہ کیفیت برسوں محسوس کی ہے اور آج تک کرتا ہوں۔ ہندوستان کی زندگی میں میرے لئے سب سے پُرکشش چیز ہندی ذہن کا تفکر ہے۔ جس نے حقیقتِ مطلقہ کی عجیب عجیب اور نادر تعبیریں پیش کی ہیں اور انسانی زندگی کی اُن بوجھ پہیلی کو ہزار دلآویز طریقوں سے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ ہندوستان کی واقعی بڑی زبانوں یعنی اُردو کے علاوہ بنگالی، گجراتی، اور مراٹھی سیکھوں تاکہ اِن زبانوں میں شاعری ناول اور افسانے کے جو بے بہا خزانے موجود ہیں اُن سے لطف اندوز ہو سکوں۔ معلوم نہیں یہ تمنا کب پوری ہوگی۔

ہندوستان رنگارنگ تہذیبوں، زبانوں اور عقیدوں کا ملک ہے اور یہ بوقلمونی اور دھوپ چھاؤں بہت پُرکشش ہے، بشرطیکہ یہاں کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی میں رواداری کی رُوح پوری طرح حلول کر جائے۔ اس کام میں ہندوستان کے صوفیوں کی زندگی اور تعلیمات غفلت، ظلم اور تشدد کے اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں مشعلِ راہ بن سکتی ہیں۔ میرے دل میں ہمیشہ سے حضرت نظام الدین اولیاء، حضرت مجدد الف ثانی، حضرت معین الدین چشتی اجمیری، حضرت امیر خسرو، کبیر اور گورونانک کے لئے گہری عقیدت کا جذبہ موجزن رہا ہے۔ صرف مذہبی نقطہ نظر ہی سے نہیں، بلکہ خالص قومی نقطہ نظر سے بھی میں اُنہیں ہندوستان کی سب سے بڑی نعمت تصور کرتا ہوں۔ ان سب بزرگوں نے اپنی تعلیمات کے ذریعے نہ صرف صحیح مذہبی رُوح کو بیدار کیا ہے بلکہ رواداری، انسانی محبت واخوت اور ہمدردی کے ایسے چراغ روشن کئے ہیں جن کی ضوفگنی کی بدولت دلوں کے آئینے نفرت اور بغض و عناد کے غبار سے پاک و صاف ہو گئے۔ اُنہوں نے اپنی پاکیزہ زندگیوں کے نمونے سے اس احساس کو تازہ کیا کہ تمام انسان بہ حیثیت انسان ایک ہی برادری کے افراد ہیں اور اُن کے دلوں کو جوڑا جا سکتا ہے اس کے برعکس جو چیز تفریق پیدا کرتی اور احساسِ یگانگت کو مٹاتی ہے، وہ چھوٹے اور تنگ مقاصد کی چاکری ہے۔ اُن سے بلند ہو کر اگر ہم دیکھیں اور سوچ سکیں تو ایک سے زیادہ سطحوں پر ایک دوسرے کے ساتھ مل کر اور ایک دوسرے کے لئے زندہ بھی رہ سکتے ہیں اور مر بھی سکتے ہیں۔

مظفر حنفی

تمہارے گھر کا یہ جادہ نظر نہیں آتا
کوئی بھی نقش چمکتا نظر نہیں آتا
نہ جانے رات میں کیا ہو کہ دوپہر ہے ابھی
ابھی سے ہاتھ بھی اپنا نظر نہیں آتا
مجلس رہا ہوں میں تنہائیوں کے خیمے میں
کہ اپنی سوچ کا سایا نظر نہیں آتا
تجھے غرور کہ مجھ سا نہیں زمانے میں
مجھے یہ فخر کہ تجھ سا نظر نہیں آتا
اس آگہی نے عقیدے بھی چور کر ڈالے
کسی بھی قطرے میں دریا نظر نہیں آتا
وہ دل نہیں جو دھڑکتا ہوا دکھائی دے
لہو نہیں جو اچھلتا نظر نہیں آتا
خوشا میں ڈوب رہا ہوں بڑے سکون کے ساتھ
کہ دور دور کنارا نظر نہیں آتا
یہ عہد اتنا ہی پیچیدہ ہے کہ دروازہ
طلسم ہوشربا کا نظر نہیں آتا
وجودِ ذات کا عرفان ہو گیا جب سے
درخت پر کوئی پتہ نظر نہیں آتا

نثار احمد فاروقی

زندگی میرے لئے وجہ مسرت کب تھی
اتنی بے زار مگر اس سے طبیعت کب تھی؟
اب تو ہر شے عدم محض نظر آتی ہے
بے قراری تھی مگر دل کی یہ حالت کب تھی
زخم رہ جائیں گے اور وقت گزر جائے گا
جب وہ ملتا تھا تو اس فکر کی فرصت کب تھی
وائے آشفتہ دلی یہ بھی نہیں آتا یاد
میری جانب نگراں چشم عنایت کب تھی
اب تو ہر یاد تری یاد ہے، ہر غم ترا غم
اتنی شائستہ بھلا میری طبیعت کب تھی
اب جو کچھ فاصلے حائل ہیں تو ان کا غم کیا
ہم جسے قرب سمجھتے تھے وہ قربت کب تھی
زندگی بھر کے لئے شہر ترا چھوٹ گیا
قیس آوارہ کی قسمت میں یہ غربت کب تھی
روٹھتے تھے کبھی ہم اور مناتے تھے کبھی
وہ بھی اک کھیل سا ہوتا تھا شکایت کب تھی
میں اسے کھو کے بھی زندہ ہوں تو اکثر دل میں
سوچتا ہوں کہ مجھے اس سے محبت کب تھی
دل کی ویرانی تو اب سیر کے قابل ہے نثار
منہدم ہونے سے پہلے یہ عمارت کب تھی؟

کنول پرشاد کنول

ہر گھڑی چونک کے یوں آنکھ نہ کھولو، سولو
خواب سے جاگ کے، پہلو نہ ٹٹولو، سولو
رنگ خوابوں کے بہت چبھنے لگے ہیں اب تو
سونا چاہو تو اٹھو، آنکھوں کو دھولو، سولو
ویسے اک جان کو کیا کم ہیں یہ جی کے دکھڑے
کوئی آزار نیا، اور نہ مولو، سولو
دشتِ دل میں ہے سرِ شام سے ہو کا عالم
ایسے سناٹے میں خود سے بھی نہ بولو، سولو
صحنِ گلشن میں برسنے لگے پتھر سر پہ
اب یہ نشتر بھی رگِ جاں میں چبھولو، سولو
زیست ویسے ہی جہنم ہے، انہیں کر کے یاد
زہر کے جام میں بس اور نہ گھولو، سولو
جانے پہنچائیں کہاں سوچ کی ظالم لہریں
ایسے طوفان میں لہروں پہ نہ ڈولو، سولو
آب موتی سی ہے اشکوں کی رکھو اس کا خیال
درد کی آن کو پلکوں پہ نہ تولو، سولو
آرزوؤں کی بڑی بھیڑ ہے آنگن میں کنول
اس طرح ساتھ نہ ہر ایک کے ہولو، سولو

"میں نے تمہارے لیے شہریار کو پسند کر لیا ہے عذرا۔"
بڑی بہن نے اپنی چھوٹی بہن سے کہا اور چھوٹی بہن نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔

"مجھے یقین ہے وہ تمہیں بھی پسند آئے گا۔" بڑی بہن نے پھر کہا مگر عذرا خاموش ہی رہی پھر رکتے رکتے کافی ہمت کر اور جھجک کر بولی۔

"کیا وہ ایک عجیب اور سمجھ میں نہ آنے والا انسان نہیں ہے باجی؟"

"پھر بھی نیکی اور خلوص پر اعتماد زندگی کو سہل بنا دیتا ہے میری بہن، بے حد آسان۔ اور یہ بات خود پا اعتماد اور دوسروں پر بھروسہ کرنے والے ہی جان سکتے ہیں۔"

"تو گویا وہ فرشتہ ٹھہرا ــــ؟"

"ہاں۔ اگر زمین پر فرشتے ہوتے ہوں تو یکیوں کر اچھے کو اچھا نہ ماننا اتنا بُرا نہیں ہوتا عذرا جتنا اچھے کو خواہ مخواہ بُرا مان لینا۔"

"مگر وہ ہم سب کے لئے کتنا اجنبی ہے باجی ــ"

"اچھے انسان کسی کے لئے اجنبی نہیں ہوتے پگلی! کیوں کہ بہروپ اور اصلیت میں جو فرق ہوتا ہے وہی مخلص اور بناوٹی انسان میں بھی۔"

پھر عذرا نے کچھ نہیں کہا اور لپک کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ بڑی بہن نے اس کے غائب ہوتے ہوئے ہیولے کو ایک عجب ایک ممتن کی نظر سے دیکھا۔ وہ کچھ دیر کے لئے بے حد گم سم، حیران اور سراسیمہ رہیں پھر ایک خیال رہ رہ کے اُن کے دل میں جاگنے لگا۔

کہیں اس لڑکی کو کوئی اور لڑکا تو پسند نہیں؟ اور اس خیال کی پھانس خود اُن کے اپنے احساس میں گڑ کر رہ گئی۔

"بے وقوف، بے وقوف!!" وہ کچھ بے قراری ہو گئیں اور انہوں نے مدھم لہجے میں غیر موجود عذرا کو مخاطب کر کے کہا۔

"اپنے دل میں غم کو نہ پالنا پگلی کیونکہ غم انسان کو چڑچڑا، بد مزاج، مریض اور بے بس کر دیتا ہے۔ غم سلامت روی، دانش مندی اور صحت کا دشمن ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے کہ زخم اتفاقاً ہی لگتے ہیں مگر جو دانستہ لگائے جائیں پھر اُن کی دیکھ بھال اور فکر کتنی اہم اور ضروری ــــــــــ

ــــ مگر وہ لڑکا کون ہے جس سے تو آج نہیں دیکھا پھر میں کس طرح یہ سمجھ لوں، یہ طے کروں کہ وہ تیرے لائق ہے یا نہیں ــ"

وہ اُٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگیں مگر اُن کے ذہن پر صرف اسی نئے خیال کا قبضہ تھا۔ اپنی بہن کے مستقبل کا اندیشہ۔

سچ ہے۔ انہوں نے سوچا کہ ارد گرد دور دور تک نئے زمانے نے پرانے خیالات کو بچپن کے بیکار کھلونوں کی طرح اٹک پٹک کے توڑ دیا ہے، مگر ہمارے گھر میں تو یہ کھلونے ابھی بالکل چکنا چور نہیں ہوئے ہیں۔ ہم ابھی تک قدردانی کے تحت ان ٹوٹے ہوئے کھلونوں کو حتی الامکان جوڑ جوڑ کر جتن سے رکھ رہے ہیں اور دوسروں کو بھی یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ چیز جتنی پرانی ہو جائے اتنی ہی قابلِ قدر اور قابلِ اعتماد ہو جاتی ہے۔ اتنی ہی عزیز اور رفیق جتنی خود اپنی عمر اور اپنا تجربہ۔ جبکہ بے دھڑک ہر چیز توڑ پھوڑ دینے، بلا سوچے سمجھے پھینک پھینک کر ہر دم نئی چیزیں سمیٹنے والوں کے پاس تو سوائے کوڑے کرکٹ کے کچھ اور نہیں ہوتا۔ ہر آن مبلنے

رہنے والوں کے پاس دیکھ بھال کر احتیاط سے منتخب کی ہوئی ایک بھی کام کی چیز نہیں۔ پھر تو اُن لوگوں میں کس طرح جا بلی پگلی جو برسہا برس کی بینے سے لگا کر رکھی ہوئی قیمتی روایات کو منٹوں میں بالکل غلط اور قابلِ فراموش سمجھنے لگے ہیں—

نظریاتی تضاد اور حقیقی تصادم کے درمیان اُن کا دم گھٹنے لگا۔ بے حد جذباتی اضمحلال کے ساتھ انہوں نے اپنی دانست میں پھر عذرا کو تاکید کی۔

"جب زندگی گزرنے پر مائل ہوتی ہے تو خوابوں کو خاطر میں نہیں لاتی دیوانی، اونچے سے اونچے محل روند کر بڑے آرام اور اطمینان سے گزر جاتی ہے اور جی جان سے خواب دیکھنے والے بھی زندگی کو اندھا دھند گزر جانے کی اجازت دیئے بغیر نہیں رہ سکتے، زندگی کو نہیں روک سکتے۔ اپنی اُمیدوں، آرزوؤں، اپنے ننّے خیالات کو بے قیمت پلندے کی طرح کسی اندھیرے کونے میں ڈال دے اور بھول جا۔ بالکل بھول جا میری بہن کہ یہ تیرا طریقہ، تیری زندگی نہیں۔ اپنوں کے سایۂ آرام میں اطمینان اور بے فکری سے سو جا کیوں کہ اطمینان ہی تیری زندگی ہے، بے فکری ہی تیری آرام دہ نیند۔

فکر کو، جھکن کو، خدشات کو اپنا ساتھی نہ بنا کیونکہ ان تمام بکھیڑوں کو نپٹانے کے لئے میں جو موجود ہوں—"

انہوں نے تصوّر میں جیسے عذرا کے سر پر اپنا شفیق ہاتھ رکھ دیا اُس کے تمتماتے ہوئے رخساروں اور متفکر آنکھوں پر نرمی سے اپنا محبت بھرا لمس پھیلانے لگیں اور سوچ سوچ کر انہوں نے پھر کہا۔

"سکون کو اپنے دل میں ڈھونڈ دیوانی، سکون ایک خزانہ ہے اور جب تک اس خزانے کی خود اپنے آپ میں حفاظت نہ کی جائے یہ کسی دوسری ذات کے توسط سے تجھے کبھی نہیں مل سکتا۔"

پھر بڑی خاموشی، بڑی بُردباری، نہایت ظاہری سکون اور تمکنت کے ساتھ وہ عذرا کے کمرے کی طرف چلیں۔ چق سے جھانک کر انہوں نے دیکھا۔ عذرا پلنگ پر اوندھی پڑی ہوئی ہے۔ اور آنسوؤں کے واضح نشان اُس کے رخساروں پر اعلانیہ دکھائی دے رہے تھے بے ساختہ اُن کا جی چاہا۔ آگے بڑھ کر خود اپنے ہاتھوں سے پونچھ دیں مگر پھر وہ ٹھٹک کر رہ گئیں۔ اُنہیں یہ نشان نہیں پونچھنے چاہئیں کیونکہ ہر انسان کی انا ایک متاع ہوتی ہے اور اس کا پامال کیا جانا، اسے ٹھیس پہونچانا کتنا مشکل، ناممکن اور ناگوار—

انہوں نے کمرے کا دبیز پردہ ٹھیک طرح دروازے پر پھیلا دیا اور اُلٹے قدموں لوٹ گئیں۔

باہر کتنی تیز ہوا ہے۔ کتنی تند اور چبھنے والی روشنی مگر پگلی عذرا کو تو ان سے محفوظ رہنے اور پردہ ٹھیک طرح سے ڈھکنے کھینچنے کا خیال نہ آیا۔

لیکن عذرا کو اپنی بڑی بہن کی اس توجہ اور پوشیدہ تلخی کا مطلق کوئی احساس نہیں تھا۔

ہائے۔ اُس نے سوچا۔ لطیف آرزوئیں کتنا کم دلمیں پیدا ہوتی ہیں مگر جب نا تمام مٹنے لگتی ہیں تو کیسے کریہہ اور غلط نقوش چھوڑتی ہیں۔ کیوں کہ کوئی آواز اُسے رہ رہ کے خبردار کرنے لگی تھی۔ اُس سے کہتے اُسے جانے کہ رونا کڑھنا عورت کا شیوہ سہی، اُس کی قناعت کا سرمایہ بھی، عورت کا محبوب راز سہی مگر پھر بھی آخر آنسو کی حقیقت کتنی۔ ؟

جو انسان ایک بار شدید محبت کر چکے پھر اُس کے پاس دوسرے جذبے کتنا ماند پڑ جاتے ہیں اور ناگاہ اگر شدید محبت کھو بھی جائے تو پھر ایسا انسان ایک ایسا چھالہ اور آبلہ ہو جاتا ہے جو کسی علاج اور سکھ سے ٹھیک نہیں ہوتا بلکہ پھر وہ اس چھالے کی تکلیف اور جلن کو ہی اپنی ساری ہستی بنا لیتا ہے اور جب انسان سراسر درد ہو جاتا ہے تو خود بخود اس صوفی کے قریب جا پہونچتا ہے۔ ویسا ہی بن جاتا ہے جس کا دنیا داری سے کوئی تعلق اور واسطہ نہیں رہتا، جو سوائے خدا کے کوئی اور تصوّر اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔

بھلے ہی لوگ کسی تصوّر اور مشغلے کے بغیر اپنا وقت گزار لیں اپنی زندگی تج دیں، بھول جائیں، غم کو خواب اور پُر امید خواہشوں اور کاوشوں کو بچکانہ آنچل کو دبھر لیں، اپنی بے خواب آنکھوں کو نیند اور خوابوں سے بے نیاز رکھ لیں مگر کیا ایسے انسان بھی خود اپنے وجود کو محفوظ رکھنے کے باوجود دوسروں کو تگ و دو کرتے ہوئے زندگی کو جیتے ہوئے دیکھنے کی مسرت سے گریز کر سکتے ہیں ؟

لاعلمی سکون سہی مگر واقفیت خود ایک جدوجہد، ایک علم ہے پگلی۔

کتنے نادان ہیں وہ لوگ جو نقاب اوڑھ کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ جو دُنیا میں آتے ہیں مگر دُنیا کو کبھی نہیں دیکھتے، کبھی سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے جو زندگی کو ایک فطری عمل نہیں ایک دُنیا دی قانون سمجھتے ہیں، جو اپنی اپنی اور سبھی خواہشات کو قتل کر کے خوش ہوتے اور اس قید اور جبر کو غیر فطری سکون کے حوالے کر کے اِس سکوت کو گھٹن کے بجائے شرافت اور ذہنی برتری سے منسوب کرتے ہیں۔

آنسو ہر مسئلے کا حل یا مداوا نہیں — آنسوؤں سے گریز کر۔ اپنی آرزوؤں کے چہرے پرسے ہر ہر نقاب نوچ کر پھینک ڈال کیوں کہ بے ضرورت ہر چیز اُس غنودگی کی طرح ہوتی ہے جو غیر صحت مندی کی علامت ہوتی ہے۔

آخر روشن آنکھوں پر نقاب کس لئے؟ زندگی کا عنوان قید و بند کس لئے — ؟؟

سوچ کہ قوتِ عمل کے بغیر ذہانت، طاقت اور اچھائی بھی کتنی بے کار اور بے سود ہو جاتی ہے۔ کتنی کند اور بھول، توڑ دے اپنے قیدی وجود کے پاؤں کی ہر زنجیر توڑ ڈال۔ ہر مزاحم ہونے والی چیز کو پاش پاش کر دے۔ کیونکہ ارادے کے بغیر عزم اور استقلال بھی سکون اور آرام نہیں بن سکتے۔

دُنیا میں رہ کر بھی دُنیا سے دُور کسی گمنام ٹاپو میں زندگی بسر کرنا کتنا عجیب اور نا قابلِ قبول ہے کیونکہ کھانا، تن ڈھانکنا اور صرف سانس لینا ہی زندگی نہیں — شوخی، شرارت اور جوان جذبوں کو محسوس کرنا، انہیں چھو لینا، پکڑ لینا ہی دراصل زندگی ہے۔ حصولِ علم اور عمل کی ترغیب ہی دراصل رشتۂ حیات، کوئی نہ کوئی مقصدِ حیات اور دُنیا میں قربت ہی اصل میں زندگی کا راز —

اپنے آنسو پونچھ لے کہ زندگی ایک بے پایاں عمل ہے۔ زندگی قید خانہ نہیں۔ محض تختۂ دار و رسن نہیں — لپک اور اس حصار کو ڈھا دے جس نے مدت سے تیرا احاطہ کیا ہوا ہے۔ تجھے قید کر رکھا ہے۔

اور ایک مسکراہٹ، ایک موہوم سی مسکراہٹ تیرگی میں اکیلی کرن کی طرح خوف زدہ اور بوکھلائی عذرا کے لبوں پر چمک کر رہ گئی۔

ہائے میرا بے کار وجود —: وہ رہ رہ کے بے کلی سے تڑپنے لگی، ٹھیک ہے کہ وہ آزادی، من مانی اور خود مختاری سے واقف نہیں، وقت کی ذہنی، تمدنی اور آئینی تبدیلیوں سے بے بہرہ رکھی گئی، وہ ارد گرد کی ساری تہذیب سے دُور اب تک وہیں ٹھہرائی گئی ہے۔ جہاں نئے علوم اور جدید سائنسی انکشافات سے قبل کا لاعلم اور مہمل ذہن ٹھہرا ہوا ہے۔ غیر واقف اور غیر آگاہ مگر آرزو کی قربت ان سب سے کس قدر جولاں اور تند، کتنی جوشیلی اور طربناک —

عذرا نے جھنجلا کر مدتوں سے اپنی خواہشات کے رُخ پر پڑی ہوئی اندھیری اور غیر ضروری نقاب کھسوٹ ڈالی اور تب اُسے ہر چیز دفعتہً بڑی روشن، چکا چوند اور اُجالوں سے پُر نظر آنے لگی۔ بے حد نئی اور جاگتی جگمگاتی ہوئی۔

"شاباش۔ شاباش —!!" آواز نے اُسے پھر اُکسایا۔

"اب غیر معروف گمنام ٹاپو سے نکل کر دُنیا کو دیکھ۔ روشنیوں کی زد میں چمک جانے کی جدوجہد میں مصروف ہر ہر چیز کو پرکھ، اُجالوں کے لئے بے تاب اندھیری خندقوں کی کشمکش محسوس کر۔ کیونکہ دیکھنا اور محسوس کرنا ہی زندگی کی اہم ضرورتیں ہیں۔ اندھا دھند آگے بڑھنا ایک صریح غلطی مگر صحیح کا تعین اور حالتِ سفر ایک دلچسپ تجربہ۔ جنونِ منزل ہی زندگی کا اصل سفر، دو رستوں، سہ رستوں اور چورستوں پر ٹریفک کی زیادتی انسان کو کتنا ہی گھبرا اور دھکا کیوں نہ دے مگر آرزو کی لگن کم نہ ہو تو صحیح منزل کا قدموں تلے آجانا کتنا ناگزیر —"

اس مسلسل گونج کے بعد بستر سے کود کر عذرا بڑے اضطرار سے خود اپنے مقابل کھڑی ہو گئی، اُس کی سرد، بے رُوح، بے عملی کو روندتا ہوا ایک نیا پُرجوش لمحہ اچانک اُس کے گلے میں اپنی جوشیلی بانہیں ڈالنے لگا، انجانی کیفیت کی ایک تیز چیخ اُس کے خشک حلق کو تر کرتی ہوئی اُس کے سوکھے ہونٹوں تک آئی اور بے اختیار ایک نام بن گئی۔

"اقبال، اقبال — آؤ اور میرا ہاتھ تھام لو۔ مجھے میری تاریک دُنیا سے نکال کر اپنی چکا چوند دُنیا میں دُور تک اپنے ساتھ لے چلو، تمہارے ہاتھ کا لمس میری ہمت بن جائے گا۔ پھر میں ہر زنجیر کی جھنکار بھول جاؤں گی، اپنے سنسان قیدی وجود کو کچل دوں گی۔ تم ایک مشتاق، متمنی

آرزومند لڑکی کی بے پناہ آنکھوں میں جھانک کر تو دیکھو۔ پھولوں کی پنکھڑی پر صبح دم اوس سے لکھی ہوئی نم، خوبصورت تحریر پڑھ تو لو۔ پھر تمہیں زندگی میں گلزار ہی گلزار ملیں گے۔ لالہ زار ہی لالہ زار، آبِ حیات ملے گا، حلاوت، سکھ، چین اور دُنیا کی تمام تر نعمتیں۔"

کاش باجی بھی میری امید کے قریب پہونچ جاتیں۔ مگر۔ میں نے تو ہمیشہ اندھیرے میں چھپ کر تمہیں دیکھا ہے اقبال کیوں کہ مجھے روشنی سے ڈر لگتا ہے نا، لیکن تمہاری خاطر اگر میں روشنی میں آجاؤں، باجی کو سب کچھ بتا دوں، اندھیرا ہمارے درمیان سے ہمیشہ کے لئے ہٹ جائے تو ـــ ؟

وہ گھبرا گھبرا کر اپنی محبوس خواہش سے بار بار التجا کرنے لگی۔

" خدا کے لئے، میری آنکھوں میں دیکھو۔ میرے دل کو ٹٹولو۔ میری حیات کو سنسان ویرانیوں کے حوالے نہ کر ڈالو۔ گرمی کی تپتی ہوئی اجاڑ دوپہر نہ بنا دو۔ بلبل سے خالی، خاموش اور گم سم جس میں لُو اور کڑی حدت کے ڈر سے، تپش کی وجہ سے کوئی متنفس باہر نہیں نکلتا۔ راہیں خالی اور شاہراہیں سناٹوں سے معمور ہوتی ہیں، سارا شہر، ساری رونق پھیکی اور ماند، کھوئی کھوئی سی۔

کہہ دو کہ تم میری نرم اور ملائم زندگی کو کرخت اور بے مہر نہیں بننے دوگے۔ تم میری پکار سنو گے، وعدہ کرو، زندگی بھر کی رفاقت کا حسین وعدہ۔"

اور ہمت اور اُمید کے باوجود وسوسوں اور اندیشوں کے درمیان تھوڑی دیر کے لئے عذرا کا وہی حال ہوا جو طویل سفر میں مختصر زادِ راہ کا ہوتا ہے۔ وہ اپنی آرزو کے مقابل کبھی تو خود کو بے حد جری محسوس کرتی اور کبھی بے حد خوفزدہ اور کم ہمت، کبھی اپنی آرزو سے خوش ہوتی، کبھی اپنی ناکامی کے خیال سے پژمردہ و مایوس۔

" میں تمہیں جانتی ہوں اقبال مگر تم مجھے پہچانتے ہو یا نہیں ؟"

اور اُس کی متضاد کشمکش کو محسوس کرکے آواز نے پھر اُسے ہمت دلائی ـــ

" بُزدلی کے ہر سر خول کے پرخچے اُڑا دے اور ٹوٹے ہوئے خول کے ٹکڑے اتنی دُور پھینک ڈال جو تجھے پھر کبھی نظر نہ آسکیں صرف کھوئے کا حصہ بن جائیں۔ تیرے استقلال، تیرے خیال کو ڈانوا ڈول نہ کرسکیں۔

یہ دل نہیں جو ٹوٹ کر زیادہ قیمتی ہو جائے گا پگلی۔ اپنی آرزو کو پہچان، خود سے کنارہ نہ کر۔"

اور عذرا نے اعتراف کیا کہ دل واقعی بہت اہم، بے حد کار آمد ہوتا ہے اور اقرار کیا کہ دل ایک نشہ ہے، ایک اُمنگ اور ترنگ جبکہ بزدلی ایک سخت واہیات اصلیت کو چھپانے والی بے کار سی چیز، اور بزدلی ناقابلِ اعتبار برف کی سل۔ دل کو ٹوٹنا نہیں چاہئے۔ دل کو پامال نہیں ہونا چاہئے۔ تب اُس کا جی چاہا۔ بن میں کوکتی کوئل کی طرح کسی گھنے سایہ دار درخت پر بیٹھ کر لازوال حیات کا کوئی ابدی نغمہ چھیڑ دے۔ ساری دُنیا کو اس نغمے سے سرشار کر دے۔ ساری دُنیا کو چاند، ستارے، محبت اور آرزو بنا دے۔

تب وہ لپک کر غسل خانے میں بھاگی اور اپنی سُرخ آنکھوں اور تمتماتے ہوئے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھپاکے مار مار کر وہ سارے نشان مٹانے لگی جو اُس کی مایوسی اور آزردگی کے نشان تھے۔ پھر آئینے کے آگے ٹھہر کر بڑی دلچسپی سے اپنے بال سنوارے، ٹرنک سے نکال کر ہلکے ہلکے رنگوں کے قوسِ قزح جیسے دل آویز کپڑے پہنے اور اتنا کرکے وہ اُس گھڑی کا انتظار کرنے لگی، جب شام کے آخری حصے میں ہمیشہ کی طرح اقبال اُس کی بڑی بہن سے ملنے آئے۔ اقبال جو اُس کی بڑی بہن کا دیور تھا اور ابھی طالب علم، تو وہ اپنی خواہش کا عکس اقبال کو دکھا ہی دے ـــ

زینے کے اندھیرے حصے پر کھڑی وہ دیر تک قدموں کی چاپ سنتی رہی، اپنے وحشی دل کو برابر سمجھاتی مناتی رہی۔ ہوشیار، خبردار۔ کہیں ڈول اور ڈگمگا نہ جانا۔ اپنی تمنا کا آئینہ اقبال کے ہاتھوں میں تھما ہی دینا، اُسے اپنا ارمان دکھا ہی دینا، آرزو کو حسرت نہ بننے دینا۔ کیونکہ تو نے آنکھیں پالی ہیں اے دل، تو فہم کا زینہ چڑھنے لگا ہے۔ میرے دل۔ میرے دل ـــ !!

مگر جب اقبال آیا تو سب کچھ بھول بھال کر عذرا یکلخت اندر بھاگی اور اپنے ہیبت زدہ دل کو تھام تھام کر خوفزدہ ہونے لگی۔ !!

" اگر اقبال مجھے دیکھ لیتے تو ـــ ؟"

اگر خود باجی مجھے اس طرح دیکھ لیتیں تو ـــ ؟

میں کیا کہتی — کیا —؟ میری زبان کو تو کچھ کہنے کی عادت ہی نہیں —!

میں سیڑھی لگا کر دیوار پر تو چڑھ سکتی ہوں شاید اور دوسری طرف کا تماشہ نگاہِ شوق سے دیکھ بھی سکتی ہوں مگر تماشہ پسند آجانے کے باوجود دوسری طرف کو دیانے کی ہمت آخر مجھ میں کیوں نہیں —؟

اور خوبصورت خیالات کے سائے جھکتے ہوئے پھول دفعتہً اس کے ذہن کے دامن سے اُچک اُچک کر اونچی اونچی ڈالوں پر جا چپکے۔

"کم ہمت، کم ہمت —!!" وہ چیخنے لگے، "تو نے اپنا آپ تو گنوایا ہی ہمارا بھی ناحق ستیاناس کیا۔ اب تو کبھی ہمیں نہیں پا سکے گی، کبھی ہماری طرف ہاتھ نہیں بڑھا سکے گی کیونکہ ہم تیری لپک، تیری پہونچ سے بہت پرے۔ دور جا چکے ہیں اور ہم اُن کے ہاتھ نہیں لگتے جو ہمیں تھامنا پکڑنا نہیں جانتے۔"

پھر دو گھنٹے کے بعد جب اقبال واپس چلا گیا تو عذرا نے سخت کوفت، جھنجھلاہٹ اور پژمردگی محسوس کی۔

"یہ میں نے کیا کر دیا — کیا —؟"

وہ دیر تک سر تھامے بیٹھی رہ گئی — اور اُمیدوں کے تمام سر بفلک محل اُس کا منہ چڑاتے، اُس پر ہنستے مسکرانے لگے،

حیات کے نظر نواز فانوس میں خود کو سجا کر تم ایک چراغ کی طرح ضرور سُلگ سکتی ہو مگر تم آفتاب کی طرح ساری دُنیا کو منور نہیں کر سکتیں۔ تم ایک حقیر ذرّہ، سورج کس طرح بن سکتی ہو بھلا۔

اور برہم آواز نے اُس سے کہا —

"ڈرپوک، تو کچھ نہیں کر سکتی۔ تازہ کھلی ہوا کی افادیت کبھی نہیں جان سکتی۔ تو بالآخر ایک قیدی ٹھہری۔ اطراف گھری ہوئی مضبوط بلند دیواروں کے حصار میں محفوظ اور مقید رہنے کی عادی۔

تو ایک لکڑی کا ٹکڑا ہے، جسے دوسرے ضرور استعمال کر سکتے ہیں مگر وقتِ ضرورت خود اپنے آپ کو استعمال کرنا، اپنے استعمال سے واقف ہونا شاید تیرا مقدر نہیں۔

اب ہر صبح اُمیدوں کے محل بنا، ہر دوپہر اُس کو روشنی

(بقیہ ۲۳ پر)

غزل

کامل فتح پوری

اللہ اللہ اُس کے چہرے کی پھبن
پانی پانی ہو گیا حُسنِ چمن

آئینہ بن کر کسی کے حُسن کا
پھر رہا ہوں انجمن در انجمن

اِک صدائے حق کا ہنگامہ نہ پوچھ
ہر طرف دار و رسن دار و رسن

تذکرہ میری وفا کا کم کرو
آنہ جائے اُس کے ماتھے پر شکن

ہنس رہا ہوں آپ اپنے حال پر
کوئی دیکھے تو مرا دیوانہ پن

میں تو دیوانہ ہوں میرے واسطے
ایک سے دونوں ہیں بستی ہو کہ بن

چاک دامانی ہے اپنی بے سبب
گریۂ شبنم پہ گُل ہیں خندہ زن

پھر کرم آمادہ ہے اُس کی نگاہ
یہ حقیقت ہے کہ میرا حُسنِ ظن

اِن پہ شاید تیرا پرتو پڑ گیا
ورنہ پھولوں میں کہاں تھا بانکپن

پھر ضرورت ہے کسی منصور کی
اُٹھ رہی ہے شورشِ دار و رسن

غم کدے میں اپنے کامل آج تک
بھول کر آئی نہ سورج کی کرن

طہاس نامہ

سعادت یار خاں رنگین کے والد کی خودنوشت

محمد حسن

انشار اور رنگین ہمارے ادب کی سب سے زیادہ رنگین شخصیتیں ہیں۔ انشاء نے رنگین کو ریختی کا موجد قرار دیا ہے۔ خود مجالس رنگین، سعادت یار خاں رنگین کی شخصیت اور اُن کے دَور کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ ابھی حال میں سعادت یار خاں رنگین کے والد محکم الدولہ اعتقاد جنگ طہاس بیگ خان بہادر کی خودنوشت سوانح عمری طہاس نامے کے عنوان سے شائع ہوئی ہے جو تاریخ اور تاریخِ ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے انتہائی مفید اور ایک اہم دَور کی نہایت دلچسپ اور اہم دستاویز ہے۔

طہاس خاں ۱۷۳۸ء کے قریب ترکی کے کسی دیہات میں پیدا ہوئے تھے۔ پانچ برس کی عمر تھی کہ نادرشاہ کے سپاہیوں نے اغوا کر لیا۔ اور غلام بنا لیا پانچ برس کی عمر ہی کیا۔ نہ بچے کو اپنا نام یاد ہے نہ اپنے آباو اجداد وطن اور گھر سے پوری واقفیت: بچپن کی چند دھندلی سی یادیں اور اپنے قبیلے اور وطن کے بارے میں سرسری قیاسات کے سوا طہاس خاں کے پاس ماضی کی کوئی یادگار نہ تھی۔ اِس لئے طہاس نامے کی تلخیص کے مترجم اور مرتب پی۔ سیتو مادھو راؤ نے کتاب کا ضمنی عنوان ایک غلام کی خود نوشت سوانح عمری" بھی تجویز کیا ہے۔

۱۷۴۷ء میں نادرشاہ کے انتقال کے بعد اس کے کچھ ترک سردار ہندوستان آ گئے اور انہیں کے ساتھ طہاس خاں بھی ہندوستان آیا۔ اُس وقت اُس کا نام ذاکر تھا جو اُس کے اغوا کرنے والوں نے اُسے دیا تھا۔ اس کا ماں باپ کا رکھا ہوا نام اُسے یاد نہیں تھا۔ ترک سردار پہلے ملتان اور پھر لاہور آئے۔ یہ زمانہ وہ تھا جب پنجاب معین الملک کے زیرِ نگیں تھا۔ معین الملک کی خدمت میں باریابی حاصل کرنے کے لئے ازبک سرداروں نے تین غلام لڑکوں کو نذر کے طور پر پیش کیا۔ اِن میں ذاکر بھی تھا جسے معین الملک نے بعد میں تیمور کا نام دیا ۱۷۵۷ء میں جب احمد شاہ ابدالی کا بیٹا تیمور شاہ پنجاب کا صوبہ دار ہوا تو ذاکر

---

[1] طہاس نامے کی تلخیص کا انگریزی ترجمہ پی۔ سیتو مادھو راؤ نے طہاس نامہ ایک غلام کی خود نوشت سوانح عمری کے عنوان سے پاپولر پرکاشن بمبئی سے ۱۹۶۷ء میں شائع کیا ہے۔ صفحات کی تعداد ۱۵۳ ہے۔ اِس مقالے میں انگریزی تلخیص سے استفادہ کیا گیا ہے اور اُن کے ناموں کا اِملا اسی کے مطابق ہے۔

کا نام تیمور کے بجائے طہاس رکھ دیا گیا۔ طہاس جگہ جگہ خود نوشت میں اپنے لئے مسکین کا لفظ بھی استعمال کرتا ہے۔ ممکن ہے یہ محض انکساری اور کسرِ نفسی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ طہاس نے یہ تخلص اختیار کر لیا ہو۔

طہاس خاں کی خود نوشت دلچسپ واقعات سے بھری ہوئی ہے دلچسپ بھی اور دل آویز بھی۔ اِن میں سرِ فہرست تو اُس کے اغوا کا واقعہ ہے جسے طہاس نے خاص تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتا ہے:۔

"نادر شاہ اور سلطان ترکی کی جنگ کے دوران میں نادر شاہ کی فوجیں میرے گاؤں سے گزریں، اُنہوں نے لوٹنا، مارنا اور ہر قسم کی ظلم زیادتی کرنا شروع کیا۔ اس وقت میری ماں اور بڑے بھائی مجھے لے کر گھر سے باہر نکل آئے۔ پورے گاؤں میں زبردست ظلم وستم توڑے گئے۔ میں اس وقت ایک سوار ہمارے مقابل ہوا۔ اُس نے مجھے میرے بھائی کی گود سے چھین لیا۔ میری ماں اور بھائی دونوں روتے پیٹتے میرے پیچھے دوڑے۔ اُس وقت ایک دوسرے سوار نے میرے بھائی کو تلوار ماری۔ اُس پر میری ماں میرے بھائی کی دیکھ بھال کرنے کے لئے مڑی۔ اس موقع کو غنیمت سمجھ کر سوار نے مجھے گھوڑے پر بٹھایا اور بھاگ گیا۔ اس کے بعد مجھے اپنی ماں اور بھائی کا کوئی علم نہیں۔"

طہاس کو بخارا کے ایک سردار سام اپنے بیٹے کی طرح پالا۔ نادر شاہ کے بعد سام فرمانروائے تبریز کی ملازمت میں آگیا۔ نادر شاہ کے مختلف سرداروں میں خانہ جنگی میں طہاس کا آقا مارا گیا اور طہاس امیر ارسلان سے وابستہ ہو گیا۔ اپنے نئے آقاؤں کی قید سے فرار ہو کر مختلف سرداروں کے درمیان غلام کی حیثیت سے منتقل کیا جاتا رہا اور آخر میں دو ازبک سردار شہاب الدین بیگ اور محمد نذیر بیگ طہاس اور چند اور غلام لڑکوں کو ساتھ لے کر پہلے ملتان اور پھر لاہور آئے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کیا۔

۱۱ مارچ ۱۷۴۸ء کو محمد شاہ کے صاحبزادے احمد شاہ اور وزیر قمر الدین خاں کی سرکردگی میں شاہی فوج کو شکست ہوئی اور قمر الدین خاں مارے گئے۔ اور اُن کے لڑکے معین الملک کو پنجاب کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ ۱۵ اپریل ۱۷۴۸ء کو محمد شاہ کا انتقال ہوا اور معین الملک نے صوبہ دار کی حیثیت سے پنجاب کا نظم ونسق سنبھالا۔

معین الملک کی خدمت میں طہاس کے پیش ہونے کا قصہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ معین الملک نے طہاس کی تربیت اور تعلیم کی طرف خاص توجہ کی۔ "ہندوستانی کے بجائے اُنہیں ترکی زبان پڑھائی جاتی تھی۔ جب معین الملک کی والدہ شولا پوری بیگم لاہور آئیں تو معین الملک نے اُن ازبک غلام بچوں کو اپنے لڑکے کہہ کر متعارف کرایا۔ احمد شاہ ابدالی اور معین الملک کی لڑائی (۱۷۵۱ء) کے بارے میں مصنف لکھتا ہے۔ کہ لڑائی کو چار ماہ ہو چکے تھے کہ احمد شاہ ابدالی کا قاصد یہ پیغام لایا کہ کثیر تعداد میں دونوں طرف سے بہت سے لوگ مارے جا رہے ہیں۔ تم آخر اُس کی کیا جواب دہی کروگے؟ بہتر ہے کہ میرے پاس آکر گفت و شنید سے معاملہ طے کر لو۔" اس کے جواب میں معین الملک بغیر کسی کے صلاح ومشورے کے احمد شاہ کے خیمے کی طرف چل دیا۔ احمد شاہ نے بڑی عزت واحترام سے استقبال کیا اور دریافت کیا۔

"تم نے میرا مقابلہ کیا ہے۔ تم سے کیسا سلوک کیا جائے۔"

معین الملک نے جواب دیا۔ "اگر تم سوداگر ہو تو مجھے خرید لو۔ اگر تم قصاب ہو تو مجھے قتل کر ڈالو اور اگر تم بادشاہ ہو تو مجھے معاف کر دو"

احمد شاہ ابدالی اس جواب سے خوش ہوا۔ معین الملک سے بغلگیر ہوا اور اُسے اپنی دستار بخش دی۔

معین الملک کی موت کا قصہ طہاس کا چشم دید ہے وہ بیان کرتا ہے کہ شکار سے واپسی پر لاہور سے آٹھ کوس پر ٹیکا پور گاؤں کے ایک قصبے میں معین الملک نے قیام کیا۔ کھانے کے بعد تھوڑی دیر آرام کیا۔ سو کر اٹھنے پر طہاس نے معین الملک کو بتایا کہ آپ کا بازو بند کھل گیا ہے۔ معین الملک کو حیرت ہوئی اُس نے بازو بند ایک سردار کو دے دیا۔ اس کے بعد معین الملک چند لوگوں کو لے کر جن میں طہاس بھی شامل تھا کھیتوں میں نکل گیا۔ وہاں اس کو بول و براز کی ضرورت محسوس ہوئی اُن لوگوں کو ہدایت

کی گئی کہ تھوڑی دیر پر منہ پھیر کر کھڑے ہو جائیں مگر کوشش کے باوجود اجابت نہیں ہوئی اور اچانک معین الملک بے ہوش ہو کر گر پڑا اور قوتِ گویائی جاتی رہی۔ آدھی رات کو انتقال ہو گیا۔ طہماس لکھتا ہے کہ چہرے سے سینے تک جسم بالکل نیلا پڑ گیا تھا۔

معین الملک کی موت کے بعد طہماس کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا معین الملک کی بیوہ مغلانی بیگم نے صوبہ داری سنبھالی۔ یہ سب غلام زادے اب تربیت کی سخت بندشوں سے آزاد ہوئے اور طرح طرح کی عیاشیوں میں پڑ گئے۔ اپنے بارے میں لکھتا ہے کہ "میں بھی ایک طوائف زادی موتی" نامی کے عشق میں مبتلا ہو گیا۔ مغلانی بیگم نے آخر کار طہماس اور پانچ دوسرے غلام بچوں کی شادی کرا دی۔ حنا بندی کی رسم ادا کی گئی اور سات کشتیاں مہندی ایک ایک اشرفی اور دو شالہ بخشا گیا۔

مغلانی بیگم کا نہایت ہی جیتا جاگتا نقشہ طہماس نے کھینچا ہے۔ جس سے اس کی بیدار مغزی، ہوش مندی اور جذباتیت کا پتہ چلتا ہے۔ جگہ جگہ پر طہماس اس بات کو جتانا چاہتا ہے کہ اس وقت بھی جب وہ ادنیٰ غلام کی حیثیت سے ترقی کر کے منصب دار اور امیر ہو گیا تھا۔ وہ مغلانی بیگم کا وفادار رہا۔ اور انہیں صحیح مشورے دیتا اور اُن کی مدد کرتا رہا۔ ایک جگہ لکھتا ہے۔

"بیگم اکثر اپنی گفتگو میں نازیبا اور غیر مناسب جملے استعمال کرتی تھی مگر میں انتہائی عقیدت کی وجہ سے ان باتوں کی پروا نہ کرتا تھا۔ میں بیگم سے ہمیشہ نصیحت اور مشورے کی باتیں کرتا رہتا تھا اس طرح کوئی نامناسب بات کرنے سے گریز کی راہ نکال لیتا تھا۔ میں بیگم سے کہا کرتا تھا ایسے نازیبا جملے نہ کہا کیجئے۔ یہ آپ کی شان اور وقار کے خلاف ہیں۔ بیگم نے مجھے قیمتی جواہرات دیئے مگر میں نے کبھی بیگم کی بات نہ مانی۔ کچھ عرصے تک یہی صورتِ حال قائم رہی مگر میرے اوپر خدا کا فضل تھا۔ میں نے کبھی ایک بھی نازیبا کلمہ زبان سے نہ نکالا اور بیگم کو ہمیشہ اپنی ماں کی طرح سمجھا۔"

مغلانی بیگم کے التفات کے تذکرے جابجا بکھرے ہوئے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیگم کو طہماس سے رُومانی دلچسپی تھی۔ بعد کو مغلانی بیگم نے ایک امیر شہباز نامی سے شادی کر لی۔

۱۰ جنوری ۱۷۶۰ کو ابدالی کے داخلہ، دہلی کا حال طہماس نے چشم دید مشاہد کی طرح بیان کیا ہے۔ ابدالی کے سپاہیوں نے طہماس اور اس کے ساتھیوں کے ہتھیار چھین لئے تھے اور انہیں مجبور کیا تھا کہ وہ چند امیر آدمیوں کے گھروں کا پتہ نشان بتائیں۔ مجبور ہو کر طہماس نے ایک بڑی عمارت کی طرف اشارہ کر دیا۔ اور جب سپاہی اس عمارت کو لوٹنے میں لگ گئے تو یہ عمارت کے پیچھے سے کود کر فرار ہو گیا۔ شہر کی لوٹ مار سے گھبرا کر مقیم بیگ کے ساتھ پیدل مغلانی بیگم کی جائے قیام پر پہونچا۔ رات وہاں گزاری۔ بیگم شہر جا چکی تھیں۔ صبح کو بیگم کے ملازموں کو لے کر شہر پہونچا۔ بیگم طہماس کو دیکھتے ہی سخت غصہ ہوئی۔

قصہ یہ تھا کہ مغلانی بیگم کی ایک چہیتی کنیز، خواجہ سرا محبت نامی کو چاہتی تھی۔ مغلانی بیگم کو یہ بات سخت ناپسند تھی۔ خواجہ سرا محبت بیگم کے جموں کے قیام کے دوران بھاگ کر دہلی چلا گیا۔ بیگم کے دہلی جانے کی خبریں گرم تھیں مگر بیگم کے ساتھ "دہلی جانے" والی کنیزوں میں اس کنیز کا نام شامل نہ تھا۔ ایک دن اچانک وہ کنیز بیگم کے ہاں سے غائب ہو گئی۔ مغلانی بیگم کی آتشِ غضب اور بھڑکی۔ اس کنیز کا سراغ لگانے کے لئے بیگم نے کنیزوں کو اتنا مارا پیٹا کہ اُن میں سے ایک کنیز مر گئی۔ کچھ دنوں بعد بیگم کی بیٹی کی ہم رکابی میں طہماس کو بھیجا گیا۔ مقامی امیر محمد سعید خاں نے نگرانی کے لئے سپاہی مقرر کئے (مغلانی بیگم کی بڑی بیٹی عمدہ بیگم وزیر عماد الملک غازی الدین خاں کی بیوی تھی) اس قافلے کے دہلی پہونچنے پر معلوم ہوا کہ جموں میں جو کنیز غائب ہو گئی تھی وہ اچانک خواجہ سرا محبت کے گھر دہلی پہونچ گئی ہے۔ خواجہ سرا محبت اب متمول اور با اثر آدمی تھا۔ اُس نے طہماس کو ملازمت کی بھی پیش کش کی تھی۔ یہ خبر البتہ مشہور ہو گئی کہ اُس کنیز کو جموں سے دہلی لانے میں طہماس کا ہاتھ ہے اور وہ عمدہ بیگم ہی کے قافلے کے ساتھ دہلی لائی گئی ہے۔ ظاہر ہے مغلانی بیگم کو یہ سُن کر سخت طیش آیا اور اس وجہ سے طہماس کو دیکھتے ہی مغلانی بیگم نے سخت و سُست کہنا شروع کر دیا۔

جہاں تک طہماس کی اولاد کا تعلق ہے۔ اس خود نوشت میں ان میں اکثر کی پیدائش کا سنہ درج ہے۔ طہماس کی اولاد میں سب سے بڑی ایک لڑکی ہے۔ اس کے بعد اللہ یار خاں (۱۷۶۰) اس کے بعد مشہور اردو شاعر سعادت یار خاں (جنوری ۱۷۶۳) جن کی ولادت سرہند میں ہوئی۔ ۱۷۶۷ء میں تیسرا بیٹا محمد یار خاں پیدا ہوا۔ ۱۷۷۰ء میں چوتھا بیٹا خدا یار خاں پیدا ہوا۔

طہماس نے دو شادیاں کیں۔ ۴۴ سال کی متاہلانہ زندگی میں پہلی بیوی سے ۱۲ اولادیں ہوئیں۔ ان میں سے صرف چار بیٹے اور تین بیٹیاں اس خود نوشت کی تحریر کے وقت یعنی ۲۴ اپریل ۱۷۸۲ء تک زندہ تھیں۔ دوسری بیوی سے دو لڑکے ہوئے اُن میں سے ایک مر گیا۔ دوسرے کا نام حق وردی خاں تھا۔ دوسری شادی کابلی مغل کی لڑکی سے ہوئی تھی جب کہ طہماس کی پہلی بیوی اور بچے نجیب آباد میں تھے اور طہماس ضابطہ خاں سے متعلق تھا اور ایک مدت سے دہلی میں مقیم تھا۔ (۱۷۷۰ء)

طہماس کی سب سے بڑی لڑکی ماہ خانم کی شادی طہماس کی منہ بولی بہن کے لڑکے عوض بدل خاں سے ہوئی۔ اس کے ہم نام جمعدار طہماس خاں نامی کی لڑکی کی شادی اللہ یار خاں سے ہوئی۔ یہ شادی غوث گڑھ کی لڑائی کی وجہ سے مقررہ وقت پر نہ ہو سکی کیونکہ غوث گڑھ کی لڑائی میں جمعدار طہماس خاں خود بھی شریک تھا۔ طہماس بھی غوث گڑھ گیا۔ وہاں کے لشکر کا حال بیان کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ گیہوں اب پہلے سے قدرے مہنگا ہو گیا ہے۔

سعادت یار خاں رنگین کی شادی بدخشی خاندان کی لڑکی سے اور محمد یار خاں کی شادی مغل خاندان کی لڑکی سے علی گڑھ میں کی گئی اور اس میں ۸ ہزار روپیہ صرف ہوا۔ سعادت یار خاں رنگین کی تعلیم و تربیت پر خاص طور پر توجہ کی گئی۔ سعادت یار خاں اور اللہ یار خاں کو شمشیر زنی، بندوق چلانے اور اس قسم کے دوسرے فنون کی تعلیم دی گئی جو سپاہی کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ مولوی عبدالغنی کو (جن کی طہماس بڑی تعریف کرتا ہے) اپنے لڑکوں کا اتالیق مقرر کیا۔ ایک مغل عالم حاجی محمد تبریزی ان لڑکوں کو ترکی زبان سکھانے پر مامور تھا۔

اور یہ دونوں اچھی طرح ترکی لکھنے لگے تھے۔ اُن کی تعلیم کے لئے طہماس نے ایک ترکی قواعد کی کتاب تیار کی تھی جس میں ترکی قواعد کے اصول فارسی میں بیان کئے گئے تھے۔ قواعد کی کتاب لکھتے وقت طہماس کو اپنی خود نوشت ترکی زبان میں لکھنے کا خیال آیا۔ لشکر کے ساتھ پڑاؤ کے دوران طہماس نے خود نوشت سوانح عمری لکھنی شروع کی۔ اس کام میں طہماس کے لڑکے بھی مدد کیا کرتے تھے گویا اس خود نوشت کی آرائش و اصلاح میں سعادت یار خاں رنگین کا بھی حصہ رہا ہے۔

اللہ یار خاں اور سعادت یار خاں نجف خاں کی فوج میں ملازم ہو گئے تھے۔ کاماں کی لڑائی کا حال طہماس نے خاصی تفصیل سے لکھا ہے۔ اس لڑائی میں طہماس اپنے دونوں لڑکوں کے ساتھ شریک تھا۔ نجف خاں ان تینوں کی بہادری اور پامردی سے بہت متاثر ہوا۔

نجف خاں کے دورانِ وزارت میں دہلی کے امن و امان اور عیش و عشرت کی طہماس نے بڑی تعریف کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ہر گھر عیش و عشرت سے معمور ہے۔ ہر طرح کی چیزیں شہر میں بیچی اور خریدی جاتی ہیں۔ اور نئی نئی عمارتیں بن رہی ہیں۔ تورانی امرا بادل بیگ خاں ترک جنگ اور نیاز بیگ خاں طالب جنگ مشہور ہیں۔ موخرالذکر کا انتقال خود نوشت کی تالیف سے کچھ پہلے ہوا تھا۔ اس کے علاوہ مراد بیگ خاں شمشیر جنگ کے سپرد توپ خانے کی خدمت تھی اور اس کی رسائی شہنشاہ تک تھی اور اُس کا قریبی عزیز عاشور علی خاں بھی توپ خانے میں اعلیٰ عہدے پر ممتاز تھا۔ طہماس کو بھی اپنی جنگی خدمات کے صلے میں محکم الدولہ، اعتقاد جنگ کے خطابات اور ہاتھی اور خلعت وغیرہ انعام میں ملے۔

اِس خود نوشت سوانح عمری کی تکمیل کے وقت طہماس دہلی کے محلہ بلی ماراں میں اپنے مکان میں مستقل سکونت اختیار کر چکا تھا۔ مکان چھوٹا تھا لہٰذا دوسرے پاس پڑوس کے مکانات لے کر ایک بڑی حویلی اپنے لئے تعمیر کر لی۔ گمی منڈی کے علاقے کو بھی خرید کر وہاں ایک باغ بنوایا۔ اپنے لڑکے اور لڑکیوں کو الگ الگ مکانات، گھوڑے اور ملازمین دیئے۔ دو لڑکے محمد یار خاں اور خدا یار خاں صوفی بزرگ شاہ امانی کے مرید ہو گئے۔

یہ خودنوشت سوانح عمری نو ماہ میں مکمل ہوئی اور ۲۴ اپریل ۱۷۸۴ء کو دلی میں پایۂ تکمیل کو پہونچی۔ اس کی اصلاح طہماسپ نے منشی میگھ راج سے کرائی۔

اس خودنوشت سوانح عمری کے مطالعے سے اندازہ ہوگا کہ اس کی ادبی اور تاریخی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اس دور کے بارے میں براہِ راست معلومات کے وسائل بہت کم ہیں۔ یہ دَور اُردو شاعری کا تشکیلی دَور ہے۔ اور میرؔ، سوداؔ، میر دردؔ جیسے عظیم شاعر اس دَور میں اُردو کے فروغ و جستجو و آرزو میں شریک رہے ہیں۔ پھر ان لوگوں کے دواوین اور تصانیف میں جن امیروں کا اور جن واقعات کا تذکرہ بار بار آتا ہے وہ اس خودنوشت کے جیتے جاگتے کردار ہیں اور اُن سے مصنف کا براہِ راست معاملہ رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس سے تاریخ کے ایک اہم اور اس کے بارے میں مختصر سیاسی معلومات ہی حاصل نہیں ہوتیں بلکہ اس دَور کی سماجی تاریخ پر بھی روشنی پڑتی ہے اور لوگوں کے رہن سہن، طرزِ احساس اور اندازِ فکر کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اور ادبی تاریخ کے نہایت اہم دور کی بازیافت میں مدد ملتی ہے۔

بقیہ خلیج

سے چکا مگر ہر رات خوف زدہ ہوکر انھیں بھول بھال کر سوجا —
ہاہاہا —"

نامعلوم طنز یہ ہنسی دیر تک گونجتی، گرجتی رہی اور یہ ہنسی کانچ کے تیز ٹکڑوں کی طرح کھچا کھچ عذرا کو چبھتی اُس کی آرزو اور احساس میں پیوست ہوگئی۔ مگر عذرا — ؟

وہ اپنی اس تکلیف پر بھی رو نہ سکی، اُف تک نہ کرسکی۔ محض اس ڈر سے کہ کہیں باجی سُن نہ لیں اور یہ زخم، یہ غم بھی اُس سے چھن نہ جائے۔ اِس بھری پُری دُنیا میں وہ خود اپنی نہ سہی مگر کچھ تو اُس کا اپنا ہے۔ درد ہی سہی، زخم ہی سہی، آرزو کا الم ہی سہی —!!!

اور اُس نے اپنے خاموش آنسو خشک کرلئے اور اُس نے تکیوں میں سر دے کر اس طرح چپ چاپ پڑگئی جیسے خود اپنے آپ کو بھی جانتی پہچانتی نہ ہو۔

●●

شارق

ہم غریبوں کا بھلا کیجئے گا
آپ اگر اور جفا کیجئے گا

یہ غنیمت ہے کہ ہم جیتے ہیں
حالِ دل پوچھ کے کیا کیجئے گا

آپ سب پر تو کرم کرتے ہیں
کبھی ہم سے بھی وفا کیجئے گا

جب ہمیں خاک میں مل جائیں گے
آپ پھر کس پہ جفا کیجئے گا

اور دو سانس کی مہلت دیجئے
پھر دوا کیا ہے دُعا کیجئے گا

جس پہ پڑتی ہے وہ جانے اُس کو
آپ کیوں شکرِ خدا کیجئے گا

اب زمانہ میں کہاں قدرِ وفا
بھول کر بھی نہ وفا کیجئے گا

وقت آئے گا تو اک دن شارقؔ
آپ بھی شکرِ خدا کیجئے گا

یہ جھوٹ ہے

آوارہ

اگر ہم خود اس وقت جھوٹ نہ بول رہے ہوں تو کہہ سکتے ہیں کہ پرانے سے پُرانے جھوٹ بولنے والے بھی، قصور معاف، ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتے کہ جھوٹ کی ابتدا کیوں کر ہوئی، پہلا جھوٹ کب بولا گیا، اور بولنے والا کون ذات شریف تھا۔ زیادہ سے زیادہ مواد جو اس فنِ لطیف کے متعلق ماہرین کے سینہ بہ سینہ چلا آ رہا ہے، اتنا ہی ہے کہ جھوٹ پہلے بولا گیا پھر فن کے خادموں نے اُسے محفوظ اور زندہ رکھنے کے لئے اتنی ترقی اور دی کہ جھوٹ لکھا بھی گیا۔ گویا اسی اُدھوری معلومات اور سرسری تحقیقات پر جھوٹ سے عام پسند انسٹی ٹیوشن پر جھوٹ کی ترکی تمام۔ آگے آیت والسلام۔ اس موقع پر افسوس کے ساتھ اپنی نااہلی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مسلسل کوشش اور کافی مہارت ہونے پر بھی ہمیں ابھی ٹکسالی جھوٹ بولنے کی سند نہیں ملی ہے۔ بڑی سعی، سفارش اور توڑ جوڑ ملانے پر جھوٹوں کی ہر قومی کانفرنس نے سادہ سادہ جھوٹ بولنے کا لیسنس دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ سیٹی علم دریاؤ ہے۔ کیا اچھا ہوتا کہ اس "سیٹی" کی جگہ "جھوٹ" ہماری کہاوت بنتا۔ ایک جھوٹ بولنے ہی کی اتنی قسمیں ہیں کہ آخری سانس تک برتتے رہئے پھر بھی آمدنی میں گولر کا پھول، برکت ہی برکت دکھائی دے۔ جمع کی مد بھری کی بھری رہے۔ اِن پرانے محققوں نے جو کار آمد اضافے کئے ہیں وہ گویا مد محفوظ ہیں۔ اِن میں سے بعض کی افادی نوعیت اور مقبول عام حیثیت خاص طور پر تسلیم کی گئی ہے۔ جیسے ایسا جھوٹ جسے بولنے میں ثواب بھی ہے، اور سہولت بھی۔ ہمیشہ انشاء اللہ سے شروع ہوتا ہے۔ اور آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں کی پھلک سے "وسیع" کی جھلک دیتا ہوا، "ضرور، ضرور" یا بسر وچشم پر ختم کیا جاتا ہے۔ البتہ یہ فیصلہ بولنے والے کے اختیاری تمیز پر ہے کہ موقع محل کے اعتبار سے بولنے کا رنگ نکھارے اور تیکھا کرنے کے لئے آپ کے سرِ عزیز کی قسم، "واللہ باللہ" کی ٹیپ بھی اس میں دیتا جائے۔ ایسے ہی جھوٹ کی ایک قسم وہ بھی ہے جو نکاح کے وقت کام آتی ہے۔ نوشہ میاں کسی سرکار کے خدمت گار بھی ہوتے ہیں اور مہینے کے پورے تیس دن صبح شام چلیں بھرنے کے بعد اگر خوش قسمتی سے نادر شاہی آقا کے جھانوں سے صحیح سلامت بچ گئے تو اصل خیر سے مہینے پیچھے پھر رُپلی کا منہ دیکھتے ہیں، مگر قاضی صاحب قبلہ کے آگے سر موڑھا سے، سہرے مقنع کی آڑ میں دبی زبان سے چبا چبا کے، لجا لجا کے جب کہتے ہیں کہ مسماۃ فلان

بنت فلاں کو بعوض مبلغ پانچ ہزار سکۂ رائج الوقت، ایک اشرفی طلائی دینِ مہر کے قبول کیا میں نے۔" اور سسرالیوں پر اپنی دھاک بٹھانے کے لئے شین قاف کے صحیح مخرج اور زیر زبر کی پوری پابندی کے ساتھ اس قول کی تکرار بھی فرماتے ہیں، تو اس خود اعتمادی کے ساتھ کہ روپے کا ذکر "چوں مد بہ حساب اندر رہے"۔ نکاح کا خطبہ ختم، رقم بے باق، اور دولھن بطور رسید وصول۔ بدگمانی سے بچنے کے لئے یوں سمجھئے کہ دولھا دولہن کی یہ جوڑی اگر مفلس ہوا پیچنے کا تہیہ کرے، اور بیاہی زندگی کے دوسرے واجبات میاں کے گلے نہ پڑیں، تو معمولی ضرب تقسیم کا سوال ہے کہ چھ روپے مہینہ قسط کے حساب سے پانچ ہزار کی خفیف سی رقم صرف انہتر سال پانچ مہینے دس دن کی مدت میں ادا ہو جائے گی۔ رہی ایک اشرفی، تو اسے حسنِ کلام سمجھنے میں کوئی امر مانع نہیں۔

لکھے ہوئے جھوٹ کی ایک مثال وہ سارے دیوان مثنویاں واسوخت اور کلیات ہیں جو اس مٹی پانی کی دنیا میں وجود پا جائیں تو آپ ایک عجیب ہڑبونگ دیکھیں یعنی عاشقوں کی بھرمارے اِدھر عطاروں اور کفن فروشوں کی دکانوں پر اُتو بولنے لگیں، اُدھر اسپتالوں اور گورستانوں میں تل رکھنے کو جگہ نہ ملے۔ "حسن رہ گزر سے" یا کرشمہ پسِ دیوار" تعزیراتِ کی کسی نہ کسی دفعہ کے تحت جیل خانے میں ہو، یا حبس دوام بہ عبور دریا شور، ورنہ پھانسی کم ازکم اور ازالہ حیثیت عرفی کے مدعی "رقیب" اور "آسمان" وکیلوں کی دربار داری یا عدالت کے کٹہرے میں۔ اسی جھوٹ کا ایک نمونہ سروس بک اور بیمہ کمپنیوں کے اقرار ناموں میں عمر کا خانہ ہے جو سوچ سمجھ کے اس حساب سے بھرا جاتا ہے کہ آگے چل کر پنشن دیر سے ملے یا پالیسی کی رقم جلد ہاتھ آئے۔

یہ عام جھوٹ کی ایک مجمل تشریح تھی۔ اب جھوٹ کے دو ایک نادر نمونے پیش کرنے کی عزت حاصل کی جاتی ہے۔ پسندِ خاطر ہوں۔ شوق سے کام میں لائیں۔ رفاہِ عام کی خاطر میں نے ذاتِ خاص کے لئے ان کا پیٹنٹ کرانا گوارا نہیں کیا۔ ملاحظہ فرمائیے کہ بولنے اور لکھنے کے علاوہ جھوٹ لگایا بھی جاتا ہے اور ان عمر دراز، شوقین بزرگوار کے کام آتا ہے جو نکاحوں کے عادی ہوتے ہیں اور بیویوں کی اکھاڑ پچھاڑ کرتے کرتے پیشہ ور شوہر ہو جاتے ہیں۔ اس جھوٹ کی محرک یا تو وہ مشاطہ ہوتی ہے جو ہر پیغام کے وقت جناب ممدوح کے اوصافِ حمیدہ کی فہرست گناتے ہوئے سن وسال کو برس پینتیس یا چھتیس کی پیٹ سے جس میں نزلہ بھی شامل ہوتا ہے، نکلنے نہیں دیتی۔ یا خود حضرت کا وہ مغالطہ نفس جو چشم بددور چالیسویں سالگرہ کے بعد بھی کلوں پر چیونٹی کے انڈے دیکھ کر سرکشی کرتا ہے۔ اس جھوٹ کا بازاری نام خضاب ہے اور اس لحاظ سے نہایت کامیاب ہے کہ بڈھوں کو بہکالو، بچوں کو ڈرالو اور بیوی کو پھسلالو۔ اس سے عجیب تر وہ جھوٹ ہے جو دانتوں کی شکل میں لگایا جاتا ہے۔ کڑاکے کے جاڑے ہوں، پوپلے منہ میں چوکا جڑا ہو۔ بڑے میاں آپ بیتی کہیں گے۔ پانی دانتوں میں لگتا ہے یا سردی کے مارے دانت سے دانت بج رہے ہیں۔

اور تو اور جھوٹ رویا بھی جاتا ہے۔ اس کا مظاہرہ اکثر اس کنجوس باپ کی وفاتِ مسرت آیات پر ہوتا ہے جس نے اشرفی تولنے کی اولاد کو جیتے جی کوڑی کوڑی کو ترسایا ہو اور خود کوڑی کوڑی کو ہاتھ سے نہیں دانت سے اٹھایا ہو۔ یہ جھوٹ حساب سے رویا جاتا ہے یعنی ترکہ اگر بے منت غیرے، مال موذی نصیب غازی ہونے والا ہے تو آنسو موٹی موٹی لڑیوں میں گرتے ہیں، اور کم سے کم پھولوں تک گرائے جاتے ہیں۔ اور محفوظ سرمائے میں یہ گنجائش بھی احتیاطاً رکھی جاتی ہے کہ اس تقریب کے سلسلے میں ماتم پرسی کے لئے ہر نو وارد کی آمد پر یہ جھوٹے موتی آنکھ بھر بھر کے نچھاور کئے جا سکیں اور اگر والدین کا پس خوردہ حصہ رسدی یا واجبی ہی واجبی ہے تو آب رسانی کی مشین کوتاہی سے کام کرتی ہے، اور آنکھیں بھیچ کر رہ جاتی ہیں کہ یہ جھوٹ ہے۔"

بیسک لٹریچر کا آٹھواں کل ہند مقابلہ

حکومت ہند کی جانب سے منعقد کئے جانے والے آٹھویں کل ہند مقابلے میں حصہ لینے کے لئے ہندوستانی مصنفین کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ مندرجہ ذیل موضوعات پر مسودے کتاب (بشمول ڈرامہ) بھیجیں۔

(۱) دیہی قیادت اور پنچایتی راج تحریک (دیہی رہنماؤں کی حقیقی مثالوں پر مبنی (۲) پنچایتی راج اور امداد باہمی کے اداروں کا آپسی تعاون اور اُن کے کام (۳) پنچایتی راج کے اداروں کو اقتدار و اختیار اور ذرائع کی منتقلی۔ اس طریق کار کو کس طرح تیز تر کیا جا سکتا ہے (۴) دیہی تعمیر نو کے کاموں میں نوجوانوں کا حصہ۔ اس پروگرام کو آگے کیسے بڑھایا جا سکتا ہے۔ (۵) گاؤں والوں کی بے روزگاری اور نیم روزگاری کو دُور کرنے کے لئے پنچایتی راج اور امداد باہمی کے اداروں کو کیسے حرکت میں لایا جائے (۶) دیہی علاقوں میں پینے کے پانی کی فراہمی (۷) دیہی ہندوستان کی کہانی جس میں اپنی حالت بدلنے اور بہتر بنانے کے لئے پسماندہ طبقوں کی کوششوں پر خاص روشنی پڑتی ہو۔ (۸) ایک ڈراما جس میں دیہی ترقی میں عورتوں کے رول کو اُجاگر کیا گیا ہو (۹) امداد باہمی کے قرض دینے والے دیہی اداروں میں نئے رجحانات (۱۰) مارکٹنگ کرنے والے امداد باہمی کے اداروں کے طریقہ کار کو کیسے بہتر بنایا جائے۔ (۱۱) 'اپنا بازار' — عوام کی خدمت کے لئے (۱۲) ایک ڈراما جس میں امداد باہمی کے اصولوں کے تحت زندگی بسر کرنے پر روشنی ڈالی گئی ہو (۱۳) دیہی علاقوں میں زرعی اور صنعتی ترقی کے لئے بجلی استعمال کرنے کے سلسلے میں پنچایتی راج اور امداد باہمی کے اداروں کا رول۔ (۱۴) دیہی بچت کو تیز کرنے میں پنچایتی راج اور امداد باہمی کے اداروں کا حصہ۔ (۱۵) کوآپریٹو فارمنگ (امداد باہمی کے ذریعے کھیتی باڑی) (۱۶) دُودھ کی سپلائی اور دُودھ کی بنی دُوسری چیزوں کی پیداوار کے لئے انجمن امداد باہمی کی تنظیم (۱۷) کوآپریٹو طریقوں سے مرغی پالن کی ترقی۔

انعام :- ہر کامیاب مصنف کو ایک ہزار روپے کا انعام دیا جائے گا۔

زبانیں :- کتاب/مسودہ وغیرہ مندرجہ ذیل میں سے کسی زبان میں بھیجا جا سکتا ہے۔

آسامی، بنگالی، گجراتی، ہندی، کنڑ، کشمیری، ملیالم، مراٹھی، اڑیا، پنجابی، سندھی، تامل، تلگو اور اُردو

اسلوب :- طرز تحریر رواں اور زبان سادہ اور آسان ہو۔ تاکہ پنچایتی راج، اجتماعی ترقی اور امداد باہمی کے کاموں میں مصروف کارکنوں، جن کے لئے یہ کتابیں لکھوائی جا رہی ہیں، کی سمجھ میں آ سکے اور اُنہیں متاثر کر سکے۔

ضخامت :- مسودہ لگ بھگ ۴۰ ہزار الفاظ پر مشتمل ہونا چاہئے۔ کتابچہ ڈیمائی آکٹو (۲۲×۱۸) سائز میں ہو اور ۱۴ پوائنٹ ٹائپ میں چھپا ہو تو لگ بھگ ۱۰۰ صفحات پر مشتمل ہونی چاہیئے۔ اگر کتاب ہو تو اس میں حسب ضرورت تصاویر بھی ہوں۔

کاپی رائٹ :- انعام یافتہ تصنیف کا کاپی رائٹ حکومت کو منتقل کرنا ہوگا۔ جو ہر طرح کے دعوے یا پابندی سے آزاد ہوگا۔ دونوں فریقین کی رضامندی سے طے شدہ مناسب رقم کاپی رائٹ کے لئے ادا کی جائے گی۔

داخلے کی فیس :- مصنف کے ذریعہ بھیجی گئی فی کتاب/مسودہ تین روپے

آخری تاریخ :- داخلہ بھیجنے کی آخری تاریخ ۲ دسمبر ۱۹۷۰ء ہے۔

ہدایتوں اور قاعدوں کے متعلق مفصل جانکاری کے لئے لکھیں۔

ڈائرکٹر (بیسک لٹریچر) وزارت خوراک، زراعت، اجتماعی ترقی اور امداد باہمی

(محکمہ اجتماعی ترقی اور امداد باہمی) حکومت ہند

کرشی بھون، نئی دہلی

ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرت اور آئین

محمد عمر

مرزا محمد حسن قتیل، بٹالہ ضلع گورداسپور (پنجاب) کے کھتری بھنڈاری خاندان کے ایک فرد تھے۔ اُن کا خاندانی نام دیوان سنگھ تھا محمد شاہ بادشاہ (متوفی ۱۷۴۸ء) کے دورِ حکومت میں آپ کے والد نے دہلی میں سکونت اختیار کی۔ کچھ دنوں قتیل نے مرزا نجف خاں (متوفی ۱۷۸۲ء) کے لشکر میں بسر کئے اور ۱۷۸۲ء ۱۷۸۴ء میں وہ لکھنؤ چلے گئے اور آخری دم تک وہیں رہے۔ ۱۸۱۷ء میں اُن کا وہیں انتقال ہوا۔ سولہ سال کی عمر میں فیض آباد میں مرزا محمد باقر اصفہانی کے زیرِ اثر انہوں نے مذہبِ اسلام قبول کیا۔ پہلے تو وہ سنّی عقائد کے پیرو ہوئے مگر مابعد شیعہ عقائد اختیار کر لئے۔ ایامِ طفلی سے انہیں شعر و شاعری کا شوق تھا۔ انہوں نے اپنی تمام زندگی شعر و شاعری، تصنیف و تالیف میں گزاری۔ فارسی کے علاوہ اُن کو ترکی اور عربی زبان پر بھی دسترس حاصل تھی۔ فارسی دیوان کے علاوہ اُن کی تصانیف کی تعداد خاصی ہے۔ وہ فارسی کے بہت بڑے عالم تھے اور اپنے زمانے میں محسودِ روزگار تھے۔

"ہفت تماشا" قتیل کی تصانیف میں سب سے اہم اور قابلِ قدر کتاب ہے۔ اس میں سات تماشے یعنی سات ابواب ہیں۔ پہلے باب میں انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرت اور آئین کا تفصیلی بیان کیا ہے۔ ذیل کا مضمون اس کی روشنی میں لکھا گیا ہے۔

مسلم سماج کی تشکیل ہندوستان میں مسلمانوں کے چار فرقے شرفاء میں شمار کئے جاتے ہیں مغل، سید، شیخ، اور افغان۔ مغل سے مراد ان اصلی مغلوں سے ہے جن کے کچھ گھرانے ولایت میں ہیں مگر ولایت، ایران اور توران کے لوگوں کی اولاد کو چاہے وہ کسی بھی شہر کے باشندے ہوں ہندوستان میں اُن کو مغل اور مغل بچہ کہا جاتا ہے۔ اگر وہ شریف النفس اور حلیم الطبع ہیں تو مغل کہلاتے ہیں اور اس کے برعکس اگر وہ بانکے، شہدے اور ہنگامہ پرور ہیں تو مغل بچہ کہا جاتا ہے۔ جو شخص ایران سے ہندوستان میں وارد ہوتا ہے تو اُسے بالعموم آقا کہا جاتا ہے۔ مگر بعض کو مرزا کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں بعض سادات اور علماء کی اولاد یا دفتر کے اہلکاروں کی اولاد کو بھی مرزا کہا جاتا ہے۔ چونکہ سادات میں بیشتر علماء اور شعراء اور دوسرے اربابِ فن گزرے ہیں، لہٰذا یہ لوگ اِن چند لفظوں سے، جو ان کے نام کے ساتھ تعظیماً آتے ہیں، مشہور ہو گئے ہیں یعنی میر اور مرزا اور کچھ لوگ سلسلۂ مادری کی بنا پر، جو کسی قزلباش کی لڑکی ہو، آغا کہلاتے ہیں۔ مگر اپنی سادہ دلی کی وجہ سے ہندوستان کے لوگ ہر ولایتی کو مغل سمجھتے ہیں۔ سادات کے علاوہ دوسرے لوگ بھی جو قابلیت کی وجہ سے بادشاہوں کی خدمت میں پہونچ گئے ہیں اور ایران میں مرزا کے لقب سے مشہور ہیں، چاہے وہ دراصل شیخ ہی ہیں۔ ہندوستان میں آکر وہ اور اُن کی اولاد مرزا ہی بن گئی ہے تو ان سے یا تو خواجہ زادے آتے ہیں جن

میں کچھ سید ہوتے ہیں اور کچھ شیوخ، پس جس طرح توران میں خواجہ زادے یکو میر یا خواجہ یا خوجہ، خوجگی، خوجم کہلاتے ہیں۔ ہندوستان میں آکر اسی لقب سے معروف ہو گئے۔ اس کے سوا کہ وہاں اوزبک کو بیگ اور یہاں مرزا۔ اسی طرح ہندوستان میں چند قسم کے سید ملتے ہیں ایک تو اصل سید، دوسرے ڈبناکے سید، جو توران کے قاعدے کے مطابق سید ہیں۔ تیسرے سادات نقلی ہیں۔ جیسے میر جعفر، میر کاظم تونی۔ تون ایک قبیلہ ہے جو میر کے لقب سے ملقب ہے۔ وہ سید ہونے کے مدعی نہیں مگر اُن کی اولاد جو ہندوستان میں آکر بس گئی ہے اور اپنے آبائی القاب سے شہرت پا گئی ہے۔ بعض رئیسوں میں عزت حاصل کرنے کے لئے قصداً مرزا کا لقب اختیار کر لیتے ہیں اور سید ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ چوتھے کشمیریوں کا وہ فرقہ ہے جن کے نام کے آخر میں میر آتا ہے جیسے ابوالحسن میر، اُن کی اولاد ہندوستان میں آکر سید مشہور ہو جاتی ہے۔ اور میر نام کے شروع میں لگ جاتا ہے۔ پانچویں وہ لوگ ہیں جو تنگیٔ معاش سے مجبور ہو کر نذر و نیاز حاصل کرنے کی غرض سے ہندی کے مرثیے پڑھ کر سید ہو گئے ہیں۔ چھٹے سیدوں کے اکثر لے پالک اور غلام بھی سیادت کے مدعی ہو گئے ہیں۔ اسی طرح کچھ دوسرے فرقے بھی سیادت کا دعویٰ کرتے ہیں۔

یہی حال مغل کا ہے۔ اُن کی بھی چند قسمیں ہیں۔ ایک تو ایران اور توران کے لوگوں کی اولاد جو خواجہ زادوں اور سیدوں کے علاوہ ہے۔ دوسرے سادات شیعہ کے غلام اور لے پالک۔

شیوخ کی بھی چند قسمیں ہیں۔ ایک اصلی ہیں۔ اُن کی دو شاخیں ہیں۔ ایک قدیم الاسلام، جیسے صدیقی، فاروقی اور عثمانی۔ دوسرے صحابہ کی اولاد۔ دوسرے جدید الاسلام جیسے کنبوہ، پراچے، خوجے اور صدیقان ملتان وغیرہ۔

ہندوستان میں جو افغانی پائے جاتے ہیں وہ روہ کے علاقے سے آتے ہیں۔ اس لئے وہاں کے افغان، روہیلہ کہلاتے ہیں۔ افغانوں کے دو بڑے فرقے ہیں۔ لڑابن اور کلانڑی۔ کلانڑی کی کئی قسمیں ہیں۔ بنگش، آفریدی، ولازاک، خٹک، رک زئی وغیرہ۔ سڑابن کی بھی کئی شاخیں ہیں۔ علاوہ ازیں غرشت اور بتین بھی دو اور فرقے ہیں۔ ہندوستان میں ایک اصل پٹھان پائے جاتے ہیں۔ دوسرے اُن کے غلام اور یا جو اُن کے زمانہ حکومت میں بخوشی مسلمان ہوئے اور اپنے کو پٹھان سمجھنے لگے ہیں۔

اس طرح یہ چار فرقے ہندوستان میں اشراف میں سے ہیں بشرطیکہ انہوں نے اپنے آبائی حسب کا تحفظ کیا ہو۔

بہت سے جولاہے ہندوستان میں اپنے آپ کو سید یا مغل ظاہر کرتے ہیں۔ اور کچھ شیخ یا افغان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مگر ان کی رشتہ داریاں آپس ہی میں ہوتی ہیں، اور اُن کی سیادت نامقبول اور غیر معتبر ہوتی ہے۔ اسی طرح افغانی اگر شیر فروشی کا پیشہ کرے یا بازار میں حقہ پلانا شروع کر دے تو معیار شرافت سے گر جاتا ہے۔ اسی طرح شیخ بھی جو پیشہ اختیار کرے اُسی سے موسوم ہو جاتا ہے۔ نچلے درجے کے پیشے کے اختیار کرنے پر اُس کا شمار شریفوں میں نہیں کیا جاتا۔ چاہے وہ خلفاء میں سے کسی کی اولاد میں ہو۔

صدیقان ملتان میں بیشتر شیعہ ہیں۔ اُن کی قرابتیں اپنی ہی برادری میں ہوتی ہیں۔ اُن میں سے کچھ نے اسلام قبول کر لیا۔ مگر اپنی قوم کے سوا کسی دوسرے فرقے میں رشتہ داری کو جائز نہیں سمجھتے۔

پس شہریوں کی قرابت اس بات پر مقید تھی کہ سید اپنی لڑکی ایسے مغل زادے کو دیتا ہے۔ جس پر مرزا کا اطلاق ہو سکے اور خوجہ زادہ کو بھی اور شیخوں میں سادات، مرزا اور خواجہ سے قرابت داری نہیں ہوتی، چاہے خواجہ زادہ کی اصل شیخ ہی ہو، لیکن جس کو شیخ کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس کا لڑکا شہر میں کسی مرزا، یا سید یا خواجہ کا داماد نہیں ہو سکتا اور اگر وہ کسی شیخ کی لڑکی لے لیں تو وہ لڑکی منقولہ بالا تینوں فرقوں کی کسی لڑکی کی طرح عزت حاصل نہیں کر سکتی اور افغان کا بھی یہی حال ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ بعضے لوگ قرابت کے موقع پر طرفین کی شرافت ڈھونڈتے ہیں اور بعضے والد کی شرافت کو کافی سمجھتے ہیں۔ اور ماں کے نسب سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، چاہے وہ کنیز ہو یا رنڈی ہو یا کوئی اور ہو۔ اور بعضے اپنی حماقت سے اور بہادری کے غرور میں مولویوں اور طبیبوں کو اپنے گروہ کے باہر سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ لوگ عزت میں سپاہی لوگوں سے کم تر ہوتے ہیں۔

نکاح بیوہ گان مسلمان بھی بیوہ لڑکی کو دوسری شادی سے

محروم رکھتے ہیں چاہے وہ سولہ سال یا اس سے کم عمری میں بیوہ ہو گئی ہو۔ اس معاملہ میں ان لوگوں اور قصبات کے شرفار کا حال تقریباً ہندوؤں کا سا ہے کہ اپنی جہالت کی وجہ سے شریعت کے احکام پر عمل نہیں کرتے بیوہ کا عقد ثانی کرنے والوں کو بے عزت اور کم مرتبہ سمجھتے ہیں۔

رسوم شادی

ہندوستان کے مسلمان بیٹے اور بیٹی کی شادی میں چند رسموں کو چھوڑ کر مثلاً آگ کے پھیرے، باقی تمام رسمیں ہندوؤں کی طرح کرتے ہیں جیسے لڑکے لڑکی کو زرد کپڑے پہنانا، کلائی میں ریشمی کلاوہ باندھنا، عقد سے فارغ ہونے تک دولہا کے ہاتھ میں لوہے کا ہتھیار پکڑے رہنا، عورتوں کا ستی گانا، تجمل اور آرائش کے ساتھ دولہا کا دولہن کے گھر ساچق لے جانا۔

ساچق

ساچق کی رسم کے دن دولہا کو مسند پر بٹھاتے ہیں اور چھوٹے اور بڑے اس کے داہنے اور بائیں بیٹھتے ہیں۔ مگر باپ، چچا، ماموں اور بڑا بھائی اس مسند کے قریب نہیں جاتے ہیں۔ ساچق کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ٹھلیوں کو پوت کر اُن پر پھول بوٹے بناتے ہیں، اُن میں نقل بھری جاتی ہے، جو شکر اور چنے سے تیار کی جاتی ہے، پستہ، بادام اور مصری سے پُر کرتے ہیں۔ چار ٹھلیوں کو ایک تخت پر رکھتے ہیں۔ تختوں کی کمی و بیشی لڑکے کے والد کی حیثیت پر موقوف ہوتی ہے۔ پھر آرائش کے تختے، جو کاغذ سے بنائے جاتے ہیں، اُن تختوں پر جمائے جاتے ہیں۔ پھولوں کے علاوہ پری طلعت عورتوں کے کاغذی مجسمے بنا کر سب کو جُدا جُدا ایک تخت پر بٹھاتے ہیں۔ علاوہ ازیں قند اور میوے کے چند خوان ہوتے ہیں۔ پھولوں کے ہار اور دوسرے زیورات دولہن کے لئے ہوتے ہیں۔ اپنے رشتہ داروں کو ساتھ لے کر حسب حیثیت ہاتھی یا گھوڑے یا میانے اور عورتوں کو چوپالہ اور ڈولی پر سوار کرکے اور دولہا کو ہاتھی یا گھوڑے پر سوار کرکے شان و شوکت کے ساتھ نقارہ بجاتے دولہن کے گھر جاتے ہیں۔ دوسری چیزوں کے علاوہ ساچق کے دن بابا فرید کا پڑا بھی دولہن کے گھر جاتا ہے۔ اس پڑا کا ہونا لازمی ہے۔ کیونکہ ہندوستان میں شادی کے معاملات عورتوں کے اختیار میں ہوتے ہیں، لہٰذا عورتیں وہ چیزیں جو شادی کے لوازم سے

ہوں، شادی میں اُن پر عمل نہ ہو، تو ملول اور کبیدہ خاطر ہو جاتی ہیں اور اس شادی کو منحوس سمجھتی ہیں۔ یہ رسم سُنی و شیعہ دونوں میں جاری ہے۔ اگر لوازم شادی میں کسی بات کی کمی رہ جائے اور شادی کے بعد جو کچھ مثلاً دردِ سر، دردِ شکم، بخار، اور اولاد کی موت یا دولہن دولہا کی موت پیش آجائے تو اُس کو رسم توڑنے کا سبب سمجھتی ہیں۔ مختصر یہ کہ دولہن کے گھر پہونچنے کے بعد دولہا کو ایک مسند پر بٹھایا جاتا ہے ایک خلعت پہنائی جاتی ہے۔ یہ شادی کے جوڑے سے الگ ہوتا ہے۔ چونکہ قاعدہ ہے کہ دولہا کی سواری میں رقاص بھی ہوتے ہیں۔ لہٰذا دولہا کے مسند نشیں ہونے کے بعد رقص و سرود ہوتا ہے۔ دو پہر رات گزرنے کے بعد اُسے گلاب سے معطر کیا جاتا ہے اور مصری کا شربت پلایا جاتا ہے۔ یہ شربت پینے کے لئے نہیں بلکہ چکھنے کے لئے ہوتا ہے چکھنے کے بعد وہ تھال میں کچھ نقدی ڈال دیتا ہے۔ اگر کوئی کچھ نہ ڈالے تو مجلس کے لوگوں میں مطعون ہوتا ہے۔

صاحب مجلس سے آشنائی کی وجہ سے ہندو لوگ بھی اس مجلس میں شریک ہوتے ہیں۔ اور قاعدہ کے مطابق یا بے خبری میں شربت اُن کے آگے لے جایا جاتا ہے، وہ بنا چکھے حیثیت کے مطابق زرِ نقد تھالی میں ڈال دیتے ہیں۔

حنا بندی

ساچق کے اگلے دن یا اُس کے تین دن بعد اگر کوئی وجہ مانع نہ ہوتی ہو، تو شبِ حنا بندی قرار پاتی ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ دولہن کے گھر سے دولہا کے واسطے دوسری طرف کے لوگ مہندی اس طرح لاتے ہیں کہ ساچق کے تختے، جو اسی جگہ چھوڑ دیئے گئے تھے۔ کیونکہ قاعدہ یہی ہے کہ واپسی کے وقت آرائش داماد کے ساتھ نہیں آتی ہے، بلکہ حنا بندی کی شب کو دولہن والوں کے ساتھ آتی ہے تاکہ شادی کی رات کو فریق ثانی اُسے دوبارہ برات کے ساتھ لائے۔ بہرحال ساچق دولہا کے گھر سے شام کو جاتی ہے اور حنا رات کو لائی جاتی ہے۔ اُس کا وقت مقرر نہیں ہوتا، کہ اوّل شب کو لائیں یا آخری شب میں۔ حنا پہونچانے کے بعد دولہا کو زنان خانے میں بلاتے ہیں تاکہ رشتے کی سالیاں اس کے ہاتھوں پاؤں میں مہندی لگائیں اور مہندی لگوانے کے بعد دولہا

پہ لازم ہے کہ اپنی حیثیت کے مطابق اُن کو کچھ رُوپے دے، جو ہندی زبان میں نیگ کہلاتا ہے۔ اُن میں سے جو سالی دولہا سے بڑی ہوتی ہے وہ اُسے سلامی دیتی ہے۔

حنا بندی کی حالت میں باہر دولہا کی طرف کے لوگوں کے سامنے مردانہ مجلس میں دونوں طرف کی ناچنے والیاں باری باری رقص کرتی ہیں۔ اور عورتوں کی مجلس میں ڈومنیاں سرود بدھائی گاتی ہیں۔ اس رات کو اس مجمع کی ہر عورت حسبِ منشا دولہا کو فحش باتیں سناتی ہے اور دولہا بے چارہ کان لگائے سُنتا رہتا ہے۔ مزکوری مراسم کے بعد اسی طرح شربت پلایا جاتا ہے جس طرح دولہا والوں کی طرف سے سُسرال والوں کو شربت پلایا جاتا ہے جس طرح سُسرال والوں نے دُولہا والوں کو پلایا تھا اور تھالی میں روپیہ لے کر سمدھن کو دیدیا جاتا ہے۔ بعدازیں مرد اور عورتیں رخصت ہوکر گھروں کو واپس ہوتے ہیں۔ اس کے اگلے دن شبِ عروسی ہوتی ہے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ساچق اور حنا بندی کی رات میں فصل ہوجانا تو قدیم رسم ہے اور اس میں کوئی قباحت نہیں لیکن مہندی اور شادی کی رات میں کوئی فصل نہیں ہوسکتا۔

برات

جب برات کی رات آتی ہے تو سرِ شام ہی سے لوگ اور دوست احباب، وضیع و شریف طرفین کے گھروں پر جمع ہونے لگتے ہیں۔ اور اُسی وقت سے دولہا زریں لباس پہن کر مسند پر بیٹھ کر عورتوں کے رقص کا تماشا دیکھنے میں مصروف ہوجاتا ہے۔ جب ایک عورت ناچ چکتی ہے تو میر مجلس کے معمر آدمی کے اشارے پر اُسے بیٹھنے کا حکم دیتا ہے اور کسی دوسری طوائف کو ناچنے پر مامور کرتا ہے۔ اس موقع پر یہ لازمی ہوتا ہے کہ دُولہا اُس طوائف کو جو رقص کرچکی ہے، عطر، پان اور دھنیا، جو چاندی کے برتنوں میں ہوتی ہے، پیش کرے۔ بعدازاں ان برتنوں کو پھر ان چیزوں سے بھردیا جاتا ہے۔ تاکہ دوسری بار کام آئیں۔ دولہا کے سوار ہونے تک یہ ہنگامہ اسی طرح جاری رہتا ہے۔

بعض گھروں میں یہ رسم ہے کہ دُولہا کو رات کے آخری وقت سوار کرتے ہیں۔ قاعدہ کے مطابق پہلے اُسے غسل کراکر، زردوزی کا لباس جو مع سہرا کے بہاہے کے گھر سے کرایہ پر آتا ہے، پہنائیں، اس کے بعد اس کے سر سے سہرا لٹکاتے ہیں، گلے اور کاندھوں پر پھولوں کی بدھیاں ڈالتے ہیں۔ بعدازیں خاندان کے آئین کے مطابق ہاتھی یا گھوڑے پر دُولہا کو سوار کرکے بڑے تجمّل کے ساتھ یعنی آرائش روشنی، آتشبازی اور ساز و نوبت اور روشن چوکی کے ساتھ دولہن کے گھر کے لئے روانہ ہوتے ہیں۔ متذکرہ طوائفیں دُولہا کے پیچھے تختِ رواں پر کھڑے ہوکر بدھائیں گاتی ہیں۔ دولہا کے گھوڑے یا ہاتھی کے آگے روشن چوکی بجاتے ہیں۔ دوسرے تمام براتی گھوڑے یا ہاتھی کی سواری پر دُولہا کے عقب میں ہوتے ہیں۔ اور جب برات دولہن کے دروازے پہنچ جاتی ہے تو بعض لوگ وہاں دولہا کے لئے دروازہ بند کردیتے ہیں اور جس وقت تک ڈھنگانا، جو راجپوتوں کی رسم ہے، کا نیگ نہیں لے لیتے، دروازہ نہیں کھولتے۔ مابعد دولہا کو مسند پر بٹھا دیتے ہیں اور رقص شروع ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد اگر شبِ عروسی سے پہلے نکاح عمل میں آگیا ہو تو دولہا کو حرم سرا میں طلب کیا جاتا ہے ورنہ نکاح کے بعد بُلایا جاتا ہے اور وہی شربت جس کا ساچق کے ضمن میں ذکر آچکا ہے، پھر شبِ عروسی کو براتیوں کو پلاتے ہیں۔ اگر نکاح پہلے ہوچکا تھا تو شربت دوبارہ پلایا جاتا ہے۔ ہر دونوں یا تینوں بار تھالی میں زرِ نقد ڈالا جاتا ہے۔ جب دولہا عورتوں کی مجلس میں جاتا ہے تو وہاں ایسی رسمیں ادا ہوتی ہیں جن کے اظہار سے مردوں میں وہ شرماتا ہے۔ مثلاً رسموں میں سے ایک رسم یہ ہے کہ بعض گھروں میں دُولہا کے منہ میں لگام لگاکر لگام دولہن کے ہاتھ میں دیدیتے ہیں، اور اکثر اس کو گھوڑے کی طرح کھڑا کرکے اُس کی پیٹھ پر زین رکھتے ہیں اور دُولہن کو اس پر سوار کرتے ہیں تاکہ جس طرف کو وہ عنان گھمائے۔ دُولہا بھی اسی طرف کو گھومے۔ اس حرکت کی علت نمائی دولہن دولہا کا اتحاد ہے، یعنی تمام عمر ایک ایسے گھوڑے کی طرح جو اپنے سوار کا تابع ہوتا ہے شوہر بھی اپنی بیوی کا تابع ہے۔ کبھی یہ رسمیں صبح تک تمام ہوجاتی ہیں اور کبھی دن نکلے تک چلتی رہتی ہیں۔ اس کے بعد سٹھنیاں گائی جاتی ہیں جو فحش

ﻠﮧ برائے تفصیل ملاحظہ ہو۔ مثنویات میر حسن دہلوی (نول کشور ۱۹۴۵ء) ص ۱۲۶-۱۲۷

سے بھری ہوتی ہیں۔ بعدازیں دولہا باہر آتا ہے اور دولہن کو پالکی میں سوار کرتے ہیں جس پر زربفت کا یا سادہ غلاف چڑھایا جاتا ہے۔ پھر اس شان و شوکت دھوم اور دھام سے جیسے گزشتہ رات برات آئی تھی صبح کو براتی رخصت ہوتے ہیں۔ تخت رواں بھی ہوتا ہے اور دولہن کا جہیز بھی۔

جہیز

جہیز کا حال دولہن والوں کی حیثیت پر موقوف ہے۔ بعض لوگ ایک ہاتھی یا دو ہاتھی معہ نقرئی ہودج کے اور چار پانچ گھوڑے معہ سنہری روپہلی زین و اسباب کے اور چند اونٹ جن پر عمدہ لباس اور برتن اور آفتابے، مٹکے، تانبے کے برتن اور چاندی کی تھلیاں عمدہ سامان سے بھرے ہوئے صندوق اور سونے چاندی کا چھپرکھٹ بھی جہیز میں دیتے ہیں۔ یہ رسم ہندوستان کے تمام باشندوں میں جاری ہے، کیا ہندو اور کیا مسلمان۔ ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق داماد کو جہیز دیتا ہے۔ صرف کنبوہ جہیز نہیں دیتے اور عروس کے گھر ساچق بھی نہیں لاتے کیوں کہ یہ لوگ ان باتوں کو مکروہ سمجھتے ہیں۔

بہرحال شبِ وصل کو کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا ہے۔ عورتیں ساز کے ساتھ ترانہ تہنیت گاتی ہیں۔ صبح دولہن کے گھر چادر جانے کے بعد پنجیری تقسیم کی جاتی ہے یہ خوشی ماں باپ کے لئے اصل شادی سے زیادہ ہوتی ہے۔

رسم چوتھا

شادی کے چوتھے دن دولہن دولہا کے ساتھ اپنے میکے جاتی ہے۔ اس موقع پر دونوں خاندانوں کی عورتیں وہاں جمع ہوتی ہیں اور فرطِ خوشی میں رنگ پاشی کرتی ہیں۔ بعدازیں پھولوں کے زیور معہ چند ٹوکریوں کے جن میں ہری ترکاریاں داماد کے گھر سے لے جا کر دولہا دولہن کو پہناتے ہیں اور فریقِ ثانی کے زن و مرد متفق ہو کر یہی پھل ترکاریاں داماد اور دولہن اور قبیلے کی عورتوں کو پھینک کر مارتی ہیں۔ یہی حرکت دولہن والیاں بھی کرتی ہیں۔ دولہا بھی زور زور سے پھل ترکاریاں پھینک پھینک کر مارتا ہے۔ چھوٹے بچوں اور دولہا کے چھوٹے بھائیوں کے سوا کوئی مرد وہاں بار نہیں پاتا۔ ترکاریوں کے علاوہ چوب گل یا باریک اور منقش زردوزی کا کام کئے سیاہ و سرخ لکڑی کے گولے یا زردوزی کی گیندیں بھی اس جنگ میں استعمال ہوتی ہیں۔ اکثر اس میں چوٹ چاٹ بھی لگ جاتی ہے۔ منہ سوج جاتے ہیں اور افغانوں میں تو بعض کی بینائی جاتی رہتی ہے۔

نذر و نیاز کی رسمیں

ہندوستان کی عورتیں بعض اکابر صوفیہ کی نذر کا کھانا پکاتی ہیں۔ ان کو مشکل کشا تصور کرتی ہیں۔ مثلاً سید جلال بخاری: بچوں کی سلامتی کے لئے چاول پکا کر مٹی کے برتن میں بھرتی ہیں اور دہی اور شکر اس میں ڈال کر شریف اور غرباء کو کھلاتی ہیں۔ سید احمد کبیر کی نذر کے گوشت کے کباب خود کھاتی ہیں اور دوسروں کو کھلاتی ہیں۔ بقیہ گوشت ابدالوں کو فروخت کیا جاتا ہے۔ یہ ابدال لوگ قربانی کے وقت کوٹلے روشن کرتے ہیں اور دہکتے انگاروں پر برہنہ ہو کر لوٹتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ بجھ جاتی ہے اور ان کے جسم کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا۔ اس بنا پر لوگ ان کے کمال کا لوہا مانتے ہیں۔ یہ سب ان کی چالاکی اور پھرتی کی بنا پہ ہے اور کوئی وجہ قرینِ قیاس نہیں۔

نوکر پیشہ لوگوں کا حال

پیادے، جن کا کام امراء کے گھر کی حفاظت کرنا، آقا کی سواری کے وقت ہم رکاب ہونا، اور نگہبانی کرنا ہے۔ شاگرد پیشہ خدمت گار دوسروں پر عزت اور شرافت میں ڈینگ مارتے ہیں مگر ان میں اور چوبداروں میں انیس بیس کا فرق ہوتا ہے۔ نسب کے اعتبار سے یہ ہو سکتا ہے کہ خدمت گار اور فراش، چوبداروں پر ترجیح رکھتے ہوں۔ خدمت گار یا فراش ہونا نجیب زادوں سے متصور ہے بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ شریف زادے امی ہونے یا افلاس کے باعث خدمت گاری یا فراشی کا کام کرنا قبول کر لیتے ہیں۔ پس اس گروہ میں جہاں دس رذیل ہیں دو ایسے بھی مل جاتے ہیں جو از روئے نسب شریف ہوں۔ اگرچہ حسب کے اعتبار سے سب برابر ہیں کیونکہ خدمت گار کو کوئی بھی اپنے ساتھ ایک برتن میں کھانا نہیں کھلاتا اور کوئی بھی اسے اپنے سامنے بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس کے برعکس اگر شریف آدمی پھٹے پرانے لباس میں بادشاہ زادے، وزیر زادے، وزیروں اور امیروں کی محفل کے سوا جہاں بھی جائے گا، اسے بٹھایا جائے گا اور کھانا بھی ساتھ کھائے گا۔ غلاک حسب و نسب دونوں اعتبار سے کمتر سمجھا جاتا ہے اور حسبی اعتبار سے

اُسے صرف اتنا مرتبہ حاصل ہے کہ اگر وہ اپنے فن میں کامل ہے تو آقا کے سامنے دوسرے خدمت گاروں کے برابر ہوگا۔ کیوں کہ اس کو مجلس میں بیٹھنے اور آقا کے ساتھ دسترخوان پر کھانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ باورچی بھی خدمت گاروں کے رتبے کو نہیں پہونچتا۔ اگرچہ اس فرقے میں بھی شرافت نسبی کا احتمال ہوتا ہے کیوں کہ اکثر امیرزادے اور شریف زادے باورچیوں کی صحبت میں رہ کر کھانا پکانا سیکھ لیتے ہیں اور گردشِ افلاک کے انقلاب کے ہاتھوں بے بس ہوکر اس فن کو ذریعہ معاش بنا لیتے ہیں اور رفتہ رفتہ وہ ہم پیشہ لوگوں میں قرابت کر لیتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی رکاب دار، باورچی کبابی، اور فیل بان بھی کمتر سمجھے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض کو سید کہا جاتا ہے بعض افغان، شیخ اور مغل بھی خال خال ہیں۔ اِن میں سے دولت مند فوج دار کہلاتا ہے اور دوسرے پیش خدمتوں کو چاکر کہا جاتا ہے۔ چاہے وہ درحقیقت از روئے شرافت چاکروں سے بھی بدتر ہو۔ سقہ، سائیس، دیگیں مانجنے والا، کہار، باورچی اور پالکی کے کہار یہ سب مسلمان ہیں۔ گویئے ان فرقوں سے ناتہ داری نہیں کرتے ہیں۔

چناں چہ گاؤں اور قصبوں کے لوگ اہل شہر کو شرافت میں اپنے برابر نہیں گردانتے۔ شہری بھی بے مقدور اہلِ قصبہ کی شرافت کے باوجود اُن سے قرابت کرنا جائز نہیں سمجھتے کیوں کہ حسب میں وہ شہریوں سے کمتر ہیں۔ دیہاتوں میں زیادہ معزز وہ آدمی سمجھا جاتا ہے جس کی زبان، چال ڈھال اور لباس شہریوں کے مشابہ ہو اور اُن جیسا کھانا بھی کھاتا ہو۔

قصہ کوتاہ، قصبات میں شیخ و سید کی رشتہ داریاں، عربوں کی تقلید میں اور اصحابِ رسول کے اتباع میں ہوتی ہیں۔ اگرچہ ایران میں وہ لوگ جنہیں ہم ہندوستانی آقا و مرزا کہتے ہیں اور مغل سمجھتے ہیں، حالانکہ دراصل وہ شیخ ہیں، لیکن ہندوستان میں شرفا قصبات کے نزدیک شیخ کو لفظ شیخ سے اور سید کو لفظ میر سے یاد کرتے ہیں۔ یہاں شیخ اور سید کو لفظ میر یا مرزا نہیں کہتے۔ مرزا یا افغان چاہے جتنا مرتبہ حاصل کر لیں لیکن اُن کی رشتہ داری شیخ یا سید کے گھرانے میں ہونا ممکن نہیں ہے۔ اگرچہ شہر میں مغل اور شیخ کے درمیان قرابت داری اتفاقی طور پر ہو جاتی ہے۔ کاشتکار کا شمار شرفا میں نہیں ہوتا۔

قصبے کے باشندوں کی شہریوں سے قرابت داری مشکل ہے وہ تو سوائے چند قصبوں کے جہاں کے لوگوں سے اُن کی قدیمی قرابت داریاں چلی آرہی ہیں، دوسرے قصبات میں بھی رشتہ نہیں کرتے بلکہ اپنے قصبے میں بھی اُن کی رشتہ داریاں چند محلوں تک محدود ہوتی ہیں۔ اِن محلوں کے علاوہ، دوسرے محلے والوں سے بھی سروکار نہیں رکھتے۔ چاہے اِس محلے کے لوگ شرافت و شخصیت میں اُن سے اُونچے ہی کیوں نہ ہوں۔

عورتوں کا احترام

قصبے کے لوگ خالہ، چچی، اور بڑی بھاوج کو ماں کے برابر سمجھتے ہیں۔ وہ ہرگز بھتیجے، بھانجے یا دیور سے پردہ نہیں کرتیں، اور شوہر کے فوت ہو جانے کے بعد ان میں سے کسی سے نکاح ثانی کر لینا بڑی رُسوائی کی بات ہوتی ہے۔ چھوٹی بھاوج کو بیٹی کی طرح سمجھا جاتا ہے۔ اور اُس سے نکاح کرنا اپنی رسم کے مطابق حرام سمجھتے ہیں۔

قصبات میں قبر پرستی

ہر قصبے میں کسی نہ کسی صوفی کی قبر ضرور ہوتی ہے جو مخدوم صاحب کہلاتے ہیں اور اس ولایت کے والی سمجھے جاتے ہیں اور وہاں کی آبادی اُن کے قدموں کی برکت سے سمجھی جاتی ہے۔

پیر اشرف سلونی[1]

ساٹھ سال کے لگ بھگ ہوئے کہ ایک بزرگ قصبہ سلون میں گزرے ہیں۔ بعض لوگ اُنہیں سید سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ نانا کے جانشین اور بے پالک تھے اس لیے خود کو شیخ ظاہر کرتے ہیں اور اپنی سیادت کا اقرار نہیں کرتے ہیں۔ اس معاملے میں بہت بحث کرتے ہیں۔ بہرکیف وہ چشتیہ فقیروں میں ایک بزرگ تھے۔

---

[1] شاہ پیر اشرف سلونی ابن شاہ پیر محمد مرید پیر کریم مانک پوری کے پیرزادہ تھے۔ اُن کی وفات ۱۱۶۰ھ میں ہوئی تھی۔ شاہ اشرف کریمی سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔ مفتاح التواریخ - ۳۲۵۔ حضرت سلون نام کے موضع میں آپ کا مزار ہے اور ۱۱۷۱ھ میں تعمیر ہوا تھا۔ ایضاً ص ۳۳۹، شاہ پیر محمد پناہ سلونی ان کے بیٹے اور پیرزادہ تھے اُن کی وفات ۱۱۹۳ھ میں ہوئی تھی۔ ایضاً ص ۳۵۷ نیز ملاحظہ ہو خزینۃ الاصفیاء اول ص ۴۸۳

توہم پرستی:

ہندوستانی مسلمان توہم پرستی کے شکار ہیں۔ مثلاً بعض گھروں میں کنواری لڑکی کا ہونا مبارک نہیں سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح مربّہ اور اچار بھی مدت العمر دوست کے گھر سے یا بازار سے خرید کر کھاتے ہیں۔ گھر میں تیار نہیں کرتے علاوہ ازیں عورتوں کے عقیدہ کے مطابق یہ سات مرد مثلاً شیخ سدو وغیرہ اور سات عورتیں سب عورتوں کے معاملات بنانے اور بگاڑنے پر مختار ہیں وہ جس پر مہربان ہوں وہ ہمیشہ آرام اور خوشحالی کی زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کے برعکس اگر عتاب نازل ہو تو وہ زندگی بھر علیل رہتا ہے۔ بلکہ شب و روز اس پر غشی طاری رہتی ہے۔ ان کی مہربانی اور نامہربانی کا انحصار ان کی نذر ادا کرنے پر ہے۔ اگر یہ کسی عورت کے سر پر آجائیں تو دوسری عورتیں شام سے صاف ستھرے مکان میں عمدہ فرش بچھا کر جمع ہو جاتی ہیں اور تمام رات گاتی بجاتی ہیں۔ اِن سات مردوں کے نام یہ ہیں۔ شیخ سدو، زین خاں، ننھے میاں، صدر جہاں چھل تن، شاہ دریا اور شاہ سکندر اور سات عورتیں۔ لال پری، سبز پری، سیاہ پری، زرد پری، آسمان پری، دریا پری اور نور پری۔ ان میں سے ہر ایک باری باری عورتوں پر حلول کرتی ہیں۔ اس رات بھر کے جلسے کو بیٹھک کہتے ہیں۔ بعض نسوانی خصلت رکھنے والے مرد بھی اِن چودہ مرد عورتوں میں سے کسی کو اپنے سر پر سوار کر لیتے ہیں۔ وہ اس دن کے لئے رنگین اور بھڑکیلے لباس اور زیور اور بقچہ رکھتے ہیں۔ مردوں میں شاہ دریا اور شاہ سکندر دوسروں سے بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ انہیں نوری شہزادہ کہا جاتا ہے۔ ان کو سگا بھائی بتاتے ہیں اور پریاں ان کی بہنیں ہیں۔ جو ایک ہی بطن سے ہیں۔ یہ عقیدہ عورتوں کے دل سے نکالنا محال ہے۔

مصوّر سبزواری

منزل ہے نہ منزل کا دُھواں دیکھتا کیا ہے
اے قافلۂ نوحہ گراں دیکھتا کیا ہے

بیگانہ صفت بھول سے چہروں سے گزر جا
یہ شہر ہے پتھر کا جہاں دیکھتا کیا ہے

چھو کر تو کبھی دیکھ مرے زخم جگر کو
طوفان کا ساحل سے سماں دیکھتا کیا ہے

اب خشک بگولوں میں سر ریگ رواں تو
ڈوبے ہوئے قدموں کے نشاں دیکھتا کیا ہے

شاید کسی غرقاب تمنا کی دعا ہو
اک شمع سر جوئے رواں دیکھتا کیا ہے

میں تیرا ہی ملبوس ہوں اے اجنبی سائے
تو مجھ کو بہ چشم دگراں دیکھتا کیا ہے

وہ غنچہ دہاں سرو قداں لوگ مصوّر
کوئی نہیں مڑ مڑ کے یہاں دیکھتا کیا ہے

کمار پاشی

میگھ دت کو ٹرین پر سوار کرانے کے بعد، میں اب اسٹیشن کے احاطے سے باہر نکل آیا ہوں۔ میگھ دت میرا پُرانا دوست ہے۔ دو روز پہلے وہ میرے شہر میں مجھ سے ملنے آیا تھا۔ برسوں بعد ہم دونوں ملے تھے۔ ڈھیروں باتیں تھیں، ڈھیروں سوال تھے اب جب کہ وہ پھر مجھ سے ایک نامعلوم عرصے کے لئے بچھڑ گیا ہے لگتا ہے کتنی ہی باتیں تھیں جو میں اُس سے نہ کہہ سکا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بھی ٹرین میں بیٹھا میرے ہی بارے میں سوچ رہا ہوگا۔ نجانے کتنی اور باتیں ہوں گی جو وہ مجھ سے نہ کہہ سکا۔

میں اب اسٹیشن کے احاطے سے باہر نکل آیا ہوں۔ رات کا ایک بجا ہے آسمان پر گہرے بادل چھائے ہیں۔ موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ جولائی کی بارشوں میں بھیگنا بھی ایک ننھی منی عیاشی سے کم نہیں۔ یہی سوچ کر دھرتی پر چلچلاتے پانیوں میں گھر کی طرف نکل پڑا ہوں۔ اسٹیشن سے میرا مکان دو فرلانگ سے زیادہ دوری پر نہیں۔ ایک فرلانگ کا اُجاڑ علاقہ طے کرنے کے بعد ایک فرلانگ لمبا بازار ہے جس کے آخری سرے پر ایک تنگ سی گلی میں مجھے مُڑ جانا ہے۔ دائیں طرف ایک چھوٹی سی حویلی ہے، جس کے باہر والا کمرہ میرا گھر ہے۔ جس کا نہ کوئی دالان ہے۔ نہ آنگن

بس ایک چھوٹا اُداس سا کمرہ ہے جس میں ایک چارپائی ہے۔ ایک میز، ایک کُرسی۔ اِدھر اُدھر بکھری ہوئی کتابیں، رسالے، اخبار اور دیوار پر فریم میں لگی ایک پینٹنگ۔ اور اب یہی چیزیں میری ذات کی پہچان بن گئی ہیں۔ میگھ دت نے سچ کہا تھا۔ یار! کتنا ہولناک ہے یہ منظر... لگتا ہے تمہارے کمرے میں نہیں بلکہ خود تمہارے اندر بیٹھا ہوں .....

اسٹیشن کے باہر کا اُجاڑ علاقہ طے کرنے کے بعد اب میں اپنے بازار سے گزر رہا ہوں۔ پانی اسی رفتار سے گر رہا ہے۔ ہر طرف گہری خاموشی ہے۔ اور اندھیرا۔ بجلی چمکتی ہے تو بازار کے آخری سرے تک لمحہ بھر کے لئے روشنی سی بہنے لگتی ہے۔ دونوں طرف کی دکانیں بند پڑی ہیں۔ چوکیدار سر پر بوری لپیٹے دکانوں کے تالے چیک کر رہا ہے۔ دھرتی پر پھیلے پانی کو پاؤں سے اچھالتا ہوا میں آگے بڑھ رہا ہوں۔ بس چند دکانوں کے بعد مجھے دائیں طرف ایک گلی میں مُڑ جانا ہے۔ سر سے پاؤں تک بھیگ رہا ہوں۔ کپڑے جسم سے چپک گئے ہیں۔ سر کے بالوں سے پانی کی بوندیں رینگ رینگ کر آنکھوں میں گر رہی

ہیں اور ایک عجیب سی ٹھنڈک میری روح میں اتر رہی ہے۔

گھنٹہ بھر پہلے میگھ دوت میرے کمرے میں بیٹھا تھا۔ آنیوالی ایک نامعلوم عرصے کی جدائی کے دکھوں نے ہم دونوں کو اُداس کر دیا تھا۔ وہ بھی میری طرح بہت جذباتی ہے' کہہ رہا تھا ؛ جاتے ہوئے تمہارا کمرہ ساتھ لے جا رہا ہوں . . . جو مجھے کہیں بھی چین نہیں لینے دے گا . . . .

میگھ دوت کی بھرائی ہوئی آواز میرے ذہن کے گنبد میں بار بار گونج رہی ہے۔

میں اس شہر میں تین چار برس پہلے آیا تھا۔ یہاں کی پُرانی عمارتیں دیکھنے۔ لیکن اس شہر کے سکون نے مجھے یہاں سے نکلنے نہیں دیا۔ اور اب تو کچھ ایسی بیڑیاں پڑ گئی ہیں پاؤں میں کہ کہیں اور بھاگ نہیں سکتا۔ شاید چاہنے پر بھی نہیں۔

پانی اسی تیزی سے دھرتی کو پیٹ رہا ہے۔ ہر طرف گہری خاموشی ہے اور اندھیرا۔ اچانک گلی میں مڑنے لگا ہوں تو چونک کر ایک دم رُک گیا ہوں۔ اپنے کمرے کے دروازے پر سائبان کے نیچے ایک سایہ نظر آیا ہے۔ خوف کی ایک لہر میرے سارے بدن کو چیرتی ہوئی نکل گئی ہے۔ میں جرأت کر کے آگے بڑھتا ہوں۔ گہرے اندھیروں میں بجلی پل بھر کے لیے چمکی ہے کوئی دروازے پر کھڑا ہے۔

"کون ہیں آپ ؟"

اب میں بالکل اس کے سامنے کھڑا ہوں۔ اگرچہ اندھیرے میں اُس کی شکل نہیں دیکھ پا رہا۔

"کون ہیں آپ ؟ — کیا چاہتے ہیں ؟"

پھر ایک آواز آتی ہے۔

"بھائی مسافر ہوں۔ بارش ہو رہی تھی۔ ذرا آپ کے چھجے کے نیچے رُک گیا . . . ."

میں خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتا ہوں اور آگے بڑھ کر کمرے کا تالا کھولتا ہوں۔ "آئیے — اندر آجائیے — بارش تھمے تو چلے جائیے گا . . . ."

وہ کچھ کہے بغیر میرے پیچھے ہو لیا ہے۔

چلتے وقت کمرے کی بتی جلتی چھوڑ گیا تھا۔ گہرے اندھیرے سے نکل کر بلب کی تیز روشنی نے آنکھیں چندھیا دی ہیں۔ اب ہم دونوں کمرے کے ٹیلے بلب کے نیچے کھڑے ہیں۔ ہمارے کپڑوں سے پانی پھسل پھسل کر فرش پر بکھر رہا ہے۔ روشنی میں میں نے ایک نظر اُسے دیکھا — ۲۵-۲۶ برس کا ایک دُبلا پتلا سا نوجوان ہے، کھلے رنگ کا، تیکھے ناک نقشے والا . . . . میں جلدی جلدی کپڑے بدلنے لگتا ہوں۔

"اگر چاہیں تو آپ بھی کپڑے بدل لیں"، میں اس سے کہتا ہوں۔

اس نے شاید میری بات نہیں سُنی۔ غور سے کمرے کی ایک ایک چیز کو دیکھ رہا ہے۔

کہاں رہتے ہیں آپ ؟ میں پھر پوچھتا ہوں۔

"آں . . . " وہ چونکتا ہے . . . "کہیں نہیں بس ازلی مسافر سمجھ لیجیے۔ شہر شہر گھومتا پھرتا ہوں۔ ابھی آدھ گھنٹہ پہلے اسٹیشن پر گاڑی رُکی تو قلی سے پوچھا "کون سا اسٹیشن ہے ؟ اُس نے کہا ؛ لال دیوار . . . . نام مجھے اچھا لگا . . . بس فوراً گاڑی سے اُتر پڑا۔ اب جو اسٹیشن سے نکلا تو ایسا محسوس ہوا جیسے یہ شہر میرا دیکھا ہوا ہے۔ حالانکہ سچ پوچھئے تو میں یہاں پہلی بار آیا ہوں . . . . لیکن حیرت ہے یہاں کی ہر چیز مجھے جانی پہچانی لگی . . . . بازار . . . گلیاں اور یہاں تک کہ آپ کا کمرہ بھی . . . ."

میں نے اُس کی طرف غور سے دیکھا ہے۔ اُس کی باتیں کتنی عجیب ہیں۔ شاید پاگل ہے . . . . سوچا پوچھوں — کہیں آپ پاگل خانے سے تو نہیں آ رہے . . . . لیکن چپ ہو گیا ہوں۔

وہ کہہ رہا ہے آپ کی گلی میں مُڑا تو لگا اِدھر پہلے بھی آ چکا ہوں . . . . ممکن ہے یہ میرا وہم ہو — لیکن —

اُس کی نظر اچانک دیوار پر اُٹھ گئی ہے۔

"یہ پینٹنگ آپ نے کہاں سے لی ؟"

"یہ میرے یہاں آنے سے پہلے ہی ٹنگی تھی" . . .

"آپ یہاں کب سے رہتے ہیں ؟"

مجھے غصہ آرہا ہے۔ عجیب احمق آدمی ہے۔ اس قسم کے سوالات
کرنے کا اُسے کیا حق ہے۔
"آپ چائے پئیں گے ؟" میں بات کا رُخ بدلتا ہوں۔
"ہاں ــــ پی لوں گا . . . . ."
"لیجئے ، پہلے تولئے سے اپنا بھیگا ہوا سر پونچھ ڈالئے ــــ اور ہاں
آپ اب بھی چاہیں تو کپڑے بدل سکتے ہیں . . . ."
"شکریہ کہہ کر وہ تولئے سے اپنا سر پونچھنے لگا ہے۔ اس دوران
میں نے کیتلی میں پانی ڈال کر اسٹوو پر رکھ دیا ہے۔ وہ اب بھی کرسی
پر بیٹھا دیوار پر لگی پینٹنگ کو غور سے دیکھ رہا ہے۔
"بھائی صاحب! آپ نے بتایا نہیں، کب سے رہتے ہیں آپ
یہاں ؟"
کتنی سادگی ہے اُس کی آواز میں
"یہی کوئی تین چار برس سے"
آپ یقین نہیں کریں گے لیکن یہ سچ ہے کہ بالکل ایسی ہی پینٹنگ
میرے ایک دوست نے بنائی تھی . . . . .
اُس کی بات سُن کر میں ایک دم چونک گیا ہوں۔
"کیا مطلب ؟"
مجھے لگتا ہے . . . . وہ لفظ لفظ پر زور دے رہا ہے . . . . یہ
وہی پینٹنگ ہے جو میرے ایک مصور دوست سرشا نند نے میری ۲۲
ویں سالگرہ پر مجھے تحفے میں دی تھی۔
اس کی بات سُن کر ایک عجیب سا خوف میرے بدن میں
سرایت کرنے لگا ہے اگر آپ کو یقین نہ آئے تو دیکھ لیجئے، اس پر ایک
کونے میں اُس کا نام بھی لکھا ہوگا . . . .
میں فوراً آگے بڑھتا ہوں۔ پینٹنگ کے قریب جاکر دیکھتا ہوں
ایک کونے میں واقعی انگریزی حروف میں ایس نند لکھا ہے . . .
کیتلی میں پانی اُبل رہا ہے۔ دُودھ اور شکر ملاکر میں چائے بنانے
لگتا ہوں۔ سوچ رہا ہوں آخر یہ کیا قصہ ہے ؟ کون ہو سکتا ہے یہ آدمی؟
یقیناً مجھ سے پہلے یہ یہاں رہتا ہوگا اور اب غالباً مجھے خوف زدہ کرنے
آیا ہے . . . لیکن کیوں ــــ ؟ کس لئے ؟

میرا خیال ہے مجھ سے پہلے آپ یہاں رہتے ہوں گے؟
چائے کی پیالی میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے وہ جواب دیتا ہے۔
"یہ کیسے ہو سکتا ہے بھائی صاحب! میں لال دیوار پہلی بار آیا ہوں اور
اپنے پورے ہوش و حواس کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میں یہاں اس
سے پہلے کبھی نہیں آیا ــــ شاید میرا وہم مجھے ورغلا رہا ہے ــــ اس شہر سے
ذہنی رفاقت ، ممکن ہے محض ایک اتفاق ہو ــــ ممکن ہے ــــ
اُسے اچانک کچھ یاد آتا ہے۔
"اس پینٹنگ کے پیچھے ایک ڈائری رکھی ہے ــــ" کہتے ہوئے
وہ اُچھلتا ہے اور پینٹنگ ہٹاکر پیچھے دیکھتا ہے۔ لیکن وہاں کچھ نہیں ہے
وہ کچھ اُداس سا ہوکر کرسی پر بیٹھ گیا ہے اور اب دھیرے
دھیرے چائے کے گھونٹ بھر رہا ہے۔
لیکن میری حیرت اور بڑھ گئی ہے۔ خوف کی لہریں میرے سارے
بدن میں سانپوں کی طرح رینگ رہی ہیں۔
شاید بارش تھم گئی ہے۔
اُس کی بات سُن کر میں اپنا ہاتھ کھڑکی سے باہر نکال کر محسوس
کرتا ہوں۔ پانی گرنا بند ہوگیا ہے۔
اچھا میں چلتا ہوں
یہ کہہ کر وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا ہے۔

میں حیران سا کرسی پر بیٹھا ہوں۔ میں نے اُس سے بہت بڑا جھوٹ
بولا ہے۔ پینٹنگ کے پیچھے واقعی ایک ڈائری پڑی تھی۔ ابھی چند روز پہلے
جب میں پینٹنگ کا فریم صاف کر رہا تھا تو وہ ایکدم نیچے فرش پر آگری
تھی ــــ ایک پُرانی بوسیدہ اوراق والی ڈائری . . .
میں نے اُسے ادھر اُدھر سے کھولا تھا . . . پڑھا کچھ نہیں . . .
بس کاغذوں میں پھینک دیا ــــ وہ یقیناً اب بھی کاغذوں کے انبار
میں پڑی ہوگی ــــ میں جلدی جلدی اُسے تلاش کرنے لگتا ہوں۔ تمام
رسالے ــــ تمام اخبار اُلٹ پلٹ رہا ہوں ــــ یہیں کہیں ہوگی ــــ
یقیناً ہوگی ــــ کہاں جا سکتی ہے ؟ میں بے صبری سے اُسے تلاش کرتا
ہوں ــــ الماری میں ــــ چارپائی کے نیچے ــــ بستر میں ــــ اور اچانک

وہ مجھے مل گئی ۔۔ میں نے جھک کر اُسے اُٹھا لیا ہے ۔ اُس کے ورق جلدی جلدی اُلٹ رہا ہوں ۔۔ دل جیسے کانپ رہا ہے ۔ نہ جانے یہ کیسا خوف ہے جو میرے انگ انگ میں سما گیا ہے ۔ پہلے صفحے پر چھوٹے مگر صاف حروف میں یہ چند سطریں درج ہیں۔

" مجھے یقین ہے : میں نے مسیح سے کہیں زیادہ
مصائب جھیلے ہیں۔ میں اپنے اندر ایک ایسا
درد محسوس کرتا ہوں جو مجھے خوف زدہ کر دیتا
ہے۔ میری روح بیمار ہے ۔ میرا ذہن نہیں ۔
ہر وہ شخص جو یہ اوراق پڑھے گا دکھی ہوگا
میرا جسم نہیں بلکہ میری روح بیمار ہے ۔۔"

ورق الٹتا ہوں۔ دوسرے صفحے پر نظر گئی ہے تو میرا سر گھومنے لگا ہے۔ دوسرے صفحے پر انتساب ہے جو میرے نام ہے موٹے حروف میں صاف صاف میرا ہی نام لکھا ہے۔

میں دوڑ کر اُس آدمی کو آواز دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ لیکن اب تک وہ نجانے کہاں نکل گیا ہوگا۔

نجانے کون تھا ؟

مجھے کیسے جانتا ہے ؟

میرا اس سے کیا رشتہ ہے ؟

کیا رشتہ ہے اس کا مجھ سے ؟

کمرے میں چاروں طرف خاموشی ہے۔ کتنا ہولناک سماں ہے۔ لگتا ہے میں اپنے کمرے میں نہیں بلکہ خود اپنے اندر بیٹھا ہوں اور لمحہ لمحہ اپنے ہی وجود کی دیواروں تلے دبتا چلا جا رہا ہوں۔

غزل

طالب رضوی برق

عشق کیوں رُسوا ہو اپنا سر رہے گا ہے
آپ اس طرح جو مل جائیے گا ہے گا ہے

بے رُخی اہلِ محبت سے روا تم کو نہیں
صدقۂ حسن سہی مجھ پہ لگا ہے گا ہے

دل کو مژگاں کا تصور ہی بہت کام آیا
ڈوبتے کو ہے سہارا یہ کا ہے گا ہے

یاد آتی ہے درازیٔ شبِ ظلمتِ غم
دیکھتا ہوں جو تری زلفِ سیا ہے گا ہے

آرزو ہے کہ ترے کوچے سے ہم بھی گزریں
پیرہن چاک یہ اس حال تبا ہے گا ہے

زندگی ختم ہوئی بس اسی حسرت میں کہ وہ
مجھ کو پاس اپنے بلائے مجھے چاہے گا ہے

دل میں تصویر تمہاری نہ اتاروں تو کہو
پردۂ رُخ بھی اُٹھے جلوہ نما ہے گا ہے

برقؔ عندیہ ترا مستحق لطف ہوا
سنتے ہیں عرش کو جا لیتی ہے آہے گا ہے

ایم کوٹھیاوی راہی

آخری خوابوں کا سفر

خنک آنکھوں میں جھلک اٹھیں لہو کی جھیلیں
زرد چہرے پہ چمک اٹھا شفق کا غازہ
جانے کس بیتی ہوئی شام کی پھر یاد آئی
ایک اک کر کے ہر اک زخم ہوا پھر تازہ

تشنہ ہونٹوں پہ ٹپکنے لگی آنسو کی شراب
سونے شانوں پہ معنبر سی زلفیں بکھریں
اور دل بیتے ہوئے لموں میں گم ہونے لگا
سوگ میں ڈوبی ہوئی ساعتیں پھر دکھنے لگیں

موم کے زرد اجالے کے تلے شیشۂ زہر
دیر سے دیکھ رہا ہے مرے ہونٹوں کی طرف
اور میں دور خلاؤں میں اٹھائے ہوئے سر
خواب بنتے ہوئے معصوم خیالوں کی طرف

وقت اب ہستیٔ ہجراں کا بہت ہی کم ہے
اس گھڑی شہد کے مانند مجھے بھی سم ہے
اس سے پہلے کہ یہ شیشہ مرے ہونٹوں سے لگے
میری محبوب! مری تشنہ نظر میں آؤ
اپنی بھولی ہوئی اس رہ گزر میں آؤ
کم سے کم آخری خوابوں کے سفر میں آؤ
دمِ رخصت خلشِ وعدۂ فردا نہ رہے!

سخاوت شمیم

پلا شک سمے جمے ی

ڈاکٹر تو نے نیا رُوپ عطا کر کے مجھے
میری خاموش اُمنگوں کو زباں بخشی ہے
میرے افکار کی دُنیا میں نہ تھی خود داری
ذہن اپنے ہی تصور سے ہوا تھا عاری
اپنی ہستی کا تصور جو کبھی آتا تھا
ایک نشتر سا رگِ جاں میں اُتر جاتا تھا
بار بار اپنے ہی چہرے پہ نظر جاتی تھی
اور بگڑی ہوئی ہیئت پہ ٹھہر جاتی تھی
نقش کچھ زیر و زبر میرے ہوئے تھے ایسے
خالقِ کل نے بنایا ہو نمونہ جیسے
دیکھتا جب کوئی عبرت کی نظر سے مجھ کو
کوفت ہوتی مرے احساسِ بشر سے مجھ کو
تیری تجویز پہ مٹنے کا ارادہ لے کر
آخرش آئی ترے پاس تمنا لے کر
اک تمنا کہ جو موہوم سی لگتی تھی مجھے
ایک نعمت کہ جو محروم سی لگتی تھی مجھے
تو نے پھر جادو کیا عالمِ بے ہوشی میں
کیا سے کیا مجھ کو کیا عالمِ بے ہوشی میں
قابلِ قدر جراحت کا نتیجہ ہی کہوں
مجھ پہ اللہ کی رحمت کا نتیجہ ہی کہوں
سب سمجھنے لگے کچھ اپنی نظر میں مجھ کو
اہمیت ملنے لگی اپنے ہی گھر میں مجھ کو
کبھی خوش فہمیٔ بے حد مجھے ہو جاتی ہے
کبھی بدلی ہوئی حالت پہ ہنسی آتی ہے
دل میں اُٹھتے ہیں کبھی چاہ کے ارمان بہت
الغرض ہو گئے اب جینے کے سامان بہت
میری خاموش اُمنگوں کو زباں بخشی ہے
ڈاکٹر تو نے نیا رُوپ عطا کر کے مجھے

احمد وصی

سراغ

اک لمحہ کو سورج کی جانب دیکھا تھا
اور جب پلکوں کا دروازہ بند کیا تھا
آنکھوں کے آگے کچھ دھبے ناچ اُٹھے تھے
دھندلے دھندلے سے کچھ سائے رینگ رہے تھے
میرے آگے پیچھے رنگین خاکے تھے
ان خاکوں میں ماضی کی تصویریں تھیں
مستقبل کے ہلکے ہلکے سپنے تھے
اور جب آنکھ کھلی تو کچھ بھی نہ تھا
پتہ چلا کہ وقت مقید ہے کرنوں میں
بھید کھلا کہ لمحے سورج کے قیدی ہیں

محمد اجمل خاں

عالم - ادیب - محقق

(۱۸۹۷ء - ۱۹۶۹ء)

——— اوصاف علی

شہر الہ آباد سے قریب ۴۰ میل دور گنگا کے کنارے ایک جگہ کڑا مانک پور ہے۔ یہاں اب کھنڈر کے سوا کچھ نہیں ہے، لیکن تاریخ ہند کے طالبِ علم جانتے ہیں کہ خلجیوں کے دور میں یہ کتنا عظیم الشان شہر تھا۔ جلال الدین خلجی یہیں قتل ہوئے تھے اور یہیں دفن ہیں۔ چودھویں صدی کے وسط میں ابن بطوطہ یہاں وارد ہوئے تھے اور اُس کا ذکر اپنے سفرناموں میں یوں کیا ہے۔

"یہ علاقہ ہندوستان میں نہایت سرسبز اور زرخیز سمجھا جاتا ہے۔ گیہوں، چاول اور نیشکر وہاں بہ کثرت پیدا ہوتے ہیں۔ کپڑا بیش قیمت تیار ہوتا ہے اور دہلی میں فروخت کے لئے آتا ہے۔"

شاید یہی شادابی و زرخیزی تھی جو محمد اجمل خاں صاحب کے اجداد کو کوئی تین سو برس پہلے افغانستان سے کھینچ کر کڑا مانک پور لے آئی اور وہ کڑا مانک پور کے سامنے گنگا پار اس جگہ آباد ہوئے جس کا نام اب گتنی ہے۔ اس نووارد افغان خاندان کا آبائی پیشہ سپہ گری تھا اور اس لحاظ سے وہ بہت ممتاز تھا، لیکن غالباً اب یہ پرسکون زندگی کی تلاش میں تھا اس لئے خاندان کے اکثر افراد زراعت میں لگ گئے اور صرف چند نے فوج اور پولیس میں جانا پسند کیا۔ ۱۸۲۱ء میں جب سید احمد بریلوی رح گتنی پہونچے تو قیام آصف خاں رسالدار کے یہاں کیا[1] جو محمد اجمل خاں صاحب کے پردادا تھے۔ اس تاریخی واقعے نے اس خاندان کو ممتاز سے ممتاز تر کر دیا۔ محمد اجمل خاں صاحب اس خاندان کے ممتاز ترین فرد ہوئے ہیں۔ وہ گتنی میں ۲ فروری ۱۸۹۷ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم الہ آباد میں ہوئی۔ پھر ان کے والد اسماعیل خاں ابنِ الہ داد خاں نے انہیں شملہ بھیج دیا۔ اعلیٰ تعلیم محمد اجمل خاں صاحب نے لکھنؤ میں اور پھر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں حاصل کی اور عالم و ادیب ہوئے۔

محمد اجمل خاں صاحب سے پہلی ہی ملاقات میں یہ بات عیاں ہو جاتی کہ اُن کا تعلق ایسے خاندان سے ہے جس کا آبائی پیشہ سپہ سالاری ہے۔ تعلیم ہی کے دوران میں انہوں نے سیاسی میدان میں قدم

[1] غلام رسول مہر: سید احمد شہید۔ صفحہ ۱۹۵

رکھ دیا تھا۔ ۲۲ برس کی عمر میں وہ خلافت کمیٹی الہ آباد کے سیکریٹری مقرر ہوئے اور دو سال بعد ۱۹۲۲ء میں کانگریس کمیٹی کے سیکریٹری ہوتے ہی وہ چرخے خرید لائے اور گھر والوں کو دینا چاہا لیکن گھر والوں نے انھیں سر پھرا سمجھ کر چرخے لینے سے انکار کر دیا۔ جب بہت دن تک محمد اجمل خاں صاحب نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا اور چرخے کی صفات میں مدلّل بحثیں اور دل کش تقریریں کرتے گئے، تو گھر والوں نے چرخہ چلانا شروع کر دیا۔ ابتداً محمد اجمل خاں صاحب گھر کے کاتے ہوئے سوت ہی سے بنے ہوئے کپڑے پہنتے تھے کھدر کا استعمال انہوں نے آخری دم تک جاری رکھا کیوں کہ اُن کا عقیدہ تھا کہ ہندوستان کے لوگوں کی بے روزگاری دُور کرنے میں چرخے کا استعمال بڑی حد تک مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

۱۹۲۶ء میں محمد اجمل خاں صاحب کو الہ آباد یونی ورسٹی میں عربی و فارسی لکچرر کی جگہ مل گئی۔ وہ اس جگہ پر صرف دو سال تک فائز رہے لیکن اس دو سال کے عرصہ میں انہوں نے اپنے علم کا ایسا سکہ بٹھایا کہ یونیورسٹی والے محمد اجمل خاں صاحب کو آج تک یاد کرتے ہیں۔ یونی ورسٹی چھوڑ کر انہوں نے میرے والد سید فصاحت علی کے ساتھ وکالت شروع کی لیکن یہ پیشہ اُنہیں راس نہ آیا اور وہ ۱۹۳۱ء میں الہ آباد چھوڑ کر کلکتہ چلے گئے جہاں رابندر ناتھ ٹیگور نے ان کی بڑی قدر کی اور اُن کو شانتی نکیتن میں ریسرچ اسکالر مقرر کیا۔ وہاں بھی وہ دو ہی برس رہے اور ۱۹۳۶ء میں اُن کی بے چین اور انقلابی طبیعت انہیں مولانا ابوالکلام آزاد کی دائمی رفاقت میں لے آئی۔ وہ مولانا آزاد کے پرائیوٹ سکریٹری ہو گئے اور مولانا آزاد کی ۱۹۵۸ء میں وفات تک اُن کے ساتھ رہے۔ اُن کو مولانا آزاد سے بڑی عقیدت تھی اور مولانا کو محمد اجمل خاں پر بڑا اعتماد تھا۔ اپنی وزارت کے زمانے میں مولانا قریب قریب تمام دفتری کاغذات محمد اجمل خاں کے سپرد کر دیتے تھے اور اُن کی رائے سے عام طور سے اتفاق کرتے تھے۔ اسی طرح مولانا آزاد نے بہت سے اہم فیصلے ان کے مشورے سے کیے۔ مولانا آزاد کو معلوم تھا کہ محمد اجمل خاں صاحب اُردو، فارسی اور عربی ادب پر اچھی نظر رکھتے ہیں اور امورِ اسلامی سے بخوبی واقف ہیں اسی لیے مولانا ان بے شمار غیر سرکاری خطوط کو بھی جو انہیں روزمرّہ موصول ہوتے تھے اور جن میں طرح طرح کے سوال اٹھائے جاتے تھے، محمد اجمل خاں صاحب کے سپرد کر دیتے تھے اور وہ اُن کے جواب دے دیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جو کتاب محمد اجمل خاں صاحب نے مولانا آزاد کے نام ادبی خطوط و جوابات آزاد کے نام سے شائع کی، ان میں مولانا کے جواب خال خال نظر آئیں گے۔ بیشتر خطوں کے جواب محمد اجمل خاں صاحب کی طرف سے ہیں۔

مولانا آزاد کے انتقال کے بعد محمد اجمل خاں صاحب ۱۹۵۸ء میں مولانا کے قائم کردہ انڈین کاؤنسل فار کلچرل ریلیشنز میں بہ حیثیت او۔ ایس۔ ڈی آ گئے اور دوسرے کاموں کے علاوہ کاؤنسل کے سہ ماہی عربی مجلّہ ثقافت الہند کے مُدیر ہوئے۔ کاؤنسل سے علحدہ ہوتے ہی اُنہیں ۲۱ مارچ ۱۹۶۴ء کو راجیہ سبھا کا ممبر نامزد کیا گیا۔ وہ جس وقت مرے پارلیامنٹ کے ممبر تھے۔

اُنہوں نے طویل علالت کے بعد ۱۸۔ اکتوبر ۱۹۶۹ء کو صبح ۵ بجے انتقال کیا اور اُن کی وصیت کے مطابق اُنہیں بستی نظام الدین نئی دہلی میں غالب اکیڈمی کے سامنے آصف علی مرحوم کی آرام گاہ کے برابر اسی دن چار بجے شام کو دفن کر دیا گیا۔

تصنیفات

محمد اجمل خاں کی اہم تصنیفات و تالیفات یہ ہیں:

۱۔ سیاست: یہ محمد اجمل خاں صاحب کی سب سے پہلی تصنیف ہے جو ۱۹۲۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے متعلق اُنہوں نے دیباچہ

محمد اجمل خاں

34049

یں لکھا ہے:

" دو کسی کتاب کا ترجمہ ہے اور نہ کسی ایک مذہب کے اصول کو بیان کر کے سلسلہ مضامین قائم کیا گیا ہے بلکہ بجائے مذہب اور مسلک کے عالم گیر اخوت انسانی کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

۲۔ حیات ارسطو ۳۔ حیات امیر خسرو ۴۔ خواجہ چشتی اجمیری

۵۔ حیات مخدوم صابر کلیری ۶۔ آزادی کے اصول۔ یہ میک سوینی (MANSWINY) کی انگریزی کتاب PRINCIPLES OF FREEDOM. کا ترجمہ ہے جو ۱۹۲۶ء میں شائع ہوا۔

۷۔ "بھگوت گیتا": یہ اُردو ترجمہ ہے جو ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا۔

۸۔ "بھگوت گیتا": یہ فارسی ترجمہ ہے جو ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا۔

۹۔ "پس منظر اسلام"۔ یہ کتاب ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی۔

۱۰۔ "مختصر سیرت سیدنا محمد صلعم"۔ یہ ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئی۔

۱۱۔ "ترتیب نزول قرآن کریم"۔

۱۲۔ "سیرت قرآنیہ رسول عربی"۔ یہ ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی۔

۱۳۔ "بنیادی ہندوستان"۔ یہ کتاب چار حصوں میں ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۲ء کے درمیان شائع ہوئی۔

۱۴۔ "جپ جی صاحب یعنی ذکر الٰہی اُردو ترجمہ مع مختصر حالات بابا گرونانک"۔ یہ ترجمہ ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ سرورق پر یہ دلچسپ عبارت ہے۔

" پانسو جلدیں تحفتاً پاکستان کے اہل دل حضرات کی خدمت میں پیش کی جاتی ہیں۔

۱۵۔ عنوانِ انقلاب ۱۶۔ پیمانِ انقلاب

۱۷۔ مشکلاتِ قرآن کا انقلابی حل

۱۸۔ HINDI WORDS COMMON TO OTHER INDIAN LANGUAGES محمد اجمل خاں کی یہ تالیف گیارہ حصوں میں ہے اور ۱۹۵۸ء اور ۱۹۶۰ء کے درمیان شائع ہوئی۔

۱۹۔ مولانا آزاد کے نام ادبی خطوط و جوابات آزاد

۲۰۔ مراثی اقوام عالم (زیر طبع) اس کتاب کا مسودہ محمد اجمل خاں صاحب نے مرنے سے کچھ عرصہ پہلے کاتب کے حوالے کر دیا تھا۔

۲۱۔ سفر نامۂ حج (غیر مطبوعہ) یہ سفر ۱۹۳۹ء میں ہوا۔ مولانا عبید اللہ سندھی بھی محمد اجمل خاں صاحب کے ساتھ تھے۔ اس لئے مولانا سندھی کے متعلق بہت سی دلچسپ باتیں اس سفر نامہ میں ہیں۔

۲۲۔ A SHORT BIOGRAPHY OF MOHAMMAD (غیر مطبوعہ)

۲۳۔ سیرت محمد رسول اللہ مع القرآن (مع اُردو ترجمہ قرآن) (غیر مطبوعہ) اس کتاب کو محمد اجمل خاں صاحب اپنی زندگی کا حاصل سمجھتے تھے اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کے حالات تاریخ وار دینے کے ساتھ ساتھ پورا قرآن بہ ترتیب تنزیل اس میں نقل کر دیا گیا ہے۔ جس سے قرآن کریم کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ محمد اجمل خاں صاحب نے متعدد رسالے اور لاتعداد مضامین مختلف علوم و فنون پر لکھے۔ بعض مضامین خصوصاً اسلام پر اتنے تحقیقی ہیں اور ایسی دقت نظر سے لکھے گئے ہیں کہ محققین انھیں بطور سند پیش کرتے ہیں۔ مثلاً اُن کا وہ مضمون جو انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے مجلہ اسٹڈیز ان اسلام میں اکتوبر ۱۹۶۴ء میں AN INQUIRY INTO THE EARLIEST COLLECTION OF THE QURAN کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔

محمد اجمل خاں صاحب اونچے پایہ کے عالم اور ادیب تھے۔ صاحب طرز نثر نگار تھے۔ شاعر تھے۔ اُن سے اسلام پر بحث کرنے میں بڑے بڑے علماء تک گھبراتے تھے۔ قرآن کا جتنا گہرا مطالعہ اُن کا تھا کم لوگوں کا ہوگا۔ عہد جاہلیہ اور ابتدائی تاریخ اسلام پر بڑی اچھی نظر تھی۔ کثرت مطالعہ کے شوق میں انہوں نے اپنی جائداد بیچ کر گھر کتابوں سے بھر لیا۔ اُن کا یہ بے مثل کتب خانہ ۱۹۴۷ء میں نذر آتش ہو گیا۔ علمی تحقیق و تفتیش سے اس قدر دلچسپی تھی کہ جب شری جواہر لال نہرو نے ۱۹۴۸ء میں اُن سے قونسل بن کر سعودی عرب جانے کو کہا تو انہوں نے انکار کر دیا۔ پھر مولانا آزاد کے ساتھ پیرس جانے کا موقع آیا تو انہوں نے اپنی تحقیقات اور تصنیفات کی تکمیل کی خاطر دہلی میں ٹھہرنا ہی پسند کیا۔ قرآن شریف کی ایک آیت سمجھنے کے لئے "تبنیت" پر تحقیق شروع کی تو کئی مہینے تک تحقیق کرتے رہ گئے اور ہندوؤں، یہودیوں اور عیسائیوں کی تمام مذہبی کتابیں اور مختلف انسائیکلو پیڈیا کی جلدیں چھان ڈالیں۔ وہ ہر

کتاب کا غائر مطالعہ کرتے اور کتاب چاہے اُن کی ہو یا دوسرے کی اُسے نشان لگا لگا کر سُرخ و سیاہ کر دیتے۔ اُردو، فارسی، عربی کے ہزاروں شعر اُنہیں یاد تھے اور ہندی کے سینکڑوں دوہے جو وہ موقع بہ موقع سُناتے رہتے تھے۔
اُردو زبان پر اُنہیں بڑی قدرت تھی۔ وہ ایک خاص اسلوبِ نگارش رکھتے تھے لیکن دوسرے ادیبوں کی طرز میں بہ آسانی لکھ لیتے تھے۔ غبارِ خاطر کا مقدمہ لکھا تو مولانا آزاد کی لے کے ساتھ لے ملا دی، اور بہت سے لوگ آج بھی اس مغالطے میں ہیں کہ مقدمہ محمد اجمل خاں نے نہیں مولانا آزاد ہی نے لکھا ہے۔

نثر و نظم میں لطیف فرق وہی بیان کر سکتا ہے جو دونوں پر قدرت رکھتا ہو۔ محمد اجمل خاں صاحب انشا پرداز بھی تھے اور سخن فہم اور سخن گو بھی۔ انہوں نے اپنے تعلیم کے زمانے میں بہت سی ہزلیں اور غزلیں لکھی تھیں۔ اُن کی ہزلیں سُن کر اکبر الہ آبادی نے خود داد دی تھی اور مشورہ دیا تھا کہ ہزل کی جگہ غزل کہا کرو۔ محمد اجمل خاں صاحب کی ایک غزل کے جو انہوں نے ۱۹۱۶ء میں کہی تھی دو شعر یہ ہیں۔

رنگ لایا ہے یہ ضبطِ اُلفت گیسوئے دوست
آخر اپنے پیرہن سے پھوٹ نکلی بوئے دوست
تھک کے جب بیٹھے تو یہ کہہ کر تلاشِ یار میں
اے دلِ حسرت زدہ وہ سامنے ہے کوئے دوست

محمد اجمل خاں صاحب کی گفتگو بڑی دلچسپ ہوتی تھی۔ اُن کے تیور ہر آن بدلتے رہتے تھے۔ آواز کا اُتار چڑھاؤ بڑا دل فریب ہوتا تھا۔ بحث کرتے تو مذہب، فلسفہ، سائنس، ادب سب کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتے، لیکن اُن کی گفتگو کا پورا لطف وہی اُٹھا سکتا تھا جسے معلوم ہوتا کہ اُن کی ڈراؤنی آنکھوں کے پیچھے نہایت نرم دل ہے۔ وہ بڑی محبت والے آدمی تھے اپنے مخالفوں سے بھی انہوں نے کبھی نفرت نہیں کی۔

ایک بار مجھے پتہ چلا کہ محمد اجمل خاں صاحب بھنگی کالونی کے بچوں کے ساتھ کھڑے بندر کا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ مجھے یقین نہیں آیا۔ وہ مجھ سے ملنے آئے تو میں نے اُس کے متعلق دریافت کیا۔ فرمایا کہ یہ غریب بچے بندر والے کے پیچھے پیچھے جا رہے تھے اُن کے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ تماشہ کرا سکیں میں نے ایک روپیہ خرچ کر کے اتنے بہت سے بچوں کا دل خوش کیا۔ ایک دفعہ ایک غریب بچے کو پھنسیوں میں مبتلا دیکھا اُن سے رہا

غزل

سیف سہسرامی

کچھ دیر اور عنبریں سانسوں کی باس دے
ہونٹوں کو میرے اپنے لبوں کی مٹھاس دے

مِل جائے گی نظر کو بصیرت کی آب بھی
پہلے تو اپنے جسم کو کوئی لباس دے

مغرور ہو نہ جاؤں سخاوت سے میں تری
دستِ طلب بڑھاؤں تو خالی گلاس دے

منظور تیرا طرزِ تغافل ہے مجھے مگر:
ہے شرط کہ زباں کو وہ التماس دے

مر جاؤں میں خوشی سے اگر، دفن کے لئے
وہ تھوڑی سی جگہ بھی مجھے گھر کے پاس دے

سچ پوچھئے تو آج کا فن کار ہے وہی
جو فکر و فن کو سیفؔ نیا اک لباس دے

نہ گیا۔ اسپتال جا کر مرہم لے آئے اور بچے کو دے کر اُس کے لگانے کی ترکیب دیر تک بتاتے رہے اگر اُنہیں جگر مراد آبادی کا یہ شعر حد درجہ پسند تھا تو ظاہر ہے اسی لئے کہ ان میں جذبۂ ترحم کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔

وہ دلِ جو بے کسوں کے شعلۂ غم میں پگھلتے ہیں
چراغِ کعبہ ہی اللہ کے گھر میں وہ جلتے ہیں

خدا محمد اجمل خاں مرحوم کو اُن کی رحم دلی کا صلہ دے۔

اڑیسا کہانی

سچی راوت رائے

نیلامبر بابو ایک ٹی پارٹی میں شرکت کے بعد گھر لوٹ رہے تھے۔ یونیورسٹی سے کٹک زیادہ دُور نہیں ہے صرف بیس میل یعنی تقریباً آدھ گھنٹے کا فاصلہ ہے پھر بھی اُن کا دل اکتاہٹ سے بھر گیا — راستہ ہے کہ ختم نہیں ہو رہا ہے۔ وہ سوچ رہے تھے — آج کی یہ بھیگی شام فضول مباحثوں کے بجائے کٹک میں اپنے گھر پر بیٹھے ہوئے اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے گزار دی جاتی تو بہتر تھا۔ بے کار بحثیں: مغربی بنگال کے اکثر وزیر اعلیٰ مجرد کیوں ہیں، اُڑیسہ کی نئی وزارت کی پالیسی کیا ہے، اِس نئی وزارت میں گرام سیویکاؤں کا مستقبل کیا ہے، اُن تمام غیر اہم باتوں میں حصّہ لینے کی اُن کی بالکل خواہش نہیں تھی۔ اس کے باوجود، اُن کو تین گھنٹوں تک وہاں بیٹھے رہنا پڑا تھا۔

راستہ بارش کی وجہ سے صاف ستھرا اور چکنا معلوم ہوتا ہے۔ اب بھی پھوار پڑ رہی ہے۔ بھیگے پودوں اور دھان کے کھیتوں پر کار کی روشنی پڑنے پر معلوم ہو رہا تھا جیسے ابرق بکھرا ہوا پڑا ہے۔ ایک پھڑپھڑاتا ہوا اُلّو ایک درخت سے دوسرے درخت کو اُڑ گیا۔ ایک لومڑی بھی راستے کے اِدھر سے اُدھر ہو گئی۔ البتہ دائیں سے بائیں کی طرف۔ نیلامبر بابو اِن سب سے بے تعلق ہیں، ایسی بات نہیں بلکہ اِن سب پر غور کرنے کا موقع نہیں ہے وہ تیزی سے کار چلا رہے ہیں۔

سب سے زیادہ بوریت محسوس ہوتی ہے لیول کراسنگ کے نزدیک۔ کٹک پہونچ کر بھی نہ پہونچنے کی طرح معلوم ہوتا ہے وہ اپنی جبیں سے پسینہ پونچھنے لگے۔

لیول کراسنگ پار ہو کر بخشی بازار پہونچتے وقت رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ تقریباً تمام دکانیں بند ہو گئی ہیں۔ ایک دو دکانیں جو باقی ہیں، وہ اب بند ہونے جا رہی ہیں۔ بتی کے کھمبے تقریباً اندھیرے ہیں۔ اُن کو خیال آیا کہ ایک اخبار لیتے چلیں، کیونکہ ممکن ہے اُن کے نوکر نے آج اخبار نہ خریدا ہو۔ انہوں نے ایک ہاکر کو بُلایا۔ اخبار کے پہلے صفحے پر نظر دوڑاتے ہوئے اپنی جیب ٹٹولنے لگے۔ ایک چونی نکل آئی۔ اُنہوں نے ہاکر کے ہاتھ پر پچیس پیسے کا سکہ رکھ دیا۔ بارہ پیسے رکھ کر اُسے تیرہ پیسے واپس کرنے تھے۔ لیکن ہاکر نے اُنہیں صرف بارہ پیسے واپس کئے ایک دس پیسے کا سکہ ایک دو پیسے کا ریزہ۔ نیلامبر بابو حسب عادت بے توجہی سے تمام پیسے جیب میں رکھنے جا رہے تھے۔ لیکن اُنہیں اچانک خیال آیا پیسے دیکھ لینا چاہئے۔ ہاکر اُس وقت سائیکل سے دس بارہ گز آگے چلا گیا تھا۔ نیلامبر بابو اُسے پیچھے سے بلانے لگے۔ اُس کو ایک پیسے کی کمی کے بارے میں اطلاع دی۔ ہاکر نے جواب دیا کہ اُس کے پاس ایک پیسہ یا تین پیسہ والا سکہ نہیں ہے اس لئے وہ مجبور ہے۔ نیلامبر بابو کو خیال آیا کہ اُن کا نوکر ہر روز اُن سے یہی شکایت کرتا ہوا آیا ہے مختلف

ہاکر اسی طرح ایک ایک پیسہ زیادہ لیتے ہیں اور اُس سے نیلامبر بابو کا کافی نقصان ہوتا ہے۔ وہ اپنے نوکر کی باتوں پر شک کر رہے تھے لیکن آج اُن کا شک دُور ہو گیا ہے۔

انھوں نے فرض کر لیا کہ یہ ایک قسم کی سوچی سمجھی منظم سازش ہے۔ فی اخبار ایک ایک پیسہ زیادہ لینے کا طریقہ ہے۔ وہ زور سے چلانے لگے کہ اُسے ضرور ایک پیسہ دینا ہوگا لیکن ہاکر اپنی جیب سے تمام پیسے نکال کر ہتھیلی پر رکھتے ہوئے دکھانے لگا کہ اُس کے پاس تین پیسے یا ایک پیسے کا کوئی سکہ نہیں ہے لیکن نیلامبر بابو ماننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اُن کا کہنا یہ تھا کہ اُس نے پہلے سے ریزگاری کیوں نہیں رکھی۔ ایسا اس نے قصداً کیا ہے وہ خود اپنی جیب سے مٹھی بھر ریزگاری نکال کر بارہ پیسے ڈھونڈنے لگے۔ لیکن اس کوشش میں اُنہیں کامیابی نہیں ہوئی۔ یا تو دس پیسے یا پانچ پیسے سامنے آرہے تھے۔ اُنہوں نے چراغ پا ہو کر ہاکر کو چار سو بیس ٹھگ وغیرہ کہہ کر اخبار واپس کر دینے کا فیصلہ کیا کیونکہ اُن کی رائے میں اِس طرح کے منظم فریب کے آگے سر جھکانا کسی قوم پرست کے لئے مناسب نہیں۔ اِس سے ملک میں دھوکہ بازی روز بروز بڑھنے لگی ہے۔ اُنہوں نے ہاکر کے ہاتھ سے پچیس پیسے کا سکہ واپس لے کر تیزی سے کار چھوڑ دی۔

کچھ دُور جانے پر اُنہیں ایک اور ہاکر ملا۔ یہ لڑکا نہیں تھا بلکہ کڑیل نوجوان تھا، پینٹ اور ہوائی شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ نیلامبر بابو نے گاڑی روک کر اُس سے اخبار طلب کیا۔ اخبار لے کر جیب سے تمام پیسے نکال کر وہ اُس کا معائنہ کرنے لگے۔ اُنہوں نے دیکھا کہ پندرہ پیسے سے کم اور دس پیسے سے زیادہ اُن کے پاس کوئی سکہ نہیں ہے۔ اُنہوں نے ہاکر کی طرف ایک دس پیسے اور ایک پانچ پیسے کا سکہ بڑھا دیا۔ لیکن ہاکر نے تین پیسے واپس نہ کر کے صرف دو پیسے واپس کر دیئے۔ اس نے لاپروائی سے کہا کہ اُس کے پاس چھوٹا سکہ نہیں ہے نیلامبر بابو کا خون کھولنے لگا۔ یہ سب ہاکر ایک ہی زمرہ میں شامل ہیں۔ سب لوگوں نے منظم طور پر ٹھگنے کا منصوبہ بنایا ہے — اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے۔ سامنے گھر نظر آرہا ہے۔ اس لئے یہی ہے آج کا آخری ہاکر، کسی اور ہاکر کے ملنے کا امکان نہیں۔ نیلامبر بابو نے سوچا، ایک پیسے کا نقصان ہو تو ہو، وہ بالآخر اخبار خرید لیں گے۔ لیکن اُن کی وطن دوستی سدِ راہ ثابت ہوئی۔ سب لوگ اگر اسی طرح ناانصافی کو برداشت کرتے رہیں گے تو ملک سے دھوکا اور فریب دُور کیسے ہو سکے گا؟

اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں ڈھیل دینے کی وجہ سے فریب بادل کی دیوار کی طرح آسمان کو چھونے لگا ہے۔ سارا ملک تباہ ہونے پر ہے۔ اُن کو یاد آیا کہ ناانصافی کرنے والا اور ناانصافی کو سہنے والا — دونوں خدا کے آگے یکساں طور پر گناہگار ہیں۔ اُنہوں نے فیصلہ کیا کہ اس ناانصافی کے خلاف آواز اُٹھنی چاہئے۔ سارے ملک میں کم از کم ایک شخص کو اُس کے خلاف آواز اُٹھانا چاہئے اور وہ شخص ہے ان کی اپنی ذات — یعنی خود نیلامبر داس۔

چاہے وہ ایک پیسہ ہو، لیکن وہ اُسے نہیں چھوڑیں گے۔ ہر روز ایک پیسے کے حساب سے مہینہ بھر میں اُن کا تیس پیسے کا نقصان ہوتا ہے۔ چور بازاری مُلک بھر میں جڑ پکڑ چکی ہے۔ نہیں، نہیں، اِس کا مقابلہ ضرور کرنا ہوگا۔ حالانکہ یہ صرف ایک پیسے کی بات ہے لیکن اس کے پس پردہ بہت بڑا اصُول پنہاں ہے۔ ضرورت پڑنے پر وہ اس اصُول کے تحفظ کی خاطر جان بھی دینے کو تیار ہیں۔ اُن کو پندرہ سال پہلے کلکتہ کے ٹرام کی ہڑتال کے بارے میں یاد آگیا۔ ٹرام کی کمپنی کے صرف ایک پیسہ کرایہ بڑھا دینے کی وجہ سے یہ ہڑتال مہینہ بھر تک چلتی رہی۔ کتنے جلوس نکالے گئے۔ آخر کار کتنی بار گولیاں چلیں۔ کئی لوگ شہید ہوئے۔ اُنہوں نے خود اُن لوگوں کی یادگار میں کئی مرتبہ پُرجوش تقریریں کی ہیں۔ کتنی نظمیں کہی ہیں۔

آج وہ اِس ناانصافی کو کیسے سہہ جائیں گے۔ نیلامبر بابو ایامِ جوانی میں قوم پرست تھے — وہ کسی سیاسی پارٹی کے رکن بھی رہ چکے ہیں۔ کئی جلسوں میں تقریریں کی ہیں۔ کئی بار ہڑتال میں بھی رہنمائی کی ہے۔ اب وہ یہ سب کام چھوڑ کر تجارت میں مصروف ہیں لیکن قوم پرستی اور وطن دوستی کا جذبہ اب بھی اُن کے دل میں موجزن ہے۔ ان کو محسوس ہوا جیسے باپو جی کی طرح ساری قوم کا غم اُن پر سوار ہے۔ ان کی طرح کا ایک خادمِ وطن۔ چور بازاری کی ہمت افزائی کرنا بہت بُری بات ہے۔ صرف بُری ہی نہیں بلکہ بہت بڑا جرم بھی ہے۔

اُنہوں نے زور سے کہا کہ ایک پیسہ ضرور دینا ہوگا۔ ہاکر نے بھی زور سے جواب دیا کہ اس کے پاس ریزہ نہیں ہے اور وہ اخبار واپس

کردیں۔ نیلامبر بابو اس پر الزام لگانے لگے کہ وہ جان بوجھ کر پیسے اپنے پاس رکھ کر دھوکا دے رہا ہے۔ ہاکر نے اپنی پینٹ کی جیب سے سب ریزہ نکال کر رکھ دیا کہ اُس میں تین پیسے کے سکے کی عدم موجودگی چلا چلا کر پکار رہی تھی۔ نیلامبر بابو نے اپنی قمیض کی جیب سے تمام ریزے نکال کر ہتھیلی پر بکھرا کر دیکھا کہ دو پیسے کا سکہ نظر نہیں آرہا ہے۔ نیلامبر بابو نے الزام لگایا کہ اگر سکہ نہیں ہے تو اسے رکھنا چاہئے تھا۔ ہاکر نے جواب دیا کہ وہ بینک نہیں ہے۔ بحث مباحثہ سے بات گالی گلوچ تک پہونچی۔ نیلامبر بابو اُسے نالائق بدمعاش جیسے الفاظ سے نوازنے لگے۔ ہاکر نے بھی جواب دیا کہ جو شخص جو کچھ کہتا ہے وہ خود وہی ہے۔ آخر میں نیلامبر بابو کے ہاتھ سے اخبار چھین کر پیسہ واپس کر کے وہ سائیکل پر چڑھ کر آگے بڑھ گیا۔ کچھ دور جا کر کہنے لگا۔ بڑے آئے اخبار پڑھنے والے، زندگی بھر میں انہوں نے کبھی اخبار پڑھا تھا۔

نیلامبر بابو اس توہین کے لئے تیار نہیں تھے۔ یہ جملہ ان کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ اگر وہ یہ آخری جملہ زبان پر نہ لا کر چلا گیا ہوتا تو گویا ان کی جیت ہوتی اور وہ اس جیت پر فخر محسوس کرتے۔ انہوں نے اپنی کار سے اس ہاکر کا پیچھا کیا۔

کچھ دور جا کر انہوں نے دیکھا کہ ہاکر کھڑا ہو کر سائیکل کی بتی روشن کر رہا ہے۔ نیلامبر بابو اپنی کار سے اُتر کر اُس کے آگے کھڑے ہو گئے۔ اُن کی آنکھیں غصے سے جل رہی تھیں۔ وہ غصے سے آگ بگولا ہو رہے تھے۔ ہاکر اُن کی یہ حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔ اُس نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ نیلامبر بابو گاڑی سے اس کا پیچھا کریں گے۔ اس کی عقل گم ہو گئی۔

راستے پر لوگوں کا ہجوم نہیں تھا۔ چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اُس نے رُکتے رُکتے پوچھا "آپ کیا چاہتے ہیں؟"

نیلامبر بابو نے کہا۔ "اخبار"

"لے جائیے۔"

"پیسہ؟"

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں"

نیلامبر بابو کے غصے پر جیسے اوس پڑ گئی۔ وہ ہاکر کے رویئے میں اس طرح کی اچانک تبدیلی کے لئے تیار نہیں تھے وہ تو باقاعدہ جھگڑا کرنے کے لئے اُس کا پیچھا کر رہے تھے۔ اُن کے ہاتھ میں حساب کا آلہ تھا۔ وہ اس طرح کے اتنی کلائمکس کی توقع نہیں رکھتے تھے۔

اُن کا جوش، غصہ، خون کا دباؤ سب ٹھپ ہو گیا۔ اب تک اُن کی نظر کے سامنے گویا ظلمت کی کالی ردا مسلط تھی، اس میں اچانک جیسے کسی نے جوت جلا دی اور روشنی کی کرنوں سے منجمد ظلمت جیسے رفتہ رفتہ برف کی مانند پگھلنے لگی۔ وہ جیب سے تمام ریزہ نکال کر ہتھیلی پر پھیلا کر دس پیسے اور پانچ پیسے کو جمع کرنے لگے۔ ہاکر بھی اپنی جیب سے ریزے نکال کر پہلے کی طرح تین پیسہ کا سکہ کھوجنے لگا۔

نیلامبر بابو اور ہاکر دونوں بیک وقت ہاتھ بڑھا کر پیسے دینے لینے لگے۔ ہاکر کے ہاتھ کی طرف پیسہ بڑھاتے ہوئے تعجب کے ساتھ نیلامبر بابو کہنے لگے۔ دو پیسے کا سکہ کہاں سے مل گیا۔

ہاکر نے بھی یکساں متعجب لہجے میں جواب دیا "ٹھیک ہے، رہنے دیجئے۔ میں نے بھی تین پیسے کا سکہ ڈھونڈ نکالا ہے۔"

نیلامبر بابو اخبار خرید کر کے گھر لوٹے۔

(ترجمہ: کرامت علی کرامت)

غزل

محمد انوار الحسن نور

یہ عشق کا دستور ہے معلوم نہیں کیوں
مسرور بھی رنجور ہے معلوم نہیں کیوں

اللہ رے عقدہ تری بدمستیٔ نگہ کا
جب دیکھئے مخمور ہے معلوم نہیں کیوں

دیکھے کوئی بھرے کسی بدخو کا تنفر
سایہ سے بھی اب دُور ہے معلوم نہیں کیوں

مختار طبیعت کبھی بن جائے دلِ زار
ہر وقت یہ مجبور ہے معلوم نہیں کیوں

کیا اور کوئی طالبِ دیدار ہے موسیٰ
پھر جلوہ سرِ طور ہے معلوم نہیں کیوں

فرماتے ہیں وہ نورؔ میں خوبی نہیں کوئی
ہر سمت یہ مشہور ہے معلوم نہیں کیوں

سیفی پریمی

"سُنہرے سپنے"

افسانہ نگار : رنبیر سنگھ امر

ناشر :- راشِ بہاری دت، ۲۷۱۱ بی، سیکٹر ۲۲ ڈی، چنڈی گڑھ۔

سائز :- ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۲۰۶

قیمت :- تین روپے ۵۰ پیسے

رنبیر سنگھ امر جانے پہچانے صحافی، شاعر اور افسانہ نگار ہیں۔ "سنہرے سپنے" میں ۷ کہانیاں شامل ہیں جن کا مواد نئے ہندوستان کی زندگی سے حاصل کیا گیا ہے۔ بعض کہانیوں میں رومانی رنگ کی جھلک ہے۔ دوسری کہانیوں کے موضوعات میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی، توہم پرستی، تعلیم، قومی ایکتا، سماجی سدھار اور نوعِ انسانی کی بہبود وغیرہ شامل ہیں جو سُنہرے سپنے کے کہانی کار کی حقیقت پسندی، وطن پرستی اور انسان دوستی کے واضح اشارے ہیں۔

اس مجموعے کی تین کہانیاں اوشا، اچھوت، کایاکلپ زیادہ قابلِ توجہ ہیں۔ اوشا میں تعلیمِ بالغان، اور سوشل ورک کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔ اچھوت کا مرکزی خیال توہم پرستی ہے۔ کہانی کے تانے بانے اور کرداروں کی آویزش سے کہانی کار نے آزاد ہندوستان کے بعض طبقوں میں توہم پرستی کے مرض کی نشاندہی کر کے اُسے دُور کرنے کی راہ بھی دکھائی ہے۔ مگر یہاں سماجی عوامل و محرکات کے بجائے اخلاقی کردار کے ذریعہ زندگی کو بدلنے کی کوشش ملتی ہے یہی کہانی کی کمزوری ہے۔

کایاکلپ میں مقصد کے اعتبار سے بلندی پائی جاتی ہے۔ اس میں آزاد ہندوستان کی صنعتی ترقی، گاؤں اور شہر کی شادابی، ہریجن سدھار، سماجی شعور، پنڈت نہرو اور اچاریہ ونوبا بھاوے کے نظریات کی تصویریں پیش کی گئی ہیں۔

کتاب میں سردار دربارا سنگھ کا پیش لفظ، راش بہاری دت کا مختصر تعارف، شری لیش کا دیباچہ اور حضرت جوش ملسیانی، ڈاکٹر منوہر سہائے انور، علامہ منوّر لکھنوی مرحوم کی قیمتی رائیں درج ہیں۔

"چراغ کا اندھیرا" (مطبوعہ اگست ۱۹۶۹ء)

ناولٹ نگار :- شبنم قیوم

ناشر :- شگفتہ شبنم

سائز :- ۲۰×۳۰/۱۶، صفحات : ۱۴۴

قیمت :- ایک روپیہ پچیس پیسے

شبنم قیوم نے اس ناولٹ میں معاشی استحصال کی زہرناکی کو پیش کیا ہے۔ پلاٹ، سادہ اور کرداروں کی تعداد کم ہے۔ ہیروئن حلیمہ ایک فعّال کردار ہے۔ ہیرو بشیر اس آئینہ کا عکس ہے جو ہیروئن

کی بدلتی ہوئی زندگی کے ساتھ ذہنی طور پر بدلتا جاتا ہے۔ ہیرو کا نفسیاتی تجزیہ قابلِ توجہ ہے۔ ہیروئن کے مکالمے اور اس کی زندگی کے مختلف موڑ کہانی کو تسلسل کے ساتھ آگے بڑھانے میں مدد دیتے ہیں۔ شک، تجسس اور ہمدردی کی مختلف منزلیں اور ان کی کیفیات کے باعث قاری کی دلچسپی قائم رہتی ہے۔

ناول نگار نے حلیمہ کے شوہر بشیر مزدور کا کردار غیر متحرک بنا دیا ہے وہ محض غیر قانونی تقریریں کرتا ہے اور جیل چلا جاتا ہے۔ ان لمبی لمبی تقریروں میں ناول نگار کی آواز اور لہجہ سنائی دیتا ہے۔ بشیر مزدور کا کردار جاندار ہونا چاہئے تھا اور سماجی شعور کا نمایندہ۔

اسپتال سے حلیمہ کا فرار اور بچے کی موت سے ٹریجڈی کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ مگر عدالت میں فلمی انداز پر مقدمے کی سماعت، طویل مکالموں اور بحثوں سے وہ تاثر زائل ہو جاتا ہے۔ ناولٹ میں قصے کا انجام بشیر مزدور کے جیل سے رہا ہونے کی مدت پر منحصر کر دیا گیا ہے یہ ایک بڑی کمزوری ہے۔ غیر ضروری تقریروں اور مکالموں کی بجائے سیاسی و معاشی عوامل و محرکات کی روشنی میں کرداروں کی فعالیت کے ذریعہ نئی زندگی کی بشارت دینا چاہئے۔ ہیرو میں طنز کی جگہ آزادی اور جمہوریت کی تمام برکتوں سے جھلاہٹ ملتی ہے جو منفی رویّہ کا مظاہرہ ہے۔

ناول نگار نے سماج میں نابرابری اور ہیروئن کے کردار میں بچے کی ماتا کو بقائے نسلِ انسانی کا فطری تقاضا دکھا کر ناولٹ کو پسندیدہ بنا دیا ہے۔ اس لحاظ سے قارئین اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھ سکیں گے۔

"میگھ دوت" (مطبوعہ جنوری ۱۹۷۰ء)

شاعر : رانا گنوری

ناشر :- پاور پبلیکیشنز، ۳۹۹۲ بازار چتلی قبر، دہلی ۶

سائز :- ۲۰×۳۰/۱۶ ، صفحات :- ۹۶

قیمت :- دو روپے

کالیداس کو ہفت شہ پاروں کی بنا پر ایک شہرۂ آفاق فنکار کی حیثیت حاصل ہے۔ ان تخلیقات کے تراجم سے مغربی اور مشرقی ادب میں بیش بہا سرمایہ کا اضافہ ہوا ہے۔

"میگھ دوت" کالیداس کی اہم رچنا ہے۔ اس کے متعدد اردو ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ سب سے زیادہ شہرت برجمو دیال عاشق لکھنوی اور علامہ بشیشور پرساد منور لکھنوی کے ترجموں کو حاصل ہوئی۔ گجیت سرن اور سلام مچھلی شہری کی کوششیں یقیناً قابلِ قدر ہیں۔

رانا گنوری کے منظوم ترجمے کی ایک خوبی یہ ہے کہ میگھ دوت کا پورا مواد ایک ہی بحر کے ذریعے اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ شاعر نے مترنم اور مانوس بحر کا انتخاب کیا ہے۔ خارجی شعری عناصر مثلاً قافیہ، وزن روانی، ترنم، وغیرہ پر نظر رکھی ہے۔ تشبیہ اور استعارہ میں دل آویزی ہے۔ تراکیب کی پابندی میں تازگی کا التزام ہے۔ شعری مفہوم یا مواد کی نزاکت کو ذہن میں رکھ کر ذہانت اور ہمدردی کے ساتھ اس کا ابلاغ کیا گیا ہے یعنی شاعر نے ہیئت اور مواد دونوں کے ساتھ انصاف برتنے کی کوشش کی ہے۔ کالیداس کے نازک، اہم، بلند اور گوناگوں مشاہدات کی ترسیل اور تفصیلی معلومات کے ذریعہ قاری کو قدیم ہندوستان کی جغرافیائی کیفیت کے علاوہ ہندوستانی کلچر اور تہذیبی اقدار سے روشناس ہونے کا موقع ملتا ہے۔

"دوسرا شجر" (مطبوعہ جنوری ۱۹۷۰ء) قیمت : تین روپے

شاعر : شجاع خاور

ناشر : اردو پبلیکیشنز ۱۴۸۰ اردو بازار دہلی ۶

شجاع خاور کو نظم نگاری سے مناسبت رہی ہے۔ پہلے مروجہ شعری سانچوں کو اپنے فکر و خیال کے ابلاغ کا ذریعہ بنایا، آزاد نظمیں کہیں۔ اور اب شعری صلاحیت کو علامتی شاعری کے تجربوں کے لئے وقف کر دیا ہے

"دوسرا شجر" ۴۴۶ لائنوں پر مشتمل ایک طویل نظم ہے جس میں ارضی بہشت کی تخریب کے بعد ایک جہانِ نو کی تعمیر کا تذبذب آمیز تصور پیش کیا گیا ہے۔

زیرِ نظر تخلیق میں کسی حد تک شکوہ اور جواب شکوہ کا انداز پایا جاتا ہے۔ بعض شعراء کے معروف مصاریع کا برمحل استعمال ملتا ہے اور معنویت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ ان مصاریع کی نشاندہی واوین کے ذریعہ کر دی گئی ہے۔

بچوں کی پیدائش میں وقفہ کیلئے

فی زمانہ بچوں کی پیدائش اتفاق کی بات نہیں۔ یہ آپ کے اختیار میں ہے۔ نرودھ استعمال کرنے سے آپ کے بچہ تبھی ہوگا جب آپ چاہیں گے، اتفاق سے نہیں۔

بچہ اور ماں کی صحت کیلئے

ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ بچے کو شروع کے تین برسوں میں زیادہ توجہ درکار ہوتی ہے۔ پھر بچے کی پیدائش کے بعد ماں کو اپنی صحت بحال کرنے میں بھی وقت لگتا ہے۔ نرودھ استعمال کرکے آپ اگلے بچے کی پیدائش ملتوی کر سکتے ہیں۔

نرودھ (کنڈوم)، اعلیٰ کوالٹی کے ربڑ سے بنتا ہے۔ دنیا بھر میں لوگ اسے استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ فیملی پلاننگ کا آسان، ومحفوظ طریقہ ہے۔ اس کے استعمال سے صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا۔

نرودھ استعمال کیجئے

فیملی پلاننگ کیلئے
اعلیٰ کوالٹی کے
ربڑ کنڈوم
15 پیسے کے 3
سرکاری امداد سے کم دام

صرف
5 پیسے
خرچ کرکے
آپ
اپنے کنبے
کو
محدود رکھنے
کی طاقت
حاصل کرسکتے ہیں

نرودھ ہر جگہ ملتا ہے:-
پروویژن اسٹور، کرانہ فروش، کیمسٹ، جنرل مرچنٹ، پان فروش وغیرہ کی دوکانوں پر بکتا ہے۔

SEP 78/61

شریمتی اندرا گاندھی راج گھاٹ نئی دہلی میں مہاتما گاندھی کی
سمادھی پر پھول چڑھا رہی ہیں۔

Vol. 29 No. 3 AJKAL (Monthly) October 1970

Edited and Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi.
Printed by Skylark Printers, 11355 Idgah Road, New Delhi-55

آج کل

دسمبر ۱۹۷۰ء ۶۰ پیسے
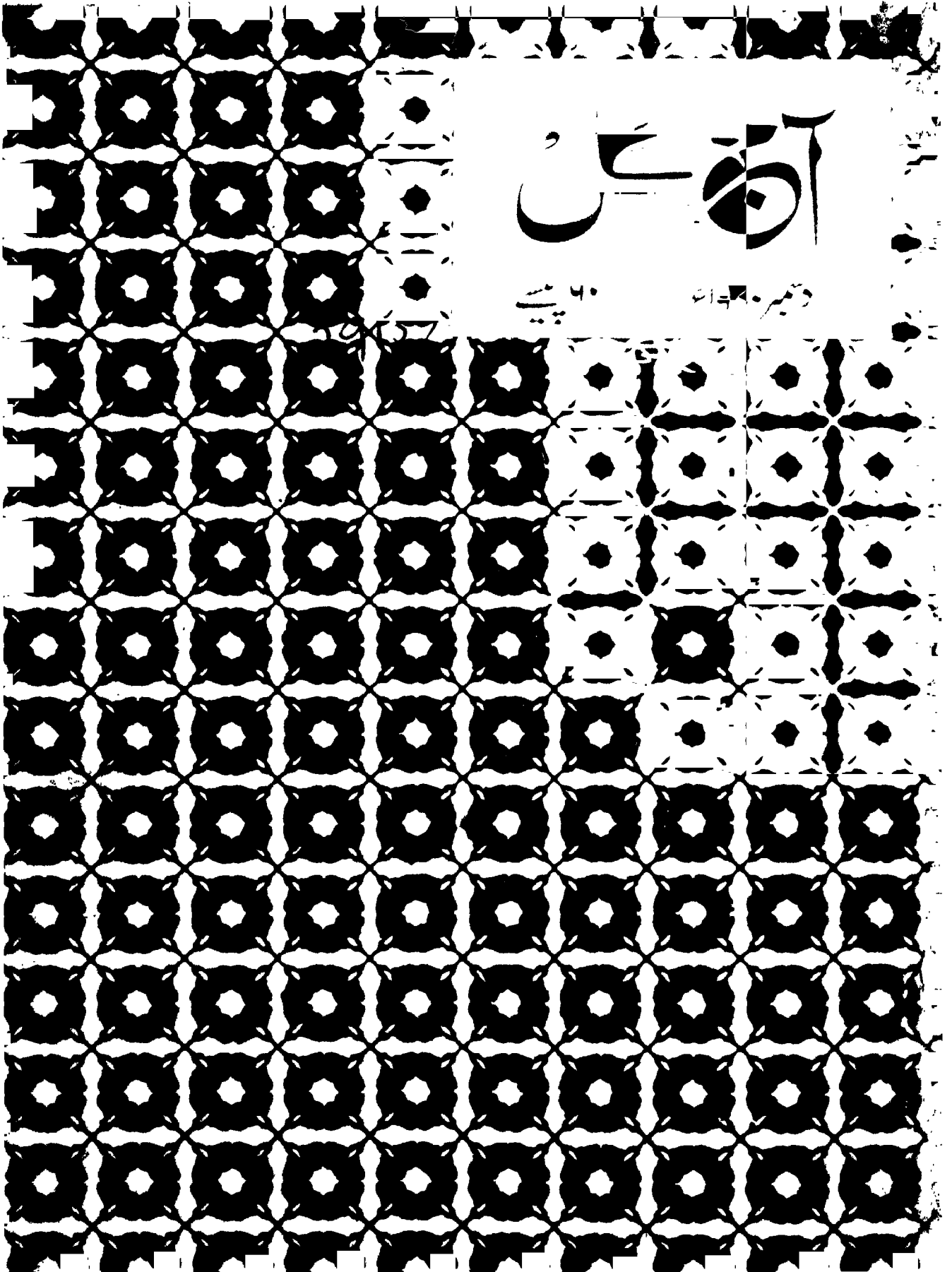
جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کا جشنِ زریں ۲۷ اکتوبر سے ۳۰ اکتوبر ۷۰ء تک منایا گیا۔ آخری دن جلسہ تقسیم اسناد منعقد کیا گیا جس سے صدر جمہوریہ ہند نے خطاب کیا۔ آپ کی
اپنی طرف چیف جسٹس جناب ہدایت اللہ، چانسلر جامعہ اور بائیں طرف جناب پروفیسر محمد مجیب وائس چانسلر جامعہ تشریف فرما ہیں۔

ریاست جموں وکشمیر سے لداخ کے بیس افراد پر مشتمل ایک وفد ہندوستان کی سیر و سیاحت کے لئے آیا تھا ایسے دورے ملک کے مختلف حصوں کے باشندوں کو ایک دوسر
نزدیک لاتے ہیں اور اتحاد اور یگانگت پیدا کرتے ہیں۔ وفد نے نئی دہلی میں مرکزی وزیر اطلاعات ونشریات شری ستیہ نارائن سنہا سے ملاقات کی اور اپنے تاثرات بیا

آجکل

نئی دہلی

شہباز حسین

نند کشور وکرم

شمارہ ۵ — جلد ۲۹

دسمبر ۱۹۷۰ء

اگراہن پوش شک ۱۸۹۲

سالانہ چندہ	ہندوستان میں	سات روپے
غیر ممالک سے	پاکستان میں	سات روپے (پاک)
	۱۰ شلنگ چھ پنس یا ۲ ڈالر	
قیمت فی پرچہ	ہندوستان میں	۷۰ پیسے
غیر ممالک سے	پاکستان میں	۷۰ پیسے (پاک)
	شلنگ یا ۱۵ سینٹ	

سرورق: منوہر جنک

شائع کردہ ڈائرکٹر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

۲۴ اکتوبر ۱۹۷۰ء تاریخ عالم کا ایک اہم دن تھا کیونکہ اُس دن اقوام متحدہ کو قائم ہوئے ۲۵ سال پورے ہو گئے۔ دُنیا کے تقریباً تمام ممالک نے اس عالمی ادارے کی سلور جوبلی کی تقریب منائی ——— ہندوستان بھی اس تاریخی تقریب میں پیش پیش رہا۔ اس موقع پر ریڈیو سے تقریر کرتے ہوئے صدر جمہوریہ ہند شری وی وی گری نے ہندوستانی عوام کو تلقین کی کہ وہ اس بین اقوامی ادارے کو مستحکم بنانے کا عہد کریں تاکہ یہ ادارہ عوام کی سماجی آزادی اور عالمی امن کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہو سکے۔ اس موقع پر دُنیا کے متعدد سربراہ اقوام متحدہ کے تاریخی اجلاس میں شرکت کے لئے نیویارک تشریف لے گئے اور اپنے خیالات و افکار کا اظہار کیا۔ اس تاریخی اجلاس میں ہندوستان کی نمائندگی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے کی اور ۲۳ اکتوبر کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے اُنہوں نے فرمایا کہ نو آبادیاتی نظام کے بچے کھچے آثار کا خاتمہ، نسل پرستی کا قلع قمع، ترکِ اسلحہ بالخصوص ایٹمی ہتھیاروں کا تیاگ اور ٹیکنالوجی کی بنیاد پر قائم نئے نوآبادیاتی نظام کا خاتمہ اس عالمی ادارے کا منتہائے مقصود ہونا چاہئے۔ اس کے ساتھ ہی وزیر اعظم نے چھوٹے اور متوسط درجے کے ممالک کو تلقین کی کہ وہ یکجا ہو کر اس عالمی ادارے کو مستحکم بنائیں نیز طاقتی سیاست سے بالاتر رہ کر اس کے اثر و رسوخ میں اضافہ کریں۔ ہندوستان کی امن پسند پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ ہماری خارجی پالیسی میں جنگ کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ پچاس کروڑ سے زائد لوگوں کو اُن کی آرزوؤں کی تکمیل میں مدد دینے کی ذمہ داری ہمیں امن و آشتی بالخصوص اپنے پڑوسی ممالک سے امن برقرار رکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ وزیر اعظم نے اپنی تقریر میں بڑی طاقتوں کی اس رویے کو ناپسند کیا کہ جب بھی ان طاقتوں نے دیکھا کہ یہ ادارہ اُن کے مقاصد کو پورا کرنے کا وسیلہ نہیں رہا انہوں نے اس عالمی ادارے کو نظرانداز کر دیا ——— علاوہ بریں یہ طاقتیں اپنے حلقۂ اثر میں توسیع کرنے کی انتھک سعی کے سلسلے میں طاقت کا توازن برقرار رکھنے، اثرات کے حلقے قائم کرنے اور بعض ممالک کے اندرونی معاملات میں مداخلت کی ناپسندیدہ پالیسیوں پر عمل کرنے کی کوشش اب بھی کر رہی ہیں اور گزشتہ ۲۵ برسوں میں جو بھی محدود جنگیں ہوئیں وہ انہیں پالیسیوں کا نتیجہ تھیں۔

اس میں شک نہیں کہ بعض عالمی مسائل حل کرنے میں یہ ادارہ ناکام رہا ہے اور بعض جنگوں کو روکنے کے سلسلے میں کوئی موثر قدم نہیں اُٹھا سکا تاہم اس کی کامیابیوں کے مقابلے میں ناکامیاں زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں اور اس نے بنی نوع انسان کی بہتری و بہبود کے لئے غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں اور یہ دُنیا کے تمام ممالک کا اولین فرض ہے کہ وہ اس عالمی ادارے کو اپنا پورا پورا تعاون دیں تاکہ مختلف قومیں ایک دُوسرے کے قریب آسکیں، رواداری اور بقائے باہم کو فروغ حاصل ہو، ان کی بنیاد پر عالمی نظام قائم ہو سکے اور انسان امن اور خوشحالی کے خوشگوار ماحول میں بہتر ڈھنگ سے زندگی گزار سکے۔

---

۲۰ - ۱۷ نومبر کو نئی دہلی میں افریقی اور ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس منعقد ہو رہی ہے جس میں افریقہ اور ایشیا کے ممتاز ادیب اور شاعر حصّہ لے رہے ہیں۔ اس موقع پر ہم افریقی ایشیائی ادیبوں اور شاعروں کی چار نمائندہ کہانیاں اور چند نظمیں پیش کر رہے ہیں۔ اُمید ہے آپ انہیں پسند کریں گے۔

گزشتہ دنوں اُردو کے دو شاعر حقی حزیں اور تیغ الٰہ آبادی ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔ ادارہ اُن کی بے وقت موت پر اپنے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔

xxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxxx

فراق گورکھپوری

(۱۰)

جب میں اپنے لڑکپن کا زمانہ یاد کرتا ہوں تو ایک طرف ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اپنے ہم عمر لڑکوں کی طرح میں بھی ایک لڑکا تھا جو انہیں میں گھلا ملا رہتا تھا لیکن کچھ چیزیں مجھے خاص طور سے اور مستقل طور سے متاثر کرتی تھیں۔ مثلاً رات کی کیفیت، طلوع و غروبِ آفتاب، دریا، ہرے بھرے کھیت، کڑوے تیل سے جلتا ہوا چراغ، لڑکپن کے بازی گاہ، لڑکپن کے دوست، کھیتوں اور باغیچوں میں پانی دینے کا منظر، جانوروں کا اپنے بچوں کو دودھ پلانا، دن کو نہیں بلکہ شام کو چولہوں میں آگ کا روشن ہونا، وہ جانور جن سے ہم مانوس ہوتے تھے یا جن سے ہم کھیلتے تھے، بستر کا سکون، دُنیائے نباتی، رامائن کی کتھا، جس کے متعلق ہوش سنبھالنے کے بعد یہ یقین پیدا ہو گیا کہ اس کی کہانی کا مقابلہ دُنیا کی کوئی کہانی نہیں کر سکتی، مہابھارت کی کتھا، جس کا مقابلہ بھی کوئی رزمیہ کہانی نہیں کر سکتی، بہت سے لوک گیت اور لوک کتھائیں، ہندوستانی موسیقی میں لَے اور سُر کی گھلاوٹ اور ایسی ہی گھلاوٹ اور ایسی ہی چھوٹی بڑی بہت سی چیزیں۔ پریم چند کی کہانیوں نے میرے لڑکپن کو خاص طور سے متاثر کیا۔ مولوی اسمٰعیل کی دینی کتابوں میں غوری اور پرتھی راج کی جنگ کے بیان نے مجھے بہت متاثر کیا۔

ہم لوگوں کے ایک ماسٹر صاحب تھے۔ رات کو جب ہم لوگوں کا سبق ختم ہو جاتا تھا تو وہ تلسی داس کی رامائن کا پاٹھ کیا کرتے تھے۔ میرے اور بھائی بہن تو اُن کا رامائن پڑھنا نہیں سنتے تھے لیکن میں دیر تک ماسٹر صاحب سے رامائن کی کتھا سُنا کرتا تھا، اور بہت متاثر ہوتا تھا۔ میں رام کا پجاری تو نہیں بنا لیکن تلسی داس اور اُن کی رامائن کا پجاری اسی وقت بن گیا اور آج تک ہوں۔ تلسی داس کی رامائن کا شمار دُنیا بھر کی سب سے مقبول و محبوب کتابوں میں ہوتا ہے۔ اس کتاب کا ہر لفظ امرت کا ایک گھونٹ ہے۔ اسے برگد کے ایک ایسے درخت سے مشابہت دی گئی ہے جس کے سائے میں کروڑوں انسانوں کی تھکی ہوئی زندگی سکون پا جاتی ہے۔ تلسی داس کی رامائن میں عجیب قوتِ شفا ہے۔ یہ سب اس زمانے کی بات ہے۔ جب میں صرف نو دس برس کا تھا پہلے پہل میرا داخلہ ماڈل اسکول پھر مشن اسکول اور بعد میں جبلی ہائی اسکول میں کرایا گیا۔ جب میں نویں درجے میں آیا تو انگریزی شاعر گرے (Gray) کی شہرہ آفاق نظم جو Gray's Elegy کے نام سے مشہور ہے، پڑھنے کو ملی اور میں مہینوں تک اُس کے اشعار گاتا اور گنگناتا رہتا تھا۔ نظم طباطبائی کی "گورِ غریباں" اسی انگریزی نظم کا منظوم ترجمہ ہے۔ چودہ پندرہ برس کی عمر میں مجھے سوامی رام تیرتھ کی انگریزی تقریروں کو پڑھنے کا موقع ملا، جن میں ویدانت کے اصول و فلسفہ پر نہایت دل نشیں دلائل تھے۔ ان تقریروں کا مجھ پر بہت اثر ہوا۔ نویں اور دسویں درجے میں مجھ سے زیادہ نمبر پانے والے کچھ ہندو مسلمان لڑکے تھے لیکن جب کلاس ٹیچر نے ضخیم تحریروں کا لب لباب یا نچوڑ انگریزی میں سو سوا سو لفظوں میں لکھنے کو کہا تو درجے بھر میں یہ کام تن تنہا میں کر سکا۔ ۱۹۱۳ء میں سیکنڈ ڈویژن میں میں نے اسکول لیونگ سرٹیفکٹ کا امتحان پاس کیا اور الہ آباد میں میور سنٹرل کالج میں داخلہ لیا۔ جب میں آٹھویں یا نویں کلاس میں تھا تو میرے پھوپھی زاد بھائی راجکشور لال سحر مرحوم مجھ سے بہت گھل مل گئے وہ میرے ہی یہاں رہتے تھے اور راتوں کو دیر تک

گلزارِ نسیم کے اشعار سناتے اور سمجھاتے تھے۔ صدہا اشعار امیر مینائی اور دوسرے شعرا کے بھی سناتے رہتے تھے۔ پھر مجھے چچا کا لکھا ہوا میرے والد یعنی عبرت گورکھپوری کا مسودہ بھی میرے ہاتھ لگ گیا تھا اور اِن واقعات سے اور میری طبیعت اور فطرت کی مناسبت سے مجھے اُردو شاعری میں گہری دلچسپی ہوگئی۔ اس زمانے کا واقعہ مجھے ابھی تک یاد ہے۔ راجکشور بھیا مرزا نہیم گورکھپوری سے اصلاح لیتے تھے۔ ایک شام کو انہوں نے داغ کا ایک شعر مجھے سُنایا یہ کہہ کر کہ اُن کے اُستاد مرزا نہیم اس شعر کا مطلب نہیں لگا سکے تھے۔ وہ شعر یہ تھا۔

دل ہی تو ہے نہ آئے کیوں دم ہی تو ہے نہ جائے کیوں
مجھ کو خدا جو صبر دے تجھ کو حسیں بنائے کیوں!

ابھی میری عمر ہی کیا تھی لیکن شعر کا مطلب میری سمجھ میں آگیا، جیسے میں نے یوں سمجھا دیا۔ عاشق معشوق کے برتاؤ سے نہایت بیزار ہو چکا ہے۔ بچھڑنے کے لئے معشوق نے ظرافتاً کہا۔ خدا تمہیں صبر دے! عاشق نے جواب دیا صبر کی بات تو ٹھیک ہے، خدا نے تم کو اتنا حسین کیوں بنایا ہے جس کی وجہ سے کہنا پڑتا ہے کہ دل ہی تو ہے نہ آئے کیوں، دم ہی تو ہے نہ جائے کیوں۔ راجکشور بھیا نے مجھے گلے سے لگا لیا۔

میور سنٹرل کالج کے ایف اے کلاس میں تین زبردست ہم جماعتوں کا ساتھ ہوا۔ امرناتھ جھا، ملّا رام تیواری اور صحت بہادر۔ یہ سب فرسٹ ڈویژنر تھے اور میں معمولی سیکنڈ ڈویژنر لیکن سہ ماہی امتحان میں مجھے اتنے نمبر ملے کہ میں بھی حلقہ خاصانِ خاص میں شمار کیا جانے لگا اور پروفیسروں کا مرکزِ توجہ بن گیا۔ فارسی پڑھانے کے لئے اسی زمانے میں پروفیسر مہدی حسن ناصری کا تقرر ہوا اور وہ مجھ پر غیر معمولی طور پر مہربان رہنے لگے۔ تاریخ کے مضمون میں لین پول کی کتاب اورنگ زیب پر داخلہ نصاب تھی۔ اتنی خوبصورت انگریزی میں یہ کتاب لکھی گئی تھی کہ ڈیڑھ سو صفحوں کی پوری کتاب مجھے قریب قریب از بر ہوگئی۔ اس کے جملوں کے مدوجزر میرے دماغ کی رگ رگ میں اُتر گئے۔ دوسرا مضمون جو مجھے بہت مرغوب تھا وہ منطق تھا ۔ Deductive Logic میں پروفیسر رے کی کتاب اور Inductive Logic میں آگرے کے ایک مشہور انگریز پروفیسر کے نوٹ نے مجھے گہرے طریقے پر سوچنا سکھایا اور میرے اندر فلسفیانہ رجحانات کو بیدار کر دیا۔ انگریزی میں دو سبق ایسے پڑھنے کو ملے جن میں زبان و بیان، فصاحت و بلاغت عروج کی منزلیں طے کرتے ہوئے نظر آئے۔ ایک سبق تھا رسکن کے مضامین Kings Treasures اور اسی کا دوسرا حصہ Queen's Garden اور دوسرا سبق تھا لارڈ مارلے کا لیکچر The Study of Literature یہ دو سبق ایسے تھے جو انگلینڈ اور امریکہ کے بھی ایف کلاس کے طلبہ کو لوہے کے چنے ناکوں چبوا دیتے۔ ہم لوگ انہیں سمجھتے تو کیا لیکن کبھی کبھی جملوں اور فقروں کی موسیقیات سے جھوم ضرور اُٹھتے تھے۔

ایک کتاب کا ذکر کرنا میں بھول گیا۔ مجھے کالج سے پھر اسکول کے نویں دسویں درجے تک جانا ہوگا وہ کتاب تھی Smile's Self Help اور اُن کی دوسری تصنیفیں Character اور Duty. پہلی کتاب نے مجھے اِس لئے بہت متاثر کیا کہ اس کی انگریزی میں دلکش زورِ بیان تھا۔ اس زمانے میں Smils کی کتابیں لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں دنیا بھر کے نوجوان پڑھتے تھے۔

میں ابھی ایف اے ہی میں تھا کہ میری شادی ہوگئی یہ شادی اتنی غلط ہوئی کہ میری زندگی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُجڑ گئی۔ میں شادی کو ایک سچے جیون کا پانا یا زندگی کا سہارا سمجھتا تھا۔ نہ کہ کوئی ایسا لباس یا گھر جسے تبدیل کیا جا سکے۔ میری دوسری شادی نہ کرنے کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ میں کسی ایسے گھرانے کی لڑکی کو بیوی بنا کر لانا نہیں چاہتا تھا جس گھرانے کے لوگ یہ جان کر اپنی لڑکی مجھے دیں کہ میری پہلی بیوی ابھی زندہ ہے۔ شادی کے بعد مجھے سال بھر تک نیند نہیں آئی اور بھیانک اور جان لیوا طرح کی سنگرہنی کا روگ ہوگیا۔ اسی کرب اور ناقابلِ برداشت حالت کے عالم میں میں نے ایف اے کا امتحان دیا اور سارے صوبہ میں میری ساتویں پوزیشن آئی۔ میں جب اس معمے پر غور کرتا ہوں کہ ناقابلِ برداشت غم و غصے کے عالم میں علمی مشاغل کے لئے میرے حواس کیسے قائم رہ گئے تو اس نتیجہ پر پہونچتا ہوں کہ بچپن سے ہی جو شغف مجھے علم کے ساتھ تھا اسی نے مجھے یا میرے دماغ کو بچایا۔ بی اے میں ایک سال کے لئے مجھے اپنی تعلیم کو ملتوی کرنا پڑا۔ اور بنارس جاکر سنگرہنی کا وہ علاج کرنا پڑا جسے کلایا

کلپ کہتے ہیں۔ ۱۹۱۸ء میں میں بی اے پاس ہوا اور صوبے بھر میں میری پوزیشن چوتھی تھی۔ تیسری پوزیشن ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی تھی۔ اُن دنوں صرف الہ آباد یونی ورسٹی تھی اور صوبے کی دوسری یونی ورسٹیاں وجود میں نہیں آئی تھیں۔

بی اے کا نتیجہ نکلنے سے پہلے ہی میرے والد صاحب منشی گورکھ پرشاد عبرت مرض الموت کا شکار ہو چکے تھے۔ ۱۸ جون ۱۹۱۸ء کو میں دہرہ دون میں اُنہیں علاج کے لئے لے گیا تھا۔ جہاں اُن کا انتقال ہو گیا اس سانحہ کے برسوں بعد میں شاعری شروع کر چکا تھا، مجھے ایک واقعہ یاد آیا۔ جب میرے والد کا انتقال علی الصباح ہوا تو دہرہ دون کے جس مکان میں ہم لوگ ٹھہرے ہوئے تھے، اُس کے باغ میں ہزار ہا رنگا رنگ خوش الحان پرندوں نے نغمہ سرائی کی تھی، اور میری ماں نے کہا تھا کہ تیرا باپ ایک نرمل آدمی تھا یعنی جس کے دل میں چھل کپٹ نہ ہو، اسی سے پردیس کی موت کے باوجود جائے مرگ اتنا سہانا نظر آ رہا تھا۔ مسافر سو گیا کیا جاگ اٹھی تقدیر منزل کی۔"

دہرہ دون میں جہاں ہم لوگ ٹھہرے ہوئے تھے وہاں سے ہمالیہ کا وہ حصہ جہاں مسوری آباد ہے صاف نظر آتا تھا۔ اپنی ماں کی بات اور والد کی یاد سے متاثر ہو کر برسوں کے بعد ایک رُباعی کہی۔

غفلت کا حجاب کوہ و دریا سے اُٹھا
پردہ فطرت کے روئے زیبا سے اُٹھا
کس درجہ سہانا ہے سحر کا منظر
پچھلے پہر فراق کون دُنیا سے اُٹھا

دہرہ دون سے اب ہم لوگ گورکھپور پلٹ آئے۔ اتفاق سے اُن کی رحلت سے کچھ پہلے ہی میری چہیتی چھوٹی بہن کی شادی طے ہو چکی تھی۔ ماتم میں ڈوبی ہوئی حالت کے باوجود مجھے شادی کا انتظام بھی کرنا تھا۔ روپیوں کی فراہمی کے لئے بہت دوڑ دھوپ کرنا پڑی۔ شادی کے بعد ہی میرا بی اے کا نتیجہ نکلا۔ اور ڈپٹی کلکٹری کے انٹرویو کے لئے مجھے نینی تال بلایا گیا۔ یہ بات اتنے آناً فاناً یوں ہوئی کہ فلسفے کے میرے معلم پروفیسر رینڈ فروڈ نے گورکھپور میں مجھے خط لکھ کر میری عرضی اپنے پاس منگوائی اور ملازمت دینے والے بورڈ کے ممبروں کو میرے لئے پہلے سے راضی کر لیا تھا۔ نینی تال سے میں پھر گورکھپور پلٹ آیا۔ کچھ دنوں کے بعد چونکہ ابھی پہلی عالم گیر جنگ کا زمانہ تھا، I.C.S. کے لئے صرف انٹرویو سے کچھ لوگوں کو منتخب کرنے کی ضرورت حکومتِ ہند کو ہوئی۔ یہ انٹرویو لکھنؤ میں ہوا جس میں مجھے پہلی پوزیشن ملی۔ کچھ ہی دنوں بعد مہاتما گاندھی نے تحریکِ آزادی شروع کر دی تھی۔ میں زندگی سے بیزار ہو چکا تھا اور بہت بد دل تھا۔ میں نے سوچا کہ والد نے جو جائداد چھوڑی ہے اسے بیچ کر خاندان کا گزارہ ہو، اور میں تمام سرکاری عہدوں کو چھوڑ کر جنگ آزادی میں شریک ہو جاؤں۔

گورکھپور میں والد کے زمانے کے قرضے کی ادائیگی اور گھر کے انتظام کے لئے مجھے مہینوں ٹھہرنا پڑا۔ یہی زمانہ میری شاعری کے آغاز کا ہے۔ میں نے کیا سوچ کر شاعری شروع کی اور شاعری کے متعلق میرا نظریہ کیا رہا ـــــ اس پر جلد ہی کچھ روشنی ڈالوں گا۔

جنگ آزادی میں شرکت کے جرم میں مجھے ڈیڑھ برس کی سزائے قید ملی اور دوسرے سیاسی قیدیوں کے ساتھ آگرہ جیل بھیج دیا گیا۔ جہاں سے ایک برس کے بعد ہم لوگ لکھنؤ جیل میں منتقل کر دئیے گئے۔ آگرہ جیل میں جو قابلِ ذکر حضرات میرے ساتھ قید تھے اُن میں بعض کے نام یہ ہیں مسٹر جوزف ایڈیٹر انڈپنڈنٹ، مسٹر رنگا اسسٹنٹ ایڈیٹر انڈپنڈنٹ، مہادیو ڈیسائی خواجہ عبدالمجید، رائے بریلی کے بزرگ میر صاحب جناب سید سلطان پور کے بابو گنپت سہائے، ایٹہ کے سب سے بڑے وکیل جنھیں ہم لوگ بھائی جی کہتے تھے ـــ اور ہندی شاعر اور ہیکلک پانڈے بیجن شرما آگرچی۔ مولانا عارف ہسوی صاحب کی ایما سے ہم لوگ کچھ لکچر بھی کرا لیتے تھے اور ہفتہ وار مشاعرہ بھی ہونے لگا تھا۔ ہم لوگوں کے ساتھ ہندی کے وہ شاعر بھی موجود تھے جن کی یہ نظم بہت مشہور ہے اور جو انہوں نے جیل ہی میں کہی تھی ـــ جھنڈا اونچا رہے ہمارا! مجھے جیل میں ذاتی اخراجات کے لئے کچھ روپے کی ضرورت پڑ گئی۔ میں گھر والوں کو زحمت نہیں دینا چاہتا تھا۔ ہندی رسالوں کے لئے بعض مضامین لکھ کر میں نے منشی پریم چند کے پاس بھیج دیئے۔ اُنہوں نے ان رسالوں سے میرے پاس روپے بھجوا دیئے۔ جیل میں ہی مجھے اپنے چھوٹے بھائی کی وفات کی اندوہناک خبر ملی۔ یہ تین برس سے تپِ دق میں مبتلا تھے، بھوالی کا قیام، کرنل اسکاٹ اور حکیم اجمل خاں کا علاج اُنہیں بچا نہیں سکا۔ میں نے اس جوان مرگ بھائی کا ایک مرثیہ کہا جو میرے مجموعہ "روحِ کائنات" میں شامل ہے۔ جب میں جیل سے چھوٹ کر گھر آیا تو میں نے اس چھوٹی سی کاپی کو تلاش کیا جس میں گیت

کے ایک باب کا میں نے منظوم ترجمہ کیا تھا۔ ترجمے کے اوراق کسی نے پھاڑ لئے تھے۔ اور اس کاپی میں میرے چھوٹے بھائی کا Temprature Chart درج تھا۔ یہ چارٹ مجھے اپنے ضائع شدہ شعری کاوش سے زیادہ عزیز ہو گیا اور آگے میں نے اپنے بھائی کی یادگار سمجھا۔

اسی زمانے میں میری ملاقات مجنوں گورکھپوری سے ہوئی۔ اور ہم دونوں بہت جلد ایک جان دو قالب بن گئے۔ پریم چند سے پہلے کی ملاقات تھی میں، مجنوں اور پریم چند اکثر یکجا ہو جاتے تھے اور وہ لمحے بہت قیمتی ہوتے تھے۔ میں نے انگریزی ادب کی تاریخ پر کچھ قیمتی کتابیں منگا رکھی تھیں اور اس سے متعلق مختلف تنقیدی کتابیں بھی فراہم کر لی تھیں۔ میں ان کتابوں کو برابر زیرِ مطالعہ رکھتا تھا۔ ہارڈی، ڈکنس، سر والٹر اسکاٹ، تھیکرے اور جارج ایلیٹ کی تصانیف ورڈز ورتھ، کیٹس اور شیلی کی انگریزی نظمیں اکثر زیرِ مطالعہ رہتی۔ میں ان دنوں اُردو میں شعر تو کہتا تھا لیکن شاعری کے بارے میں سوچتا بھی بہتا تھا۔ میں نے اُردو شاعری میں بہت سے محاسن کو محسوس کیا لیکن مجموعی حیثیت سے ایک آسودگی کا بھی احساس ہوتا تھا مجھے اس بات کا تحت الشعوری طور پر شدید احساس ہونے لگا کہ خیر و برکت کے وہ عناصر جنہوں نے سنسکرت ادب، قدیم ہندی ادب اور ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادب کو بسا اوقات امرت بانی بنا دیا ہے، اُردو ادب میں اُن کا قریب قریب فقدان ہے اگرچہ خواجہ میر درد، شاہ تراب، آسی غازی پوری اور مسلمانوں میں کئی سادھو سنت اور فقیر روحانیت و پاکیزگی کے حامل بہت سا کلام چھوڑ گئے ہیں۔ ہندوستان کی اور زبانوں کا ادب تصباتی زبان میں ہے، جس میں ایک بھولا پن ہوتا ہے اور سادگی اور سبزگی۔ اُردو زبان وہ تنہا ہندوستانی زبان ہے، جس کی ساخت و لب و لہجہ سو فیصدی شہری ہے۔ شاید اسی وجہ سے اُردو میں ہم کبیر، سور اور دوسرے ویشنو شاعروں کا لب و لہجہ آسانی سے پیدا نہیں کر پاتے۔ ہندی کے لوک گیت اُردو شاعری سے بسا اوقات زیادہ دلکش معلوم ہوتے ہیں شاید اس لئے کہ ان میں سنگیت کا عنصر غالب ہوتا ہے۔

اُنہیں دنوں میرے بے سر و سامان مکان میں پنڈت جواہر لال نہرو مہمان ہوئے۔ انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں دیکھ لیا کہ میں سخت مالی پریشانیوں میں گرفتار ہوں۔ انہوں نے فوراً مجھ سے کہا کہ تم الٰہ آباد آکر آل انڈیا کانگرس کمیٹی میں انڈر سیکریٹری کی حیثیت سے دفتر سنبھال لو۔ مولانا محمد علی کانگرس کے صدر تھے امتحاناً مجھ سے کہا گیا کہ اُن کی دو گھنٹے کی اُردو تقریر کی انگریزی رپورٹ اخباروں کے لئے تیار کر دوں میری رپورٹ کی صداقت اور اختصار سے مولانا بہت خوش ہوئے۔ پھر بھی میری رپورٹ تقریباً دو ہزار الفاظ پر مشتمل تھی مولانا نے میرے تقرر کی حامی بھر لی اور مجھے ڈھائی سو روپیہ ماہانہ تنخواہ پر ملازمت مل گئی میں اس عہدہ پر چار برس تک قائم رہا۔ اس دوران میں نے شعر زیادہ نہیں کہے۔ اچھی کتابوں کے مطالعہ میں وقت صرف کرتا تھا۔ ایک کتاب جس نے مجھے بہت متاثر کیا اور جس کا گہرا اثر پچاس برس گزر جانے کے بعد اب بھی ہے وہ تھی

Prince Kropotkin's . Mutual Aid

اس کتاب نے زندگی اور انسانیت سے متعلق مرکزی ایمان عطا کیا۔ اُردو کے کچھ مضامین بھی میں نے اسی زمانے میں لکھے جو مشہور رسائل میں شائع ہوئے۔ دفتر میں کام زیادہ نہیں تھا جسے میں گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں پورا کر لیا کرتا تھا۔ باقی وقت لکھنے پڑھنے میں ہی کاٹ دیتا تھا۔ اس زمانہ میں جو اشعار میں نے کہے، اُن میں کئی شعر بہت مقبول ہوئے۔ رواروی میں دو شعر یاد آ رہے ہیں۔

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں
خیر تم نے تو بے وفائی کی

غرض کاٹ دیئے زندگی کے دن اے دوست
وہ تیری یاد میں ہوں، یا تجھے بھلانے میں

کچھ اور بتانے سے پہلے مودبانہ یہ گزارش کر دینا چاہتا ہوں کہ میری ادبی صلاحیتیں ہشت پہلو رہی ہیں۔ تقریباً ایک ہزار صفحات پر تین جلدوں میں میرے انگریزی کے مضامین پھیلے ہوئے ہیں۔ قریب قریب اتنی ہی ہندی مضامین کی ضخامت ہوگی اور اتنی ہی میری اُردو نثر بھی ہوگی۔ شاعری کے علاوہ میں نے ہندی میں کچھ کہانیاں بھی لکھی تھیں۔ جو الٰہ آباد یونی ورسٹی کے بی اے ہندی کورس میں شامل ہو گئی تھیں۔ ایک انگریزی کہانی کو میں نے اُردو ڈرامے کی شکل میں پیش کیا۔ انگریزی کے کئی مضامین کے ہندی ترجمے شائع کئے ـــــ ہندوستانی اقتصادیات پر اُردو میں ایک طویل مضمون لکھا۔ ہندی میں مابعد الطبعاتی مضمون اس موضوع پر لکھا کہ 'ترقی کیا ہے'۔ جمالیات پر انگریزی میں ایک چھوٹی سی کتاب لکھنے کا ارادہ تھا۔ جسے میں پورا نہ کر سکا۔ اس شالی شہر

کو مرکزی موضوع بنا کر ایک ناول لکھنا شروع کیا تھا لیکن اس کام کو بھی آگے نہ بڑھا سکا۔ ٹیگور کی تحریروں اور تقریروں کی رپورٹیں خاص طور پہ مجھے اس زمانہ میں متاثر کرتی ہیں۔ گیتانجلی میرے لئے نہایت موثر و دلکش تصنیف تھی جس کا تیس برس بعد میں نے اُردو میں ترجمہ کیا اور ساہتیہ اکیڈیمی کے لئے ٹیگور کی ۱۰۱ نظموں کا اُردو ترجمہ کیا جو ساڑھے چار ہزار مصرعوں پر محیط ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ بسا اوقات ٹیگور کی نظمیں، خاص کر قدرے طویل نظمیں اپنی چُستی کھو بیٹھتی ہیں۔

کانگرس کا دفتر ۱۹۲۷ء میں مدراس میں منتقل ہوا، اسی زمانہ میں پنڈت جواہر لال نہرو عالمی سیاست سے اپنی واقفیت کو مکمل کرنے کے لئے یورپ چلے گئے، جہاں سے انہوں نے متعدد خطوط مجھے روانہ کئے۔ کاش میں ان خطوں کو ضائع نہ کرتا! پنڈت موتی لال نہرو نے مجھے مشورہ دیا کہ مدراس نہ جاؤ اور میور کالج میں اپنے قدیم، مربی و مہربان اعلیٰ پروفیسروں نے مجھے ایف اے کے درجے پڑھانے کے لئے لکھنو کرشچین کالج میں ملازم رکھا دیا، حالانکہ ابھی میں بی اے پاس تھا۔ لکھنو سے سناتن دھرم کالج کان پور میں انگریزی اور اردو پڑھانے کے لئے بلا لیا گیا۔ یہیں سے میں نے انگریزی میں ایم اے کا امتحان پاس کیا۔ اور میں پہلا امیدوار تھا، جسے آگرہ یونی ورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کے امتحان میں فرسٹ ڈویژن ملا۔ میں فوراً الہ آباد یونی ورسٹی میں انگریزی کا لکچرر مقرر ہو گیا اور تیس برس انگریزی ادب کی تعلیم دے کر ۱۹۵۸ء میں ریٹائر ہوا۔

یونی ورسٹی میں ۲۸ برس کا زمانہ میری شعر گوئی کی پوری نشو و نما کا زمانہ ہے۔ ۱۹۳۶ء میں مولانا نیاز فتح پوری مرحوم نے "نگار" میں مجھ پر ایک سیر حاصل تنقیدی مضمون لکھا جس نے ہندوستان بھر کے ادبی حلقوں کو میری طرف متوجہ کر دیا اس عرصہ میں تقریباً سات سو رباعیاں میں نے تصنیف کیں جن میں "روپ" کی رباعیاں بھی شامل ہیں۔ علاوہ غزلوں کے میں نے جو اُردو نظمیں اس دوران میں کہیں، ان میں چار پانچ ہزار اشعار ہوں گے۔ غزلیں قریب چار سو کے اس عرصہ میں میں نے کہیں بہت سے لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ اکثر میری غزلیں بہت طویل ہو جاتی ہیں۔ میں طویل غزلیں قادر الکلامی، مشاقی اور اُستادی دکھانے کے لئے نہیں کہتا بلکہ جس موڈ میں کوئی غزل شروع ہوتی ہے اسی موڈ کی مختلف جھلکیاں میرے سامنے آتی جاتی ہیں۔ اور جب تک یہ جھلکیاں نظر آتی جاتی ہیں اشعار ہوتے جاتے ہیں۔ میں اس حقیقت کا بھی قائل ہوں کہ غزل کو مختصر ہی ہونا چاہئے۔ اس امر پر گفتگو کرتے ہوئے ایک بار میرے دوست مجنوں نے کہا تھا کہ تم نظم گو پیدا ہوئے تھے۔ طبیعت کے انتشار کی بدولت غزل گو ہو بیٹھے اس بنا پر تمہاری غزلیں طویل ہو جاتی ہیں۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ غزل کہتے وقت میں بر تھ کنٹرول کو عمل میں نہیں لا سکا ہوں۔

یونی ورسٹی کی طویل ملازمت سے متعلق کچھ باتیں نہایت اختصار سے آگے بتاؤں گا۔ پروفیسر کی زندگی شروع ہونے سے سات آٹھ برس پہلے کے دو واقعات یادداشت میں عود کر آئے۔ ایک بار مجنوں اور پریم چند میرے گاؤں میں ساتھ ساتھ میرے گھر میں مقیم تھے۔ ایک افسانے کا پلاٹ میرے ذہن میں آیا جسے میں نے ان دونوں دوستوں کو سنا دیا۔ کچھ دنوں بعد کہانی کی شکل میں مجنوں کے نام سے "گہنا" کے عنوان سے اُردو میں میرا یہ پلاٹ شائع ہوا ساتھ ہی پریم چند کے نام سے یہی کہانی " आभूषण " کے نام سے شائع ہوئی۔ بہت سے لوگوں نے حیرت ظاہر کی کہ حقیقتاً یہ پلاٹ مجنوں کا ہے یا پریم چند کا۔ مجنوں نے پریس میں اعلان کر کے سب کی تشفی کر دی کہ پلاٹ نہ اُن کا ہے نہ پریم چند کا بلکہ دونوں کے دوست رگھوپتی سہائے فراق کا ہے کیا میں اس امر پر فخر کر سکتا ہوں کہ دو چوٹی کے کہانی کاروں نے قریب قریب لفظ بہ لفظ میرے بتائے ہوئے پلاٹ کو اپنا لیا؟ دوسرا واقعہ ان دنوں کا ہے جب میں کانگرس کا ایک کارکن تھا۔ گورکھپور سے ہم کئی لوگ گورکھپور ضلع میں واقع کانگرس کے کام سے گولا بازار میں جا کر ایک چھوٹے دھرم شالے میں ٹھہرے۔ گولا بازار مہاجنوں کی ایک بہت بڑی منڈی ہے۔ دھرم شالہ میں ہم لوگوں کو معلوم ہوا کہ اس کے تہ خانے میں ایک بابا جی آ کر ٹھہرے ہیں وہ پچیس برس سے مون دھارن کئے ہیں۔ ہم سب کو اشتیاق پیدا ہوا اور ہم لوگ تہ خانے میں بابا جی کو دیکھنے گئے، جو سوالات تو زبانی سُن لیتے تھے اور جواب ایک سلیٹ پر کھڑیا سے لکھ دیتے تھے۔ گاندھی جی کا نعرہ "ایک سال کے اندر سوراج" ابھی ہم لوگوں کے ذہنوں پر مسلط تھا لیکن اس کی تکمیل میں کچھ دیر ہو رہی تھی۔ ہمارے اس سوال کا کہ ہندوستان کب تک آزاد ہوگا، بابا جی نے یہ جواب لکھا "ابھی بیس برس بعد"۔ اس وقت ہم سب کو کچھ مایوسی سی ہوئی۔ لیکن بیس تو نہیں تئیس چوبیس برس بعد ۱۹۴۷ء میں ہندوستان

آزاد ہوا۔

یونی ورسٹی کے زمانے میں میں نے کم وبیش گہرے طور پر جن کتابوں کا مطالعہ کیا اُن میں چند کے نام لگے ہاتھوں بتا دیتا ہوں۔

Bergson's Creative Evolution

Benjamin Kidd's Social Evolution

Principles of Western Civilization

Edward Carpenter's Civilization, its cause and cure

My Days Dream اور انیسویں صدی میں لکھے ہوئے مشہور ترین انگریزی ڈرامے Hamingway's Farewell to Armies مشہور فرانسیسی ناول کا انگریزی ترجمہ All Quiet on the Western Front آنند کمار سوامی کی شہرہ آفاق انگریزی تصانیف Chesterton, H.G. Wells G.B. Shaw کی تصانیف

۲۔ بنے کمار سرکار، رادھا کمد مکرجی اور کچھ دیگر مشاہیر کی تصنیفیں۔ پوری فہرست بہت لمبی ہو جائے گی۔

مندرجہ بالا کتابیں خالص ادبی موضوعات پر نہیں تھیں اُن کے موضوعات ثقافتی اور فکریاتی تھے۔ انگریزی ادب کی بہت سی دلکش تصویریں نظر سے گزرتی رہیں انگریزی شاعری ۳۰۔۴۰ ہزار صفحات تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس دشت کی سیاحی کون کرتا۔ اس لئے انگریزی کے نثری اور شعری ادب سے کافی واقفیت حاصل کرنے کے لئے میں نے چار سلسلہ کتب کا سہارا لیا کیولر کوچ کی

The Oxford Book of English Verse

The Oxford Book of English Prose

اور Word's English Poets اور کریک کی مرتب کردہ پانچ ضخیم جلدوں میں Prose Selections۔ یہ سب تو ایک جھلک ہے ان کتابوں کی، جن کا غائر مطالعہ میں پروفیسری کے دوران میں کرتا رہا۔ انگریزی ادب کی تعلیم دینے میں میری یہ کوشش رہی کہ کلاس کو انگریزی ادیبوں کے وہ محسوسات اور وجدانی کیفیات محسوس کرا دوں، جن کی حامل ان کی تخلیقات تھیں اس کے لئے ایک غیر زبان (انگریزی) میں مجھے غیر معمولی سادگی کرنا پڑتی تھی میرا اصول اور عقیدہ تھا کہ معلم کا سب سے اہم فرض طالب علموں کو کچھ رسمی اور اوپری باتیں بتا دینا یا یاد کرا دینا نہیں ہے۔ بلکہ اُن کے ذہن میں اسباق میں جو داخلی تجربات ہیں، انھیں اتار دینا ہے۔ میں نے اس عمل کا نام انگریزی میں Felt Teaching رکھا۔ میں نے یونی ورسٹی میں یہ دیکھا کہ تھوڑے ہی معلم اپنے کلاسوں کو سوچنے اور محسوس کرنے کی دولت دے پاتے ہیں۔ میں نے ایک بات اور یونی ورسٹی میں دیکھی کہ ٹیچروں میں باہم بیگانگی اور بے تعلقی رہتی تھی۔ ہر ایک ٹیچر اپنا موضوع بُرے بھلے ڈھنگ سے کلاس کو پڑھا دیتا تھا۔ علوم کے باہمی ربط و تعلق کا اندازہ نہ ٹیچر کو ہوتا تھا نہ کلاس کو۔ یونی ورسٹی کی تعلیم ایک پوری کڑی بن ہی نہیں پاتی تھی۔ ٹیچر جب آپس میں ملتے یا کہیں آ بیٹھتے تو مختلف مضامین کے ٹیچر ہوتے ہوئے آپس میں کسی علمی موضوع پر گفتگو کر ہی نہ پاتے۔ یہ خطرناک بے نیازی طلبہ کے سروں میں بھی سمائی ہوئی تھی۔ تمام علوم کی آفاقیت اور ہم آہنگی کے احساس کی پرچھائیں بھی نہ ٹیچروں کے دل و دماغ پر پڑتی تھی نہ طلبہ کے۔ دُنیا کے کلچر اور ہندوستان کے کلچر پر ٹیچروں میں پانچ منٹ تک گفتگو ناممکن تھی اور ہے۔ بہت کم ٹیچروں کو میں نے طالب علموں کے لئے ہمدرد پایا۔ بہت کم ٹیچروں کو میں نے اس امر کا متمنی دیکھا کہ طالب علم اندر سے کچھ بن جائیں یا ہو جائیں یونی ورسٹی کی تعلیم بڑی حد تک دفتروں کا رسمی روزانہ کاروبار بن کر رہ گئی تھی بہت کم ٹیچر ایسے تھے جن کے گھروں پر طلبہ کے گروہ جا کر کچھ حاصل کر سکتے۔

اُردو شاعری میں میری دلچسپی اور میری تخلیقات کی وجہ سے بہت سے پروفیسر مجھے ایک عجیب و غریب آدمی سمجھنے لگے تھے۔ مادری زبان کے ادب سے اور ہندوستانی فکریات سے قریب قریب ہر ایک ٹیچر ناواقف تھا بے خبر تھا۔ بیگانہ تھا۔ یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین بھی کچھ دنوں تک کبھی کبھی علمی مشاغل میں دلچسپی کا ثبوت دیتی رہی بلکہ بعد کو وہ اتنی خطرناک ہو گئی جس کا علم ہندوستان بھر کو ہے۔ یہ دیکھ دیکھ کر میرا دل خون ہوتا رہتا تھا کہ کانوکیشن کے زمانے میں تقریباً ہر ڈگری لینے والے کے چہرے پر اس فکر و تشویش کی مہر لگی ہوتی تھی کہ ڈگری تو پا گئے، ملازمت کہاں ملے گی اور کھائیں گے کیا؟ اور کانوکیشن پر کیا موقوف ہر سال یونیورسٹی

کے ہزاروں طلبہ کے چہرے اس بات کی خاموش گواہی دیتے تھے کہ امتحان کے لئے پڑھ تو ضرور رہے ہیں لیکن امتحان پاس ہونے کے بعد کیا ہوگا ان محسوسات نے یعنی نوعمر طلبہ کے مرجھائے چہروں نے مجھ سے دو شعر لکھوائے

ریاضِ دہر میں جھوٹی ہنسی بھی ہم نے دیکھی ہے
گلستاں در بغل ہر غنچہ خنداں نہیں ہوتا

دوسرا شعر یوں ہے

ریاضِ ہند کے ذو گل بکس جاتے ہیں کھلتے ہی
یہ ہاتھوں میں کبھی آئینۂ شبنم نہیں لیتے

یہ ہائے ہائے کرتی ہوئی صورتیں دیکھئے آج کے ہندوستان میں کیا قیامتیں ڈھا رہی ہیں۔

میں نے کچھ اہم کتابوں کے اپنے زیرِ مطالعہ رہنے کا ذکر پہلے کیا ہے۔ ایک اہم کتاب جس کا اثر میرے دل و دماغ پر بہت دور رس رہا۔ John Stuart Mill's Autobiography تھی۔ میں مطالعہ میں اپنا زیادہ وقت نہیں لگاتا تھا اور میری زندگی میں کوئی وقت روزانہ مطالعے کے لئے معین نہیں تھا۔ میں جتنا پڑھتا تھا اس سے کہیں زیادہ اور کئی بار زیادہ سوچتا تھا۔ اپنے خیالات اور اپنے دماغ کی شخصیت کو مرتب کرتا رہتا تھا۔

لیکن کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں محض ادق اور سنجیدہ ادب کا مطالعہ کیا کرتا تھا ہلکا پھلکا ادب بھی بشرطیکہ وہ کسی قابل ہو، میرے لئے ایک کشش رکھتا تھا۔ P.G. Wood-House کے بہت سے ناول اور کہانیوں کے مجموعے میں شروع سے آخر تک بڑی تعداد میں پڑھ گیا تھا۔ انگلستان کے جاسوسی افسانے سیکڑوں کی تعداد میں پڑھ گیا تھا اور اب بھی اس طرح کا اچھا ادب پڑھے بغیر جی نہیں مانتا۔

یونی ورسٹی میں ملازمت کے دوران اور جب سے ریٹائر ہوا ہوں تب سے آج تک میں علاوہ اور اہم موضوعات کے شاعری پر اور شاعری کی اصل ماہیت پر بہت کچھ پڑھتا اور سوچتا رہا ہوں جن نتائج پر میں پہونچا ہوں ان میں سے چند یہ ہیں۔

۱۔ فصاحت، بلاغت، مضمون آفرینی، غزلیت اور دیگر مانی جانی صنعتوں کے علاوہ میرے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت تاثیر کو ہے اور سوز و گداز کو۔ یہاں ایک دھوکا ہو سکتا ہے۔ تاثیر شاعر کی ذاتی و انفرادی غم و خوشی محرومی و کامیابی بالخصوص و محدود اثر ڈالنے والے موضوعات و واقعات کو اچھے شعر کے سانچے میں ڈھال دینے سے بھی پیدا ہوتی ہے اور یہ تاثیر کبھی کبھی بہت گہری ہوتی ہے لیکن میرے نزدیک وہ پُرتاثیر اشعار زیادہ اہم رہے ہیں، جن میں کہنے کو تو موضوع مخصوص ہو لیکن جو ہمیں ایسا آفاقی احساس بھی کرائیں، حیات و کائنات کا ایسا تجربہ دیں جو محدود واقعوں کی اثر انگیزی سے بلند ہوں۔ مشہور رومانی نانگ کار سفوکلیز سے متھو آرنلڈ نے The Higher Seriousness کا فقرہ اخذ کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ بلند تر سنجیدگی۔ نہ تو بلند آہنگی سے پیدا ہوتی ہے اور نہ محض جلوہ و پردہ کی آنکھ مچولی سے اس سنجیدگی کا ایک غلط استعمال کسی مذہب و ملت کے مقاصد کو بیان کرنا بھی ہے اس سنجیدگی کی میرے نزدیک بہترین مثالیں سنسکرت ادب کے اس حصے میں مل جاتی ہیں، جنہیں اُپ نشد کہا جاتا ہے۔ میری شاعری کے پختہ ہونے سے پہلے اُپ نشدوں کے اثر سے ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ شروع ہو چکی تھی اور میری شاعری کے بلوغ کے زمانے میں وہ آگے بڑھ رہی تھی۔

۲۔ اگر ہم اُپ نشدوں کی تعلیم سے دنیا کے تصوف کی مماثلت پر زور دیں تو ایک اہم فرق نظر انداز ہو جاتا ہے، وہ ہے ہندوستان کے روحانی کلچر میں مادی کائنات کی الوہیت کا احساس۔ اس لئے میں نے اپنی نیچرل شاعری میں محض مناظرِ قدرت کی خارجی تصویر کشی کو کافی نہیں سمجھا اسی طرح ہم کو فارسی اور اردو شاعری میں عورت کی دیویت اور بچوں کی الوہیت کے احساس کا فقدان نظر آیا۔ رُوپ کی رباعیاں، جگنو، ہنڈولہ، میری طویل تخلیقیں ہیں اور میری نظم آدھی رات، دوسری نظم پرچھائیاں، تیسری نظم کارتک پورنما اردو شاعری کی اس کمی کو، جس کا ذکر میں نے ابھی ابھی کیا ہے۔ پورا کرنے کی کوششیں ہیں۔ ہندوستانی کلچر یا بلند ہندو کلچر نہ کوئی قومی چیز ہے، نہ ملی چیز ہے، نہ سیاسی چیز ہے اور نہ وہ کوئی سطحی چیز ہے۔ وہ ایک آفاقی چیز ہے، جس میں کسی عقیدہ، کسی مذہبی رسم و رواج کو دخل نہیں ہے۔

۳۔ ہندوستان کے مزاج کی وہ گہری تہیں، جنہیں پھوڑ کر ہندوستانی کا کلچر نکلا ہے، اس کا کچھ اندازہ میں اپنی شاعری سے اپنے ہم وطنوں کو کرا سکوں اور ان کے دھیان میں ہندوستان کے لئے ایک ایسا شعور پیدا کر سکوں، جو تنگ نظر قومیت یا فرقہ پرستی سے آزاد ہو۔ یہی کوششیں میری

شاعری کی محرکات رہی ہیں۔
۴۔ شاعری کی زبان کے متعلق کئی مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ بہت سے اشعار کی زبان اچھی ہوتے ہوئے بھی اکثر کتابی ہوتی ہے۔ اور ہمارے وجدان کی اوپری سطحوں کو ہی چھو پاتی ہے۔ لغت کی زبان کو زندگی کی زبان بنانا، اسے ایک رچا ہوا ٹیمپریچر عطا کرنا، اس سے رومانی عناصر پیدا کرنا کہ خاص و عام گہرے

فراق لال قلعہ کے مشاعرہ جشن جمہوریت میں اپنا کلام سنا رہے ہیں

اور دیرپا طور پر متاثر ہوں، بڑا مشکل کام ہے۔ میری کوشش یہی رہی ہے کہ میں ایسا کرسکوں۔

اس مختصر سے مضمون میں بس اتنا ہی کہہ کر رخصت ہوتا ہوں: یہ پورا مضمون برجستہ بول کر لکھوایا ہے ممکن ہے کہ کہیں کوئی فروگزاشت رہ گئی ہو جس کی معذرت چاہتا ہوں۔

ہندوستان کی مسجدیں

حرمت الاکرام

زمانہ

جلاتا دیئے وقت کی محفلوں میں
جبینوں پہ رُلتا سماتا دلوں میں
جگاتا نئی دھڑکنیں قافلوں میں
زمانہ گزرتا چلا جا رہا ہے

گزشتہ کو خوابِ فراموش کرتا
ہر امروز کو شاملِ دوش کرتا
فسوں زارِ دوراں کو گلپوش کرتا
زمانہ گزرتا چلا جا رہا ہے

بسیرا تغیر کی باہوں میں لیتا
تلون کی امواج پر ناؤ کھیتا
اک اک پل پہ فردا کو آواز دیتا
زمانہ گزرتا چلا جا رہا ہے

قدم ماہ و خاور کے زینوں پہ دھرتا
حوادث کی گہرائیوں میں اترتا
مہ و سال کی ندیاں پار کرتا
زمانہ گزرتا چلا جا رہا ہے

اُلجھتا حقائق کے مہر و غضب سے
اُبھرتا بہار و خزاں کے عقب سے
نکلتا ہوا حلقۂ روز و شب سے
زمانہ گزرتا چلا جا رہا ہے۔

روایات کے ذہن و پیکر بدلتا
جہاں وار قدروں کے تیور بدلتا
مسائل کے اصنام و آذر بدلتا
زمانہ گزرتا چلا جا رہا ہے

بتاتا کہ مڑتی ہے تاریخ کی رَو
یہ کہتا کہ اونچی ہوئی شمع کی لو
فضا تا خلا ڈالتا اپنا پرتو
زمانہ گزرتا چلا جا رہا ہے

سُناتا کسی کوہکن کا فسانہ
بناتا کسی سوہنی کو نشانہ
سنبھالے ہوئے درد کا تازیانہ
زمانہ گزرتا چلا جا رہا ہے

کسی ساز سے کھیلتا راگ جیسے
بھڑکتا اِس انداز سے آگ جیسے
کوئی چوٹ کھایا ہوا ناگ جیسے
زمانہ گزرتا چلا جا رہا ہے

چرائے نظر، کج ادا اوس کی صورت
لئے برقِ پنہاں، گھٹاؤں کی صورت
بگولے سمیٹے ہواؤں کی صورت
زمانہ گزرتا چلا جا رہا ہے

آخری شہری بستی سے بھی اِن بلندیوں تک کافی فاصلہ تھا۔ اس جگہ سڑک کے مغربی کنارے پر گھنا جنگل تھا اور اُسی میں کہیں ایک آرام گاہ چھپی ہوئی تھی وہاں تک چڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوا کہ پھیپھڑے کی پھونکنی قدم قدم پر شہر شہر کی دھول نکال رہی ہے۔ تھک تھکا کر اُوپر آگئے۔ ساتھ ہی شام ہوگئی۔ دم لینے کو اندر بیٹھے ہی تھے، نہ جانے کہاں سے بادل آگئے اور برسنے لگے۔ بند کھڑکیوں کے اندر ہی ایک نئے ماحول کے گہرے احساس میں کھاپی کر سوگئے۔

صبح کو پہلی دھند کے ساتھ ایک نئی ہوا جھریوں میں سے اندر آچکی تھی اور ایک جھونکا میری اَدھ کھلی آنکھوں میں ایسے لپکا کہ جیسے اس بات کا احتمال ہو کہ کہیں اسا شے ہوتے ہوتے پھر بند نہ ہوجائیں۔ جیسے ہوا کے پہلے ایک سوا جھونکے کا جادو ہونا ہو، کہ جیسے آنکھ کے ڈھیلوں کا برسوں پُرانا اور چھپا ہوا درد یہیں اُبھر آیا ہو کہ جیسے ڈھیلوں کے اس درد کو پہلے ہی ٹھنڈے پھاٹے سے ٹھیک ہونا ہو اور پھر اس ایک جھونکے کے آدھے ٹکور سے ہی پتلیوں کے بیچ میں سے دو آنکھوں کے تارے گھونٹ بھر بھر پینے لگے اور بدن کے اندر اندر جتنے بھی اپنے راستے تھے، گرد سے اٹے، دبے پٹے، کھنچے تھکے، جلے تپے، راستے ہی راستے، اُوپر نیچے، دائیں بائیں، سب کے سب تر ہوگئے، سب کے سب دُھل گئے، ایک ٹھنڈے پھاٹے سے، ہوا کے ایک جھونکے سے ــــ

کمرے سے باہر روپہلی روشنی میں دھندلے دھندلے رنگوں کا ایک بھرا پُرا خواب تھا جو لمحہ بہ لمحہ اُبھرتا گیا، ٹھوس حقیقت بنتا گیا اور میرے

احساسات حیرت کی ابتدائی شکل سے نکل کر درجہ بدرجہ اس حقیقت کو قبول کرنے لگے اور کہیں اندر رُوح سے گھلنے ملنے لگے۔

میری اونچائی کے عین مقابل، وادی کے اُس پار سربفلک ایک پہاڑ تھا۔ پہاڑ کی ایک چوٹی اُدھر تھی ایک اِدھر۔ بیچ کا گریبان سا ایسے لٹک رہا تھا۔ جیسے پورا کٹا ہوا ہلال ہو۔ ہلال اتنا بڑا کہ خود آفتاب کو گود میں لے لے۔ اسی ہلال کے بیچ میں آفتاب کی آمد کا جلوہ تھا اور اس پیش رو جلوے میں ہی ایک اَن دیکھی دُنیا کا ذرہ ذرہ الگ الگ ظاہر ہو رہا تھا لیکن الگ ایسا کہ ایک ذرّے کو بھی دیکھو تو تصویر کی تصویر ذہن میں آجائے۔ لیکن اس دُنیائے دلگیر اور حسن و مرکب میں گھاس کے تنکے تنکے کا، ہوا کی ہلکی سی اٹھکیلی کا، بوند بوند کی چمک کا، ڈھکی ہوئی اُترائیوں کا ٹہنیوں کے جال میں سے نیلے دُودھیے آکاش کے ٹکڑوں کا ہری ہری جھاڑیوں میں سے روشنی کے جزیروں کا، سب کا اپنا اپنا وجود تھا، اپنی اپنی اہمیت تھی۔ ایسی کہ رنگ کی ایک بندیا کو کہیں سے اُٹھا لو، کونپل کی ایک جنبش کو روک لو، یا آواز اور خموشی کے توازن کو اپنی ایک انگڑائی سے بگاڑ دو، اُسی وقت جیسے ایک سنگیت رُک جائے، جیسے کئی تار ٹوٹ جائیں۔

اِدھر اپنے پہاڑ کے موٹے پیٹ سے، جنگل کے قدموں پر نہ جانے کن لازوال ذخیروں سے، کن برفیلے پاتالوں سے چھوٹ چھوٹ کر، اور کن نیلے آکاشوں سے چھن چھن کر وہی پانی پھوٹ پھوٹ کر نکل رہا تھا جس

کی پیاس سے کیہم صحراؤں کی خاک پھانکتے ہوئے آئے تھے۔ قدرت کی اس اندر سبھا میں آبِ حیات کا یہ متحرک گوشہ بھی تصویر کے مناسب نقطے پر تھا اور پھولے پھولے سبزے میں نیلے سفید کی کناریاں کاڑھتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ تصویر کی اترتی ہوئی لمبائی میں، اپنا ایک ساز بجاتا ہوا، اپنا ایک سُر الاپتا ہوا، سُر جو ساری لمبائی چوڑائی میں پھیلا ہوا ہمہ گیر خاموشی میں جان ڈالتا تھا۔ سُر جو اس رُوح خیز خاموشی کا ہی اہم ترین حصہ تھا۔

ہلال کے مرکز میں اب سفید شعلوں کا چشمہ سا بن گیا اور میں نے گردن موڑ کر دیکھا کہ اپنے پہاڑ کی چوٹی پر چیڑ کے ان گنت درختوں کا یہ بھاری پھریرا تھا وہ سنہری ہو چکا تھا۔ یہ چیڑ، یہاں وہاں، کس مالی نے اُسے تراشا تھا۔ یہ چیڑ ڈھلانوں سے اُٹھ کر آسمان کو چھوتے ہوئے کسی ایک میں کہیں خم نہیں۔ ٹیڑھی مٹی سے نکل کر سیدھی کمر کیے ہوئے ان ڈھلانوں کی پھسلن پر یہ کندھے سے کندھا کیسے ملاتے ہیں۔ کہیں دستوں کے دستے پہاڑ چڑھتے دکھائی دیتے ہیں، کہیں منہ کھلی کھائیوں میں رنگ بھرتے ہیں، کہیں تیکھے کناروں کو نرم کرتے ہیں، کہیں پچھلے جاڑوں کی برف پہاڑ کے سینے کے ساتھ چمٹی ہوئی ہے۔ تو اُسی پر اپنی چھاؤں ڈال رہے ہیں، کہیں بادل کے ٹکڑے دستہ کھول کر نیچے آ گئے ہیں، اُنہی کو گلے لگا کر سہلا رہے ہیں اور جہاں بھی ہیں دور دور تک بھینی بھینی خوشبو کا ایک ایسا عالم پیدا کرتے ہیں کہ ہر نئی سانس آدمی کے دماغ کو اس حد تک سُن کر دی جائے کہ آدمی آدمیت ہی کے حدود میں کھویا رہے۔

لیکن ادھر تکونی ٹکڑے پر دھوپ آ گئی ہے اور میں ایک نئے قیصر گرم ماحول میں دن کے اس کنوارے منظر کا واحد مالک ہوں۔ ایک نگاہ اٹھاتا ہوں تو پہاڑ کی جنوبی دُم تک وادی کی وادی میری پکڑ میں آ جاتی ہے۔ پانی کے ستارے ہیں یا پتھر کا سُرمئی رنگ، دھان کا ہرا ہرا مخملی بچھونا ہے یا سرسوں کا کھرا کھرا سونا، دور کے چیڑوں کا نیلا دھواں ہے یا پاس کے درختوں کا گیلا گیلا رنگ۔ جہاں جی چاہے وہیں نظریں جماتا ہوں۔ یہاں سے جی بھر جائے وہاں سے چننے لگتا ہوں۔ ادھر نرم نرم پر نظریں پٹ سی جاتی ہیں، اُدھر سخت سخت پر دوڑ سی لگاتی ہیں۔ ایک آن میں ساٹھ فٹ اونچے چیڑ پر جا بیٹھتی ہیں۔ دوسری آن میں بہت نیچے اُتر کر چشمے میں ڈبکی لگاتی ہیں — اور اگر ادھر دیکھوں شمال کی طرف۔ درختوں نے نظر کے راستے روک لیے ہیں۔ لیکن یہی بات اچھی ہے کہ جنگل کی چھپی ڈھکی گلیوں میں آنکھ مچولی کھیل لیتی ہیں۔ وہ رہی مستطیل ایک رنگ کے پانی کی، پانی کہاں یہ تو راکھ اور رنگ کے جنگلی پھول ہیں جو ایک مستطیل میں بکھر رہے ہیں۔ وہ رہی بل کھاتی ہوئی سڑک افق کے پاس، سڑک کہاں؟ یہ تو وہی اپنا پانی ہے جو وہاں تک پہونچ گیا ہے۔

سوچ رہا ہوں کہ اس دھرتی پر یہ بھی ہے، ایسا گوشہ بھی جہاں انسان کی ہر بے چینی کو نیند آ جائے۔ جہاں زندگی پکارے تو جواب مل جائے۔ لیکن یہ گوشہ کتنی دور ہے۔ زندہ انسان کی بستی سے۔ شاید حقیقت یہی ہے لیکن حقیقت تک فاصلے کیوں ہیں۔ فاصلے؛ منزل کی یہی طاقت ہے۔ طاقت؟ ہاں حُسن طاقت ہے۔

میرے سر پر دھوپ آ چکی ہے۔ یہ دھوپ ہوا کی خنکی کو مغلوب کر چکی ہے۔ چیڑ کا مخروطی سایہ اور چھوٹا ہو گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سامنے پہاڑ کے تیور کس گئے ہیں، کہ بیچ میں چیڑوں کی جو میٹھی میٹھی لکیر تھی، وہی لمبی نوکدار اور ہٹی ہوئی مونچھ سی بن گئی ہے — یہ پہاڑ — کون چڑھے اس پر؟ چڑھے تو برسوں کی تربیت پا کر، بچاؤ کے پورے سامان کے ساتھ، آزمائی ہوئی ترکیبوں سے، اور پھر بھی ایک ایسی پتلی، ٹیڑھی، جھکتی، لڑکھڑاتی لکیر بنا کر کہ پہاڑ کے اتنے بڑے پھیلاؤ پر اگر ایک جلتی لکڑی کا دھواں بھی کہیں سے اُٹھتا ہو، پہاڑ پر دھوئیں کی وہ اودی لکیر تو دکھائی دے لیکن چار چڑھتے ہوئے انسانوں کی ننھی قطار نہیں دکھائی دے گی۔ پہاڑ ایک ملک گیر وسعت ہی نہیں بلکہ ایک ایسا وزن ہے جو تخیلات پر بھی بھاری ہو جائے۔ انسان اس کے دامن صدیوں تک کترتا رہے، پہاڑ کو کمبل جتنا احساس نہ ہو جائے — پھر یہ پانی ایک بہتا ہوا راگ ہی نہیں، کہ چھینٹ بھر ہونٹ اُٹھا اُٹھا کر جھونکے جھونکے کے ساتھ سُر ہی ملاتا جائے۔ دیکھا جائے تو اب بھی اس کے بہاؤ میں دھکے ہیں، حملے ہیں، بے حد اضطراب ہے، روڑے روڑے پر دھاوا ہے۔ چٹانوں پر چڑھائی ہے، اور اس میں طاقت ایسی ہے کہ ایک طغیانی سے نظامِ عالم کو توڑ دے۔ اور ہوا کے یہ معصوم سے جھونکے جو صبح صبح مرہم لیے گھوم رہے تھے۔ ......

یکایک میرے دماغ میں بات آ گئی کہ آرام گاہ کی کھڑکیاں خوب اچھی طرح بند ہیں اور اس کمرے کی طرف دیکھتے ہی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں خواہ مخواہ بے لگام وسعتوں میں کھویا ہوا تھا۔ ادھر ایک نظر میں گھر لوٹ سا آیا۔ یہ کمرہ — درحقیقت حُسن کا گہوارہ یہی تھا۔ مطلب یہ کہ باہر جو حُسن تھا، بکھرا

بکھرا سا تھا، آوارہ سا تھا، زرد رنگ اور مغرور سا۔ وہی یہاں میرے کمرے میں آکر سمٹا سمٹا سا تھا، اپنا اپنا سا تھا، پیاسے بھرتا ہوا سا، بلائیں لیتا ہوا سا، سامنے پہاڑ تو عظیم الشان ہے، جہانگیر ہے، لیکن یہی اس چھوٹے سے گھروندے میں میری خدمت میں حاضر ہے۔ جگر کے ٹکڑے ہیں اسی کے یہ جو کٹ کٹا کے، گھڑ گھڑا کے قرینے سے جڑ کے میرے قدموں کے لئے زینے بن گئے ہیں۔ میرے کمرے کو استواری کے ساتھ اپنے سر پر بٹھائے ہوئے ہیں اور وہاں دھوپ کی آگ ہے یا بجلی کی کڑک، وہ ہی میرے کمرے کی روشنی ہے۔ اُدھر دوڑتا دہاڑتا پانی پہاڑوں کو چیرتا نکل آئے۔ بڑے بڑے چٹانوں کو بہاتا لائے، جھاگ بھرے منہ سے آسمان سر پر اٹھاتا جائے یہاں میرے کمرے میں وہی نلکیوں میں خم کھاتا، موڑ موڑ پر سجدے کرتا، چپ چاپ چلا آتا ہے اور میں جہاں چاہوں، جتنا چاہوں، جس وقت بھی چاہوں اسی کی مٹھاس سے اپنی پیاس بجھاتا ہوں۔ واقعی قدرت حسین ہے تو یہاں ہے میرے اپنے کمرے میں، جہاں دھوپ کے سات رنگ تو ہیں لیکن اس کی تپش نہیں، جہاں پانی میں ٹھنڈک ہی ٹھنڈک ہے اور زور بالکل نہیں اور ہوا جو اندر ہے اس میں مرہم ہی مرہم ہے۔ آندھی نہیں ہے ـــ

تو پھر اس حسن کی قوت کہاں گئی؟ قوت؟ قوت؟ ہے تو ہمارے بازوئے توانا میں، ہماری اپنی ترکیبوں میں جنگل کا یہ درخت بہت اونچا تو چلا گیا ہے۔ لیکن میرا جی چاہے تو چار چوٹیں اِدھر اور رسی کا ایک پھندا اُدھر۔ تھرتھراتا کانپتا ہوا۔ آسمان کی ٹھنڈی گود میں سے اپنے سر کو کھینچ نکالے گا۔ اور زمین کی لمبائی ناپتا ہوا میرے قدموں میں دھڑام سے آگرے گا ـــ پھر کھڑا تھا تو مجھے ڈھکا ڈھکا یا اچھا لگتا تھا۔ اس کی چھال میں بھی ایک کشش تھی لیکن اب تو میرے قدموں میں پڑا ہوا ہے، میرے اشاروں کا منتظر ہے۔ اس کی یہ چھال کتنی بے معنی لگتی ہے۔ چھال ہے تو اس میں سیڑھی آری چلے یا کوئی کیل ٹھک جائے۔ ـــ میرا پلنگ ـــ ہاں یہ بھی کبھی ڈھکا ڈھکا یا جنگل کا باسی تھا۔

پھر یہ فاصلے ـــ ؟ کس نے کہا یہ قوت ہے؟ پہاڑ ـــ ؟ کس نے کہا یہ دیوار ہے ـــ ؟ ہم چاہیں تو اُن بنی ہوئی موچھوں کے بیچوں بیچ ایک کالی سُرنگ ایسی نکالیں کہ پہاڑ کا چہرہ تو چہرہ اس کے اندر رخانوں کی قلعی کھل جائے۔ نہیں تو اوپر اوپر ہی اس کی ہریالیوں میں ہم مثالی راہیں کھو دیں گے، اس کی چوٹیوں پر بھاپ پھینکتے ہوئے جہاز اُڑائیں گے اور اس سوئی ہوئی وادی کو ہلا دیں گے، جگا دیں گے۔ اور یہیں انہی ہواؤں پانیوں میں اپنا شہر بسائیں گے۔ بازار سجائیں گے۔ جہاں ہوٹل جگمگائیں گے اور ایک شور اٹھے گا انسان کی قوتِ تعمیر کا جو صورتِ عالم بدل دے۔ انسان کی حدود خواہش کا جو آسمانوں سے آگے جائے۔ اور جب خیال سے خیال ٹکرائے گا، فلسفے سے فلسفہ، ادارے سے ادارہ، ایک نئے نظام سے دوسرا، جب مناظرے ہوں گے، مقابلے ہوں گے، الگ الگ رنگ لہرائیں گے۔ اِن پہاڑوں پر وسعت کا گھمنڈ رہے گا نہ وزن کا۔ اس حسن تک فاصلے رہیں گے۔ نہ فاصلوں کی قوت ـــ اور یہ پانی ـــ

ہاں یہ وادی آخر اتنی بے جان نہیں ہے۔ اس وقت بھی، ہاں، وہ، چشمے کے کنارے پر چشمے کے پانی سے، ایک عورت اپنے برتن مانجھ رہی ہے۔ ہونہہ۔ ایسا لگتا تھا۔ پانی کی چمک برتن کے سامنے کو بھی نہیں رہے گی۔ لو ـ جل کرنوں کی نازک سلوٹوں پر، بھاری، بھاری، موٹے موٹے، دائرے پھیل گئے اور وہ رہی دوسری عورت، وہ تو کپڑے دھونے لگی ہے۔ اس طرف تو صابن کی پھولی پھولی جھاگ تیرنے لگی ہے، جھاگ کے نیچے وہ چم چم کرتے ہوئے ہیروں کے نخرے کہاں ـــ ؟ ایک عورت کے ایک کپڑے سے اتنی ساری وہ جھاگ بھی نکل رہی ہے اور جھاگ کے نیچے پانی کی ایک پیلی پیلی مونگیائی لکیر بھی مڑتے مڑتے چل رہی ہے۔

بہرحال چشمے کا پانی اچھا ہے۔ کہتے ہیں یہاں آکر بھوک بڑھ جاتی ہے کہتے ہیں کہ یہاں کے مرغے بڑے لذیذ ہوتے ہیں۔ خود اس جگہ کا نام مرغا ہے۔ مجھے کل شام آتے ہی اتنی بھوک لگی تھی کہ صبح کے ناشتے کی فکر ہوئی تھی چوکیدار نے کہا تھا کہ تین دکانوں پر مشتمل بازار میں مرغیاں ہی مرغیاں ہیں اور سب مرغیوں میں ایک ہی مُرغا۔ مجھے مرغیوں سے نفرت ہے۔ میں نے کہا تھا جس دام مُرغا ملے، اُٹھا لاؤ ـــ

ہئیں ـــ ؟ وہی تو ہے ـ چوکیدار ـــ نیچے ـــ چشمے پر ـــ مُرغا ہاں مُرغا ذبح ہو رہا ہے ـــ یہ بات : کیا جاندار مرغا ہے۔ کیا تاج دار مرغا ہے۔ لہو کی لکیر اتنی گاڑھی ہے کہ دُور تک پانی کی پیٹھ پر سوار ہے۔ !

زمیں سارَن کی نازاں کیوں نہ ہو اپنے مقدر پر ؛ کہ تجھ سا پیکرِ ایثار اِس کی خاک سے اُٹھا
نچھاور کر دیا سب کچھ وطن کی راہ میں جس نے ؛ اک ایسا غازیِ کردار اس کی خاک سے اُٹھا

میں اکثر سوچتا ہوں وہ گھڑی کتنی مقدس تھی ؛ لیا تھا کشورِ ہندوستاں میں جنم جب تو نے
تو اِس انداز کا اِک پھول تھا اپنے گلستاں میں ؛ کہ سارے دیس کو مہکا دیا تھا تری خوشبو نے

میں اکثر سوچتا ہوں کیا کوئی ایسا بھی لمحہ تھا ؛ تری اسّی برس کی جہد پرور زندگانی میں
کسی نے دردِ ملک و قوم سے بیگانہ پایا ہو ؛ تجھے تیرے لڑکپن میں، ضعیفی میں، جوانی میں

نگاہوں میں مری ہے آج اک سیلاب کا منظر ؛ قیامت ڈھا رہی ہے ہر طرف گنگا کی طغیانی
ہیں زیرِ آب دونوں بردواں بھی اور پٹنہ بھی ؛ نہیں محشر سے کم گنگا کی یہ طوفاں سامانی!

تجھے آفت رسیدوں کے لئے میں وقف پاتا ہوں ؛ سہارا بے کسوں کا بن کے تو میداں میں آتا ہے
دوا دارو سے کرتا ہے کسی بیمار کی خدمت ؛ کسی مظلوم کی تو پیار سے ڈھارس بندھاتا ہے

دوا، سامانِ خورد و نوش، کپڑے ہاتھ میں لیکر ؛ تجھے خدمت کی منزل ہی کا جویا دیکھتا ہوں میں
غریبوں، بے نواؤں کی مدد کے بعد راتوں کو ؛ زمیں کے فرش ہی پہ تجھ کو سویا دیکھتا ہوں میں

وہ سارے ملک کی ہو یا فقط تحریکِ چمپارن ؛ نظر آتا ہے تو مجھ کو رفیقِ خاص گاندھی کا
نہ کیوں ہر گام پر ہو کامرانی ہمنوا تیری ؛ کہ تیرے سر پہ ہے دستِ شفیقِ خاص گاندھی کا

نگلی جا رہی ہے شہر کو آتشِ تعصب کی ؛ مری نظروں میں ہے جلتی ہوئی مُلتان کی دُنیا
قیامت ہے کہ انسان خود ہی انساں کا شکاری ہو ؛ الٰہی کیا یہی ہے دھرم کی، ایمان کی دُنیا!

تجھے میں دیکھتا ہوں بیقرار و مضطرب ہر دم ؛ تو اجمل خان کو لے کر سوئے ملتان آتا ہے
ترے آنے سے رکتے ہیں بھڑکتی آگ کے شعلے ؛ تو اپنے آنسوؤں سے آ کے یہ شعلے بجھاتا ہے

تصوّر نے تجھے ان سے ٹکراتا ہوا دیکھا ؛ وہ رولٹ کے مظالم ہوں کہ ڈائر کی جفاکاری
کہانی حریت کی نامکمل رہ گئی ہوتی ؛ اگر حصہ نہ ہوتی اس کا تیری حوصلہ داری

اہنسا ہے وہ یا ہے اتحادِ ہندو و مسلم ؛ تجھے دیکھا تو ان میں صورتِ روحِ رواں دیکھا
خلافت کی چلی تحریک جب اپنی سیاست میں ؛ تو اس کا بھی تجھے اک رہنما ئے کامراں دیکھا

درالی ہو کہ چہرہ، آسون ہو وہ کہ آرہ ہو ؛ نہ بھولیں گے کہ تو آیا تھا ظلمت میں ضیا بن کر
یہ طوفانوں کے مارے تا قیامت یاد رکھیں گے ؛ کہ طوفانوں میں تو نکلا تھا ان کا ناخدا بن کر

وہ ہو مونگیر کا بھونچال یا کوسی کی طغیانی ؛ ترا دردآشنا دل تھا مداوا ہر تباہی کا
تیرے اخلاص ہی کو دیکھ کر رحم آگیا اس کو ؛ ٹھکانہ ہی کہاں تھا ورنہ اس قہرِ الٰہی کا

تو تھا ساہتیہ سمیلن کا وہ ایک رکن بنیادی ؛ کہ اردو کو ہمیشہ تو نے اپنی ہی زباں سمجھا
تجھے اردو سے بھی، ہندی سے بھی یکساں محبت تھی ؛ خلوصِ دل سے تو رازِ بہارِ گلستاں سمجھا

صداقت آشرم پٹنے میں ہو وہ مظہر الحق کا ؛ نئی دہلی کا یا میلوں میں پھیلا قصرِ سلطانی
تری نظروں میں یہ دونوں نشانِ راہِ منزل تھے ؛ قناعت کا ملا تھا وہ خزانہ تجھ کو لاثانی

بڑھی اس دیس میں زنداں کی عزت جس طرح تجھ سے ؛ اسی صورت بڑھی ایوانِ آئینی کی عزت بھی
ترے دم سے رہا سرمایۂ ایوانِ آئینی ؛ مودت بھی مروت بھی، اخوت بھی شرافت بھی

ترا ہندوستاں تجھ کو بھلا سکتا نہیں ہرگز ؛ کہ وقفِ ہند تھا ہر دم عمل تیرا سخن تیرا
ترے اس جسم ہی پر نہیں اے قوم کے رہبر ؛ تجھے ہر وقت دل سے یاد کرتا ہے وطن تیرا

غزلیں

علقمہ شبلی

زندگی ہے آج فرسودہ نصابوں کی طرح
ہم پڑھے جاتے ہیں بس درسی کتابوں کی طرح

کون اَب کس کو پکارے کس سے ہوں باتیں یہاں
شہر میں ہیں لوگ بے چہرہ نقابوں کی طرح

تھی مری فکرِ رسا ہی جن کی معراجِ سخن
مجھ سے اَب ملتے ہیں وہ عالی جنابوں کی طرح

دَور ہے یہ بے یقینی کا کچھ ایسا دوستو!
اب حقائق بھی نظر آتے ہیں خوابوں کی طرح

میرا ذوقِ سجدہ ریزی راس جن کو آگیا
اب چمکتے ہیں وہ پتھر آفتابوں کی طرح

تشنگی جاکر چھپائے سر کہاں اس عہد میں؟
ہوگئے ہیں وقت کے دریا سرابوں کی طرح

پھول صحرا کے بھی ہوسکتے ہیں فخرِ صد اِرم
کوئی رکھے تو انہیں شبلی گلابوں کی طرح

شیدا رومانی

شرابِ غم ہی نہیں صرف آدمی کے لئے
اجل کا زہر بھی پینا ہے زندگی کے لئے

نجانے لوگ یہاں کیسے دل لگاتے ہیں
ہمیں نہ مل سکی فرصت بھی دلگی کے لئے

چراغِ راہ سے منزل تو مِل نہیں سکتی
چراغِ دل کی ضرورت ہے رہبری کے لئے

حیاتِ جاوداں بخشی غمِ محبت کو
اب اور چاہیئے کیا آپ کی خوشی کے لئے

جو کرسکے نہ کبھی احترام پیمانہ
چلے ہیں ایسے بھی کم ظرف میکشی کے لئے

فقط خلوص کی باتوں سے کچھ نہیں ہوتا
خلوصِ دل بھی ضروری ہے دوستی کے لئے

خیال و فکر ہی سب کچھ نہیں ہے اے شیدا
خدا کی دین بھی لازم ہے شاعری کے لئے

افسر اتفادری سہسرامی

دوش پر رہا بھی ہے سر کبھی گیا بھی ہے
زندگی کی راہوں میں دشتِ کربلا بھی ہے

ہم نے یہ بھی دیکھا ہے ہم نے یہ سُنا بھی ہے
اپنا غم چھپانے کو آدمی ہنسا بھی ہے

دشت دردِ انساں میں سایۂ سکوں بنتا
کیا کوئی درخت ایسا راہ میں اُگا بھی ہے

خنجرِ اَلم کھاکر زہرِ رنج و غم پی کر!
آدمی جیا بھی ہے آدمی مرا بھی ہے

کس سے حالِ دل کہئے کس سے حالِ دل سُنئے
زندگی کی محفل میں آدمی رہا بھی ہے

خار زارِ اُلفت میں چل رہا ہوں میں تنہا
مُڑ کے دیکھتا بھی ہوں کوئی دوسرا بھی ہے

وادیٔ محبت کے تجربوں سے گزرا ہوں
دِل ہی راہ رَو بھی ہے دِل ہی رہنما بھی ہے

آپ تو رہے افسر سب کے خاکِ پا بن کر
یہ بتایئے ہم کو کوئی آپ کا بھی ہے

آج کل نئی دہلی

حاذق الملک اور مسیح الملک

حکیم اجمل خاں کو حاذق الملک اور مسیح الملک کے خطابات سے نوازا گیا تھا، پہلا خطاب برطانوی حکومت نے دیا تھا دُوسرا قوم کا عطیہ تھا۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ وفادار بھی تھے اور باغی بھی۔ حکیم اجمل خاں نے حکومت سے باغی ہو کر قوم کی وفاداری کا اعلان کر دیا۔ اس کی ابتدا پہلے خطاب کی واپسی سے ہوئی۔ فوراً ہی ہندوستانی قوم نے اُنہیں مسیح الملک بنا دیا۔ عمر کے آخری سانس تک وہ اسی لقب سے یاد کئے جاتے رہے۔ آج بھی جب انہیں دُنیا سے رخصت ہوئے نصف صدی گزر چکی ہے، وہ مسیح الملک ہی کہلاتے ہیں اسی لقب سے تاریخ میں اُن کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔

حکیم صاحب ۱۷ شوال ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۳ء) کو شریف منزل دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی اور رسمی تعلیم کے بعد حکیم اجمل خاں نے کلام پاک حفظ کیا اور مسجد شریف خاں میں محراب سنائی۔ قدرت نے بے شمار ذہنی و دماغی صلاحیتوں کے ساتھ اُنہیں حافظہ بھی بہت اچھا دیا تھا۔ تھوڑی عمر ہی میں انہوں نے مختلف قدیم علوم میں قابلیت پیدا کر لی۔ عربی، فارسی اور اُردو پر اُنہیں اہل زبان کا سا عبور تھا۔ انگریزی اگرچہ پڑھی نہیں تھی، مگر معمولی سی جھجک کے ساتھ انگریزی میں بات کر لیا کرتے تھے۔ طب ان کا آبائی فن تھا۔ اپنے والد حکیم محمود خاں سے طب کی ابتدائی کتابوں کا درس لیا۔ تکمیل حکیم عبدالمجید خاں اور حکیم غلام رضا علی خاں سے کی۔ عملی زندگی کا آغاز حکیم محمود خاں نے کر دیا۔ اس کے بعد بڑے بھائی حکیم عبدالمجید خاں کی سرپرستی میں طبابت سیکھتے رہے۔ حکیم اجمل خاں دہلی میں کم اور رامپور میں زیادہ رہا کرتے تھے۔ حکیم واصل خاں کی موت کے بعد دہلی میں زیادہ رہنے کا اتفاق ہوا۔

ان کا سب سے انفرادی کارنامہ یہ تھا کہ ملی اور سیاسی سرگرمیوں میں ساتھ ساتھ حصہ لیتے رہے۔ طبیب کی حیثیت سے بھی کامیاب رہے اور سیاست داں کی حیثیت سے بھی اُن کا درجہ کافی بلند رہا۔ قوم پرستوں کی صف میں انہوں نے اپنی اگلی صف میں بہترین مقام مخصوص کرا لیا یہاں تک کہ ہندوستان کی سب سے سرگرم اور فعال جماعت کانگریس کی نہ صرف صدارت بلکہ ڈکٹیٹر شپ بھی حاصل کر لی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے لکھا کہ کانگریس کی قیادت میں انہیں غیر معمولی اور نمایاں مقام حاصل تھا۔

حکیم اجمل خاں نے محبت اور خدمت کی طاقت سے دلی والوں کے دل جیت لئے تھے۔ لارڈ ہارڈنگ اپنے افسران سے کہا کرتے تھے کہ وہ دہلی کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ ایک وقت تھا جب دہلی میں اُن کے اور سوامی شردھانند جی کے الفاظ کو قانون کا درجہ حاصل تھا۔

حکیم اجمل خاں اپنے مخالفین سے کبھی انتقام نہیں لیا کرتے تھے بلکہ اُن کے مقابلہ میں ہمیشہ عفو و درگذر کے عادی تھے۔ اُن کے پڑوس میں ایک اخبار نویس رہا کرتے تھے۔ جو صحیح معنی میں صحافت کی تجارت کیا کرتے تھے جس کے لئے جو چاہتے لکھ دیتے تھے۔ حکیم صاحب کے خلاف بھی لکھتے رہتے تھے۔ کسی ریاست سے اُنہیں کئی ہزار روپے وصول کرنے تھے کافی کوشش کر چکے تھے کامیابی نہ ہوئی تھی۔ حکیم صاحب کے والیٔ ریاست سے مراسم تھے۔ یہ بات اخبار نویس صاحب کو معلوم ہوئی تو وہ بڑی ندامت اور شرمندگی کے ساتھ حکیم صاحب کی خدمت میں آئے اور سفارشی خط کی درخواست کی جواب

ملاکل آیئے دوسرے دن یہ حضرت پھر پہونچے حکیم صاحب نے کہا غالباً آپ جانتے ہوں گے کہ میرے خطوط سکریٹری لکھا کرتا ہے مگر آپ کا معاملہ بالکل ذاتی نوعیت کا ہے۔ یہ بات آپ کو پسند نہ آتی کہ خط میرا سکریٹری لکھے اس لئے میں نے خود ہی لکھا ہے تاکہ آپ کا راز فاش نہ ہو لیکن یہ خط اسی وقت آپ کو دیا جائے گا جب آپ یہ وعدہ کریں کہ اب تک جس انداز سے آپ میرے خلاف لکھتے رہے ہیں، اس میں کوئی فرق نہیں آئے گا اخبار نویس مجبور تھے وعدہ کر کے خط لے لیا اور اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو گئے، اس کے بعد وہ پھر آئے غالباً شکریہ ادا کرنا چاہتے تھے اس مرتبہ حکیم صاحب نے ملاقات سے انکار کر دیا۔

حکیم اجمل خاں نے مدرسہ طبیہ کی پرانی عمارت کو ناکافی خیال کر کے قرول باغ میں ایک بڑا رقبہ حاصل کیا۔ اس سلسلے میں دہلی کے چیف کمشنر سے ایک معرکہ بھی ہوا مگر حکیم صاحب کو کامیابی بھی ہوئی اور انہوں نے لارڈ ہارڈنگ ہی سے عمارت کا سنگ بنیاد نصب کرایا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ناکامی پر ختم ہو گئی تھی اس کی جگہ ایک اور تحریک جنم لے چکی تھی جو آہستہ آہستہ جوان ہوتی جا رہی تھی چنانچہ غلامی کے خلاف ایک نئی جدوجہد کا آغاز ہوا اور انقلاب کی گھن گرج صاف سنائی دینے لگی۔ حکیم اجمل خاں عین وقت پر اس ہنگامہ کارزار میں شریک ہوئے۔ اُن کے نزدیک آزادی انسان کا فطری حق تھا جس کو حاصل کرنے کے لئے نہیں بلکہ چھین لینے کے لئے ہر قسم کی قربانی جائز تھی۔ انہوں نے وقت کی کسی سیاسی تحریک سے دامن بچانے کی کوشش نہیں کی۔ حکیم صاحب آزادی کی سب سے پہلی شرط ہندو مسلم اتحاد کو قرار دیتے تھے۔ لیکن گائے کی قربانی اور مسجدوں کے سامنے باجہ بجانے کا سوال اس زمانے میں بہت اہم تھا ۱۹۱۹ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کا اجلاس امرتسر میں ہوا تو حکیم اجمل خاں نے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے مسلمانوں سے کہا کہ وہ گائے کی قربانی نہ کریں اس وقت عوام میں بڑا جوش تھا۔ ملک کے دور دراز حصوں سے جوشیلے نوجوان اپنے محبوب لیڈروں کی تقریریں سننے آئے تھے حکیم صاحب، پنڈت موتی لال نہرو، مہاتما جی اور تلک آنجہانی کے جلوس بڑی دھوم سے نکلے تھے۔ استقبال بھی بڑی دھوم دھام سے ہوا تھا، حکیم صاحب کے مشورے کا مسلمانوں پر بہت اچھا اثر ہوا۔ حقیقت میں وہ ہندوستان کی ان دو بڑی اقوام میں محبت اور یگانگت کے جذبات پیدا کرنا ہی اپنی زندگی کا مقصد خیال کرتے تھے۔ مہاتما گاندھی نے اُن کی اس خصوصیت کا اعتراف کرتے ہوئے کتنے حسین الفاظ استعمال کئے ہیں۔

Hindu Muslim Unity was the breath of his nostrils

بقول ستیہ پال صاحب حکیم اجمل خاں ہی تھے جن کے اثرات سے بقر عید پر گائے کی قربانی رک گئی۔ یہ بھی انہیں کا دم تھا کہ سوامی شردھانندجی کو جامع مسجد دہلی میں تقریر کرنے کا موقع ملا اور کوئی شخص مخالفت نہ کر سکا۔ حکیم اجمل خاں کے سینہ میں حب وطن کا جو سمندر موجزن تھا اس کا ایک منظر اُن کے خطبۂ صدارت کے آخری الفاظ میں جھلکتا محسوس ہوتا ہے۔

"اس حیثیت سے کہ ہم اس خاک سے پیدا ہوئے اور دوسری قوموں کے ساتھ اس ملک کے فخر کرنے والے وارث بنے ہم ان فرائض کو جو ہماری زادو بوم ہم پر عائد کرتی ہے نہ صرف اچھی طرح سمجھتے ہیں بلکہ دلی خواہش کے ساتھ ان کے ادا کرنے کے لئے ہم ہندو عیسائی پارسی اور دوسرے بھائیوں کے ساتھ آمادہ ہیں۔"

آزاد ہند کا ایسا حسین و جمیل تصور اُن کے ذہن میں موجود تھا جس کے خدوخال ماضی کے مقابلہ میں زیادہ دلکش اور نظر فریب تھے۔ اسی خطبہ میں وہ لکھتے ہیں۔

"ہندوستان کے لئے ایک نادیدہ مستقبل میں وہ عظمت اور شان پنہاں ہے کہ اس کے ماضی کا زیادہ سے زیادہ مہتم بالشان زمانہ بھی اس کے مقابلہ میں کم اور حقیر نظر آتا ہے۔ آیئے اب ہم سب متحدہ طاقت کے ساتھ اپنے ہاتھ بڑھائیں اور اسی مستقبل کے چہرے سے جو ہمارے ذہنی مگر اعلیٰ تخیل کے ساتھ وابستہ ہے نقاب اٹھانے کی خلوص دل سے کوشش کریں۔"

۱۹۲۱ء میں ہندو مہا سبھا کی مجلس استقبالیہ کے صدر کی حیثیت سے انہوں نے جو خطبۂ صدارت پڑھا اس میں حسب عادت ہندو مسلم اتحاد پر

پر زور دیا۔ احمد آباد میں خلافت کانفرنس کے صدارتی خطبہ میں انہوں نے مسلمانوں کو سخت امتحانات کیلئے تیار رہنے کا مشورہ دیا۔ ۱۰ مارچ ۱۹۲۲ء کو مہاتما گاندھی چھ سال کے لئے جیل بھیجدیئے گئے۔ انہوں نے اپنے تمام اختیارات حکیم اجمل خاں کے سپرد کر دیئے۔

اجمل خاں سفر و سیاحت سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ اس میں ذاتی مقاصد سے زیادہ علمی اغراض پیش نظر رہتی تھیں۔ ان کی سیاحت تجربات و مشاہدات کا ایک دفتر ہے۔ سب سے پہلے انہوں نے ۱۹۰۴ء میں سفر عراق کا ارادہ کیا اور بصرہ ہوتے ہوئے بغداد پہونچ گئے۔ پھر نجف اشرف کی زیارت کرنے کے بعد کربلا چلے گئے۔ ۱۹۱۱ء میں انہوں نے انگلینڈ، فرانس، جرمنی، آسٹریا اور ترکی کا سفر کیا۔ اس دورے کا مقصد صحت کی بحالی اور تبدیلی آب و ہوا کے ساتھ یہ تھا کہ انگلستان اور دوسرے ممالک میں طب کی ترقیوں کا گہری نظر سے مشاہدہ کیا جائے۔ طبی دُنیا میں یہ سفر اس لئے بھی بہت زیادہ اہم تھا کہ حکیم اجمل خاں پہلے طبیب تھے جو ان مقاصد کے لئے یورپ جانے کی جرأت کر رہے تھے۔ وہاں اُن کا پرجوش خیر مقدم ہوا۔ انہوں نے مختلف اوقات میں طب قدیم کے نظریات اور ان کی قدر و قیمت سے ارباب علم کو روشناس کیا۔ ڈاکٹر انصاری جن کا نام ہمارے ملک کی سیاسی تاریخ میں کافی اہمیت رکھتا ہے، ان دنوں لندن میں مقیم تھے۔ حکیم اجمل خاں سے اُن کی پہلی ملاقات چرنگ کراس ہاسپٹل میں ہوئی۔ ڈاکٹر انصاری ہاؤس سرجن کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ یہ ملاقات سیاسی اور قومی کاموں کی اچھی تمہید ثابت ہوئی۔ چرنگ ہاسپٹل میں حکیم اجمل خاں کی طبی قابلیت کی آزمائش کا ایک بڑا نازک مرحلہ آیا۔ اس کی تفصیل ڈاکٹر انصاری کی زبانی سنئے۔ وہ لکھتے ہیں کہ :۔

> "حکیم صاحب سے میری پہلی ملاقات لندن میں جب میں چرنگ کراس ہاسپتال میں ہاؤس سرجن تھا۔ بوساطت ڈاکٹر صاحبزادہ سعید الظفر خاں ہوئی تھی۔ حکیم صاحب بغرض سیاحت لندن تشریف لائے تھے اُن کو لندن کے مشہور ہسپتالوں کے معائنہ کا شوق تھا۔ چرنگ کراس ہسپتال کا معائنہ بہت چھان۔ بین اور ہر شعبے کی تحقیقات کے ساتھ میرے ہمراہ کیا۔"

"ڈاکٹر سٹینلے بائڈ چرنگ کراس کے مشہور اور سینیر سرجن تھے اور وہ بادشاہ کے بھی آنریری سرجن تھے۔ تشخیص امراض اور فن سرجری میں لندن میں یہ مسلم اُستاد سمجھے جاتے تھے۔ میں اُنہی کا ہاؤس سرجن تھا۔ حکیم صاحب سے اُن کی ملاقات میں نے کرائی تھی۔ انہوں نے حکیم صاحب کو ہسپتال آنے کی دعوت دی۔ ایک مریض کے مرض کے متعلق مسٹر بائڈ طلبا کو سمجھا رہے تھے۔ حکیم صاحب سے بھی انہوں نے مریض کو دیکھنے اور تشخیص کرنے کی خواہش کی۔ بعد معائنہ حکیم صاحب نے یہ تشخیص کی کہ مریض کی آنتوں کے ابتدائی حصہ میں کہنہ زخم ہے جس کے باعث درد کی تکلیف اور حرارت تھی۔ ڈاکٹر بائڈ کی رائے میں وہ پت کی تھیلی کا ورم تھا۔ انہوں نے حکیم صاحب کو نہایت خلق اور اصرار سے دوسرے روز صبح کو اس مریض کے آپریشن کے وقت بلایا اور ہنس کر کہا کہ یہ طب یونانی اور انگریزی طب کا امتحان ہے، آپریشن سے پتہ چل جائے گا، کہ کون سی طب صحیح ہے۔ شکم چاک کرنے پر حکیم صاحب کی تشخیص صحیح نکلی اور ڈاکٹر بائڈ نے نہایت فیاضی اور کشادہ پیشانی کے ساتھ حکیم صاحب کو ان کی کامیابی پر مبارکباد دی۔"

تیسری مرتبہ ۱۹۲۵ء میں انہوں نے مختلف ممالک کی سیر کی۔ اس سفر میں ڈاکٹر انصاری بھی ساتھ تھے۔ ۲۲ اپریل ۱۹۲۵ء کو وہ پیرس پہونچے۔ ایک ماہ تک وہیں مقیم رہے۔ پیرس میں اُن کی ملاقات مشہور انقلابی مولوی برکت اللہ بھوپالی سے ہوئی جو پیرس میں پناہ گزین کی حیثیت سے ٹھہرے ہوئے تھے۔
پیرس کے دوران قیام میں حکیم صاحب نے سب سے زیادہ دلچسپی کتب خانوں کو دیکھنے میں لی۔ تمام نادر کتابوں کو انہوں نے بڑے غور سے دیکھا۔
پیرس میں حکیم صاحب نے ایک بہت ہی پیچیدہ مریض کا علاج کیا۔ یہ ایک عورت تھی جس کی ٹانگیں سکڑ گئی تھیں اور پیٹ میں درد تھا۔ مقامی ڈاکٹر بہت علاج کر چکے تھے۔ مریضہ کو آرام نہیں ہوا تھا۔ حکیم صاحب نے بہت تھوڑی مقدار میں ایک دوا کھانے کو دی جس سے اُسے حیرت انگیز فائدہ ہوا۔ دراصل اس کی آنتوں میں گرہ پڑ گئی تھی جو حکیم اجمل خاں کی دوا سے ٹھیک ہو گئی۔ مختلف مقامات کی سیر کرنے کے بعد وہ ہندوستان واپس آ گئے۔ ہندوستان پہونچنے کے بعد وہ پھر سیاسی ہنگاموں میں شریک ہو گئے، لیکن اس مصروفیت کو نباہ نہیں سکے اور خرابی صحت کے باعث جلسوں میں شرکت بند کر دی۔ دسمبر ۱۹۲۵ء میں کانگرس کا جو اجلاس ہوا اس میں وہ نہ جا سکے صرف پیغام بھیجدیا گیا۔

سے دلچسپی کم ہوگئی لیکن مطب کا سلسلہ جاری رہا طبیہ کالج کے مسائل پر بھی توجہ کرتے رہے ملک کی عام بیداری کے پیش نظر وہ طب یونانی کو وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا چاہتے تھے جولائی ۱۹۲۶ء میں حکیم صاحب نے طبیہ کالج میں شعبۂ تحقیقات قائم کیا۔ ملک کی مشہور اور ممتاز شخصیتیں اس کالج کی طرف متوجہ ہو چکی تھیں۔ شعبۂ تحقیقات ڈاکٹر سلیم الزماں کے سپرد کر دیا گیا۔ بدقسمتی سے ملک میں فرقہ وارانہ ذہنیت اُبھر آئی تھی۔ جگہ جگہ فسادات ہو رہے تھے۔ حکیم صاحب ان اندوہناک واقعات سے بے حد متاثر تھے انہوں نے انتقال سے کچھ پہلے سیاسیات سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ انہیں قلبی عوارض کی شکایت تھی۔ اس حالت میں بھی وہ طبیہ کالج، جامعہ ملیہ اور ہندو مسلم اتحاد کو اپنی زندگی کا مطمح نظر خیال کرتے تھے۔ اپریل ۱۹۲۷ء میں طبی کانفرنس کا اجلاس رام پور میں ہوا۔ یہ حکیم صاحب کی زندگی میں کانفرنس کا آخری اجلاس تھا ان کا پیمانہ حیات لبریز ہو چکا تھا بس چھلکنے ہی کی دیر تھی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے اس اجتماع کا نقشہ اپنی یادداشت میں نہایت موثر انداز میں کھینچا ہے وہ رقمطراز ہیں کہ

"آپ نے فرمایا کہ اپنی زندگی کا بہترین حصہ فن طب کی خدمت میں صرف کر کے اس کی بنیاد مضبوط قائم کر دی ہے۔ اب آئندہ آپ لوگوں کا یہ فرض ہے کہ اس کی مستحکم بنیاد پر عمارت بنا کر ہمیشہ کے لئے اس کو قائم رکھیں اور اس کی ترقی کے ذرائع پیدا کریں۔ سب سے آخر میں یہ فرماتے ہوئے اٹھے کہ مجھ کو اپنی زندگی کی اتنی امید بھی نہیں ہے کہ سال آئندہ کی کانفرنس میں شرکت کر سکوں۔"

اپنی موت کے متعلق حکیم صاحب کا خیال غلط نہیں تھا۔ رام پور ہی میں ان پر وجع القلب کا حملہ ہوا اور ۲۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کی صبح کو سوا دو بجے وہ دنیا سے رخصت ہو گئے اس وقت ان کی عمر ۴۹ سال کی تھی۔ یہ کوئی معمولی حادثہ نہ تھا۔ ایک دم ایسا محسوس ہوا جیسے سورج گرہن میں آ گیا۔ ہر طرف تاریکی سی چھا گئی۔ تمام مشاہیر قوم نے اس ماتم میں شرکت کی مہاتما گاندھی نے ۵ جنوری ۱۹۲۸ء کے ینگ انڈیا میں نہایت پرسوز اور پُراثر انداز میں خراج عقیدت پیش کیا۔ وہ لکھتے ہیں۔

حکیم جی کی موت نے مجھ سے صرف ایک دانشور اور ثابت قدم شریک کار ہی کو نہیں چھین لیا بلکہ میں نے ایک ایسا دوست کھو دیا جس پر میں ضرورت کے وقت اعتماد کر سکتا تھا۔ ہندو مسلم اتحاد کے معاملے میں وہ میرے مشیر اور رہنما تھے وہ انسانی فطرت کو پہچانتے تھے۔ اسی صلاحیت نے انہیں صحیح قوتِ فیصلہ عطا کی تھی۔ حکیم صاحب خیالی قسم کے انسان نہیں تھے وہ اپنے خوابوں کو حقیقت میں تبدیل کرنے کی قوت رکھتے تھے۔"

اُن کی موت تاریخ، روایت اور ایک دور کی موت تھی۔ وہ عام انسانی اوصاف کے لحاظ سے عظیم انسان اور اخلاقِ حسنہ کا نہایت خوبصورت پیکر تھے۔ بہت وضعدار، بامروت اور دوست پرست بھی تھے۔ اگرچہ بے حد سنجیدہ اور متین تھے مگر ظریفانہ حس بھی رکھتے تھے۔ ان کی ظرافت میں بھی سنجیدگی ہوا کرتی تھی۔ مہاتما گاندھی کے علاوہ ملک کے تمام مشاہیر نے حکیم اجمل خاں کی موت پر بہترین الفاظ میں اظہار ملال کیا، پھر ایک بار ان کی فنی اور قومی عظمت کا اعتراف ہندوستان کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے ۱۹۷۰ء میں انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن اینڈ میڈیکل ریسرچ کا افتتاح کرتے ہوئے بہت شاندار الفاظ میں کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ حکیم اجمل خاں صاحب صرف افراد کی بیماری کا علاج ہی نہیں کرتے تھے بلکہ انہوں نے قوم کی بیماری کا علاج کرنے کی بھی کوشش کی۔

حکیم اجمل خاں کے سینہ میں ایک درد مند دل تھا وہ اپنے ماحول کے ہر واقعہ سے متاثر ہوتے تھے۔ زندگی کے متعلق ان کا مشاہدہ بہت گہرا تھا انہوں نے نہایت شگفتہ اور موثر اشعار کہے ہیں۔ خاص طور پر فارسی میں وہ اپنے جذبات کو ظاہر کرنے کا نہایت اچھا سلیقہ رکھتے تھے۔ ان کا مجموعۂ کلام دیوان شیدا کے نام سے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی نگرانی میں ۱۳۴۲ھ میں شرکت کاویانی برلن سے شائع ہوا ہے۔ ضخامت ۱۱۲ صفحات ہے ہندوستان میں بھی اسی نام سے ان کا دیوان شائع ہو چکا ہے۔

یوپی کے قبائلی

امیر حسن

اگرچہ ہندوستان میں قبائلیوں کی آبادی کُل آبادی کی تقریبا ۶فی صد ہے، لیکن اُن کی زندگی رہائش اور کلچر کے بارے میں عام آدمی کی واقفیت افسوسناک حد تک کم ہے، افسانہ نگاروں، ناول نویسوں اور فلموں نے اُن کی زندگی کو عموماً رُومانی، جذباتی اور غیر حقیقی رنگ میں پیش کیا ہے اور اس کوشش میں انہوں نے اُن کی زندگی کے ٹھوس مسائل اور اُن کی تہذیب کے روشن پہلوؤں کو پس پشت ڈال دیا ہے۔

ہندوستان کے قبائلی اور خصوصاً یوپی کے قبائل ہماری توجہ کے مستحق ہیں اور ذیل کا مضمون اسی کوشش کا ایک حصّہ ہے۔

آبادی

یوپی میں قبائلی آبادی ۶ لاکھ کے قریب ہے۔ یہ لوگ صوبہ کے تین خاص حصّوں میں رہتے ہیں۔ صوبے کے شمال، مغربی کوہستانی علاقہ میں بھوٹیا، راجی، بورا، جونساری اور لنساری نام کے لوگ رہتے ہیں یہ لفظ جولنساری دہرہ دون ضلع کے جولنسار بھابھر پرگنے کے باشندوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ویسے ان میں خاص راجپوت خاص براہمن،

کاریگر لوگ اور ہر جن باشندے سب ہی شامل ہیں۔ پہاڑی قبائلیوں کی تعداد تقریباً پونے تین لاکھ ہے۔ ترائی اور بھابھر کے علاقہ میں تھارو اور بُکسا دو آدی واسی قومیں جن کی آبادی قریب پون لاکھ ہے، رہتی ہیں۔ تھارو گورکھپور سے لے کر نینی تال تک ترائی کے اضلاع میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بُکسا نینی تال کے بازپور کے علاقہ میں کثیر تعداد میں رہتے ہیں پوڑی گڑھوال، بجنور اور دہرہ دون میں بھی قلیل تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ جنوبی اتر پردیش کے علاقہ میں ڈھائی لاکھ سے بھی زیادہ کی تعداد میں اس ملک کے سب سے قدیم باشندوں کی فہرست میں آنے والے آدی واسی لوگ رہتے ہیں۔ ان میں کول، چیر، کھروار، کوروا، اگریا، سہاریا اور راواں خاص ہیں۔ پٹھاری۔ پرہیا، گھیا اور بھیل قومیں بھی کم تعداد میں پائی جاتی ہیں۔ کول بھیل۔ گونڈ اور سہاریا کو چھوڑ کر باقی تمام آدی واسی قومیں صرف مرزا پور اور اس سے ملحق وارانسی ضلع کے پٹھاری خطہ میں رہتی ہیں۔ سہاریا اور بھیل لوگوں کی آبادی صرف جھانسی میں محدود ہے۔ کول۔ مرزا پور اور وارانسی کے علاوہ باندہ اور الہ آباد میں بھی کافی تعداد میں رہتے ہیں۔ گونڈ خصوصاً مرزا پور میں

روانیں علاقے کی ایک کولتا لڑکی

رہتے ہیں مگر تھوڑی بہت آبادی باندہ اور جھانسی میں بھی ہے۔

نسل

کوہستانی علاقہ کے شمالی حصوں میں رہنے والے بھوٹیا اور راجی اور ترائی کے تھارو اور بکسا منگولی نسل کے ہیں۔ خاص راجپوت اور خاص برہمن اور کسی حد تک بوراوگ رُومی نسل سے تعلق رکھتے ہیں مگر اُن میں منگولی خون کی بھی کافی آمیزش ہے۔ جنوبی یوپی کی قومیں کولاری نسل کی ہیں جو کہ منڈا، دراوڑی، لسانی طبقے سے تعلق رکھتی ہیں۔ مگر سہاریا اور بھیل اوروں سے مختلف ہیں۔ ان کی ابتدا ہندی اور دراوڑی نسل کی مشترکہ قوموں سے ہوئی۔ اُن کے مذہبی فریضوں اور عقائد میں توہم پرستی، آسیب پرستی، جادو ٹونا، وغیرہ کو بہت دخل ہے زندگی کی تشکیل یا تخریب میں ان کا بہت بڑا رول ہوتا ہے۔ عموماً قبائلی لوگ نئے دیوی دیوتاؤں کو بخوشی قبول کر لیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اُن کے دیوتاؤں کی تعداد روز بہ روز بڑھ رہی ہے۔ عام طور سے ہندو مذہب کے کچھ چیدہ دیوتاؤں کے ساتھ اپنے خاص قدیم دیوی دیوتاؤں میں اعتقاد رکھتے ہیں۔ بھوٹیا۔ بابلا، چان سدھوا، کنشیاکرن وغیرہ دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہیں۔ جونساری لوگوں کے خاص دیوتا "بلے ناتھ، گنا ناتھ اور کھوسیا ہیں۔ تھارو مونے بابا، کنٹیار باگی بائی کی پوجا خاص طور سے کرتے ہیں۔ جنوبی یوپی کے مرزا پور کے رہنے والے قبایل میں راجہ چندول، برم بابا، مدھی، مائی اور ستیلا مائی کی پرستش عام ہے۔ باندہ ضلع کے کول رُام اور سیتا کے پرستار ہیں روایت کے مطابق رام، سیتا اور لکشمن نے اپنے زمانہ جلاوطنی میں کچھ عرصہ تک چترکوٹ میں جو کہ ... ائی علاقہ کی سرحد کے نزدیک واقع ہے قیام کیا تھا گو کہ بھیل اور سہاریا ... بگ آدی واسیوں سے کہیں زیادہ ہندو مذہب سے متاثر ہیں مگر اُن کے بھی کچھ خاص قبائلی دیوتا ہیں۔ دیوی دیوتاؤں سے رابطہ قائم رکھنے اور جھاڑ پھونک کے لئے تھاروؤں میں بھرا، اور مرزا پوری قبائل میں "بگیا" ... تے ہیں۔ اُن کی ذمہ داری ان دیوتاؤں کو خوش رکھنے کی بدرُوحوں اور ... بھوں سے گاؤں کی حفاظت کرنے کی اور مذہبی رسوم کو باقاعدگی کے ساتھ انجام دلانے کی ہوتی ہے۔

سماج میں نظم کو برقرار رکھنے اور آپسی مسائل کے تصفیہ کے لئے عام طور سے برادری کی پنچایت ہوتی ہے جس کے صدر کو چودھری یا مکھیا کہتے ہیں۔ تھاروں میں صدر کا نام پدھان اور بکسا لوگوں میں تخت ہے تخت کی مدد کے لئے منصف، داروغہ اور سپاہی بھی ہوتے ہیں۔ پنچایتوں کو تسلیم کرنا لازمی ہے۔ جائداد کے وارث مرد ہی ہوتے ہیں۔ بڑے لڑکے کو کچھ زیادہ حصہ ملتا ہے۔ جسے تھارو 'جھٹواس' کہتے ہیں۔ منقولہ جائداد کا کچھ حصہ بیوی اور لڑکیوں کو بھی مل جاتا ہے۔

جائداد کی حقدار نہ ہوتے ہوئے بھی خواتین خاندان اور سماج میں بہت اہم مقام رکھتی ہیں جس کی خاص وجہ ان کا مردوں کی طرح کماؤ ہونا ہے۔ گھر کے سارے کام تو کرتی ہی ہیں۔ زراعت و مویشی پالنے میں بھی وہ مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں۔ کچھ قبائل کے لئے مشہور ہے کہ ان کے مرد، زن مرید ہوتے ہیں۔ تھارو عورتیں چتوڑ کی رانیوں کی اولاد ہونے کا

تھارو بچے

دعویٰ کرتی ہیں وہ کہتی ہیں کہ مغلوں کے زمانے میں چتوڑ کی کسی لڑائی میں سارے مردوں کے ہلاک ہونے کے بعد رانیاں محافظ سپاہیوں اور خادموں کے ہمراہ ترائی کے جنگلات میں بھاگ کر پناہ گزین ہوئیں کچھ عرصہ کے بعد انقلاب زمانہ کے تحت راجپوت راجکماریوں کی شادیاں خادموں اور سپاہیوں سے ہوگئیں۔ اور انہی کی اولاد تھارو کے نام سے موسوم ہوئی یہ ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ جہاں تھارو عورتیں خوبصورت اور پُروقار ہوتی ہیں، مرد معمولی شکل و صورت کے منکسر المزاج ہوتے ہیں لیکن تھاروں کے نسلاً راجپوت ہونے کی بات محض حکایت کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ جیسا پہلے

ذکر آچکا ہے یہ لوگ دراصل منگولائی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے. کچھ قبائلی اپنی لڑکیوں کی شادی کمسنی میں کرنے لگے ہیں. مگر بھوٹیا. راجی اور بھیل وغیرہ اب بھی سن بلوغ پر پہونچنے کے بعد ہی لڑکیوں کی شادی کرتے ہیں. بھوٹیا لوگوں میں " رنگ بنگ " نام کا ایک ادارہ تھا. جہاں غیر شادی شدہ لڑکے اور لڑکیاں بلا روک ٹوک رقص و سرود کے لئے ملاقات کرتے تھے. یہ ادارہ موجودہ کلبوں سے کافی مشابہ تھا جن کا خاص مقصد ممبران کے لئے تفریح طبع کا سامان مہیا کرنا تھا. مگر ساتھ ہی ساتھ "رنگ بنگ" کے کچھ قواعد اور حدود تھے. جن کے اندر ممبران کو رہنا اور عمل کرنا پڑتا تھا. اس ادارہ کے ذریعہ بھوٹیا لڑکے اور لڑکیوں کو اپنے شریک حیات کے انتخاب میں بڑی مدد ملتی تھی. ساتھ ہی ساتھ جنسیات کی مزدوری اور ابتدائی ٹریننگ بھی مل جایا کرتی تھی. مگر گزشتہ چند سالوں میں مصلحوں اور ناصحوں کی نظر عنایت سے یہ ادارہ زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہے.

دہرہ دون کے جونسار بھابھر کے علاقہ میں ایک عورت کے کئی شوہر ہوتے ہیں. ایسا رواج اس علاقہ سے ملحق اتر کاشی کے روائیں اور شہری گڑھوال کے جونپور علاقے میں بھی ہے. رواج کے مطابق کئی بھائیوں کی ایک یا ایک سے زیادہ بیویاں ہوتی ہیں. کسی ایک بھائی کو کسی ایک بیوی پر اختیار کلی نہیں ہوتا ہے. مگر اب یہ طریقہ کم ہوتا جا رہا ہے.

اس سماج میں لڑکیوں کو شادی سے قبل اور بیویوں کو اپنے مائیکے میں کافی جنسی آزادی ہوتی ہے. عارضی جنسی تعلقات اور معاشقے کو سوسائٹی عموماً نظر انداز کر دیتی ہے.

قبائلی لوگوں کے اور بھی بہت سے مسائل ہیں. اُن میں خوش حالی کے ساتھ ساتھ تعلیم کا بھی فقدان ہے. بیماریوں کے علاج کے لئے معقول شفاخانہ اور ڈسپنسریاں کم ہیں. نقل و حرکت کے لئے سڑکوں کی کمی ان ترقی میں حارج ہے. پینے کا صاف پانی اکثر علاقوں میں کمیاب ہے. ان سب دشواریوں کی طرف حکومت توجہ دے رہی ہے. مگر اب بھی بہت کچھ کرنا باقی ہے. ملک کی متوازن ترقی کے لئے قبائلی لوگوں کو دوسرے لوگوں کی معاشی سطح پر لانا ضروری ہے. اس کام میں سماجی کارکنوں اور انجمنوں کو بھی ہاتھ بٹانا چاہئے●

شکیب ایاز

سر رکھتے ہی تکئے پہ یہ محسوس ہوا ہے
آہستہ سرہانے میں کوئی بول رہا ہے

بکھری تو ہواؤں نے کھڑے کان کئے ہیں
ڈھائے ہوئے مینارے کی یہ گونگی صدا ہے

ساون کی اُمس آج کے انساں کا مقدر
جو کھل کے نہ برسے یہ وہی کالی گھٹا ہے

نظروں سے تحیر کی کرن پھوٹ رہی ہے
آئینے کا معصوم بدن کانپ رہا ہے

مُلزم کی طرح شام کٹہرے میں کھڑی ہے
مغرب ہے یہ۔ سُورج کا یہیں قتل ہوا ہے

گرنے لگے دیواروں سے خوابوں کے کلنڈر
دروازہ لگا دو کہ بہت تیز ہوا ہے

بچوں کی پیدائش میں وقفہ کیلئے

فی زمانہ بچوں کی پیدائش اتفاق کی بات نہیں۔ یہ آپ کے اختیار میں ہے۔ نرودھ استعمال کرنے سے آپ کے بچے تبھی ہونگے جب آپ چاہیں گے، اتفاق سے نہیں۔

بچہ اور ماں کی صحت کیلئے

ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ بچے کو شروع کے تین برسوں میں زیادہ توجہ درکار ہوتی ہے۔ پھر بچے کی پیدائش کے بعد ماں کو اپنی صحت بحال کرنے میں بھی وقت لگتا ہے۔ نرودھ استعمال کرکے آپ اگلے بچے کی پیدائش ملتوی کرسکتے ہیں۔

نرودھ (کنڈوم)، اعلیٰ کوالٹی کے ربڑ سے بنتا ہے۔ دنیا بھر میں لوگ اسے استعمال کرتے ہیں کیونکہ یہ فیملی پلاننگ کا آسان و محفوظ طریقہ ہے۔ اس کے استعمال سے صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا۔

نرودھ ہر جگہ ملتا ہے۔
پروویژن اسٹور، کرانہ فروش، کیمسٹ، جنرل مرچنٹ، پان فروش وغیرہ کی دوکانوں پر بکتا ہے۔

صرف 5 پیسے خرچ کرکے آپ اپنے کنبے کو محدود رکھنے کی طاقت حاصل کرسکتے ہیں

نرودھ استعمال کیجئے

فیملی پلاننگ کیلئے
اعلیٰ کوالٹی کے ربڑ کنڈوم
15 پیسے کے 3
سرکاری امداد سے کم دام

خالد رحیم

زخم کو پھول کہو، درد کو خوشبو سمجھو
دل کو صحرا کا بھٹکتا ہوا آہو سمجھو

دھوپ کی شعلہ فشانی سے پریشاں کیوں ہو
یادِ محبوب کو بھی سایۂ گیسو سمجھو

رات کو اپنے خیالوں کا دریچہ مانو
چاند کو چاند نہیں، ایک پری رو سمجھو

اپنی انگڑائیاں آئینے میں دیکھو تو ذرا
کیا ہے نوخیز خط و خال کا جادو سمجھو

جس کی آغوش میں کھلتے ہیں محبت کے کنول
ایسے ہر شعلے کو محبوب کا پہلو سمجھو

شب کی آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے موتی ہیں
اے شگوفو! انہیں شبنم نہیں، آنسو سمجھو

ظلمتِ شب سے ہو کیوں اتنے ہراساں خالدؔ
زندگی کو نہیں کچھ اور تو جگنو سمجھو

قسیم الحق گیاوی

نئی فضا ہے نئی بزم ہے دماغ نئے
جلاؤ دوستو محفل میں اب چراغ نئے

اُجاڑ اُجاڑ سا ہے گلشنِ حیات تمام
اُٹھو کہ ہم کو لگانے ہیں اب تو باغ نئے

پُرانے جام و سبو کو اُٹھا دے اے ساقی
کہ مے نئی ہے تو پھر کیوں نہ ہوں ایاغ نئے

نہ منزلوں کا پتہ ہے نہ کارواں ہے کوئی
نئی ہے راہ، نئے راہرو، سراغ نئے

عجیب رنگ ہے صحنِ چمن کا آج قسیمؔ
کہ بلبلوں کے مقابل ہیں اب تو زاغ نئے

صبا نقوی

یہ رندی و مستی کے قصے، یہ بادہ و ساغر کی باتیں
اے شیخِ حرم ہیں تیرے لئے امکان سے باہر کی باتیں

معلوم نہیں پھر کیوں انساں مجبورِ گنہ ہو جاتا ہے
کیا جھوٹ ہیں جنت کے وعدے کیا خواب ہیں کوثر کی باتیں

بے مول ہے جنس مہر و وفا، بازارِ تمدن میں پھر بھی
کیوں چاہنے والے کرتے ہیں اخلاص کے جوہر کی باتیں

آنکھوں میں چھلکتے ہیں آنسو، ہونٹوں پہ ہنسی لہراتی ہے
جب رات گئے دیوانوں کو یاد آتی ہیں دن بھر کی باتیں

میزانِ دلِ انساں میں صباؔ کیا فرض و محبت کو تولیں
جب اپنے بہلنے کا ساماں ہوں حسن کے پیکر کی باتیں

نازالملکہ

سونے کے کمرے کی کھڑکی کے شیشے پر گھبراہٹ آمیز دستکوں سے نیند ٹوٹ
اور میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اچانک بتی جلائی تو اپنی بہن سمیا کو پلنگ کے پاس والی
ڑکی سے منہ سٹائے دیکھا۔

"سائرن!" اُس نے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

ایک لمحہ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ پھر اچانک ساری بات سمجھ
آگئی میں نے فیصلہ کیا کہ اب یہاں سے بہت جلد بھاگ چلنا چاہیے

کپڑے بدلتے ہوئے میں نے ان تمام چیزوں پر نظر ڈالی جو مجھے بے حد
زیز تھی۔ میں نے بچپن سے انہیں کس طرح سنوارا اور نکھارا تھا۔ اب وہ میری شخصیت
حصہ بن چکی تھیں۔ چاروں طرف ہر چیز میری تھی — مگر میں اپنے ہاتھ میں
ایک کمبل اور تکیہ لئے بھاگ رہی تھی۔

سائرن کی چیخ، گولیوں کی آواز اور دور کہیں گرتے گولے کے دھماکے
سن رہی تھی۔ دل میں ٹیس سی اٹھی۔

کمرے کو چھوڑتے چھوڑتے میں نے سونے کی زنجیر سے لٹکی قرآن کی ایک ننھی
سی سے اٹھالی۔ یہ میری اماں کی آخری یادگار تھی۔ میں نے اُسے گلے میں لٹکا
بتی آف کر دی۔ باہر نکل کر ایک لمحہ میں نے سوچا کمرے کو لاک کر دوں!
ہی دیر بعد یہ گھر میرا نہیں رہ جائے گا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں میں نے اس
لگا ہی دیا۔

تالے میں کنجی گھماتے وقت لگا ہے۔ سارے فلسطین کا دروازہ بند کر رہی
ہوں۔ دروازے کی سرد چوکھٹ کے سہارے میں نے اپنا رخسار ٹکا دیا اور
سسک سسک کر رو اٹھی۔

میرے پیچھے سے ہلکے قدموں کی آہٹ آئی۔ وہ ننھا وسیم تھا اس
کی صاف شفاف آنکھوں میں حیرانی اور پریشانی صاف جھلک رہی تھی۔

میں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ صرف دھیرے سے اُسے گود میں اٹھایا اور چوم لیا۔
اسے سینے سے لگاتے ہوئے میں نے سوچا۔ جب تک ہم ساتھ ہیں،
ان تمام چیزوں کی جنھیں ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں، کوئی اہمیت نہیں۔ میں نے
بچے کے معصوم مکھڑے کی طرف دیکھا۔ اُسے کیا معلوم کہ وہ کسی نامعلوم تاریک
مستقبل کی طرف جا رہا ہے۔

باہر باقی لوگ تاریکی میں ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ہر ایک کے پاس
صرف ایک کمبل اور تکیہ تھا گھوڑی پر زین کسی جا چکی تھی۔ اور اس کے اوپر
کچھ کھانے پینے کے سامان، پانی کا برتن اور میرے دونوں چھوٹے بھتیجوں کے
کپڑوں کا بوجھ لدا تھا۔

— سب اپنی چیزوں کو خود لے کر چلو۔ گھوڑوں پر زیادہ وزن مت ڈالو۔
آگے! میں — آپا؟ وسیم نے تتلا کر پوچھا۔

وسیم نے کچھ نہ کچھ لے کر چلنے کی ضد کی۔ اس کی ماں نے رائے دی کہ وہ
اپنا لکڑی کا گھوڑا لے لے لیکن وہ اسمار کی دودھ پینے کی شیشی لے کر چلنے کی
ضد کر رہا تھا۔

"نہیں نہیں! اس کی ماں چلائی تم توڑ دو گے۔ پھر اسما کو بھوکی رہنا پڑے گا۔"

وہ ضد کرتا ہوا رو پڑا۔ ابا نے اسے پیار سے گود میں لے لیا۔
"ارے۔ بہادر بچے کہیں روتے ہیں!"

آخر طے ہوا کہ بوتل اُسے دیدی جائے کیونکہ کاکی کی جیب میں ایک بوتل تھی۔

اس سارے ماحول نے میرے قد آور مست مولا چچیرے بھائی کمال کو جسے گاؤں کی حفاظت کے لئے دوسرے لوگوں کے ساتھ یہیں رہ جانا تھا عجیب طرح سے پریشان کر دیا۔ اس نے حکم بھرے لہجے میں کہا —

اب آپ لوگ جلئے! "خدا حافظ!"

پھر کچھ بلند آواز میں بولا" آپ لوگ ضرور واپس آئیں گے۔ اپنی زمین ہم کسی بھی قیمت پر چھننے نہیں دیں گے۔ یہودیوں کو کیا، ہم خدا کو بھی نہیں دیں گے!"

سمیا اوپری منزل سے کتابوں کا ایک بنڈل لئے ٹپکتی ہوئی آئی — میں اُنہیں چھوڑ نہیں سکتی! اس نے معافی مانگنے کے انداز میں لجاجت سے کہا۔ بحث کرنے کا وقت نہ تھا اس لئے میں بھی اس کا ہاتھ بٹانے لگی تاکہ کچھ تو وقت بچے۔

"ہمیں چلنا چاہئے! سہمے ہوئے لہجے میں ادھر اُدھر جھانکتے ہوئے میں نے کہا۔ دیکھو وہ پاس آتے جا رہے ہیں۔ آہٹ کتنی صاف سنائی دے رہی ہے"

رات کے گہرے اندھیرے میں ہم نکل پڑے۔ کسی کے پاس کچھ بھی تو سامان نہ تھا۔ سوائے ایک کمبل اور تکئے کے۔

ہم چپ چاپ چل رہے تھے جنوبی سمت میں مصری چوکیوں کی طرف — لمحہ بھر میں ہم لوگ ذوفرد بے گھر پناہ گزین ہو گئے تھے۔

ہمارے قدم تھکے اور بوجھل تھے۔ ہمیں کچھ عجیب طرح سے احساس ہوا۔ جیسے یہ زمین اب ہماری نہ رہی۔ سر جھکائے اور مضمحل ہم آگے بڑھ رہے تھے جیسے ہم اِن تمام لوگوں کے دکھ اور تکلیفوں کا بوجھ ڈھو رہے تھے جنہیں روئے زمین نے اب تک بے گھر کیا گیا ہو۔

آس پاس کچھ آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہمارے پڑوسی بھی اپنے گھر چھوڑ رہے تھے۔ ہر خاندان ایک چھوٹی لالٹین لے تھا۔ ان لالٹینوں کی گنتی سے بے گھر لوگوں کے خاندان کی تعداد آسانی سے بتائی جا سکتی تھی۔

ہم لوگ ایک ویران سنسان علاقے سے گزر رہے تھے۔ ہر طرف گھور اندھیرا تھا۔ اچانک میری چھوٹی بہن ہدیٰ نے ایک بھیانک چیخ ماری اندھیرے میں ہم بوکھلا اٹھے۔ آگ کی ایک دہکتی گیند نے ہماری آنکھیں چکا چوند کر دیں۔ ایک بھیانک دھماکہ ہوا۔ آگ کا فوارا آسمان کی طرف اُچھلا اور ہم نے اپنے چہروں پر ایک جلن محسوس کی۔ اس سے پہلے کہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ کیا ہو رہا ہے سمیر بھیانک آواز میں چلایا۔ وسیم!!!

ہم نے پاگلوں کی طرح اس کے کپڑے میں لگی آگ بجھانے کی کوشش کی۔ ابا نے اُسے اپنے سینے میں لپیٹ لیا۔ وہ بُری طرح گھائل ہو چکا تھا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کا بچنا ممکن نہیں۔ وہ بار بار چیخ چیخ کر "اماں اماں" پکار رہا تھا۔

داہنی جانب — سمیا نے گھبراتے ہوئے اشارہ کیا۔ پٹرول پمپ میں آگ لگ گئی تھی!

ہم لوگ بے تحاشہ بھاگ رہے تھے۔ ابا اپنی بوڑھی باہوں میں وسیم کو اٹھائے ہوئے تھے۔ وہ پہلا شکار تھا۔ میدان جنگ میں کھیت ہونے والا — پہلا سپاہی!

ہم بھاگتے بھاگتے ایک پہاڑی پر پہونچے۔ جہاں ہم اپنے کو آگ سے زیادہ محفوظ محسوس کر رہے تھے۔ ننھے وسیم کا حال معلوم کرنے کے لئے ہم سب ابا کو گھیرے ہوئے تھے۔ ابا کے لبادے میں لپٹا وہ آخری سانسیں گن رہا تھا! اس کی دونوں معصوم آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ گالوں پر آنسوں ڈھلک رہے تھے۔ وہ رہ رہ کر کانپ رہا تھا۔ کچھ کہنے کے لئے اس کے چھوٹے چھوٹے ہونٹ پھڑک رہے تھے۔ لیکن آواز نکل نہ پا رہی تھی۔

اس کی گھومتی نظریں اپنی ماں کے چہرے پر آکر ٹھہر گئیں۔ ہاجرہ نے آنسو بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ بولنے کی کوشش نہ کرو میرے بیٹے! اس کا گلا بھر آیا اور وہ رونے لگی۔

بچے نے بڑی کوشش سے جس میں اُسے بے حد تکلیف ہو رہی تھی اپنا ہاتھ جو ابا کے لبادے میں چھپا تھا، آگے بڑھایا۔ اکھڑے ہوئے اور ٹوٹے پھوٹے لہجے میں بڑبڑایا — "دیکھو اماں، میں نے اسے توڑا نہیں۔"

اُسے زوروں کی ایک کپکپی آئی۔ اس کا جسم سکڑنے لگا۔ دھیرے دھیرے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے۔ پھر اس کی آنکھیں مند گئیں۔

(بقیہ ص ۴۰)

شمالی ویت نام

تابوت سے گہوارے تک

مائی نگو

بوڑھے اندھے کی جھونپڑی بانسوں کے جنگل میں تھی۔ خود اس کی جھونپڑی بھی بانسوں کی بنی اور بانسوں سے چھائی ہوئی تھی۔ اور چاروں طرف بھی بانس ہی بانس تھے — اونچے اونچے بھورے رنگ کے، موٹے، سخت مضبوط اور نیچے نیچے، سبز رنگ کے، پتلے پتلے، ملائم نرم، لچکدار — ان ہی بانسوں میں بہت سے لق لقوں نے اپنے گھونسلے بنا رکھے تھے اور جھٹ پٹے کے وقت سب نر مادائیں اُن کے بچے اتنا شور مچاتے لڑتے اور پھڑ پھڑاتے کہ سامنے والے چشمے پر ایک ہنگامہ سا مچا رہتا۔ بانسوں کے پتے اُن کی بیٹ سے سفید ہوجاتے اور پھر جب خزاں کا موسم آتا تو اتنے پتے جھڑتے کہ اندھے کی جھونپڑی کی چھت ڈھک جاتی —

اسی جھونپڑی کے پاس وہ جگہ تھی جہاں بھینسے چرانے والے لڑکے چشمہ پر نہایا کرتے تھے، اُس کنارے پر ایک سوکھا پیپل کا پیڑ کھڑا تھا، جس کی صرف دو شاخیں تھیں جو اِدھر اُدھر نکلی ہوئی تھیں، بیچ سے تنا جھک گیا تھا — اور دُور سے ایسا لگتا تھا کہ جیسے کوئی آدمی دو زانو ہو کر اپنا سر کٹوانے کے لئے تیار، دونوں ہاتھ اٹھائے فریاد کر رہا ہے۔ لوگ کہتے تھے کہ اس پار کے اُس پیپل اور اس پار کے اس بوڑھے اندھے کی عمر ایک ہی تھی!

اندھا بوڑھا نہ جانے کب سے یہاں رہتا تھا، اب سے کوئی پندرہ سال پہلے، جب اُس کی عمر ستر برس کے قریب تھی تب ایک روز جاڑوں کی ایک رات میں کچھ بھک منگوں نے اس کی جھونپڑی میں پناہ لی تھی اور صبح کو اُن کے جانے کے بعد بوڑھے نے دیکھا کہ وہ لوگ ایک کونے میں ایک ننھی سی بچی کو سوتا چھوڑ گئے تھے۔ اس وقت اندھے کو تھوڑا تھوڑا سجھائی دیتا تھا۔ اُس نے بچی کو گود میں اٹھایا تو وہ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ تھی، شاید وہ اسی لئے اس کو چھوڑ گئے تھے کہ اس کے مرنے میں بس ذرا ہی سی کسر باقی تھی — مگر اب بوڑھا اس کو رکھنے کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا: بچی کے آجانے سے سنسان جھونپڑی میں جیسے جان سی پڑ گئی۔ اب تک وہ بالکل تنہا رہتا آیا تھا۔ جوانی میں اُس نے ایک آدھ بار عشق لڑانے کی کوشش کی تھی مگر وہ اتنا مفلس تھا کہ کسی عورت نے اس کی بیوی بننا پسند نہیں کیا۔

وہ دراصل گاؤں کا رہنے والا بھی نہیں تھا، کہیں باہر سے آیا تھا اُس کے پاس کچھ اوزار تھے، بڑھئی کا تھوڑا بہت کام کر لیتا تھا۔
مگر کام بھی یہاں کیا تھا۔ کبھی بانس کی کوئی کرسی بنا دی، کبھی کوئی دیمک لگا پلنگ یا پایہ ٹوٹی کرسی مرمت کر دی اور بس۔

پھر ایک دن ایک عورت آئی اور اُس نے اُسے ایک نئی چیز بنانے کا آرڈر دیا مگر وہ اس آرڈر سے مطلق خوش نہ ہوا بلکہ اُسے کوفت ہوئی کیونکہ وہ اپنے بدنصیب بچے کے لئے چار ہاتھ لمبا تابوت بنوانا چاہتی تھی۔ بوڑھا نہیں چاہتا تھا کہ اس کے ہاتھوں سے کوئی ایسی چیز بنے جو ہمیشہ کے لئے مٹی میں دفن ہوجائے۔ اس لئے اس نے انکار کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ عورت بے چاری اتنا روئی پیٹی اور اس نے بوڑھے کی اتنی خوشامدیں کیں کہ آخر وہ راضی ہوگیا — اور اس کے بعد تابوتوں کا سلسلہ چل پڑا۔ فرانسیسی شہنشاہیت کے دور میں جتنے بچے پیدا ہوتے تھے اس کی آدھی تعداد موت کا شکار ہوتی تھی! رفتہ رفتہ بوڑھا بڑھئی بچوں کے تابوت بنانے کا ماہر ہو گیا

جانے لگا۔ اور اسی کی آمدنی سے وہ ننھی سی بچی پلنے لگی جو بن بلائے اُس کے گھر آگئی تھی، اب جسے اس کی بیٹی بن گئی تھی۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ لوگ پرانے تابوت لے آتے جو انہوں نے قبرستان کی زمین کھود کر حاصل کئے تھے یا دیمک لگے ہوئے پلنگ کا کواڑ، کے ٹکڑے ہوئے پلنے جا فریاں اور پارٹیشن ـــ اور اُس کے ہاتھوں میں آکر وہ بہترین تابوتوں کی شکل اختیار کر جاتے۔ بوڑھا بڑھئی دوسروں کے غموں سے گھرا اپنی فنکاری کا مظاہرہ کرتا اور اس کی چھوٹی سی جھونپڑی ہمیشہ اور ول کے دُکھ بھرے آنسوؤں سے نمناک رہتی۔ اسے کبھی کسی کی مسکراہٹ نصیب نہ ہوتی اور اس کا دل ایسا بکھرا ہوا رہتا جیسے گوڑا ہوا مگر ویران کھیت جیسے بھورے پانی برسانے والے بادل کا وہ ٹکڑا جسے تیز ہواؤں نے تتر بتر کر دیا ہو گا۔ بدات کو اس کو خوابوں میں دکھائی دیتا کہ ننھے منے ہنستے گاتے کودتے اچھلتے بچوں کا ایک گروہ اُسے چاروں طرف سے گھیرے ہے، پھر پلک جھپکنے میں سب کے سب زمین پر گر کر تڑپنے لگے، اُن کے ننھے منے دل بیٹھنے لگے اور بیٹھتے بیٹھتے بالکل بیٹھ گئے اور وہ ساکت اور بے جان ہو گئے، پھر اُن کی لاشیں تابوتوں میں رکھی جانے لگیں جو اُس نے بنائے تھے، اُن کی مائیں اُن کی طرف ہاتھ پھیلائے روتی پیٹتی دوڑ رہی ہیں مگر موت کا ظالم ہاتھ اُن سے کہیں زیادہ مضبوط ہے ـــ اندھیرا ہے، پھوار پڑ رہی ہے اور لوگ اپنے بچوں کے تابوت کندھوں پر اٹھائے کیچڑ بھرے، راستے پر سے جا رہے ہیں جس پر گھُپ اندھیارا ہے اور جو راستہ کبھی ختم ہی ہونے میں نہیں آتا۔

اس سال جاڑوں کے موسم میں اُس کے اور آس پاس کے گاؤں میں چیچک کی وبا پھیلی، اتنے بچے مرے کہ ٹھیک سے دفن ہونے کی بھی مہلت نہ ملتی تھی۔ نہ جانے کتنے بغیر تابوتوں کے دفن کر دیئے گئے۔ بہت سے مرے ہوئے بلکہ مرتے ہوئے بچوں کو بھی اسی راستے سے قبرستان کی طرف لیجایا جاتا رہا، جو بوڑھے کی جھونپڑی کے پچھواڑے سے نکلتا تھا۔ رات کو بوڑھے کی یہ بھی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ جھونپڑی میں چراغ جلائے، اندھیرے میں گھٹنوں پر سر رکھے وہ ساری ساری رات بیٹھے بیٹھے کاٹ دیتا تھا۔ مرنے والوں کی کراہیں، چیخیں، رونے والوں کی آہ و بکا ایسی لگتی تھی جیسے قبرستان میں جنگلی بلیاں رو رہی ہوں بوڑھے کی منہ بولی بیٹی بھی چیچک میں مبتلا ہو گئی۔ بوڑھے نے بانس کی کھپچیوں سے ایک ٹوکری سی بنائی اور اُس میں اُسے لٹا کر کیلے کے پتوں سے ڈھک دیا۔ ننھی سی بچی کی سانس مشکل سے آجا رہی تھی۔ کھانسی کے دھچکے اُس کے سارے وجود کو جھنجھوڑے ڈالتے تھے۔ بوڑھے کا کھانا پینا چھوٹ گیا۔ اس کی ٹوکری پر وہ سر نہوڑائے آنسو بہایا کرتا۔ کیا اُس کی قسمت میں یہی لکھا تھا کہ وہ اپنی بچی کا تابوت بنائے! کیسے وہ چیچک سے زندہ بچ گئی۔ یہ ایک معجزہ تھا بیماری نے اس کے چہرے پر اور جسم پر گہرے نشان ڈال دیئے۔ وہ سوکھ کر کانٹا ہو گئی مگر نہ جانے کیسے وہ مری نہیں۔

پھر جب اُس میں ذرا سی طاقت آگئی تو بوڑھے نے اُسے اٹھایا، اپنے کندھے پر باندھا۔ ہاتھوں میں اپنے اوزار اور کچھ چیتھڑے گدڑے تھے وہ اُٹھائے اور شہر کی طرف چلا گیا۔

اگست انقلاب کی کامیابی کے بعد وہ پھر گاؤں لوٹا جدوجہد آزادی کا پانچواں سال تھا۔ اس چھوٹی سی ندی کے پار والے کنارے پر وہ پیپل کا پیڑ ابھی تک تھا مگر دشمن نے اس کے دونوں ہاتھ کاٹ کر اس کے تنے پر اپنی مشین گن جمائی تھی۔ اور اُس سے وہ بوڑھے کے گاؤں پر گولیاں برساتے تھے۔ بوڑھا گاؤں پہونچا ہی تھا کہ بانسوں کے اس جنگل میں ایک گولہ پھٹا اور وہ اندھا ہو گیا۔ اب وہ اپنے کاریگر ہاتھوں کے استعمال سے معذور ہو گیا۔ اور اپنی بچی کی محنت پر بسر کرنے پر مجبور ہوا۔ وہ اب بڑی ہو چکی تھی، اس کے چہرے پر چیچک کے داغ تو ضرور تھے مگر وہ محنتی، ذہین اور ملنسار لڑکی تھی۔ کھیتوں یا گھروں میں محنت کر کے وہ اتنا لے آتی تھی کہ وہ اپنا اور اپنے اندھے باپ کا پیٹ پال سکے۔ گاؤں میں جو آزادی کمیٹی بنی تھی اس کے لئے پیغام رسانی کا کام بھی کرتی تھی، گوریلا سپاہیوں کی رہبری کرنا بھی اس کا کام تھا اور راتوں کے اندھیرے میں سپاہیوں کے لئے کشتی کھینا بھی اس کے ذمہ تھا۔

دھیرے دھیرے بوڑھا اپنی قسمت پر شاکر ہو گیا اُس کی جھونپڑی گوریلا نوجوانوں کی پناہ گاہ بن گئی اور وہ اُن کی خدمت میں لگ گیا۔ اس میں ایسی گہری کھائیاں بھی وہ کھودتا تھا جس میں دشمن کے حملے کے وقت سپاہی پناہ لے سکیں۔ اس کے لئے رات و دن برابر تھے۔ آنکھوں کا نور کھو جانے کے بعد اُسے تاریکی سے کیوں گھبراہٹ ہوتی! وہ رات کو دریا پر کشتی کھیتا تھا۔

امن قائم ہو جانے کے ساتھ ہی گاؤں کمیٹی نے سب سے پہلے اسکول

اور ہسپتال قائم کرنے شروع کئے۔ بوڑھے کی بیٹی کو دائی کا کام سکھانے کی ٹریننگ لینے کے لئے بھیجا گیا اور وہ اسے پورا کرکے واپس آئی تو گاؤں کے زچہ خانے کی نگران بنادی گئی۔

بوڑھے کی جھونپڑی کے پیچھے جو انتظار گھر تھا اور جہاں بچوں کی لاشیں دفن سے پہلے رکھی جاتی تھیں، وہ دشمنوں کے ہوائی حملوں سے کھنڈر ہوگیا تھا، گاؤں کمیٹی کے والنٹیروں نے مل کر اس کے ملبے سے ایک نئی عمارت کھڑی کی — دو کمروں کا ایک نیا مکان، جس کی اینٹوں کو باہر سے لال رنگا گیا۔ اندر سے سفید پتائی کی گئی اور اس پر ایک بڑا سا سائن بورڈ لگایا گیا — "زچہ خانہ" !

بوڑھے کی لڑکی اس زچہ خانے میں کام کرنے لگی۔ صبح سے شام تک وہ اپنا سفید لباس پہنے، ہاتھ میں قینچی نشتر سوئی کا بکس سنبھالے اپنے بلاوز ایسی سفید روئی کا بنڈل اٹھائے تیز تیز ادھر اُدھر گھومتی رہتی تھی، پُرانے نظام نے اس کے جسم پر گہرے داغ اور نشان چھوڑے تھے مگر اس کی رُوح تھی پاک اور صاف! اور بچوں کو جنم دینے والی ماؤں کو اس کی صورت سے بھلا کیا لینا تھا۔

امن ہوتے ہی بچوں کی تعداد بڑھتی گئی اور بوڑھے کے کان میں اکثر بچوں کے رونے کی آوازیں آنے لگیں، وہ ابھی تک اپنی جھونپڑی میں رہتا تھا، وہی جھونپڑی جو بانسوں کے گھنے جنگل کی آغوش میں تھی، ڈھیروں تلیئے اب بھی آکر بانسوں کے جھنڈ پر بیٹھتے تھے اور چاروں طرف کی ہریالی ان کی بیٹ سے سفید ہوجایا کرتی تھی۔ مگر بچوں کا رونا اب اور طرح کا ہوتا تھا۔ تکلیف اور موت کی وہ کراہیں اب نہیں سنائی دیتی تھیں۔ بلکہ بچہ ماں کے جسم سے باہر آکر ایک گہری سانس لے کر زور سے چیختا تھا۔ وہ چیخ ایک پرسکون صبح کی آمد پر شہنائی کی تان ایسی لگتی تھی۔ جب انسان پہلی بار زندگی کو سلام کرتا ہے۔ اپنے وطن اور پوری انسانیت اور ناپیداکنار فضاؤں کو صدا دیتا ہے! بچے کی آنکھ کھلتی اور ایک روشن مستقبل کے نور سے چمچا کے پھر بند ہوجاتی۔ اور کمرے میں اس کی پکار گونجنے لگتی۔ اور تھکی ہاری ماں اپنے بچے کی پہلی آواز سُن کر اطمینان کا سانس لیتی۔

پھر ایک دن بوڑھے نے ایک نرم نرم ڈالیوں والے بانس کے پیڑ کو کاٹا — اُسے مچھلی پکڑنے کے لئے ایک ٹوکری بنائی تھی۔ اِدھر چند دنوں سے دریا کی سطح پر گھاس پھوس اکٹھا ہونا شروع ہوگیا تھا جس کے معنی یہ تھے کہ مچھلیاں اور جھینگے آنے شروع ہوگئے تھے — وہ مچھلی پکڑنے جائے گا، اب ٹوکری تقریباً تیار ہورہی تھی۔ اُس کا قطر اتنا بڑا تھا جتنے اس کے دونوں ہاتھ پھیل کر ہوتے تھے۔ اور وہ اتنی بڑی بڑی کھپچیوں سے بنی گئی تھی جتنی اس کی پہلی اُنگل۔

دوپہر کو اس کی بیٹی کھانا کھانے گھر آئی اور اپنے بوڑھے باپ کی حیرت انگیز کاریگری دیکھ کر تعجب سے کھڑی کی کھڑی رہ گئی، پھر وہ اس کے پاس بیٹھ گئی، اور بڑی دیر تک ٹوکری کی بنائی دیکھتی رہی، پھر بولی مجھے تو معلوم نہیں تھا آپ اتنی اچھی ٹوکریاں بھی بُن لیتے ہیں۔"

بوڑھا چپ رہا — اس کی انگلیاں چلتی رہیں — اور وہ مسکراتا رہا۔ وہ اور قریب کھسک آئی "تو پھر، آپ میرے لئے کچھ پالنے کیوں نہیں بُن دیتے ؟"

"کچھ کیا نہیں بُن دیتے ؟" بوڑھا ششدر رہ گیا، اُس کی بے نور آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔

"ارے پالنے گہوارے، — ہاں ہاں، بچوں کے لئے پالنے — بات یہ ہے کہ میرا جو زچہ خانہ ہے وہاں ابھی سامان کی بہت کمی ہے، اور . . . . کمیٹی بھی کہتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح کام چلاؤ۔ اتنی جلدی سب کو سب سامان کہاں سے دے دیں — تو میں نے سوچا کہ بچوں کے لٹانے کے لئے . . . . "

"ہوں" بوڑھے نے گردن ہلائی اب اُس کی سمجھ میں کچھ کچھ آرہا تھا۔ سر اٹھا کر اس نے آسمان کی طرف دیکھا . . . "پالنے . . . ؟ ہوں ہوں۔" جیسے وہ تصور ہی تصور میں ہواؤں پر پالنے کا نمونہ دیکھ رہا ہو پھر اُس نے دونوں ہاتھ آگے کو بڑھائے اور بانسوں کے جنگل کی طرف چلا —

بانس کا ایک نرم لچک دار پودا، پھر ایک اور پھر ایک اور، اور ایک موٹا سا مضبوط بانس، کنارا بنانے کے لئے — دو دن بعد گہوارہ تیار ہوگیا جو نیم بیضاوی شکل کا ہے اور پھر وہ زچہ خانے کے ایک کمرے میں ڈوری سے لٹکا دیا گیا۔ اور آہستہ آہستہ ایسے ڈولنے لگا جیسے پانی پر ناؤ دھیمے دھیمے بہتی ہے۔ اس کے اندر سے بچے کے ہلتے ہوئے پاؤں اور زور زور سے ہوا میں چلتی ہوئی پتواروں کی طرح لگ رہی تھیں۔

پہلے گہوارے کے بعد اندھا بوڑھا گہوارے بنانے میں جٹ گیا —

اس عمر پر آکر، زندگی کے ستر اسّی برس گزارنے کے بعد تو اُسے اپنی مرضی کا کام ملا تھا۔ بانسوں کا جنگل چھدرا ہوتا گیا اور بانسوں کی ننھی ننھی سفید ملائم پھنگیں اُڑاُڑ کر بوڑھے کی داڑھی پر بیٹھ جاتیں جب وہ گہوارے بنتے بیٹھتا تو ننھے منے بچے اُسے گھیر لیتے اور وہ اُن کے درمیان ایسا لگتا جیسے کوئی بھگوان اپنے پجاریوں سے گھرا بیٹھا ہے: — اُس نے گہوارے میں کچھ خصوصیتیں بھی پیدا کرنی شروع کر دی تھیں۔ لڑکوں کے لئے سیدھے سادے جالی دار مگر لڑکیوں کو بھی ذرا نخرہ ہوتا ہے، اُن کے لئے جالیوں میں پھول بھی اور کناروں پر بھی ذرا زیادہ سجاوٹ! پھر وہ لکڑی یا بانس کے ننھے ننھے کھلونے بنا کر اُن میں ٹکاتا۔ کبھی بھینس، کبھی چھوٹا سائیکل اور یا پھر موٹر کار، ہوائی جہاز، یا کتاب اور یا پھر ستار یا بانسری۔ یہ سب کھلونے بچے پر اثر کریں گے۔ اس کے لئے شگون بنیں گے، وہ بڑا ہو کر کسان بنے گا یا مزدور یا انجینئر یا ہو سکتا ہے وہ کوئی ناچنے والی بنے۔ ستار بجانے والی یا بانسری کی تانیں چھیڑنے والی بنے۔

وہ ابھی تک اسی دریا کے کنارے، اسی گاؤں میں اسی جھونپڑی میں رہتا تھا مگر اب جھونپڑی میں زندگی کی روشنی اور طاقت آگئی تھی لوگ آئے دن اس کے یہاں آتے تھے۔ اپنے بچوں کے لئے گہوارے خریدنے۔ جب اُس نے پورا سیواں پالنا بنا کر ختم کیا تو شہر کی سرکاری دوکان سے کئی سو پالنوں کا آرڈر اس کے لئے آیا۔

اور اسی سال موسم بہار میں یکایک، اُس پار لگے ہوئے پیپل کے پرانے ٹھونٹھ میں ایک انکوا پھوٹا — سبز انکوا — جس کے دو ننھے ننھے ہاتھ تھے — جیسے کسی ننھے سے بچے کے دو ہاتھ — یہ دو ہاتھ پہلے بھی تھے مگر دشمنوں نے انہیں کاٹ کر ٹھونٹھ پر مشین گن جمائی تھی اور اب یہ دونوں ڈالیاں ایسی لگتی تھیں جیسے اپنی دونوں ہاتھوں سے اس مشین کو اس زور سے دھکیلا تھا کہ وہ سات سمندر پار جا پڑی تھی۔ جب بوڑھے کو کسی نے خبر دی کہ اُس پار کے پیپل میں پھر دو ڈالیاں نکل آئیں تو اُس نے اپنی بے نور آنکھیں اُوپر اٹھائیں اور پالنا بنتے ہی بنتے تھرتھرانے والے سے بولا "ہاں میں جانتا تھا مجھے معلوم تھا کہ یہ نئی زندگی ٹھونٹھ کو بھی ہاتھ بخش دے گی"

مترجم: رضیہ سجاد ظہیر

(انگولا)

آگستان مینتو

بین اقوامی شہرت یافتہ اور انگولا کے محبوب رہنما اور شاعر آگستان مینتو کی تخلیقات میں یقین، عزم، اور نئی زندگی کا پیغام ملتا ہے۔ اُن کی نظموں کا بہت سی غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

نئی زندگی کی تلاش میں

میری ماں:
(سیاہ فام ماتیں جن کی اولادیں رخصت ہو چکی ہیں)
تم نے مجھے سبق پڑھائے صبر، اُمید اور انتظار کے
جو تم نے کٹھن دنوں میں اپنائے تھے۔
لیکن میری زندگی نے جھوٹی اُمیدوں کے بھرم توڑ دیئے
میں وہ نہیں ہوں جو دوسروں کا انتظار کرے
بلکہ وہ ہوں، جس کا دوسرے انتظار کریں
اور ہم خود اُمیدوں کے پیغمبر ہیں
تمہاری اولادیں
جو زندگی دینے والے یقین کی شمع پر قربان ہیں
تمہاری اولادیں
نئی زندگی کی تلاش میں . . . . .

کہانی

جنوبی افریقہ

رچرڈ رایو

"ہم اس سماج کے ایک اہم جزو ہیں۔ ایک ایسا سماج جس کی آبادی کا بڑا حصہ مصیبتوں میں گھرا ہوا ہے جس میں کسی انسان کو صرف اس لئے ذلیل سمجھا جاتا ہے کہ اُس کا رنگ کالا ہے . . . ."

کاکری نے اسٹیج پر اپنی نگاہیں جما دی تھیں اور تقریر کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں اتنی بات آ رہی تھی کہ تقریر کا یہ حصہ نہایت اہم ہے اور اُس کی حقیقت میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے۔ عالم مقرّر بولتے بولتے تھوڑا رک گئے تھے اور ایک گلاس سے پانی پی رہے تھے۔ کاکری کو اپنا گلا بھی تر ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

اکتوبر کے سورج کی گرم کرنیں بھیڑ میں کھڑے ہوئے لوگوں کو پسینے میں نہلا رہی تھیں۔ آسمان بے حد صاف تھا۔ یہاں تک کہ سامنے کی پہاڑیوں کی چوٹیوں پر بھی بادل نہیں دکھائی دے رہے تھے۔

"یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم ہر اُس قانون کو توڑیں جو کسی انسان کو زندہ رہنے کے حق سے محروم رکھتا ہے۔ جو لوگ رنگ کی وجہ سے آدمی اور آدمی کے درمیان فاصلہ رکھے ہوئے ہیں اُن سے ہمیں بہادری کے ساتھ مقابلہ کرنا ہے۔ آپ کے بچے عمر بھر اس حق سے محروم رہ جاتے ہیں جو جنم سے سب کو ملا ہے، اُن کو ہر طبقہ میں ذلیل کیا جاتا ہے چاہے وہ سماجی ہو، اقتصادی ہو، یا کسی اور شکل میں ہو. . ."

کاکری اپنے اندر ایک طوفان محسوس کر رہا تھا۔ ایک ایسا طوفان جس سے باہر نکلنے کے لئے اس نے پہلے کبھی نہیں سوچا تھا۔ اسٹیج پر اب اور کوئی صاحب نئے نظریات کے بارے میں کہہ رہے تھے۔ ان مقرر کے نظریات کے تحت کاکری کے پاس اور اُس کے بچوں کے پاس بھی کچھ حقوق تھے ان باتوں نے اچانک اُسے چونکا دیا۔

یہ سب سوچتے سوچتے کاکری کی بھنویں سکڑ کر پاس پاس آ گئی تھیں۔ اسٹیج پر ابھی اور کئی مقررین تقریر کرنے کے لئے باقی تھے۔ گورے اور کالے دونوں اور دونوں کے تعلقات برابر تھے۔ اس وقت رنگ سے کسی قسم کا فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ نیلی پوشاک پہنے ایک انگریز خاتون اینجل کو سگریٹ پیش کر رہی تھیں۔ اینجل اس جلسے کا ایک کالا مزدور لیڈر تھا۔ کاکری کو بہت تعجب ہوا۔ اُس نے محسوس کیا کہ یہ سگریٹ گویا اس کو ہی پیش کیا گیا ہے اور تب اس نے جیب سے کوالا کا پیکٹ نکالا۔ اس کو اپنے قصبے کی یاد آئی۔ اگر کہیں اینجل نے اُس کے یہاں کے بوڑھے انگریز کی لڑکی کو سگریٹ پیش کیا ہوتا تب تو بوڑھا بے ہوش ہی ہو جاتا۔ اُس نے تصور کی آنکھ سے یہ دیکھا کہ اس کا چچا آڈکیلاس بوڑھے کی بیوی کو سگریٹ پیش کر رہا ہے۔ یہ تصور اتنا دلچسپ تھا کہ وہ قہقہہ لگائے بغیر نہ رہ سکا اور ادھر اُدھر کھڑے ہوئے لوگ چونک کر اُسے دیکھنے لگے۔ اپنی جھینپ مٹانے کے لئے وہ سگریٹ جلانے کی نقل کرنے لگا۔

اسٹیج پر ایک گوری خاتون نیلی چست پوشاک پہنے ہوئے تھیں اُس کے گورے بازو کاندھوں تک کھلے ہوئے تھے جو کچھ وہ اُن خاتون سے سُن رہا تھا اگر وہ سچ ہے تب تو وہ بھی اتنا ہی اچھا ہے جتنا کہ اور دوسرے لوگ۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا لیکن خود ہی وہ ہوشیار ہوگیا کہیں اس کی یہ بات کسی اور نے سن نہ لی ہو اور خوف سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اب وہ گوری خاتون کہہ رہی تھیں "ہر اُس قانون کو چنوتی دینی چاہیے جو ایک انسان کے مقابلے میں دوسرے انسان کو ذلیل سمجھتا ہے۔ کبھی کسی بھی ٹرین میں جاکر بیٹھ جائیے۔ کسی بھی ریستوران میں بے خوف داخل ہو جائیے" کالری نے سوچا کہ وہ ایسا کیوں کہہ رہی ہے۔ وہ تو کسی بھی حال میں بہتر سے بہتر فلم دیکھ سکتی ہے۔ بہتر سے بہتر تیراکی کی جگہ میں تیر سکتی ہے۔ خوبصورت سے مکان میں رہ سکتی ہے وہ اس بوڑھے دقیانوسی انگریز کی لڑکی سے کئی گُنا حسین اور خوبصورت ہے۔ دُھوپ میں چمکتے ہوئے اُس کے خوبصورت بال کیا غضب ڈھا رہے تھے۔

پھر اُس نے ایک اسکیم بنانی شروع کی۔ ایک خوفناک اسکیم ذہن میں آتے ہی اس کو نکال دینے کی کوشش کی جیسے جیسے اُس کی تقریر ہوتی رہی اس کے دماغ میں وہی اسکیم مضبوطی سے گھر کرتی رہی۔ وہ قانون توڑے گا وہ خود یعنی کالری۔ آکوکیلاس اور بوڑھے کو وہ حیرت میں ڈال دے گا اور بوڑھے کی لڑکی نیلی کو بھی چاہے وہ زہر کھانے کے برابر ہی کیوں نہ ہو لیکن وہ چنوتی اُسے قبول کرنی ہوگی۔ پھر وہ بھی ویسے ہی مسکرائے گا جیسے اخباروں میں چھپی تصویریں مسکرا رہی ہیں۔

جلسہ ختم ہو چکا تھا، وہ اس بھیڑ میں سے راستہ بناکر نکل رہا تھا اسی وقت ایک تیز آتی ہوئی کار کے بریک لگنے کی زبردست آواز سے وہ چونک پڑا۔ اور اچھل کر سڑک کے پار کھڑا ہوگیا۔ وہ خوف سے گھبرایا ہوا تھا اور کانپ رہا تھا۔ غصے میں بھرا ایک گورا چہرہ کار کی کھڑکی میں سے جھانک رہا تھا ــــ

"کیوں بے کالے کے بچے؟ ایسے ہی سڑک پر چلتے ہیں؟"

کالری غصے سے اُسے گھورتا رہا۔ اُس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی۔ یقیناً اُس آدمی نے ہی اُس گوری خاتون کو اس کالے اینجل کو سگریٹ پیش کرتے ہوئے نہیں دیکھا ہوگا ورنہ وہ اس طرح نہ چیختا۔ کالری کو سخت الجھن محسوس ہو رہی تھی۔ پھر اُس نے سوچا کہ جلدی سے ٹرین پکڑ کر گھر روانہ ہو جانا چاہیئے۔ یہ ہی اُس کے حق میں بہتر ہوگا۔

اسٹیشن پر پہنچ کر وہ پھر حیران ہوگیا۔ ہزاروں لوگ ٹہل رہے تھے۔ کالے، گورے، بھورے، سب ہی طرح کے۔ رائج قاعدوں کو چنوتی ضرور دینا چاہیئے۔ اُس نے سوچا۔ کالری کو تقریر کے الفاظ یاد آئے لیکن وہ یہ نہیں سوچ پا رہا تھا کہ وہ کس کو اور کس طرح اسے عملی جامہ پہنائے۔؟

وہ خاموشی سے ٹہلتا رہا اسی وقت اُس کی نگاہ پلیٹ فارم کی ایک بنچ پر پڑی جس پر سفید رنگ سے جلی حروف میں لکھا ہوا تھا "صرف گوروں کے لئے" اُس نے سوچا کہ اب کچھ بات بنی اور اس طرح ایک موقع اس کے ہاتھ آیا اتنی معمولی لکڑی کی بنی یہ بنچ اور یہ حکم۔ ایسی سینکڑوں ہزاروں بنچیں اس کے قبضے میں ہیں لیکن اس بنچ میں ساری بُرائیاں ایک ساتھ داخل ہوئیں۔ اس کے اور انسانیت کے درمیان یہ بنچ ایک رکاوٹ کا کام کر رہی تھی۔ اُسے محسوس ہوا کہ اگر اس بنچ پر وہ نہیں بیٹھا تو اُسے خود کو آدمی کہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اُس کے انسان ہونے کا دارومدار اس بنچ پر ہی بیٹھنے سے ہے۔ اس سنہری موقع کو اُسے کسی بھی قیمت پر جانے نہیں دینا چاہیئے۔ اور وہ یہ سوچ کر ہی اس بنچ پر بیٹھ گیا۔

بنچ پر بیٹھنے کے بعد بظاہر وہ پُرامن دکھائی دے رہا تھا لیکن اس کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ دو متضاد خیالات اُس کے ذہن میں ہیجان پیدا کر رہے تھے۔ ایک آواز کہہ رہی تھی تمہیں اس بنچ پر نہیں بیٹھنا چاہیئے۔ پہلا خیال اس کی شخصیت کو جھنجھوڑتا۔ کھیتوں پر اُس کے جان لیوا کام کی یاد دلاتا اس کے باپ کی شکل آنکھوں کے سامنے آجاتی اور اس کے باپ دادا کی تاریخ گھوم جاتی جو خچر کی طرح پیدا ہوئے۔ خچر کی طرح زندہ رہے اور خچر کی طرح مر گئے۔ دوسری آواز میں مستقبل کے خواب تھے۔ کالری تم ایک انسان ہو، تم نے وہ ہمت دکھائی ہے جو تمہارے والد بھی نہ دکھا سکے تم کو انسان کی موت ملے گی۔

کالری نے جیب میں سے ایک سگریٹ نکالا اور کش لینے لگا۔ کوئی بھی اس کے اس طرح بیٹھنے پر غور کرتا ہوا نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ ایک اینٹی کلائمکس تھا۔ دُنیا اب بھی اسی طرح تھی۔ لوگ اب بھی پیدا ہو رہے تھے، مر رہے تھے کسی آواز نے چیخ کر یہ نہیں کہا کہ کالری کو فتح ملی ہے۔ وہ بالکل دوسرے عام لوگوں

کی طرح بھیڑ بھرے پلیٹ فارم پر سگریٹ پھونک رہا تھا۔ کیا یہ اُس کی فتح تھی؟ کیا حقیقتاً عام آدمی ہو گیا تھا۔ اچھے لباس میں سجی ہوئی ایک گوری خاتون پلیٹ فارم پر ٹہل رہی تھی۔ کیا وہ بنچ پر بیٹھے گی؟ تب اُسے ایک آواز اندر کی طرف سے سُنائی دی۔ تمہیں کھڑا ہو جانا چاہیے تاکہ گوری خاتون کو تمہارے بغل میں نہ بیٹھنا پڑے۔ کاآری نے اپنی آنکھوں کو ایک خاص انداز میں چھوٹا کرتے ہوئے اور بھی اطمینان سے سگریٹ پینا شروع کر دیا۔ وہ خاتون پلکیں جھپکائے بغیر اُس کے بغل سے گزر گئی اور پلیٹ فارم پر چہل قدمی کرتی رہی اور اُس کے حقوق کو چنوتی دینے کے سلسلہ میں خوف زدہ تھی یا اُس نے اس طرف دھیان ہی نہ دیا۔

کاآری نے محسوس کیا کہ وہ بہت زیادہ تھک گیا ہے۔ اب اُس کے دماغ میں ایک نیا خیال رینگ رہا ہے۔ ایک بہت بڑی قیمت چکانے والا خیال۔ یہ ایک ایسا خیال تھا جو کہہ رہا تھا کہ تم اس بنچ پر چنوتی دینے کے خیال سے نہیں بلکہ اس لئے بیٹھے ہو کہ تمہیں بہت تھکن محسوس ہو رہی ہے۔ وہ اس بنچ پر سے نہیں اُٹھے گا۔ کیونکہ وہ بہت زیادہ تھک گیا ہے۔ یا اس لئے نہیں اُٹھے گا کہ وہ چنوتی دینا چاہتا ہے۔

پلیٹ فارم پر اسی وقت آئی ہوئی ٹرین کی کھڑکیوں سے لوگ باگ ایک دوسرے کے اُوپر چڑھ اور اُتر رہے تھے۔ اتنی دھکم پیل مچی ہوئی تھی کہ کسی نے اُس کی طرف غور ہی نہ کیا۔ اس ٹرین میں وہ جا سکتا تھا۔ دُنیا کا سب سے آسان کام تھا کہ وہ اس ٹرین پر چڑھے اور ان تمام ہنگاموں سے دُور بھاگ جائے۔ چنوتیاں دینا اور بنچوں پر بیٹھنا اور دھوپ میں جلنا! ہوں ... لیکن یہ تو شکست ہوگی۔ انفرادی شکست۔

"ابے بنچ خالی کر۔"

کالری نے اس سخت آواز پر دھیان دینا بھی مناسب نہ سمجھا اور وہ اس خیال میں گم رہا کہ آذکیلاس اس وقت راشن کی دوکان پر اپنی سستی شراب کی خاطر لائن میں کھڑا ہوا ہوگا۔

"میں کہتا ہوں بنچ خالی کر بے کینے۔"

اس بار کالری نے چونک کر حالات کا اندازہ لگایا اور تب اُس نے بے حد کاہلی کی نظروں سے غصے میں لال تمتماتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا۔

"اُٹھو" اُس نے پھر چیخ کر کہا۔ کالری چپ چاپ اُسے گھورتا رہا۔ "ابے کالے! کیا میری آواز نہیں سُن رہا ہے؟"

کالری نے جان بوجھ کر ایک زوردار کش لیا اور بڑے غور سے سگریٹ کی جانچ کرنے لگا۔ تو اب اس کے امتحان کا وقت آ رہا ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف اس طرح دیکھا گویا اکھاڑے میں دو مُکے باز ایک دوسرے کی طاقت کا اندازہ لگا رہے ہوں اور دونوں کو پہلا وار کرتے ہوئے خوف محسوس ہو رہا ہو۔

"اچھا سالے رکو! میں ابھی پولیس لے کر آتا ہوں۔

کاآری نے اب بھی اپنی طویل خاموشی نہیں توڑی۔ بولنے کا مطلب ابھی تک حاصل کی ہوئی منزلت سے ہاتھ دھونا ہوگا۔ ایک غیر معمولی خاموشی قائم رہی۔

"گھبرا مت۔ ابھی میں پولیس لاتا ہوں۔ اپنی زُبان تو کیوں نہیں کھول رہا ہے۔"

کاآری نے اچانک گورے آدمی کی کمزوری پر غور کیا۔ گورا نوجوان۔ خود کوئی کارروائی کرتا ہوا گھبرا رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کاآری نے بنچ کی جنگ کا پہلا راؤنڈ جیت لیا۔ دھیرے دھیرے بھیڑ وہاں جمع ہوتی گئی۔

"افریقہ" ایک جوکر نما آدمی اپنا انگوٹھا چبا کر چیخا۔

کاآری نے اس طنز پر کوئی توجہ نہ دی۔ تمام لوگ دھیرے دھیرے اُسی طرف جمع ہوتے جا رہے تھے۔ سب کی نگاہیں اُس غیر معمولی واقعہ کی طرف جمی ہوئی تھی کہ ایک کالا آدمی گورے آدمی کی بنچ پر بیٹھ گیا۔

"ذرا اس کالے بن مانس کو دیکھو! بے جا حقوق دیئے جانے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے نا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب اُن کے لئے الگ بنچ بنی ہے ..."

"آنے دو پولیس کو ابھی سالے کا بھرتہ بن جائے گا۔

"ارے صاحب ان پر کبھی اعتماد نہیں کرنا چاہیئے۔ میرے یہاں پر اس طرح کا ایک نوکر تھا...."

کالری سب کچھ سُنی اَن سُنی کر کے وہاں جما رہا۔ اس کی یہ حرکت اب پکے یقین میں بدل گئی تھی جو مرضی آئے لوگ کریں لیکن وہ کسی بھی حالت میں یہاں سے نہیں اُٹھے گا۔

"اچھا! تو یہ ہیں وہ حضرت! چل تو اُٹھ۔ خود تو یہ پڑھ نہیں سکتا۔"

سپاہی گرجا۔ کاآری نے سپاہی کے پیتل کے بٹنوں اور بلّوں کی طرف دیکھا۔

"اپنا نام جلدی بول۔"

کالری اپنی خاموشی میں گم رہا۔ سپاہی کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ بھیڑ ہر لمحے بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

"تمہیں کوئی حق نہیں ہے کہ تم اس طرح کے لہجے میں ایک انسان سے گفتگو کرو۔" ایک بھدی خاتون نے یہ الفاظ کہے۔

"آپ اپنا کام کیجئے" سپاہی نے کہا "جب آپ کی ضرورت پڑے گی تو آپ کو بلوا لوں گا۔ آپ ہی لوگوں نے اِن کافروں کا دماغ یہاں تک چڑھا دیا ہے کہ یہ لوگ اب گوری لڑکیاں پسند کرنے لگے ہیں۔"

"میں کہتی ہوں کہ تم اس سے قاعدے سے گفتگو کرو۔"

"دیکھئے مادام .... دیکھئے آپ ...." سپاہی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اُن خاتون کو کس طرح چپ کرائے۔

"نہیں اُٹھتا ہے تو سالے کو ایک بوٹ لگاؤ۔"

کالری کی گردن پر ہاتھ لگاتے ہوئے گورے نوجوان نے کہا

"اٹھ سالے! اُٹھ حرام زادے۔"

کالری نے احتجاج کے طور پر بنچ کو پوری طرح سے پکڑ لیا۔ کئی آدمی مل کر اُسے اپنی جانب کھینچ رہے تھے اور بربریت کے ساتھ اس پر ظلم کر رہے تھے۔ اچانک اُسے محسوس ہوا کہ کسی نے اس کی آنکھ پر ایک گھونسہ جڑ دیا۔ آنکھ کے پاس سے خون بہنے لگا۔ سپاہی نے دونوں ہاتھوں سے اس کی کلائی پکڑنی چاہی اور اُسے بھیڑ میں لانا چاہا۔ کالری بھیڑ میں گھسٹتا رہا اور اُس پر لاتعداد ظلم ہوتے رہے۔ اچانک ہی وہ کمزور پڑ گیا اور اس نے سوچا کہ اب لڑنا بے کار ہے۔ ہاں اب اُس کے مسکرانے کی باری ہے۔ وہی مسکراہٹ جو اخبار میں چھپی ہوئی تصویروں کے چہروں میں تھی۔ اس نے ایک غیر انسانی قانون کو چنوتی دی اور فتح پائی۔ نتیجہ کی پرواہ کس کو ہے۔

"اِدھر آسالے" سپاہی نے اُسے بھیڑ میں گھسیٹتے ہوئے کہا۔

"ہاں .... ہاں . . . شوق سے" کالری نے پہلی بار اپنی زبان کھولی۔ اور سپاہی کی طرف ایسی گستاخ نظروں سے دیکھا جس میں گوروں کی بنچ پر بیٹھنے کی ہمت تھی۔

پیٹرس لومبا

کانگو

عظیم دریا کے یہ کنارے
یہ سینے گل پوش وادیوں کے
ہے جن کو اب بھی اُمید فردا
یہ سب تمہارے ہیں تم ہی جانو
وسیع خطے زمین کے
اور دولتیں زمین کی
یہ سب تمہاری ہیں تم ہی جانو

چمکتے اور مہربان سورج کی گرم کرنیں
ازل سے اب تک
مداوائے درد کر رہی ہیں
شہید بے بس ستم رسیدہ
ہمارے اجداد کے یہ آنسو
چمکتے سورج کے منتظر ہیں
کہ پھر وہی تیز گرم کرنیں
یہ بہتا سیلاب خشک کر دیں

اور اس زمیں پر
اسی زمیں پر
سیاہ افریقی سرزمیں پر
سدا سے ہم تم ہیں جس کے شیدا
عظیم کانگو کی قوم کو تم
سناؤگے اب خوشی کے نغمے
اب اس کو آزاد تم کروگے۔

مترجم: اشرف عابدی

یوسف الصباعی

یوسف الصباعی :- انجمن افرو ایشیائی مصنفین کے سکریٹری جنرل اور قاہرہ کے ادبی۔ کلچرل سوسائٹی کے روحِ رواں ہیں۔ آپ صاحب طرز ناول نگار ڈرامہ نویس، نقاد اور افسانہ نگار ہیں انہیں ادب کے بہت سے بین اقوامی انعامات حاصل ہو چکے ہیں۔ بہت سے ادبی، سیاسی جریدوں کے ایڈیٹر ہیں۔ ان کا تازہ ناول "ہم کانٹے نہیں بوتے" ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا ہے بہت سے ناولوں اور مختصر افسانوں کا مختلف غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

ایک دن بحث کے بیچ ایک دوست نے مجھ سے پوچھا "آپ کا کیا خیال ہے، کیا خوش قسمتی انسان کو وراثت میں ملتی ہے یا ہم اسے اپنی صلاحیت اور طاقت سے حاصل کرتے ہیں ؟"

"— میں سمجھتا ہوں خوش قسمتی قسمت سے ملتی ہے، انسان کی کوشش کا اس میں کوئی دخل نہیں۔"

اس نے میری بات سُن کر ایک لمبی سانس لی اور بولا "جیسے آپ بھی ان لوگوں میں سے ہیں جو ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اس امید میں بیٹھے رہتے ہیں کہ اگر قسمت میں خوشی لکھی ہے تو مِل جائے گی، کوشش کرنے سے کیا فائدہ!"

" جی ہاں، اور میں اپنے دعوے کے ثبوت میں مثال دے سکتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"— میرے دوست! اس بارے میں میرا نظریہ تم سے بالکل مختلف ہے میں سمجھتا ہوں قدرت کی طرف سے ہر آدمی کو خوش قسمتی ایک خاص مقدار میں عطا کی جاتی ہے۔ یہ مقدار کم یا زیادہ ہو سکتی ہے، مگر یہ ممکن نہیں کہ ایک شخص بالکل تشنہ رہ جائے۔ انسان کے خارجی حالات سے خوش قسمتی کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ حقیقت میں خوش قسمتی ایک دوا ہے جسے الماری میں بند رکھنے سے مریض کی حالت کبھی سنبھل نہیں سکتی۔ صحت کے لئے ضروری ہے کہ دوا استعمال کی جائے۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ پیدائشی خوش قسمتی کو استعمال کرنے کی صلاحیت کچھ لوگوں میں کم ہوتی ہے کچھ میں زیادہ۔"

" معاف کیجئے۔ میں آپ کے خیالات سے متفق نہیں ہوں۔ قسمت میں دکھ لکھے ہوں، تو انسان اِن دکھوں سے خوشیاں کیسے کشید کر سکتا ہے ؟"

میرے دوست نے انکار میں سر ہلایا۔ میں سمجھ گیا میری بات سے اس کی تسلی نہیں ہوئی۔ بات چیت جاری رکھتے ہوئے بولا "میں ایک بہت اُجلے شخص کی کہانی آپ کو سُناتا ہوں۔ اگر ہم اس کے بارے میں آپ سے یہ کہیں۔ کہ اس کو بھی خوش قسمتی کا اتنا ہی حصہ ملا جتنا آپ کو، مجھے یا کسی دوسرے انسان کو، تو اُس سے بڑھ کر بے وقوفی کی بات کیا ہوگی۔"

" ہاں، تو وہ ایک ایسا شخص تھا، کہ ہر وقت اندر ہی اندر جلتا اور کڑھتا رہتا۔ جب دیکھو غصہ اور شکایت کی سرتاپا تصویر۔ زمانۂ طالب علمی سے اس کی یہی حالت تھی۔ اُسے شبہ تھا کہ مدرس جان بوجھ کر اس پر ظلم کرتے ہیں اور اس سے نفرت کرتے ہیں۔ ساتھیوں سے وہ الگ الگ رہتا کیونکہ اُسے یقین تھا کہ اُن کی طرف سے فریب کے سوا اور کچھ نہیں مل سکتا عملی زندگی میں قدم رکھا تو اُس کے ہونٹوں پر ظلم اور ناانصافی کی شکایت رہنے لگی۔ وہ سمجھتا تھا اس سے بڑھ کر بے عقل اور کم تر خدا نے کسی کو نہیں بنایا، حالانکہ سچائی اس کے برعکس تھی اور وہ بہت عقل مند آدمی تھا۔ کسی کو کوئی چیز ملتی تو وہ جل کر کہتا۔ یہ چیز مجھے کیوں نہ

مل گئی۔ ہر حادثے سے وہ دُکھ اور کوفت سے دوچار رہتا۔ ماحول سے وہ بے زار تھا۔ جب بھی کسی سے ملتا یہی کہتا آپ نے سُنا فلاں شخص کو یہ کچھ ملا ہے؛ بھلا یہ کہاں کا انصاف ہے؟ اُسے کسی نے خوش اور مطمئن نہیں دیکھا، نہ اُس کی زبان سے شکریے کے الفاظ سُنے۔ اُسے کسی پر اعتبار نہ تھا کبھی سے وہ مطمئن نہ تھا اس کی ہر بات شکوہ تھی۔۔۔ اُس کی پوری زندگی شکوہ اور دُکھ سے بھری تھی۔ پھر ایک دن اُس نے شادی کرلی۔ جو لوگ اُسے جانتے تھے۔ وہ اُس کی بیوی کے لیے ہمدردی کا اظہار کرنے لگے۔ میں سمجھتا ہوں ایسا کرنے میں وہ حق بجانب تھے۔

وہ عورت اس کے جیون ساتھی کے رُوپ میں زندگی کے دن بتانے لگی۔ وہ اُس کے تلخ دنوں میں ہر وقت ساتھ رہی، اُس نے ہر موقع پر اپنے ہم سفر کے ساتھ زندگی کی کڑی اور بے ہنگم راہیں طے کرنے کا پکا ارادہ کر رکھا تھا۔ لیکن جلد ہی اُسے محسوس ہوگیا کہ وہ اس کے بس کے باہر ہے۔ گھر کے تلخ ماحول میں اس کا دم گھٹنے لگا۔ جب بھی خالی وقت ملتا وہ گھر سے باہر اپنی سہیلیوں کے پاس دل بہلانے کے لیے چلی جاتی۔

اس شخص کے دماغ میں شبہ پیدا کرنے کے لئے اس سے بڑھ کر اور کون سی چیز کارگر ہو سکتی تھی۔ وہ تو پہلے ہی کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھا کہ شبہوں کی پرورش کر سکے۔ وہ اپنی بیوی کو شبہ کی نظر سے دیکھنے لگا۔ اس خیال سے اس کا دل غصّے سے بھڑک اُٹھا کہ اُس کی مکار بیوی نے اُس کے ساتھ خیانت کی ہے۔ پھر کیا تھا وہ ہر وقت بیوی کی جاسوسی کرنے لگا۔ اب اس کے من میں یہ خواہش زور پکڑنے لگی کہ اس کی بیوی عملی طور سے بد دیانت ثابت ہو جائے تاکہ وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہو کہ وہ دنیا میں ہمیشہ سے تکلیف سہتا آیا ہے لیکن بیوی نے ایسا کوئی موقع نہ دیا اور اُس کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ یا تو اس لیے کہ اُس کی بیوی پاک تھی یا اس لیے کہ وہ بہت چالباز تھی۔

اپنی تدبیر میں ناکامیاب ہونے سے اس شخص کا دکھ بڑھ گیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اپنے ناخن بیوی کی صراحی دار لمبی اور صاف گردن میں پیوست کر دے تاکہ اس کی سانس بند ہو جائے یا سینے میں چھرا گھونپ دے، مگر ایسا کر سکے کیسے، شاید بیوی بہت چالاک اور ہوشیار تھی۔

اس شخص کے ہاتھ پیر میں تناؤ پیدا ہونے لگا اور اس کے سلوک سے بیوی خوف زدہ رہنے لگی۔ اسے اپنے شوہر کی آنکھوں میں وحشت نظر آتی تھی۔ اُسے یقین ہوگیا تھا کہ وہ شخص اس کو قتل کر دے گا۔

اس بار اعتبار کر لینے کے بعد کہ بیوی نے بیوفائی کی ہے، اس شخص نے پکا ارادہ کر لیا کہ ایسا جال بچھائے جس سے اس ابھاگن کو ٹھکانے لگا سکے۔ کسی کو اس پر شبہ نہ ہو اور لوگ یہی خیال کریں کہ وہ قدرتی موت مری ہے۔

وقت گذرتا رہا اور وہ شخص تدبیریں سوچنے اور جال بچھانے میں مگن رہا۔ لیکن ہر منصوبہ میں کوئی نہ کوئی کمی نظر آتی کہ وہ اُسے پورا نہ کر پاتا۔ رات کو جو منصوبہ سوچتا، صبح اُسے رد کر دیتا۔

ایک دن وہ اپنی بیوی کے ساتھ فلم دیکھنے چلا گیا۔ فلم کی کہانی ایک قاتل کے جرم کے متعلق تھی۔ مختصر یہ کہ ایک دلہن نے اپنے شوہر کو بالکونی سے گرا دیا۔ وہ عورت اور اُس کا شوہر ساحل سمندر پر ایک الگ تھلگ مکان میں ہنی مون منانے آئے تھے۔ شوہر بوڑھا لیکن دولت مند تھا۔ بیوی اس کی جائداد کی جلد از جلد وارث بن جانا چاہتی تھی۔ اُس نے پاس کے ایک ڈاکٹر اور اپنے پڑوسیوں سے کہا۔ میرا شوہر رات کو نیند کی حالت میں چلتا ہے اور اس بات سے خوف زدہ ہے۔ پھر ایک رات اس نے اپنے شوہر کی کافی میں زہر ملا دیا۔ وہ بے ہوش ہوگیا تو اُسے بالکونی کی طرف گھسیٹ کر لے گئی۔ اور نیچے گرا دیا۔ پھر وہ بستر میں جا کر سو گئی۔ صبح ہوئی تو لوگوں نے دیکھا دلہن بالکونی میں کھڑی شور مچا رہی ہے، اور نیچے فرش پر اُس کے شوہر کی لاش پڑی ہے۔ سب نے یقین کر لیا کہ وہ شخص رات کے وقت نیند کی حالت میں چلتے ہوئے گر پڑا اور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

یہ فلم دیکھ کر وہ شخص بہت خوش ہوا۔ اس کامیاب منصوبے نے اس کے من میں ایک نئی اُمنگ پیدا کر دی۔ اُس نے اسی وقت اپنے مکان کی خرابیاں تلاش کیں اور نئے مکان میں تبدیل ہوگیا۔ یہ مکان سمندر کے کنارے پر تھا۔ اس کی شکل فلم والے مکان سے ملتی جلتی تھی۔

مکان کی بالکونی میں کھڑے ہو کر اُس نے نیچے دیکھا تو جھرجھری سی آگئی۔ بہت دُور نیچے کنارے پر بکھرے ہوئے بڑے بڑے پتھر دیکھ کر اسے اپنی اسکیم پوری ہوتی ہوئی نظر آئی۔ سمندری ہوا کے ایک ٹھنڈے

جھونکے نے اُسے چھوا اور وہ سوچنے لگا، قسمت جرم کرنے کے لئے کسی اچھی جگہ لے آئی ہے۔ اگلے دن وہ نیند کی گولیوں کی ایک شیشی خرید لایا اور اپنی بیوی کو یہ یقین دلانے لگا کہ وہ نیند نہ آنے کی مریض ہے اور یہ دوا نیند لانے میں مددگار ثابت ہوگی۔

بعد میں وہ شہر کے تفریحی مقامات پر گھوما پھرا اور تفریح کے لئے لائے عموماً سبھی لوگوں سے باتوں میں یہ ذکر کیا کہ سمندر کے کنارے مکان لینے کی وجہ یہ ہے کہ میری بیوی نیند نہ آنے کی مریض ہے اور سمندر کی تازہ ہوا اس کی صحت کے لئے فائدہ مند ثابت ہوگی۔ کچھ دن گزرے تو لوگوں نے دیکھا، وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہے۔ ہمدردی سے انہوں نے وجہ پوچھی۔ وہ بولا —— میری بیوی کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے پچھلی رات میں نے اُسے نیند کی حالت میں چلتے ہوئے دیکھا۔

کئی آدمیوں نے اُسے تسلّی دی کہ یہ مرض قابلِ فکر نہیں دھیرے دھیرے ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن ڈاکٹر سے صلاح ضروری ہے۔

وقت گزرتا رہا۔ کچھ ہفتے بعد لوگوں نے سُنا، اُس کی بیوی کی حالت اور خراب ہوگئی ہے اور وہ ابھی تک رات کو نیند کی حالت میں گھومتی پھرتی ہے۔ یہ بھی پتہ چلا، وہ شخص ایک ڈاکٹر سے صلاح لینے والا ہے —— کچھ دنوں بعد وہ شخص ڈاکٹر کے پاس گیا اور بولا — میں ایک ایسے شخص کے بارے میں مشورہ لینا چاہتا ہوں جو رات کو نیند کی حالت میں چلنے کے مرض میں مبتلا ہے۔

ڈاکٹر نے پوچھا "کیا آپ تھکن محسوس کرتے ہیں؟"

"میں؟" اس نے پریشان ہو کر سوال پوچھا

"جی ہاں! آپ"

"آپ کو یہ احساس کیسے ہوا کہ مجھے نیند نہ آنے کی شکایت ہے؟"

"میرے دوست! ذرا رکئے! آپ کی بیوی نے مجھ سے کہا تھا، میں کسی کو نہ بتاؤں لیکن میرا خیال ہے اچھا ہو آپ کو اپنی حالت معلوم ہو جائے۔ آپ کی بیوی آج صبح میرے پاس اس معاملے میں صلاح لینے آئی تھیں۔"

"کس معاملے میں؟ کیا اپنی نیند کی حالت میں چلنے کے بارے میں؟ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے اس روگ کو جانتی ہو۔"

"صبر رکھئے۔ ساری بات میری سمجھ میں آگئی۔ آپ کی بیوی نے مجھے بتایا، اس نے آپ کو دوبارہ نیند کی حالت میں چلتے ہوئے دیکھا اس کا خیال ہے کہ آپ کو اپنی حالت کا پتہ نہیں۔

اس شخص کے ہونٹ جیسے سِل گئے، اور زبان گونگی ہوگئی۔

ڈاکٹر نے کہا "معاف کیجئے گا۔ میرا تجربہ ہے، کئی مریض اپنے مرض کا دوستوں اور رشتہ داروں کے ساتھ تعلق جوڑتے ہیں۔ میں نے آپ کی بیوی کو علاج کے طریقوں کے علاوہ ایسے مرضوں کے ماہر ڈاکٹر اپنے ایک دوست کے نام خط بھی دیا ہے تاکہ آپ کی حالت زیادہ خراب ہو جائے تو وہ آپ کو اُس کے پاس لے جائیں۔"

وہ شخص خوف زدہ گھر لوٹ آیا۔ اُس کے چہرے پر خوف اور بے چینی کے نشان تھے۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ بیوی اس کے ہتھیار سے اس کا کام تمام کرنا چاہتی ہے۔ اُسے یقین ہوگیا کہ اُس کی اسکیم اب راز نہیں رہی۔ وہ سوچنے لگا، نہ جانے آج کی رات کے بعد وہ قاتل ہوگا یا مقتول۔

اس کی بیوی میز پر سر رکھے اونگھ رہی تھی۔ کھانا سامنے پڑا تھا۔ اس نے آتے ہی میز پر سے چھری اُٹھائی اور ارادہ کیا کہ بیوی کی پیٹھ میں گھونپ دے۔ لیکن جلد ہی اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا اور بالکنی کی طرف کھسک گیا۔ پھر نیچے سمندر کے ساحل کی طرف جھانکا۔ ٹھنڈی ہوا سے اس کی طبیعت میں کچھ سکون پیدا ہوا اور وہ نیچے آگیا۔ بڑی نرمی سے اُس نے اپنی بیوی کو جگایا۔ اسے ڈاکٹر کی بتائی ہوئی باتیں جیوں کی تیوں سُنا دیں اور پوچھا۔ تم نے ایسا کیوں کیا؟

اُس کی بیوی نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ میں اُسے کیوں نہ بتاتی؟ اس بات نے تو میرے ہوش حواس گم کر دیئے تھے۔ مجھے خبر نہ تھی کہ آپ کو اس بات کا پتہ ہے۔ لیکن خیر آپ بھی اپنی حالت سے واقف ہو چکے ہیں۔ جب سے ہم اس مکان میں آئے ہیں، میں نے کئی بار آپ کو نیند کی حالت میں چلتے ہوئے دیکھا ہے۔ پھر بھی مجھے کچھ پریشانی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن کل رات جب میں نے آپ کو بالکنی میں کھڑے اور نیچے دیکھتے ہوئے پایا تو چپ نہ بیٹھ سکی اور ڈاکٹر سے صلاح لینے چلی گئی۔

اُسے اپنی بیوی کی یہ بات صحیح لگی کیونکہ جب سے وہ اس شہر میں آیا تھا، اُس نے بالکنی اور نیند میں چلنے کے سوا کچھ سوچا ہی نہ تھا۔ ہوسکتا ہے بیوی کی بات صحیح ہو اور وہ نیند کی حالت میں چلنے لگا ہو اس کے علاوہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ رات کو کسی وقت اُٹھ کر بالکنی میں گیا ہو کہ اپنا منصوبہ تصور میں پورا ہوتے ہوئے دیکھے۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ بات ضرور تھی۔ اُس کا سر درد سے پھٹنے لگا۔ گلا خشک ہوگیا اُس نے پیالے کی طرف ہاتھ بڑھایا اور سارا پانی ایک ہی سانس میں گلے کے اندر انڈیلنے کے بعد کرسی کی پشت سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔

بیوی نے پوچھا" آپ کافی پئیں گے؟"

وہ کرسی پر اس طرح اُچھلا جیسے سانپ نے ڈس لیا ہو اور خوف زدہ لہجے میں بولا" نہیں میں ہرگز کافی نہیں پیوں گا۔"

" پیارے! کافی سے آپ کی طبیعت میں تازگی آئے گی۔ اور بے چینی ختم ہوجائے گی۔ اس کے علاوہ آپ نیند کی زیادتی سے محفوظ رہ سکیں گے۔ بیوی نے صلاح دی۔"

اس کا جسم بوجھل ہوگیا۔ انگ ڈھیلے پڑگئے، اور نیند اس کی آنکھوں میں گھس آئی۔ اُس نے جاگنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ تم مجھے زہر پلانا چاہتی ہو، ہرگز نہیں۔ میں تمہارے جال میں ہرگز نہیں آؤں گا..... تم..... تم.....

اس نے اپنی بیوی کی نرم اور پرسکون آواز سنی۔ میں آپ کو کافی میں زہر پلانا چاہتی ہوں، یہ کہتے تو بھی ہیں آپ۔ کیا کافی کے سوا کسی چیز میں زہر نہیں ملایا جاسکتا؟ کیا پانی میں زہر نہیں ملایا جاسکتا؟ آپ نے ایسا کیوں نہیں سوچا؟"

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے پپوٹے بوجھل ہوتے جارہے تھے اگلے ہی لمحہ وہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

دوسری صبح سورج طلوع ہوا تو لوگوں نے دیکھا، وہ عورت بالکنی میں کھڑی شور مچا رہی ہے۔ اس کے شوہر کی لاش نیچے سمندر کے کنارے پتھروں پر پڑی ہے۔ لوگوں کے پوچھنے پر وہ روتے ہوئے بولی میرے شوہر کو نیند میں چلنے کی بیماری تھی۔ رات وہ نیند میں چلتے ہوئے بالکنی سے گر پڑے۔

صبح مجھے پتہ چلا کہ بستر پر نہیں ہیں۔ میں نے نیچے دیکھا تو اُن کی لاش دکھائی دی۔ ہائے ہائے لوگو! میں تو لٹ گئی۔ میں برباد ہوگئی۔ اب میرا کیا بنے گا؟

کسی نے اُس کی بات پر شک نہ کیا اور اس طرح وہ اچھا بھلا اپنے انجام کو پہونچا۔ اب تمہارا کیا خیال ہے۔ اس کی قسمت میں خوش قسمتی کب اور کیسے آئی؟ وہ بے چارہ تو واقعی اچھا بھلا تھا۔"

میرا دوست بولا" میری رائے تمہارے خیال سے مختلف ہے۔ اگر تم اس کے عمل پر غور کرو تو پتہ چلے گا کہ اس کی ساری الجھنیں خود کی پیدا کردہ تھیں۔ اسے خوش قسمتی ملی ضرور لیکن وہ اُس سے کام نہ لے سکا۔"

مترجم: شاہد ماہلی

بقیہ: لالٹین

ابا نے جھپٹ کر اسے لبادے میں چھپا لیا۔ اور سب دھاڑ مار کر ایک ساتھ رو پڑے۔

ہم نے اُسے وہیں دفنا دیا۔ ابا نے اپنے ننگے ہاتھوں سے ایک ننھی قبر کھودی، قرآن کی آیتیں پڑھیں اور ایک چھوٹی سی نماز ادا کی۔

گولیوں اور بمباری کی آواز نزدیک آتی جارہی تھی۔ بھیا لالٹین اٹھائے راستہ دکھا رہی تھی۔ آخری بار میں نے پیچھے گھوم کر دیکھا۔ پہاڑی پر لالٹین ہی لالٹین دکھائی دے رہی تھیں۔

ایک فلسطینی نظم

محمود درویش ایک فلسطینی مہاجر ہیں۔ اور یہ نظم فلسطینی مہاجروں کی عکاسی کرتی ہے۔ محمود کو عرب دنیا میں عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ حال میں افروایشائی ادب کی بہترین تخلیقات کے تحت انہیں لوٹس پرائز دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔

نئی دہلی میں منعقد چوتھی افروایشائی مصنفین کانفرنس میں ان کی شرکت متوقع ہے۔

تعارف

محمود درویش

لکھ لو بیشک
میں ایک عرب ہوں
کارڈ نمبر پچاس ہزار
آٹھ بچے ہیں
نواں اگلی گرمیوں میں جنم لے گا
کیوں تم پریشان ہو گئے؟
لکھ لو بیشک
میں ایک عرب ہوں
پیشہ، ہمجولیوں کے ساتھ پتھر تراشنا
روزی کمانا، کپڑے کتابیں
بچوں کے لئے ضروری ہیں
تم جانتے ہو
میں کبھی تمہارے در پر
بھکاری بن کر کھڑا نہیں ہوں گا
کیا تمہیں غصہ آ رہا ہے
میرا کوئی نام نہیں ہے
صابر، جہاں سب کچھ غصہ کی آگ میں
دہکتا ہے۔
میں یہاں جڑیں کھودتا ہوں
زیتون اور دوسرے پیڑوں کے آگے
ہل جوتنے والوں کی نسل کا ہوں
میرے والد محض ایک معمولی کسان
کوئی خاندانی باغ نہیں
کوئی پیڑ بھی نہیں
میرا گھر صرف سرکنڈوں کی جھونپڑی ہے
کیسا لگتا ہے یہ ایک انسان کے لئے؟

لکھو لو بیشک
میں ایک عرب ہوں
بالوں کا رنگ گہرا کالا
آنکھیں بھوری
خاص نشان
ایک جذبات بھرا دل اور دماغ میں عقل
ہاتھ پتھر کی طرح سخت اور کھردرے
پسندیدہ کھانا، زیتون کا تیل اور جڑی بوٹیاں
پتہ:۔ ایک بھولا ہوا بے گناہ گاؤں
جہاں گلیوں کا نام نہیں ہے
اور سبھی لوگ کھیتوں اور کیاریوں میں ہوتے ہیں
کیا اتنا بتانا کافی نہیں؟
تم نے میری انگوری بگیا لوٹی ہے
اور وہ زمین جسے میں جوتتا تھا
تم نے میرے بچوں کے لئے کچھ نہیں چھوڑا
سوائے چٹانوں کے
اور میں نے سنا ہے
تمہاری سرکار چھیننے والی ہے
ان پتھروں کو بھی
اچھا تو اب لکھ لو سب سے پہلے
مجھے کسی سے نفرت نہیں ہے
نہ میں کسی کی چوری کرتا ہوں
لیکن جب مجھے بھوکوں مارا جاتا ہے
تو میں اپنے دشمن کو کھا جاؤں گا۔
خبردار!
میری بھوک اور میرے غصے سے

مترجم: شاہ عالی

نئی کتابیں

ذوقِ سفر

غلام ربانی تاباں کا دوسرا مجموعۂ کلام

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی۔

قیمت: پانچ روپے ۲۰ پیسے ضخامت ۱۹۲ صفحے

کتابت و طباعت اعلیٰ — کاغذ دبیز، کتاب مجلد اور جلد پوش کی حامل ہے۔

تاباں صاحب نے حدیثِ دل سنائی تو رمز شناس دل دھڑک اٹھے تھے اس کے بعد انہوں نے غزل کی ایمائیت، اشاریت اور تابانیوں سے شعر کی دنیا کو ایک جلوۂ تاباں دکھایا۔ ان کا کلام پڑھنے اور غور کرنے کی چیز ہے اس کے باوجود جب یہ مدھم، تحت اللفظ سے شعر سناتے ہیں تو جب موقع آہ اور واہ کا شور اٹھتا ہے۔ مقامِ شکر ہے کہ تاباں صاحب اپنے جلسوں کے بیچ میں بھی نہیں آئے اور انہوں نے یہ گوارا نہیں کیا کہ شاعری کو اس کے مروجہ آہنگ اور دلربائی سے بے نیاز کر دیا جائے۔ اُن کی غزل میں عاشق و معشوق دونوں کا درجہ بہت بلند ہے۔ یہ گھٹیا عشق کی ترجمانی نہیں کرتے۔ پاسِ وضع اور غیرت کا ساتھ نہیں چھوڑتے۔

ایک دن وقت بتائے گا جنوں کی عظمت
یوں تو ہم لوگ ہیں رُسوا سرِ بازار بہت
خلوص بچ گیا الزام سے گدائی کے
ہیں دستِ شوق پہ احسان نا رسائی کے
یہ چار دن کی رفاقت بھی کم نہیں اے دوست
تمام عمر بھلا کون ساتھ دیتا ہے
بڑے عجیب ہیں آدابِ ترکِ اُلفت کے
چراغ بجھتا نہیں جلملانے لگتا ہے

زندگی کے معارف و نکات بڑی سلاست سے بیان کر دیتے ہیں

تمام جہد و تجسس تمام درد سہی
سفرِ حیات ہے حاصلِ سفر کا گرد سہی
چلے چلو کہ ابھی دور ہے دیارِ خلوص
قدم قدم پہ زمانے سے اک نبرد سہی
ہر ایک موڑ پہ جلتے ہیں منزلوں کے چراغ
تھکا ہوا ہے مسافر کدھر کدھر جائے

ان کی شاعری کے بیسیوں رُخ ہیں لیکن وہ دھیما پن جو اُن کے لہجے میں ہے غزل کے لہجے میں بھی ہے۔ گھن گرج، ہاؤ ہو، شور و شر اور آشوب کاری کا نام نہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اچھا شعر ڈھونڈنے کے لئے انتخاب کی ضرورت نہیں۔ اُن کا پیرایۂ گفتار منفرد ہے اس دورِ کم عیاری میں اگر ایسا گراں بہا مال مل جائے تو اہلِ ذوق کی خوش وقتی ہے اس سے جدید تر شاعری اور کہاں ملے گی۔

جذبہ و آواز

من موہن تلخ کا دوسرا مجموعۂ کلام

ناشر:۔ ورشا پبلیکیشنز ۲۰۷۰ ٭ نیو راجندر نگر نئی دہلی ۵

قیمت:۔ ۴ روپے ۵۰ پیسے

تلخ کا یہ دوسرا مجموعہ کلام ہے۔ پہلا مجموعہ "چراغِ فکر" ۱۹۵۸ء میں چھپا تھا۔ صحافت کی پیچدار اور جانگداز راہوں کا مسافر اگر اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو باقی و سالم رکھ سکے تو بڑی بات ہے لیکن تلخ نے اس بادۂ ناب کی تلخی میں اور اضافہ کیا ہے۔ یہ بات بجا اور درست کہ یہ ضرورت سے زیادہ وقت تک "منقار زیرِ پر" رہے اور داغ کے اس شعر کی یاد دلاتے رہے ہیں

لگ گئی چُپ تجھے اے داغِ حزیں کیوں ایسی
کچھ تو کم بخت ذرا حال سُنا تو اپنا

تعلق اور بے تعلقی کے درمیان جنگ اُن کی زندگی کا بہت بڑا سانحہ ہے اس کی ترجمانی انہوں نے بہت کی ہے بلکہ وہ اس احساس میں ڈوب گئے ہیں

اک بات کہوں تم سے کہ وہ میں ہوں کہ تم ہو
کوئی بھی تعلق سے بڑا ہو تو بتا دو
اور پھر سے کس ربط کی بھولی ہوئی پہچان ہوں میں آج
مجھ کو تو نہیں تم کو پتہ ہو تو بتا دو

اُن کا لہجہ کچھ ایسے ہی تحیرات کا حامل ہے اسی تحیر اور لاعلمی سے وہ شعر میں زندگی کے راز مستور کر دیتے ہیں کھل کر کہہ دیں تو مزہ کیا رہے۔ انہوں نے غزلیں بھی کہی ہیں اور نظم کی بساط بھی بچھائی ہے اس بساط پر ہر رنگ کے مہرے ہیں۔ زندگی کا درد بھی ہے اور محبت کی پرکاری بھی ہملٹ سے یہ بہت متاثر نظر آتے ہیں اور اسی طرح بہکی بہکی باتیں کر کے لطف اُٹھاتے ہیں کیونکہ ان میں طنز بھی ہوتا ہے اور حقیقت بھی۔ جذبۂ آواز کے عنوان سے ایک نظم کے چند شعر سنئے۔ لطف تو جبھی آئے گا جب پوری نظم پڑھیں۔

پو پھٹے کا سماں تھا کچھ ایسے۔ جیسے جوگی بدن پہ راکھ ملے
رُوپ کا جیسے جوگیا ہو لباس۔ من میں بھٹکے پیا ملن کی آس
جیسے شہروں سے چل دئے ہوں فقیر۔ جیسے پھر چل بسا ہو داس کبیر

ان تین شعروں سے نظم تو کیا سمجھ میں آئے گی لیکن بیان دیکھئے زبان دیکھئے تصویر کشی دیکھئے اور لہجے کی حلاوت دیکھئے۔ دیباچہ انہوں نے خود لکھا ہے اور وہ بھی شائستہ نثر کا ایک نمونہ ہے۔

نظموں میں ابہام زیادہ ہے۔ اس کی زیادتی شاعر کے مفہوم کو کبھی ضربات بھی پہونچاتی ہے اسکولی حیثیت سے یہ شاعری جدید و قدیم کا امتزاج ہے لیکن فکری اعتبار سے زیادہ تر جدید بلکہ بے جا نہ ہوگا اگر کہیں قطعی جدید تیلج اگر لکھتے گئے تو چراغِ فکر اور جذبۂ آواز سے اور آگے بڑھیں گے اور اگر اُن کی رفتار اور تیز ہو گئی تو نہ جانے کون سے ماہ و انجم کو پھاند جائے گی۔

جگر بریلوی

(شخصیت اور فن) کہنہ مشق شاعر اور ادیب شیام موہن لال جگر بریلوی کی زندگی اور فن کے باب میں یہ کتاب مالک رام اور سیلی برکی نے مرتب کی ہے — ناشر: علمی مجلس دہلی -٦
قیمت: چھ روپے

جگر صاحب نے اُردو شعر و ادب کی بڑی خدمت کی ہے اور ان کا شمار اساتذہ میں ہوتا ہے۔ اگر ادب کے خادموں کی ہمت افزائی ان کی زندگی میں ہو جائے تو ان کے لئے باعثِ امتنان اور عقیدت گزاروں کے لئے لائقِ مبارک باد ہے۔ مالک رام صاحب کے مقدمے کے علاوہ اس کتاب میں بارہ مضامین شامل ہیں جن میں دو خود جگر صاحب کے قلم سے ہیں اور لکھنے والے سب کے سب ایسے ہیں جنہوں نے جگر صاحب کو مختلف پہلوؤں سے دیکھا ہے۔ اس لئے اِن مضامین میں حق بیانی ہے، سچائی ہے۔ کتاب میں جگر صاحب اور اُن کی اہلیہ محترمہ کی تصاویر بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر منوہر سہائے انور اپنے مضمون کے شروع میں لکھتے ہیں۔

"حضرت شیام موہن لال جگر بریلوی کی جامع کمالات ذات اپنی انفرادیت کے لحاظ سے یگانۂ روزگار متصور ہوتی ہے۔ آپ نے نثر و نظم میں فکر و نظر اور اظہار و ابلاغ کی جو طرز اختیار کی ہے اُس کے واضع آپ ہی ہیں۔ آپ کی طبیعت تقلید سے ہمیشہ اجتناب کرتی رہی ہے۔"

آنکھوں کے شہتیر

مصنف: رفیع الدین احمد
ناشر:۔ رام پور انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل سٹڈیز
قیمت:۔ پانچ روپے۔ کتابت و طباعت اوسط

یہ کتاب مصنف کے سات مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس دور میں طنز و مزاح کے میدان میں قدم رکھنے والوں کی یوں تو اچھی خاصی تعداد ہے لیکن کہیں پھکڑپن مل جاتا ہے اور کہیں علم کی چاشنی نہیں۔ ایسے گنے چند لوگ ہیں جو اس سلسلے میں معتبر ہیں۔ مصنف کے یہ مضامین شائستہ مزاح کا نمونہ ہیں۔ اُن کی پشت پر علم بھی ہے اور فن بھی — مضامین کے عنوان ہیں — سفر ہے شرط — ڈاکٹر کی صلاح مانئے۔ جاگتے رہنا۔ ہماری کرکری، مذاقِ سخن، پان ہماری جان اور ہمارا سنگیت۔ مذاقِ سخن خاصے کی چیز ہے۔ آخر میں نئی شاعری پر پھبتی کسی ہے۔

"نئی شاعری تخیل کی پرواز کو جیوں کا تیوں ریکارڈ کرنے کا فن ہے۔ خیالات جتنے بے ربط، بے ہنگم اور بے تکے ہوں گے اتنے ہی فطری قرار پائیں گے۔"

یہ یک طرفہ فیصلہ ہے لیکن مزاج والوں کو کئی خون معاف ہوسکتے ہیں۔

مشاہیر کے اولیں صحیفے

مشاہیر کی پہلی تحریریں

ناشر:۔ رام پور انسٹی ٹیوٹ آف اوری اینٹل اسٹڈیز

قیمت:۔ بیس روپے جو بہت زیادہ ہے

مرتب:۔ عابد رضا بیدار

اس کتاب میں ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور محمد حسین آزاد کی پہلی تحریریں درج ہیں۔ جو نایاب نہیں تھیں۔ پہلی تحریروں سے مصنفین کے قدوقامت کا اندازہ نہیں ہوتا اس لئے اُن کی اشاعت کوئی خاص بات نہیں۔ افسوس ہے کہ کتاب کے باہر جلی قلم سے لکھا ہے۔ "ڈاکٹر ذاکر حسین اور نیچے نہایت باریک قلم سے لکھا ہے" اور دوسرے " اس سے شبہ ہوتا ہے کہ مرتب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ہیں۔ مرتب نے خود اپنا نام اندرونی ٹائیٹل پر دیا ہے۔ انگریزی میں البتہ جلد پوش پر مصنف کا نام موجود ہے۔

سوغات

شوق سالکی لکھنوی کا مجموعۂ کلام

ناشر:۔ ادارہ اشاعت اردو ہند ملاڈ بمبئی ۶۴

مرتبین:۔ سردار جوہر نجم سہارن پوری

قیمت:۔ پانچ روپے

شوق کی شاعری ابہام کی شاعری ہے نہ اغلاق و غلو کی۔ سادگی میں کہیں کہیں پرکاری نظر آجاتی ہے جو لطف دے جاتی ہے۔

حوصلہ میرا بڑھتا ہوا دیکھ کر
ظالموں کے ارادے بدلنے لگے

نہ لب پہ موجِ تبسم نہ آنکھ پُرنم ہے
جنوں کی حد میں پہنچ کر عجیب عالم ہے

پیش لفظ کہئے یا مقدمہ "لفظوں کے قاتل اور لفظوں کے مسیحا" کے عنوان سے سردار جوہر صاحب نے نئی شاعری کے بعض علمبرداروں " پر جانب داری کا الزام لگایا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ یہ لوگ دیانت دارانہ تبصرے نہیں کرتے بلکہ اپنی پسند اور اپنے مطلب کے شاعروں کو اچھالتے ہیں۔ آخر میں وہ اتنے برہم ہو گئے ہیں کہ یہاں تک کہہ گئے۔

" نئی شاعری اور نئی تنقید میں ذہنی آوارگی، غنڈہ گردی اور بدمعاشی کے جو جراثیم ہیں، انسانوں کے درمیان کسی وقت بھی شرافت و سنجیدگی اور عظمت و اخلاص کی فضا قائم نہیں ہونے دیں گے۔"

لہجہ سخت ہو گیا ہے اور متانت و صداقت سے خالی ہے۔ کچھ لوگ نئی شاعری اور نئی تنقید کے غلط اجارہ دار بن جائیں تو بری بات ہے لیکن نئی شاعری اور نئی تنقید تو بحیثیت مجموعی قابلِ الزام نہیں ہو سکتی۔

ہمیں امید ہے کہ سردار جوہر صاحب اِن بحثوں میں اُلجھنے کے عوض شوق صاحب کی طرح اور شعراء کا کلام بھی شائع کریں گے۔ نازش پرتاب گڑھی اور فضا ابن فیضی اور بہت اچھے شاعر اس بات کے منتظر ہیں کہ کوئی قدردان اُن کے کلام کو شائع کرے۔

ذکرِ نانک

مرتب:۔ اندرجیت گاندھی

ناشر:۔ گوردوارہ پربندھک کمیٹی چاندنی چوک دلی۔

دیباچہ رہبر مدیر ملاپ کے قلم سے ہے اور تقریظ مفتی عتیق الرحمن نے لکھی ہے۔ گورونانک صاحب کے پنج صد سالہ یوم ولادت کے جشن کے موقع پر ساٹھ اردو شعراء کا گوروصاحب کو منظوم خراجِ عقیدت اس کتاب میں درج ہے۔ یہ کوشش مرتب کے لئے لائق مبارکباد ہے۔ قومی یکجہتی کی ایسی خدمت اگر اہلِ ادب کرتے رہیں تو یہ ملک جسے جنت نشان کہتے ہیں، ابدی راحتوں کی جنت بن جائے۔

کلس

راجندر ناتھ رہبر کا مجموعہ کلام قیمت: ایک روپیہ

ملنے کا پتہ:۔ انڈین بک ڈپو۔ دی مال۔ شملہ۔ ۱

اس زمانے میں اردو کلام کا چھپ جانا ہی شاعر کے لئے بڑی سعادت ہے۔ رہبر صاحب کا کلام ہموار ہے۔ وہ نشتریت جس پہ سخن شناس مرتے ہیں، اُن کے یہاں نہیں۔ لیکن پھر بھی سمندر کی تہ میں جائیں تو

کبھی کبھار کوئی گوہرِ آبدار ہاتھ آ ہی جاتا ہے۔

اپنی تسکینِ بندگی کے لئے
نت نئے بُت تراشتا ہوں میں

سفینہ ڈاکٹر موہن سنگھ ادیب راشے دیوانہ کی نظموں کا مجموعہ

ضخامت : ۱۶۸ تقطیع ۲۰×۳۰/۸ کتابت و طباعت گوارا

قیمت : پانچ روپے

ملنے کا پتہ : پروفیسر ادیب راشے ۴/۳/۷ ماڈل ٹاؤن دہلی۔۹

ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ اُردو کے پرانے بلکہ بہت پرانے خادموں میں سے ہیں۔ انہوں نے پہلے پہل اُردو کو اوڑھنا بچھونا بنایا تھا لیکن جلد ہی تصوف کی کملی اوڑھ لی اور اُن کی متعدد انگریزی کتابیں دنیا بھر میں مقبول ہوئیں۔ بہت سی کتابیں پنجابی ادب کے بارے میں تصنیف کی ہیں۔ ان سب باتوں سے قطع نظر وہ اُردو کے بڑے مشاق شاعر ہیں اور این و آں، مکان و زمان، نور بالذات، ذات و صفات وغیرہ قسم کی بھول بھلیاں میں گھومتے پھرتے ہم لوگوں کو منزل کی راہ دکھاتے ہیں چنانچہ زیرِ نظر کتاب بھی ایسے کلام سے پُر ہے جو اُردو والوں کے یہاں کم ملے گا۔ یہ سوقیانہ قسم کی زلفِ گرہ گیر کی کہانی نہیں بلکہ حیات و ممات کے پُرپیچ مسئلوں کا حل پیش کرتی ہے۔

غزلوں میں سے تو آدمی شعر انتخاب کر لیتا ہے لیکن جہاں ہر چیز پہلے ہی منتخب ہو وہاں انتخاب پیش کرنے کی ضرورت نہیں اہلِ نظر پڑھیں اور داد دیں۔

سحرِ نغمہ ساحر ہوشیار پوری کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے جسے اگر سحرِ جلوہ بھی کہہ دیں تو غلط نہ ہوگا۔ پہلے مجموعے کا نام سحرِ غزل تھا۔ ساحر صاحب جوش ملسیانی صاحب کے فارغ الاصلاح شاگردوں میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ اُن کا ہر سحر سحرِ حلال ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب میں اچھے شعروں کی تعداد خاصی ہے۔ دس بیس شعر بھی اگر کسی مجموعے میں ایسے مل جائیں جو نشتر ہوں تو غنیمت ہے۔ سحرِ نغمہ میں تو بہت سے نشتر ہیں۔ جذبات اور نفسیات کی عکاسی ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ قدیم رنگِ سخن اُن کا ورثہ ہے لیکن فکر اور ندرتِ اظہار کے لحاظ سے انہیں قدیم نہیں کہا جاسکتا۔ نئی راہوں میں بھی انہوں نے گام زنی کی ہے لیکن اُن کے کلام پر تغزل حاوی ہے۔ چند شعر سنئے۔

دوستی کی جو گل عذاروں سے ؛ دشمنی ہو گئی بہاروں سے
ایک طوفاں سے کیا بچی کشتی ؛ لاکھ طوفان اٹھا کناروں سے
دشمنوں سے بھی دوستی کی ہے ؛ حوصلہ ہے فریب کھانے کا
جھنجھنا اٹھا ہے دل کا ہر تار ؛ آپ کا نام سنا ہو جیسے

قیمت : دس روپے۔ ملنے کا پتہ :۔ ماہ نامہ بیسویں صدی دریا گنج دہلی
ماہ نامہ تحریک۔ انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی

گلِ رعنا مرتبہ :۔ مالک رام

' غالب کے اُردو اور فارسی کلام کا اولین انتخاب۔

ناشر :۔ علمی مجلس دہلی چھتہ نواب صاحب' فراش خانہ دہلی

قیمت :۔ سات روپے پچاس پیسے

کاغذ، کتابت، طباعت، جلد نہایت عمدہ

مرزا غالب ۱۸۲۶ء کے آخر میں کلکتے کے لئے روانہ ہوئے۔ ۲۱ فروری ۱۸۲۸ کو وہاں پہونچے، اور ماہ ستمبر ۱۸۲۹ میں دلی کے لئے روانہ ہوئے۔ وہ ۲۹ نومبر ۱۸۲۹ کو دلی میں وارد ہوئے۔ کلکتے میں اُن کی ملاقات مولوی سراج الدین احمد سے ہوئی۔ اُن سے غالب کو بہت محبت اور عقیدت پیدا ہو گئی کیوں کہ وہ اُن کے بڑے قدر دان تھے۔ قیامِ کلکتہ کے زمانے میں انہوں نے غالب سے فرمائش کی کہ وہ اُن کے لئے اپنے اُردو اور فارسی کلام کا انتخاب تیار کر دیں چنانچہ 'گلِ رعنا' اسی انتخاب کا نام ہے۔ یہ قلمی نسخہ مالک رام صاحب کو عماد الملک سید حسین بلگرامی کے پوتے سید نقی بلگرامی سے ملا۔ مولوی سراج الدین کے ساتھ ہی اِن دنوں میں عماد الملک بہادر کے دادا مولوی سید کرم حسین صاحب کلکتے میں موجود تھے اور سفیر اودھ تھے غالباً انہوں نے مولوی سراج الدین احمد سے 'گلِ رعنا' کی نقل حاصل کی، اور وہ اُن کے خاندان میں محفوظ رہی۔ یہاں تک کہ سید نقی بلگرامی تک پہونچی۔ مولوی سید کرم حسین بلگرامی صاحب وہی شخص ہیں جنہوں نے اپنے ہاتھ پر چکنی ڈلی رکھی تھی اور غالب نے فی البدیہہ بارہ شعر کا قطعہ چکنی ڈلی کی تشبیہات کے باب میں کہا تھا۔ محمد حسین آزاد کا یہ قول کہ غالب کے اُردو کلام کا پہلا انتخاب مولوی فضلِ حق خیر آبادی اور مرزا خانی کوتوالِ شہر نے کیا اس لحاظ سے درست نہیں۔ 'گلِ رعنا' کی ایک نقل پاکستان میں بھی ہے مگر وہ ابھی شائع نہیں ہوئی۔ مالک رام صاحب کا یہ کارنامہ غالبیات کے سلسلے میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ انہوں نے کتاب کی ترتیب میں متعدد نسخوں اور کتابوں سے مدد لی ہے۔ اُمید ہے کہ یہ کتاب جو پہلی بار منظرِ عام پر آئی ہے غالبیات کے سلسلے میں تحقیق کے نئے دروازے کھولے گی۔

دلّی جو ایک شہر تھا

از: راجندر لال ہانڈا ترجمہ: سلیم احمد

ملنے کا پتہ: - مکتبہ جامعہ پرائیویٹ لمیٹیڈ۔ نئی دہلی قیمت: چھ روپیہ

راجندر لال ہانڈہ کا نام انگریزی اور ہندی صحافت وادب کی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ زیر نظر کتاب ہندی کے علاوہ ہندوستان کی اور دوسری علاقائی زبانوں میں بھی شائع ہو کر قبول عام کی سند حاصل کر چکی ہے۔ اُردو میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ اس کے اُردو اڈیشن میں پروفیسر محمد مجیب کا پیش لفظ کتاب کی زینت ہے غلام ربانی تاباں نے کتاب اور مصنف کا تعارف تحریر فرمایا ہے۔ اس کتاب میں دلی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اس زمانہ کے واقعات پر مبنی ہے جب دلّی ایک ہنگامی اور بحرانی دَور سے گزر رہی تھی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب دُوسری جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی اور ہندوستان دھیرے دھیرے آزادی کی منزل کی طرف قدم بڑھا رہا تھا۔ ہندوستان کی آزادی کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا ہے اور اسی کے ساتھ تقسیم ملک اپنے جلو میں تباہی و بربادی کا ہیبتناک اور خوفناک طوفان لے آتی ہے۔ دس سال کا یہ مختصر عرصہ ہے مگر اس مختصر سی مدت میں تاریخ کے بہاؤ کا رُخ مڑ جاتا ہے۔ ایک بساط اُلٹ جاتی ہے اور دُوسری بساط بچھائی جاتی ہے تہذیب و تمدن، سیاست و حکمت کے ایک نئے دَور کا آغاز ہوتا ہے۔ تاریخ کے پُرانے کھنڈرات پہ نئے ہندوستان کی نیو رکھی جاتی ہے۔ ہانڈا صاحب نے اس دَور کی دلّی کے بدلتے رنگ و رُوپ کو صفحۂ قرطاس پر سمیٹ لیا ہے۔ یہ کتاب آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی۔ افسانہ بھی ہے اور حقیقت بھی۔ جگہ جگہ مزاح کی چاشنی نے اس کتاب کے موضوعات کو اور بھی دلچسپ اور شگفتہ بنا دیا ہے: "دلّی مت آنا"، "کرفیو کی ساعتیں" "کھنڈر کلب" وغیرہ خاکے طنز و مزاح کے اچھے نمونے ہیں۔ مصنف نے ہندو مسلم جھگڑے اور لسانی تنازع جیسے مسائل پر بھی قلم اُٹھایا ہے۔ زبان کے مسئلہ پر اُن کی دلیلیں کافی مضبوط ہیں اور ہندی پریمیوں کے لئے لمحۂ فکریہ۔ ہندو مسلم مسئلہ پر جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ ایک وسیع ذہن اور ہمدردانہ نقطۂ نظر کی عکاسی تو ضرور کرتے ہیں مگر مسئلے کا حل نہیں ہو سکے۔ اس سلسلے کے مضمون میں فیاض حسین (مصنف کے ایک دوست) جو باتیں کہتے ہیں وہ جیسے اُن سے کہلوائی گئی ہوں۔ مصنف نے فیاض صاحب کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ اسی لئے شاید پورا مکالمہ مصنوعی معلوم ہوتا ہے۔

ترجمہ سلیس، شستہ اور رواں ہے اور کتاب، طباعت اور گٹ اپ کے لحاظ سے بھی اچھی ہے۔

رئیسہ خانم

پرچھائیوں کی وادی

مصنف: انور عظیم - قیمت: پانچ روپے

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ۔ اُردو بازار دہلی ۶

ہماری یونی ورسٹیوں کے کیمپس جو آج کی زندگی کے پیچ در پیچ مسائل کے گہوارے ہیں اور عرصے سے اخبارات، رسائل اور سنجیدہ محفلوں میں گفتگو کا موضوع بنے رہے ہیں، اُن پر ہمارے ادیبوں نے بھی اکثر توجہ دی ہے۔ انور عظیم کا ناول "پرچھائیوں کی وادی" بھی دراصل اسی قبیل کی تخلیقات میں سے ہے۔ اس کی اہمیت یہ ہے کہ یہاں مصنف نے یونی ورسٹی کی بظاہر رُومانی فضا میں پلنے بڑھنے والے نوجوانوں اور بزرگوں کی بے چین اور بحران زدہ جذباتی زندگی کی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ 'پرچھائیں' کی علامت بڑی خوبصورت اور معنی خیز ہے۔ ہماری زندگی کے مسائل اور تضادات ہی دراصل ٹھوس حقیقتیں ہیں۔ اور اُن کے سائے میں پروان چڑھنے والے کردار محض اُن کی پرچھائیاں ہیں۔ ایسی پرچھائیاں جو اپنی اصل سے بھاگتی، کتراتی، منہ چھپاتی، موہوم اندھیروں اور چکا چوند کر دینے والی روشنیوں میں کبھی خود سے کبھی غیروں سے آنکھ مچولی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہ وہی پرچھائیاں ہیں جنہیں آج کل کی زبان میں انٹلکچوئل کہا جاتا ہے۔ یہ بیک وقت اپنے سماج کے وفادار بھی ہیں اور باغی بھی۔ یہ تنہائیوں میں کچھ اور ہوتی ہیں اور محفلوں اور جھگڑوں میں کچھ اور۔ جیسے یہاں اُن کے باہمی رشتے بھی اسی قدر دوہرے بلکہ پیچیدہ ہیں۔ ایک ہی شخص کے ساتھ بے وفائی اور خلوص ایک ہی لمحے میں جرم اور پچھتاوا۔ ہر دلکش چیز کی طرف لپکنا بھی اور اس سے بیزاری بھی، یہ سب ان کرداروں کی خصوصیات ہیں۔ ان کی ذات کے اندر برپا ہونے والے اس ہیجان کا سب سے واضح اظہار ان کی جنسی تمناؤں، محرومیوں اور اُلجھنوں میں ملتا ہے اور اس ناول کی کہانی ان ہی کے

سہارے اُبھرتی اور پتہ پتہ کھلتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔

ناول کا اہم ترین کردار معمر پروفیسر شیراز ہیں جو سب سے زیادہ پختہ کار ہیں بلکہ لڑکیوں کے معاملے میں تو منجھے ہوئے ہاتھ رکھتے ہیں۔ وہ محبت کی تلاش میں جنسی لذت تک پہونچے اور پھر اُسی کے ہو رہے۔ یونی ورسٹی میں بڑے بڑے جانِ عالم آئے مگر وہ پروفیسر شیراز سے بازی نہ لے جا سکے۔ سچ پوچھیے تو پروفیسر شیراز کی شخصیت نے ہی اُن کے فرسٹریشن میں سرلمحہ اضافہ ہی کیا۔ شہناز بے حد حسین اور مقناطیسی کشش رکھنے والی لڑکی ہے۔ باپ کی خواہش کے مطابق ایک نہایت کامیاب ڈاکٹر سے شادی کی۔ اس شادی نے نہ محبت عطا کی نہ جنسی آسودگی۔ مگر پروفیسر شیراز کے ہوتے ہوئے ایسی لڑکی کو کس چیز کی کمی ہو سکتی تھی؟ اُسے پُرسکون گھر کے سوا اور سب کچھ مل گیا۔ اس کا شوہر برکت الٰہی محض ایک متدِ فاضل ہے۔ پریتم اور چندر موہن نوجوان ہیں، خوبرو ہیں۔ اچھی لڑکیوں کے دیوانے ہیں۔ معمولی لڑکیوں سے جان بچائے پھرتے ہیں۔ شہناز کی موجودگی میں شیراز کی بیٹی شہلا اُن کے لئے مسئلہ ہے۔ شہناز کا ایک بچہ بھی تھا جو نہ جانے کس کا تھا اور اچھا ہوا، کہ بچپن میں ہی ختم ہو گیا مگر اس کا موہوم وجود آخر تک دل کو تڑپاتا ہے۔ بیگم صدیقی اور بیگم سلامت اس تصویر کے پس منظر ہیں وہ گہرے رنگ ہیں جو تضاد کو واضح کرنے کے لئے استعمال کئے گئے ہیں اور نہایت اہم ہیں

یہ ایک دلچسپ اور جاندار ناول ہے۔ ابتدائی حصوں میں ربط تلاش کرنے میں ذرا مشکل پیش آتی ہے۔ مگر جیسے جیسے کہانی آگے بڑھتی ہے، سرے ملنا شروع ہو جاتے ہیں۔ ناول میں طنزیہ علامتوں اور اشاروں سے جابجا کام لیا گیا ہے جس سے مصنف کا اپنا نقطۂ نظر بھی واضح ہو جاتا ہے۔ اور وہ ہے اس دور کی بے کردار زندگی سے بیزاری اور پرچھائیوں کی جگہ اصل پیکروں کی تلاش۔ انور عظیم کا تخیل بہت رنگین و رعنا ہے اور اکثر پڑھنے والے کو اپنے ساتھ خواب و خیال کی دُنیا میں اُڑائے اُڑائے پھرتے ہیں۔ پروفیسر شیراز پر فالج کا حملہ اور شہناز کا پاگل پن ناول کے سب سے مؤثر حصے ہیں۔ شہلا کا کردار کچھ ڈھیلا ڈھالا سا ہے وہ اچانک اور شاید بلا وجہ ناول سے غائب ہو جاتی ہے یہاں تک کہ اپنے باپ کی سخت بیماری کے زمانے میں۔ چندر موہن اور پریتم کی پہلی ہی ملاقات ضرورت سے زیادہ Frank بلکہ رقیبانہ تھی ہے۔ مجموعی طور پر ایک دلچسپ اور خوبصورت ناول ہے۔ اور اس میں ہماری زندگی کے موجودہ المیے کو موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

صدیق الرحمٰن قدوائی

---

(۱) مقدمہ شعر و شاعری ۔ قیمت ۲/۶۰ لائبریری ایڈیشن ۳/۴۰

(۲) انتخاب سراج اورنگ آبادی " ۱/۲۰ " " ۱/۷۰

(۳) موازنۂ انیس و دبیر " ۳/۲۵ " " ۴/۲۵

مکتبہ جامعہ نے حکومت جموں و کشمیر کے تعاون سے اُردو کے معیاری اور کلاسیکی ادب کو، اصل متن کی صحت و صفائی اور تحقیق و تفحص کے ساتھ شائع کرنے کا عزم کیا ہے۔ اس سلسلے کی جو پہلی تین کتابیں سامنے آئی ہیں وہ بالترتیب اس طرح ہیں۔

مقدمہ شعر و شاعری

مرتبہ:۔ رشید حسن خاں

خواجہ الطاف حسین حالی کی مقدمہ شعر و شاعری اس سلسلے کی پہلی کتاب ہے۔ یہ سب سے پہلے دیوان حالی کے ساتھ سن ۱۸۹۳ء میں دہلی کے مطبع انصاری سے شائع ہوئی تھی۔ نسخۂ جامعہ کی بنیاد اسی متن پر رکھی گئی ہے۔

درحقیقت یہ اُردو کی وہ پہلی تنقیدی کتاب ہے جس میں حالی نے شعر و شاعری سے متعلق لاتعداد گوشوں اور اَن گنت مسائل پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ حالی نے اپنے استدلال میں عربی و فارسی کے علاوہ انگریزی شاعری کا بھی حوالہ دیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب مشرق و مغرب کو قریب لانے کی پہلی شعوری کوشش نظر آتی ہے۔ حالی نے روایتی انداز سے ہٹ کر جدید غزل کی بنیاد رکھی جس کے زیرِ اثر انہوں نے بھی اور بعد میں آنے والوں نے بھی غزل کو تنگنائے سے نکال کر نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا چند وہ نکات بیان کئے جو انہیں روایت شکن بناتے ہیں۔ اُردو میں آزاد نظم کا جو تصور سامنے آیا اس میں حالی کے افکار و خیالات کو بھی بڑا دخل ہے۔

فی الواقع جس طرح غالب پر کام کرنے والے کے لئے "یادگارِ غالب" سے مفر نہیں۔ اسی طرح اُردو شعر و ادب سے وقوف کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بھی ناگزیر ہے۔ حالی کی اکثر رائیں صائب و صحیح ٹھہری ہیں۔ تاہم اُن کی چند باتوں سے آج اختلاف کی بڑی گنجائش ہے۔ جس کا سبب حالی کی وہ حد سے بڑھی ہوئی شرافت ہے جو بعض اوقات اُن کی پرکھ میں آڑ بن گئی ہے۔ یہ انداز خال خال ہے جو کسی طرح کتاب کی مجموعی افادیت پر اثر انداز نہیں ہوتا۔

انتخاب سراج اورنگ آبادی

اس سلسلے کی دوسری کڑی سراج اورنگ آبادی کے کلام کا انتخاب ہے۔ سراج کی اثر آفرینی کے بارے میں اُن کے کلام کے مرتب ڈاکٹر محمد حسن کی رائے ہے۔

"شمالی ہند کے دورِ اوّل کے بلند قامت شاعروں میں
سے کوئی بھی اُن کے اثرات سے آزاد نہیں ہے۔ میر
سودا، درد سبھی کے تصورات اور اسلوبِ بیان
پر سراج کے اثرات کی نشان دہی کی جا سکتی ہے۔"

یہ بات دوسری ہے کہ خود سراج کے کلام میں نہ شیریں دیوانگی ہے، نہ شبنمی نگاہ۔ جمال دوستی اور اسلوب پرستی ولی کی طرح اُن کے یہاں بھی ہے۔ تصوف کی چاشنی اور مجاز کی رنگینی وہ بھی رکھتے ہیں۔ سراج نے آج سے تک بھگ ۲۵۰ سال پہلے جب شاعری کی زبان شکست و ریخت سے دوچار تھی مگر اس کا کینڈا بن چکا تھا اس کے باوجود ولی کی طرح سراج نے بھی اُردو کی اس روایت کو دکن سے شمال کی طرف منتقل کرنے میں پہل کا کام کیا ہے۔

کلام سراج کی لسانیاتی خصوصیات کے ذیل میں اتنا اشارہ کافی ہے کہ اس میں دکنیت کے جملہ عناصر موجود ہیں۔ فاضل مرتب کی اس صراحت کے باوجود کہ طرزِ کتابت میں تبدیلی نہیں کی گئی، ہائے دوچشمی کا طرزِ کتابت جدید قاعدے کے مطابق ملتا ہے۔ مناسب ہوتا کہ اس میں بھی تبدیلی نہ کی جاتی اور اگر کی گئی تھی تو صراحت کی جاتی تاکہ لسانیاتی نقطۂ نظر سے جائزہ لینے والوں کو اپنے تجزیئے میں آسانی ہوتی۔

موازنۂ انیس و دبیر

مرتبہ رشید حسن خاں

اس سلسلے کی تیسری اہم کتاب ہے۔
یہ کتاب پہلی بار سن ۱۹۰۷ء میں آگرہ کے مطبع مفید عام سے شائع ہوئی تھی۔ جامعہ کی بنیاد اسی پر رکھی گئی ہے۔ اس کتاب کے سامنے آتے ہی شبلی پر جو بے دے ہوئی اس میں اُن کے سر جانب داری کا الزام تھا۔ حالی کی طرح شبلی بھی اُردو تنقید کے معماروں میں سے تھے۔ اُن کی بھی کسی تنقیدی تحریر سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کتاب مرثیہ گوئی کا تفصیلی تعارف، تبصرہ، اور تشریح ہے۔ میر انیس کے محاسن او مرزا دبیر کے معائب کا بیان ہے۔ اتنا ہی نہیں دبیر کے محاسن کا کہیں کہیں دبے لفظوں میں اعتراف بھی ہے۔ ساتھ ہی اُن کے محاسن کی قدر و قیمت کا تعین اور بعض دلچسپ توجیہیں بھی ہیں۔
وفورِ عقیدت میں ایک کمی یہ بھی آئی ہے کہ شبلی نے دبیر کو وہ داد نہیں دی جس کے وہ مستحق تھے۔
اس کے باوجود شبلی کا یہ کام بلکہ کارنامہ عملی اور تقابلی تنقید کا اچھا نمونہ ہے اس میں انہوں نے ایک بڑے موضوع کا احاطہ اور بھرپور محاکمہ کیا ہے۔ تنقید کے کچھ اصول برتے اور متعین کئے ہیں اُن اختراع میں ذہن کی خلاقی اور طباعی سے زیادہ مختلف زبانوں (عربی و فارسی) میں مروجہ تنقیدی اصولوں سے استفادہ کرتے ہوئے اُردو میں ایک اگلا قدم اٹھایا ہے اس طرح کہ کوئی گوشہ تشنۂ تشکیل محسوس نہیں ہوتا۔ لہجے میں متانت ہے مگر تقشف نہیں اور نہ رکاکت ہے اور نہ خارا شگافی۔
اُردو ادب کی ان تین معیاری کتب کو مکتبہ جامعہ نے جس سلیقے سے شائع کیا ہے اس کے لئے اربابِ مکتبہ، حکومت جموں کشمیر اور اساتذہ اور محققین بجا طور پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ضرورت ہے کہ اربابِ ادب بھی اِن گنج ہائے گراں مایہ سے اپنی لائبریریوں اور کتابی ذخیروں کو مزین کر کے اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہوں۔

امیر اللہ شاہین

۲ اکتوبر ۱۹۷۰ کو نئی دہلی میونسپل کمیٹی کے آڈیٹوریم میں ایک کلچرل ادارے "رن دی وو" کی طرف سے "شام سروش" کا انعقاد کیا گیا جس میں مشہور اُردو شاعر رفعت سروش
کے کلام پر مبنی شعر و نغمہ کا پروگرام پیش کیا گیا۔ انور صدیقی اور علی جواد زیدی نے رفعت سروش کی شاعری پر روشنی ڈالی اور حفیظ احمد خاں ، سرلا کپور، ادشا سیٹھ اور نینا دیوی
فن کاروں نے اُن کی غزلیں اور نظمیں گائیں (دائیں طرف) نینا دیوی نغمہ سرا ہیں (بائیں طرف) رفعت سروش اپنا کلام سنا رہے ہیں۔

۲۴ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو ہندوستانی ادبی سوسائٹی کی جانب سے
ماؤلنکر ہال نئی دہلی میں قومی یک جہتی سے متعلق ایک مشاعرہ منعقد ہوا جس
میں جاں نثار اختر، کیفی اعظمی ، اختر الایمان ، مجروح سلطان پوری اور
متعدد ممتاز شعراء نے شرکت کی۔ مشاعرے کی صدارت مرکزی نائب وزیر
جناب یونس سلیم نے کی۔
(تصویر میں) جناب محمد شفیع قریشی مرکزی نائب وزیر مشہور اداکار دلیپ کمار
کا استقبال کر رہے ہیں جو اس مشاعرے میں شرکت کے لئے خاص طور پر
تشریف لائے تھے۔
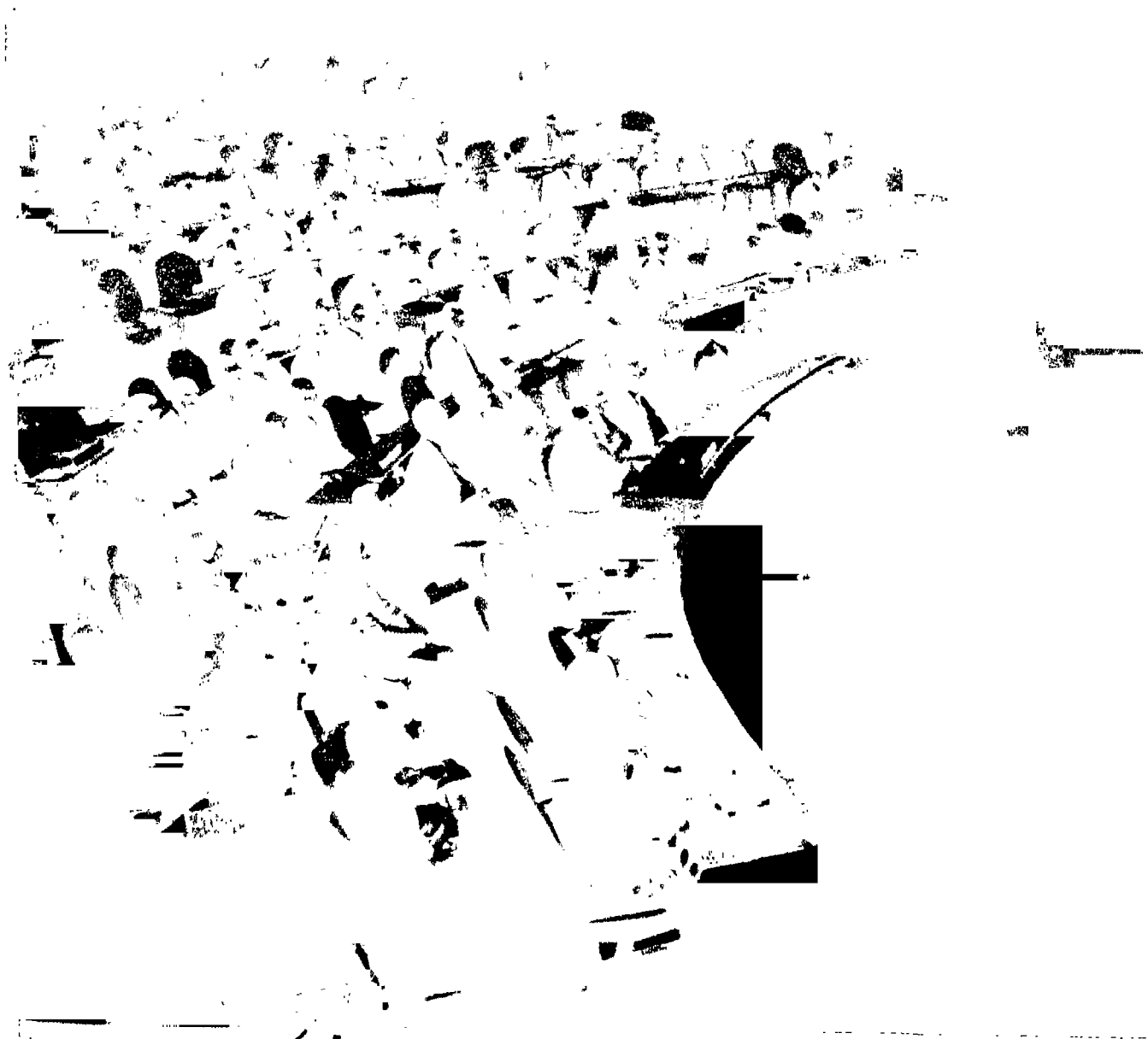
وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے سلور جوبلی اجلاس میں تقریر کر رہی ہیں۔

Vol. 29 No. 5 AJKAL (Monthly) December 1970

Edited and Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi.
Printed by Skylark Printers, 11355 Idgah Road, New Delhi-55
Regd. No. D-509
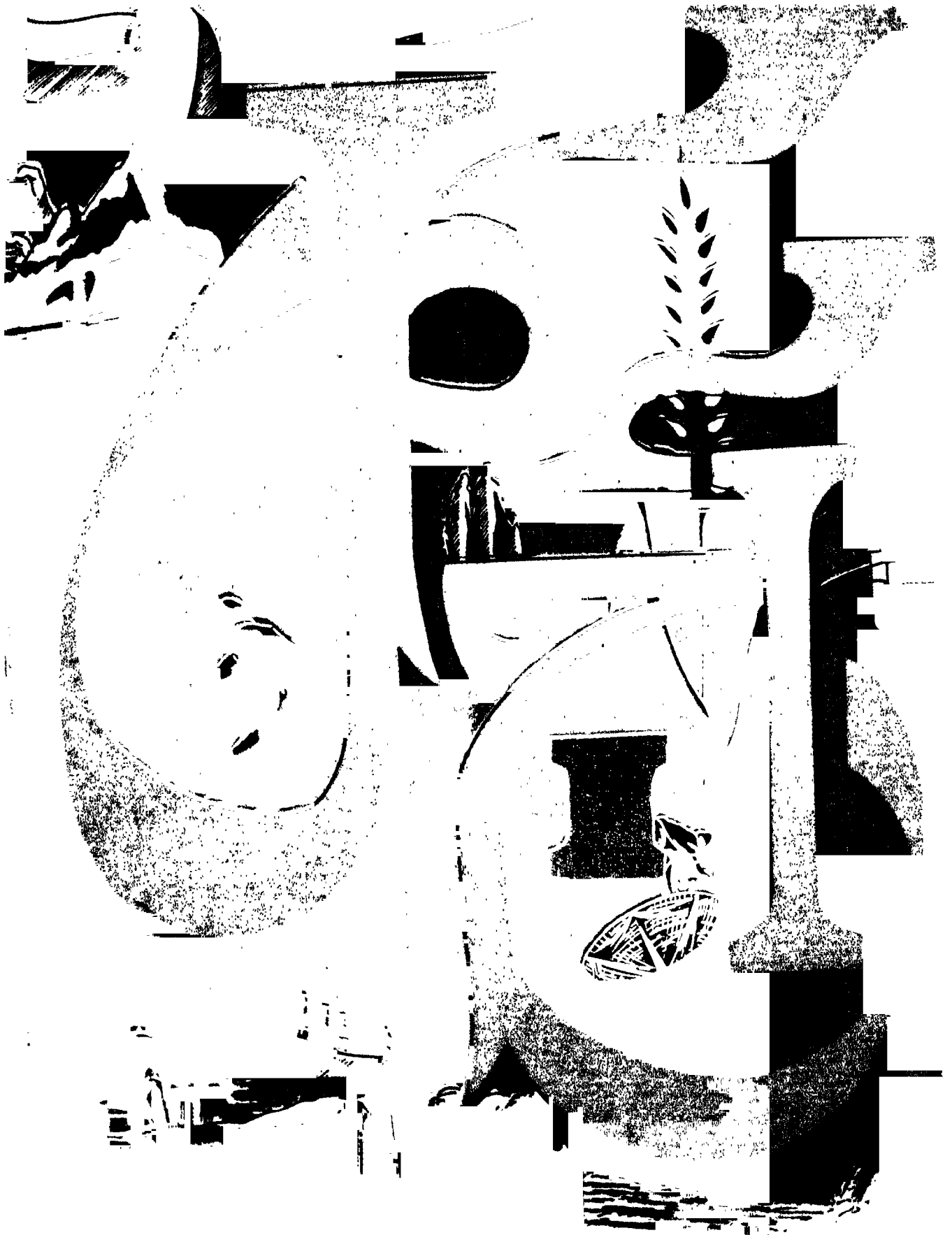
۲ نومبر ۱۹۷۰ء کو وگیان بھون نئی دہلی میں بھارتیہ گیان پیٹھ کا ایک لاکھ کا ادبی انعام اُردو کے ممتاز شاعر جناب رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کو اُن کے شعری مجموعے "گلِ نغمہ" پر دیا گیا۔ اس تقریب میں وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے اُن کی شاعری کے منتخب ہندی مجموعے "بزمِ زندگی ۔ رنگِ شاعری" کا اجرا کیا۔ اس موقع پر ان کی شاعری پر مبنی رقص و موسیقی کا پروگرام بھی پیش کیا گیا۔

۲۸ نومبر ۱۹۷۰ء کو وزیر اعظم ہند مسز شریمتی اندرا گاندھی نے نئی دہلی میں کچھ مسلم ممبران پارلیامنٹ، سفرا اور ممتاز شہریوں کے ساتھ افطار میں شرکت کی ۔

اُردو کا مقبول عوام مصور ماہنامہ

آجکل

نئی دہلی

ایڈیٹر
شہباز حسین

سب ایڈیٹر
نند کشور وکرم

جلد ۲۹ شمارہ ۶
جنوری ۱۹۷۱ء
پوس ماگھ شک سمت ۱۸۹۲

سمعتی ۔ملی ۔ قیصر سرمست

سالانہ چندہ
ایک سال : ۷ روپے
۲ سالہ : ۱۲ روپے
۳ سالہ : ۱۷ روپے

شائع کردہ
ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

یوم جمہوریہ کی تقریب ہر سال ہمیں یہ یاد دلاتی ہے کہ ملک کی تعمیر و ترقی کے لئے جہاں نئے نئے کارخانوں، زیادہ پیداوار، بہتر صحت اور تعلیم کے لئے کوششیں کرنی ہیں وہاں دوسری طرف ہمیں اپنے اخلاق و کردار کا جائزہ بھی لینا ہے۔ اپنی روزمرہ کی زندگی میں ہمیں اس بات سے زیادہ تکلیف نہیں ہوتی کہ ہمارے پاس آرام و آسائش کی چیزیں نہیں ہیں بلکہ اس سے زیادہ ہوتی ہے کہ سماج میں اکثر ایسے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے یا دفتروں، اسپتالوں یا تعلیم گاہوں میں ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جو بڑی شدت سے ہمیں یہ احساس دلاتے ہیں کہ ہماری اخلاقی حالت بڑی پست ہو گئی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ غریبی اور بیکاری بہت سی خرابیوں اور برائیوں کی جڑ ہے لیکن یہ بھی درست ہے کہ خوش حال ممالک یا افراد بھی خرابیوں اور برائیوں سے پاک نہیں۔ مادی ترقی ہمیں آگے تو بڑھاتی ہے اوپر نہیں اٹھاتی۔

ہمارے مشہور سائنس داں ڈاکٹر ہومی بھابھا سے "ٹائم میگزین" کے ایک نامہ نگار نے سوال کیا تھا کہ ہندوستان میں جو سائنس اور ٹکنالوجی کے لحاظ سے ایک پچھڑا ہوا ملک ہے کس طرح آپ اور آپ جیسے دوسرے سائنس داں پیدا ہو سکے تو انہوں نے بڑا مسکت جواب دیا تھا: یہ صحیح ہے کہ ہندوستان نے موٹر کار یا ریفریجریٹر ایجاد نہیں کیا ہے اور نہ ہی یہ چیزیں دوسرے صنعتی ملکوں کی طرح ہندوستان میں وسیع پیمانے پر تیار کی جاتی ہیں لیکن سینکڑوں برسوں سے سال کے اُن مہینوں میں جب اُسے کام نہیں ہوتا تو ہندوستان کا کسان ایک درخت کے سائے میں بیٹھا سوچتا اور غور و فکر کرتا رہتا ہے۔ اسی فرصت اور فراغت نے ان دستکاریوں کو جنم دیا جن کی صناعی اور کاریگری نے دُنیا سے اپنا لوہا منوایا۔ اسی غور و فکر نے ان فلسفیوں اور فلسفوں کو جنم دیا جنہوں نے انسان کو محبت، بھائی چارے اور رواداری کا پیغام دیا۔ حیات اور کائنات کے اسرار سے پردہ ہٹایا اور انسان کو انسان کی حیثیت سے جینا سکھایا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان اخلاقی قدروں کو اپنی زندگی اور مزاج کا ایک حصہ بنا لیں اور ان روایات کے امین بن جائیں جو ہزاروں برسوں کے تجربے اور تفکر کے بعد ہم تک پہونچی ہیں۔ تب ہی ہم صحیح معنوں میں ایک پُرمسرت زندگی گزار سکیں گے۔

---

۲۱ نومبر ۱۹۷۰ء کو ممتاز ہندوستانی سائنسداں ڈاکٹر سی۔ وی۔ رامن کا ۸۲ برس کی عمر میں انتقال ہو گیا۔

ڈاکٹر چندر شیکھر وینکٹا رامن ۷ نومبر ۱۸۸۸ء کو تامل ناڈو میں تروچراپلی کے مقام پر پیدا ہوئے۔ اپنی طالب علمی کے زمانے سے ہی وہ سائنٹیفک تحقیق میں دلچسپی لینے لگے تھے اور سرکاری ملازمت (۱۹۰۷ء - ۱۷) کے زمانے میں بھی یہ شوق جاری رہا۔ ۱۹۱۷ء میں وہ فزکس کے پروفیسر ہوئے۔ ۱۹۲۱ء میں انہوں نے پہلا غیر ملکی دورہ کیا۔

۱۹۳۰ء میں روشنی کے انتشار سے متعلق اُن کی مشہور تحقیق پر فزکس کا نوبل پرائز عطا کیا گیا۔ وہ واحد ہندوستانی تھے جنہیں سائنس میں یہ انعام دیا گیا تھا۔

۱۹۳۴ء میں انہوں نے اپنی اکاڈمی قائم کی جس نے سائنس کی ترقی میں غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔ عالمی شہرت کے ہندوستانی سائنسداں ڈاکٹر بھابھا اور وکرم سارابھائی بھی اسی ادارے کے تربیت یافتہ ہیں۔

جوش ملسیانی

عالم وجود میں آنے کی تاریخ یکم فروری ۱۸۸۴ء ہے۔ مقام ولادت ملسیاں تحصیل نکودر ضلع جالندھر ہے۔ ملسیاں بہت بڑا گاؤں ہے۔ آبادی چار ہزار کے قریب تھی مگر ننانوے فیصد ناخواندہ۔ دستخط بھی نہ کر سکتے تھے۔ میرے والدین اور رشتہ دار بھی بالکل ان پڑھ تھے کچے مکانات ہی میں آبادی کی بود و باش تھی بمشکل سے دس بارہ مکان پختہ ہوں گے۔ گلی کوچے گندے نالیاں متعفن صفائی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ تجارتی لحاظ سے بھی اس کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ میں جس گھر میں پیدا ہوا اس پر مفلسی اور عسیر الحالی کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ آمدنی کے ذرائع مفقود تھے۔ والد پٹواری رہے تھے۔ بادہ نوشی کی عادت نے یہ سکھا رکھا تھا کہ ؎

پاک خور امروز و زنہار از پئے فردا مخور

کبھی طبیعت موج پر آئی تو کچھ بھیج دیا ورنہ کئی کئی مہینے بالکل خاموش رہتے تھے۔ شاید یہ سمجھتے تھے کہ برہمنوں کا گھر ہے دان کی چیزیں آتی رہتی ہیں گزارہ ہو ہی جاتا ہوگا مگر یہ خیال باطل تھا۔ والدہ کو بھی ایک دو گھریلو دستکاریوں کی مشقت برداشت کرنی پڑتی تھی۔ کبھی چچا بھی جو نزدیک کے گاؤں میں دکان داری کرتے تھے، کچھ امداد کرتے تھے۔ مگر وہ برائے نام تھی۔ البتہ ارزانی کافی تھی۔ دو ڈھائی آنے میں تین چار افراد کا کنبہ دونوں وقت پیٹ بھر سکتا تھا۔ جبری کفایت شعاری سب کے لئے ضروری ہوتی تھی۔ برا بھلا کھانا جو میسر آتا تھا کبھی کھا لیا جاتا تھا کبھی زہر مار کر لیا جاتا تھا۔ مکان بھی بہت چھوٹا تھا اور وہ بھی کچا۔ رقبہ ڈیڑھ مرلے سے زیادہ نہ تھا۔ صرف ایک کوٹھا جس کو کمرا کہنا لفظ کمرا کی تحقیر ہے۔ آگے چھوٹا سا صحن جس کا نصف حصہ سہ طرفہ دیواروں پر چھت ڈال کر کچن کے لئے روک لیا گیا تھا۔ باقی کو صحن کہا جا سکتا ہے۔ یہ بھی طول و عرض میں چھ سات فٹ سے زیادہ نہ تھا۔ کھلے مکانوں میں رہنے کا موقع ملا تو بارہا یہ سوچا کہ میرے بزرگ اتنے تنگ مکان میں کس طرح گزارا کرتے رہے۔ بیاہ شادی کے موقع پر رشتہ دار مہمانوں کو کہاں بٹھاتے ہوں گے۔ مرگ کے موقع پر صف ماتم کہاں بچھی ہوگی۔ مسلسل بارشوں میں کہاں اٹھتے بیٹھتے ہوں گے۔ اسی ڈربے میں میری پرورش بھی ہوئی۔ گاؤں بہت بڑا ہونے کے باوجود اسکول وہاں صرف پرائمری تک تھا۔ پانچ سال وہیں تعلیم پائی۔ فیس چار پانچ آنے سے زیادہ نہ تھی۔ وہ برداشت ہوتی رہی۔ مڈل اسکول چار میل کے فاصلے پر تھا۔ وہاں داخل ہوا۔ ہوسٹل میں رہنے کی استطاعت نہ تھی پیدل جاتا اور پیدل آتا تھا۔ سڑک کچی اور بعض جگہ ریتلی تھی۔ جوتا کبھی نصیب ہو جاتا تھا کبھی ننگے پاؤں ہی چلنے پھرنے پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔ ایک دو مہربانوں نے گھر کی غریبی پر ہیڈ ماسٹر کو متوجہ کیا۔ فیس معاف ہو گئی۔ یہ معافی تین سال جاری رہی۔ پڑھنے کے لئے مستعمل کتب نصف قیمت پر خریدی جاتی تھیں مگر یہ کفایت بھی گھر کے ضروری اخراجات پر بار تھی میرا لباس بھی بہت مختصر ہوتا تھا کھادی کے ایک کرتے، کھادی کے ایک پاجامے اور کھادی کی ایک چادر میں موسم سرما بسر کرتا رہا۔ اگرچہ یہ ماحول تاریک ترین تھا مگر اس کا روشن پہلو اب میرے سامنے ہے۔ اسی ماحول نے صبر سکھایا، قناعت سکھائی، سادہ زندگی اور کفایت شعاری کی عادت کو طبیعت ثانیہ بنایا۔ گویا مفلسی اور ادبار کی زحمتیں عادت بن کر میرے لئے رحمت ثابت ہوئیں۔ خاص کر کفایت شعاری اور سادہ زندگی، آگے چل کر بہت مفید ثابت ہوئی۔ بچوں کی شادیوں اور مکان

وغیرہ کی تعمیر میں کبھی مقروض ہونے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

چودہ سال کی عمر میں والد بھی وفات پا گئے۔ اب مصیبت شدید تر ہو گئی۔ مستقبل کی فکر کلیجا توڑتی تھی۔ سبیلِ معاش کا غم کھائے جاتا تھا۔ بیس سال کی عمر تک یہی آشوبِ غم شاملِ حال رہا۔ اس آشفتہ حالی میں شاعری کا جوہر اگر اکتسابی ہوتا تو مزدور مٹ کر رہ جاتا مگر وہ وہبی اور خداداد تھا اور پکار پکار کر کہہ رہا تھا ؎

وہ داغ ہوں جو کبھی شست وشوئے جا نہ سکے
وہ نقش ہوں کہ زمانہ جسے مٹا نہ سکے

یہ وہ پھول تھا۔ جو گرم ترین ہواؤں میں افسردہ تو بارہا رہا مگر پژمردہ نہیں ہوا۔ یہ وہ چراغ تھا جسے آندھیوں کے رستے میں رکھ دیا گیا تھا۔ اس کا شعلہ تھرتھراتا تو رہا مگر بجھا نہیں۔

ان صبر شکن اور روح فرسا حالات کو ہر شخص شاعرانہ ذوق و شوق کا جانی دشمن سمجھے گا مگر ان مصائب و آلام کو بھی میں منجملہ محرکاتِ شاعری سمجھتا ہوں۔ انہیں کے احساس نے بیسیوں اشعار ایسے کہلوائے جنہیں براہِ راست میرے ذاتی تاثرات کہا جا سکتا ہے۔ مفلس کی عید کے عنوان سے جو نظم کہی، وہ اسی زمانے کی تخلیق ہے۔ مضمون ایک مفلس ہی کی زبان سے بیان کیا ہے۔ اس کے دو تین شعر ملاحظہ ہوں ؎

جو مجھے دینا تھا وہ دفتر میں پہلے لکھ لیا
اے مرے رزاق حجت میں کروں تو کیا کروں
اک یہی جانِ حزیں صبر آزما، درد آفریں
سوچتا ہوں شکرِ نعمت میں کروں تو کیا کروں
یہ وہ ہے دریائے غم جس کا کنارا ہی نہیں
ناخدا سے عرضِ حاجت میں کروں تو کیا کروں

ایک اور نظم غریبوں کی دُنیا کے عنوان سے ہے، وہ بھی اسی زمانے کی دین ہے۔ اس کے دو بند عرض کرتا ہوں ؎

خطا ہو کسی کی خطاوار یہ ہیں
قصور اور کا ہو گنہ گار یہ ہیں
شفا جن سے بھاگے وہ بیمار یہ ہیں
نہیں جن کا چارہ وہ ناچار یہ ہیں

غریبوں کی دُنیا میں راحت نہ ڈھونڈو
غریبوں کی دُنیا میں راحت نہیں ہے

غریبوں کی حالت سنبھلتے نہ دیکھی
قضا ان کی بالیں سے ٹلتے نہ دیکھی
کبھی پھانس غم کی نکلتے نہ دیکھی
کبھی نبضِ صحت سے چلتے نہ دیکھی

غریبوں کی دُنیا میں راحت نہ ڈھونڈو
غریبوں کی دُنیا میں راحت نہیں ہے

بعض رباعیات میں بھی یہی رونا رویا ہے۔ ان کا ایک ایک شعر یہاں لکھ دینا کافی ہے۔

۱۔ زر دار کے عیب میں بھی ہے حسنِ قبول
بے زر کا ہنر بھی عیب ہو جاتا ہے

۲۔ زر دار کے گھر میں رنج و غم ہنستے ہیں
نادار کی دُنیا میں خوشی روتی ہے

۳۔ طالع کا عروج خوش نصیبوں کے لئے
ہر وقت کی افتاد غریبوں کے لئے

امیروں کی دنیا بھی لکھی۔ صرف عنوان مختلف ہے مگر ہے یہ بھی افلاس زدہ زندگی اور مفلوک الحالی ہی کی آواز۔ افسوس کہ یہ نظم گم ہو گئی۔ بہت سی تلاش کے باوجود دستیاب نہیں ہوئی۔ قوتِ حافظہ نے بھی وفا نہیں کی۔ صرف پہلا بند یاد رہ گیا ہے، وہ لکھے دیتا ہوں ؎

اٹھے ہیں تو ابرِ بلا بن گئے ہیں
چلے ہیں تو بادِ فنا بن گئے ہیں
نہ پوچھو کہ نخوت میں کیا بن گئے ہیں
یہ دنیا کے بندے خدا بن گئے ہیں

امیروں کے دل پر بھروسہ کریں کیا
امیروں کے پہلو میں دل ہی نہیں ہے

اس عسیر الحالی میں بارہا ایسا ہوا کہ گراں خاطری گراں جانی بن گئی اور امیر مینائی کا یہ شعر بارہا زبان پر آیا ؎

غم اٹھانے کو بہت تھے ترے بندے یارب
کیا کمی تھی اگر اک مجھ کو نہ پیدا کرتا

ایک اور شعر بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ ایک مدت تک فراموشی کی آغوش میں سویا رہا۔ بیاض میں بھی نہیں تھا مگر شملے کی ایک صحبت میں جب دو تین عزیزوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کا سامان کہاں ہے۔ ہم آپ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں تو ناگہانی طور پر یاد آگیا اور انہیں سُنا دیا۔ شعر یہ ہے ؎

بے سروساماں ہوں لیکن بے سروساماں نہیں
ساتھ لے کر اپنی بے سامانیاں آیا ہوں میں

بیس سال کی اس مسلسل فلاکت اور زبوں حالی میں بچپن کے کھیل تماشے خواب وخیال رہے۔ بعنفوانِ شباب میں بھی رنگینیٔ صحبت کبھی نصیب نہ ہوئی بادِ بہاری کے ہر جھونکے سے یہی کہتا رہا ؎

تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

خواجہ حافظ کا یہ مشہور مصرع: ہنگام تنگ دستی در عیش کوش و مستی کبھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔ خدا جانے اس کا مفہوم اُن کے ذہن میں کیا تھا۔ تجربہ کر رہا تھا کہ یہ مضمون حقیقت کے خلاف ہے، کہاں تنگ دستی اور کہاں عیش۔ یہ تو لنگوٹی میں پھاگ کھیلنے والی بات ہے۔ یہ قول سراسر ناقابلِ تسلیم ہے۔

اب اس مفلوک الحالی کا بیان چھوڑ کر اپنی دوسری مشکلات کی داستان گزارش کرتا ہوں۔ اسے سُن کر بھی اہلِ ادب بہت حیرت زدہ ہوں گے اور کہیں گے کہ اس قسم کے دیہاتی ماحول میں ایک آدمی شاعر، ادیب اور نقاد کس طرح بن سکتا ہے۔ خاص کر ایسی تنگ دستی اور زبوں حالی میں، جو نہ کوئی ادبی کتاب خرید سکتا ہے، نہ کوئی ادبی رسالہ منگوا سکتا ہے، جس کو صاحبِ ذوق کی صحبت بھی نصیب نہ ہوتی ہو، جسے کوئی ایسی چیز بھی کہیں سے مستعار نہ مل سکتی ہو جسے چوبیس گھنٹوں میں دو تین منٹ کے لئے بھی اُردو میں بات کرنے یا سننے کا موقع نہ ملتا ہو۔ پنڈت ہری چند اختر نے میری ادبی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انہوں نے ایسے پس ماندہ علاقے میں زندگی بسر کی ہے کہ جس کی زمین کو کھودا جائے تو کسی ادیب یا شاعر کی ہڈی تک برآمد نہ ہو سکے۔ صرف ایک فی صدی آبادی اُردو میں شُدبُد رکھتی تھی۔ اس میں بھی کوئی تیسری جماعت تک پڑھا ہوا تھا کوئی چوتھی پانچویں تک۔ اس شُدبُد کا استعمال بھی ہیر رانجھا، سوہنی مہیوال اور پورن بھگت کے قصّے پڑھنے تک محدود تھا۔ پانچویں پاس آدمیوں کی تعداد دس بلکہ اس سے زیادہ نہ تھی چند آدمی کیا پڑھے ہوئے تھے ساتھیوں کا کوئی نام بھی نہ جانتا تھا۔ صرف دو آدمی ایسے تھے جن کی فارسی دانی گلستاں کے آسان آسان حصّوں تک محدود تھی۔ میں صرف انہیں کا ہم صحبت تھا اُن میں ایک تو ذیلدار بخش بخیرا چودھری اللہ بخش تھے میرا کافی احترام کرتے تھے مگر میرے کسی شعر کو سُن کر دہراتے تھے تو اُسے ناموزوں کر دیتے تھے۔ تلفظ بھی صحیح نہ ہوتا تھا۔ غلط کا لام ساکن کر دیتے تھے۔ ذبح اور نزع کو بکسرۂ اول پڑھتے تھے جرم کو بضمۂ اول بولتے تھے۔ انجام کا الف بکسرۂ اول کہا کرتے تھے۔ میں اُنہیں ٹوکتا تو غیاث اللغات لے بیٹھتے۔ وہاں وہی کچھ لکھا ہوا پاتے تھے، جو میں اُنہیں بتاتا تھا اس شکست پر کہہ دیتے تھے کہ تم نے تو لفظ پر جھونپڑی ڈال رکھی ہے۔ دُوسرے صاحب پنشنر ڈاکٹر جھنڈے خاں تھے۔ اُن میں یہ خاص وصف تھا کہ کسی مریض کے لئے دو ڈیڑھ آنے سے زیادہ قیمت والی دوا تجویز نہ کرتے تھے۔ بیماروں کے ہمدرد تھے۔ مولانا رومی کی مثنوی کے شیدائی تھے مگر یہ بھی غلط پڑھتے تھے۔ بعض دفعہ پڑھنے ہی میں مصرع کو ساقط البحر بنا دیتے تھے۔ ایک دو آدمی ایسے بھی تھے کہ فارسی کی تیسر کتابیں، مینا بازار اور پنج رقعہ بھی اُن کے پاس تھیں مگر دو سطریں بھی سمجھ نہیں سکتے تھے۔ سمجھنا تو درکنار اُن کو صحیح پڑھ ہی نہیں سکتے تھے۔ بس یہ تھی اس آبادی کی تعلیمی کائنات جس میں پرورش پانے کے لئے قدرت نے مجھے مجبور کر دیا تھا۔

اسکول میں چوتھی جماعت ہی سے فارسی شروع ہو جاتی تھی۔ پانچویں میں گلستاں کے دو باب انتخابی شکل میں شاملِ نصاب تھے۔ مجھے اُردو فارسی کے مضامین سے خاص دلچسپی تھی گلستاں کے بہت سے شعر اُنہیں دنوں میں مستقل طور پر یاد ہو گئے تھے۔ حافظہ بہت اچھا تھا اُردو کی پہلی کتاب میں مولانا محمد حسین آزاد کی جو نظمیں شاملِ درس تھیں، وہ سب مجھے زبانی یاد ہو گئی تھیں۔ اب بھی اُن کے کچھ حصّے حافظے میں ہیں۔ ان میں دو نظمیں تو سالم کی سالم اب تک یاد ہیں۔ ظاہر ہے کہ اُردو فارسی کی نظم سے مجھے قدرتی لگاؤ تھا اور شاعرانہ ذوق کی یہ بنیادی علامت تھی۔ مڈل سکول میں داخل ہوا۔ تو وہاں ان مضامین سے دلچسپی اور بھی بڑھ گئی۔ باوا سنگت سنگھ بیدی ہیڈ ماسٹر تھے۔ اگرچہ شاعر نہ تھے مگر اچھے صاحبِ ذوق، اچھے نکتہ شناس اور اچھے سخن فہم تھے۔ پڑھاتے تھے تو محاسنِ شعری بھی بیان کرتے تھے۔ فارسی اور اُردو کے مضامین اُنہیں کی تدریس میں شامل تھے۔ کبھی کبھی تین چار آسان بحروں کے ارکانِ تقطیع بھی بتا دیتے تھے۔ بعض اوقات ایک دو شعروں کی تقطیع بھی کر دیتے تھے۔ اُنہیں کے ادبی ذوق نے پہلی بار میرے جذبۂ شاعری کو متحرک کیا اور وہ نیم بیداری کے عالم میں انگڑائیاں لینے لگا۔ عمر ابھی بارہ تیرہ سال ہی کی تھی۔ طبیعت نے بُرا بھلا شعر کہنے پر مائل کر دیا۔ میرے ہم جماعت

طلبا نے میرے فکرِ سخن کو پیش گوئی کر دی کہ یہ ضرور شاعر بنے گا۔ دیوانِ ذوق کا کچھ حصّہ بھی انہوں نے پڑھایا۔ ایک دن اس دیوان کی ایک غزل پڑھا رہے تھے۔ اس غزل کا یہ شعر ؎

تفنگ و تیر تو ظاہر نہ تھا کچھ پاس قاتل کے
الٰہی پھر جو دل پر تاک کر مارا تو کیا مارا

پڑھ کر مجھ سے پوچھنے لگے کہ بتاؤ کیا مارا؟ میں نے فوراً کہہ دیا کہ تیر ادا مارا۔ یہ جواب سن کر وہ اور میرے ہم جماعت بہت خوش وقت ہوئے اور باواجی نے زندہ باش کہا۔ یہ تھے میرے ابتدائی محرکاتِ شاعری، جن کا سلسلہ یہاں کی تعلیم ختم ہونے پر تہی دستی اور تنگ حالی نے منقطع کر دیا۔ انھیں دنوں میں والد کا انتقال ہوا۔ فکرِ معاش اور بھی روح فرسا ہو گئی۔ چچا نے اپنی دکان میں نون تیل بیچنے کا دھندا اختیار کرنے کے لیے مشورہ دیا۔ دو تین مہینے تو میں نے اس مشورے پر عمل بھی کیا مگر یہ مقام ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ علمی و ادبی اشتہا نے مجھے بیزار کر دیا۔ آخر یہاں سے اٹھا تین سال سبیلِ معاش کی تلاش میں ادھر اُدھر ٹامک ٹوئیے مارتا پھرا۔ اس عالم میں بھی شاعرانہ ذوق نے میرا دامن جو اگرچہ صد چاک تھا، نہ چھوڑا۔ دو ڈھائی سو شعر اس مدت میں کہہ ڈالے۔ بڑے اساتذہ اردو کا کلام پڑھنے کا جب بھی موقع ملا، ذوقِ صحیح اور وسعتِ نظر نے کہہ دیا کہ جو کچھ کہا ہے۔ وہ کچھ بھی نہیں۔ اس آواز کو جو صداقت کا پیغام تھی، سن کر یہ ذخیرہ چاک کر دیا اور ملسیاں کو خراب آباد سمجھ کر چھوڑ دینے کا ارادہ کر لیا۔ اب بھی میں اُسے خراب آباد ہی کہا کرتا ہوں۔ میری ایک غزل کا مقطع یہ ہے ؎

کیا کرو گے جوشؔ تم جا کر وہاں ؛ ملسیاں اب بھی خراب آباد ہے

معاشی مشکلات کا مسئلہ حل کرنے کی کوشش اور مسلسل ناکامیوں کے بعد پیشہ مدرسی اختیار کرنے کے لیے جالندھر کے ٹریننگ اسکول میں داخل ہو گیا۔ یہاں وظیفہ ملتا تھا۔ ہوسٹل کا بل ڈھائی تین روپے ماہانہ سے زیادہ نہ تھا اس لیے گزارہ ہو جاتا تھا۔ یہاں کی درسی کتابوں میں میر و سودا، ناسخ و آتش اور ذوق و غالب کا کلام پڑھ کر بہت خوش وقت ہوا۔ ان اساتذہ کے کلام نے جذبۂ شاعری کو جھنجھوڑ کر پھر سے بیدار کر دیا۔ اسے نئی زندگی عطا کی۔ ان بزرگوں کے کلام نے مجھے بتایا کہ شعر کیا ہوتا ہے۔ شاعری کی عظمت سے کیا مراد ہے۔ خوش بیانی اور تر زبانی کسے کہتے ہیں۔ شباب کی ابتدا تھی اس

لیے طبیعت غزل کی طرف خود بخود مائل ہو گئی مگر شکر کا مقام ہے کہ عنفوانِ شباب اور سنِ بلوغ کے باوجود شبابیات اور عریاں قسم کی شاعری میرے نزدیک نہیں پھٹک سکی۔ یہ شعر اسی زمانے کی یادگار ہے ؎

امیر وہ نہیں جس کا کہ دل فقیر نہیں
فقیر وہ نہیں جس کا کہ دل امیر نہیں

یہاں سے فارغ ہو کر اور ڈویژن بھر میں اوّل رہ کر جاؤنی جالندھر میں ملازمت اختیار کر لی۔ یہاں کا ادبی ماحول میرے لیے خوش گوار تھا۔ زبان اور فن کے ادبی شکوک رفع کرنے کے مقصد سے کسی قابل شاعر کی ضرورت محسوس ہوئی۔ حضرت داغؔ کے نامور شاگرد نسیمؔ بھرت پوری کا دیوان کہیں سے مل گیا تھا۔ اُسے پڑھ کر انہیں سے خط و کتابت شروع کر دی۔ وہ فراخ دلی سے میرے خطوط کا جواب دیتے تھے۔ میرے بعض اشعار کی داد بھی دیتے تھے۔ انہوں نے میرے رنگِ طبیعت کو پسند کیا اور حضرت داغؔ دہلوی سے اصلاح حاصل کرنے کا مشورہ دیا۔ اگرچہ میں پہلے ہی حضرت داغؔ کے رنگِ سخن کا گرویدہ تھا مگر رسائی کے لیے توسط کی ضرورت تھی۔ یہ مشکل بھی موصوف نے اپنی سفارش سے حل کر دی اور ۱۹۰۲ء میں یہ سلسلہ قائم ہو گیا۔ اسی سال مجھے بڑی جماعتوں کی تدریس کے قابل بنانے کے لیے ٹریننگ کالج لاہور میں طلب کر لیا گیا۔ یہ انتخاب بالکل یقینی تھا کیونکہ میں ڈویژن بھر میں اوّل رہا تھا۔ وظیفہ یہاں بھی ملتا تھا۔ گزر اوقات میں کوئی دشواری نہ تھی۔ یہاں پہنچا تو لاہور کی ادبی فضاؤں نے میرے نوعمر جذبۂ شاعری کو بھرپور جوانی عطا کی۔ پہلی دفعہ لاہور ہی میں مشاعرہ دیکھنے کا موقع ملا۔ شوقِ سخن گوئی خوب اُبھرا۔ ہر مشاعرے میں شامل ہوتا اور پڑھتا رہا۔ کالج میں اُردو فارسی کے پروفیسر بھی شاعرانہ دل و دماغ رکھتے تھے۔ وہ بھی اپنا کلام سنا کر مجھے متحرک کرتے رہتے تھے۔ یہاں سے فارغ ہو کر ملازمت کے سلسلے میں پھر دیہاتی زندگی میرے حصّے میں آئی۔ چونکہ میں بیس سال ایسی زندگی کا خوگر رہا تھا اس لیے اب یہ بارِ خاطر نہیں تھی۔ وجہ یہ کہ تلاشِ معاش کے تفکرات اب گلوگیر نہ تھے۔ پوری بے فکری سے حسبِ فرصت مشقِ سخن کرتا رہا۔ لکھنؤ کا رسالہ پیام یار اب کالج ہی میں منگوانا شروع کر دیا تھا۔ اس میں مشہور اساتذہ وقت کا کلام بھی جو میرے لیے خضرِ راہ تھا شائع ہوتا تھا۔ ادبی دل بستگی اور استفادے کے لیے یہ کلام بھی فکرِ سخن کو پر پرواز عطا کرتا رہا۔ اب سکونت بھی ملسیاں سے نکودر ضلع جالندھر میں منتقل کر لی تھی۔ یہ مقام ضلع کی ایک تحصیل کا صدر مقام ہے۔ ادبی لحاظ سے محرکِ شعر و سخن تو نہ تھا

مگر ملیاں کی طرح خراب آباد بھی نہ تھا۔ معاشی اطمینان کی وجہ سے ہر قسم کی ادبی کتابوں کا مطالعہ بھی اب شروع کر دیا گیا۔ منشی فاضل اور ادیب فاضل کے امتحان بھی دیئے۔ عروض کی کتابیں بھی غور سے مطالعہ کیں۔ اِن میں جواہر العروض اور بحر الفصاحت قابلِ ذکر ہیں۔ اس مطالعہ کے بغیر بھی میری طبیعت ہر بحر میں خواہ وہ سالم ہو یا مزحف۔ بالکل صحیح رفتار سے چلتی تھی پیچیدہ بحروں میں ناکام نہ ہوتی تھی۔ ناموزوں مصرع زبان پر آتا ہی نہیں تھا۔ اس مطالعے سے میں نے محسوس کیا کہ سبب اور وتد کی دو دو قسموں کے ہوتے ہوئے فاصلہ وغیرہ (چار حرفی اور پنج حرفی الفاظ کی عروضی تجزی) بالکل بے ضرورت ہے سبب اور وتد ہی تمام الفاظ پر حاوی ہو جاتے ہیں۔ اِن امتحانوں میں فارسی کی متعدد کتابوں کو مطالعہ کرنے کا اتفاق ہوا۔ گلشنِ راز نے حقیقت و مجاز کا مفہوم سمجھایا۔ عرفان کے راز بتائے۔ شعر العجم نے فارسی ادب کی پوری تاریخ ذہن میں مرتکز کی۔ چہار مقالہ اور درّہ نادرہ نے فارسی زبان کے سنگستان دکھائے۔ اس زبان میں چند اور سنگستان بھی طائرانہ نظر سے دیکھے مثلاً مینا بازار، پنج رقعۂ ابو الفضل۔ سہ نثرِ ظہوری وغیرہ۔ حیرت ہوئی کہ اس قسم کے پتھر فارسی کے دامن میں کیوں بھرے گئے۔ دیوانِ نظیری نیشاپوری قصائدِ قاآنی۔ قصائدِ عرفی بھی اِن امتحانوں کے لئے پڑھے۔ نظیری کے تغزل اور قاآنی کی بے پناہ روانیِ کلام نے بتایا کہ شاعرانہ عظمت کیا ہوتی ہے۔ فلسفہ کی ایک کتاب روح الاجتماع بھی اس امتحان کے نصاب میں شامل تھی۔ ایسا خشک مضمون پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ کم بخت بار بار رٹنے پر بھی محفوظ نہ رہتا تھا۔ کتاب علم التعلیم میں ایک حصہ علم الحواس بھی تھا۔ ویسے تو یہ بھی خشک تھا مگر اتنا نہیں کہ دماغ کو بالکل خشک کر دے۔ گلستاں بوستاں سالم کے علاوہ سکندر نامہ بری شاہ نامہ، غالب کا فارسی دیوان، امیر خسرو کی ایک مثنوی، یہ کتابیں بھی دیکھیں۔ مگر جزوی صورت میں اخلاقِ جلالی اور اخلاقِ ناصری نے انسانیت کا نقش دل و دماغ پر بٹھا دیا۔ انوارِ سہیلی کے سیاست آموز بیان بہت پسند آئے۔ اُردو نثر کی کتابوں میں سے فسانۂ آزاد اور فسانۂ مبتلا زبان کے لحاظ سے سبق آموز ہوئے۔ اس فضیلت میں توبۃ النصوح کو بھی برابر کا حصہ دار پایا۔ آبِ حیات اور نیرنگِ خیال کی تو دنیا ہی دوسری تھی۔ ناقدانہ نثر نگاری کا اعجاز قدم قدم پر مسحور کرتا پایا گیا۔ ناول اور فسانے پڑھنے کی طرف طبیعت کبھی مائل نہیں ہوئی۔ البتہ سُراغ رسانی کے بہت سے ناول پڑھے۔ اس شوق کی وجہ یہ ہے کہ شطرنج کا شوق ایسی کتابوں سے لگاؤ پیدا کرتا رہا۔ شطرنج میں بھی تو سمندِ خیال کی جولانیاں لازم ہوتی ہیں۔

اُردو میں میر تقی اور سودا نے آہ اور واہ کا منظر پیش کیا۔ سودا کی قصیدہ گوئی کو عرفی اور خاقانی سے ٹکراتے دیکھا۔ ہجویات میں انوری سے مصافحہ کرتے بھی دیکھا۔ دیوانِ ذوق اور دیوانِ غالب کی امتیازی خوبیاں زیرِ غور رہیں۔ غالب کے اُردو خطوط میں شاعری ہی شاعری دیکھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ وزن اور بحر سے بالکل بے نیاز ہے۔ فن اور زبان کے بہت سے نکات ان میں حل شدہ پائے جاتے ہیں۔ حضرت داغ کے چاروں دیوان امیر مینائی کے دونوں دیوان بڑے غور سے مطالعہ کئے مگر زبان کا ریاض حضرت داغ ہی کے کلام بلاغت نظام سے ہوتا رہا۔ سب سے زیادہ رہنمائی اُنہیں کی زبان نے کی۔ دلی کے مشاعروں میں شامل ہوا تو بعض اصحاب نے یہ کہا کہ چھ سات سال تو دلی میں ضرور رہے ہوں گے، ورنہ پنجاب کے ایک گوشے میں رہ کر ایسی زبان کبھی نہ لکھ سکتے۔ میں نے جواب میں کہا کہ میں جب بھی دلی آیا ہوں، تین چار دن سے زیادہ نہیں ٹھہرا۔ یہ جواب سُن کر وہ حیران ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ اتنا ریاض تو فوق العادۃ ہی کہا جا سکتا ہے۔ بہت سے تنقیدی مضامین اور فنی مباحث بھی زیرِ مطالعہ رہے۔ حالی کی تالیف یادگارِ غالب اور مولانا محمد حسین آزاد کی تصنیف منیف آبِ حیات لاہور میں مجھے دورانِ تعلیم میں بطور انعام ملی تھیں۔ ان کتابوں سے بھی بہت سا استفادہ ہوا اور بہت سی وسعتِ نظر حاصل ہوئی۔ ان کے علاوہ معرکہ شرر و چکبست، مرزا یگانہ کی تصنیف غالب شکن۔ صبر رام پوری اور مولانا احسن کے فنی مباحث بھی پڑھے۔ حضرت داغ کے کلام پر جو اعتراضات مسلسل طور پر اودھ اخبار میں شائع ہوتے رہے اور جن کے جوابات نسیم بھرت پوری نے نہایت قابلیت سے لکھ کر تازیانہ کے نام سے کتابی صورت میں شائع کئے، مشعلِ راہ ثابت ہوئے۔ ملک بھر کے بڑے بڑے مشاعرے بھی محرک رہے۔ مشاہیر شعراء اُردو سے مجالست و موانست کا موقع بھی ملا۔ بے خود دہلوی، نواب سائل، کیفی دہلوی، نوح ناروی۔ دل شاہجہاں پوری، ساحر دہلوی، مہر گوالیاری ان سب اصحاب سے ادبی تعاون بھی، ان اصحاب سے ملاقاتیں بھی ادبی گفتگو تک محدود تھیں۔ یہ میری ادبی زندگی کو خوب

پچکاتی تھیں۔ ساحر دہلوی، کیفی دہلوی، بے خود اور نواب سائل کی قیام گاہیں ادبی اکھاڑے تھیں۔ انھیں غالب اور ذوق کے زمانے کی مٹی سی یادگار کہا جا سکتا تھا۔ ان بزرگوں کی وفات تو دلی کو ختم کر گئی۔ اب میں کبھی دلی آتا ہوں تو یہی مصرع زبان پر آجاتا ہے۔

دلی میں سب ملے مجھے دلی ملی نہیں

میرے محرکاتِ شاعری پوچھے گئے ہیں چھوٹے بڑے میں نے تمام محرکات بیان کر دیئے ہیں مگر میں تین چار محرکات کو مراتب بالاتر سمجھتا ہوں۔ سب سے بڑا محرک تو موزونیٔ طبع۔ ذوقِ سلیم اور وجدانِ صحیح ہے جو خداداد تھا اور قدرت نے بڑی فیاضی سے میرے دل و دماغ میں ودیعت کیا تھا۔ اس کے بعد دوسرا بڑا محرک سعدی اور حضرت داغ کا کلام ہے۔ سعدی نے پند و موعظت کے خشک ترین میدان کو اتنا سرسبز و شاداب کیا کہ اس کی بہار کو بہارِ بے خزاں کہنا چاہیئے۔ سعدی کے سیکڑوں جواہر پارے میری کشتِ ادب کی آبیاری کرتے رہے ہیں اس نامور بزرگ کی روح اگر یہ کہے کہ لانبی بعدی۔ تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔ سعدی کا جواب پیدا کرنے میں بعض اہلِ قلم نے قلم تو اٹھایا مگر شکستہ پا ہو کر رہ گئے۔ اُن کی محنت شاقہ کا نتیجہ بہروپ ہی کہا جا سکتا ہے۔

دوسرا بڑا محرک ہے حضرت داغ کی سحر نگاری، شوخ بیانی۔ تر زبانی، فصاحت۔ بلاغت اور معاملہ بندی یا تغزل میں اُن کا مدِ مقابل اس زمانے میں کوئی نہ تھا۔ اُنھیں کے فیضان نے مجھے پر پرواز عطا کئے۔ تیسرا بڑا محرک لاہور ہے جس کی ادبی زندگی میرے لئے ادب آموز تھی۔ باقی محرکات جو میں نے بیان کئے ہیں، میرے لئے ان کا درجہ ان کے بعد ہے۔ اگرچہ میری تعلیمی ترقی اور ادبی دست گاہ میں وہ محرکات بھی کافی وزن رکھتے ہیں۔ اُن کے فیض و کرم کا بھی مجھ پر بڑا احسان ہے۔

حضرت داغ کی معجز نگاری اگرچہ میرے لئے بہت بڑی محرک تھی مگر میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ اپنے میلانِ طبیعت کے زیرِ اثر اُن کا اندازِ سخن اس حد تک اپنی طبیعت میں جذب نہیں کر سکا جس قدر نوح ناروی، سحر شاہ جہاں پوری اور بے خود بدایونی نے جذب کیا تھا۔ اس میں کوتاہی اور تقصیر کی کوئی بات نہیں غالب کے ۴۰۴ شاگردوں میں ایک نے بھی ان کا اندازِ سخن کُلی قبول نہیں کیا مگر اس حقیقت کے باوجود میری ہر غزل میں تین چار ایسے شعر ضرور پائے جاتے ہیں جن پر داغ کے رنگ کی چھاپ صاف نظر آتی ہے۔ اور یہ ماننا پڑتا ہے کہ یہ اندازِ انھیں کا فیضانِ سخن ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

پی لوگے تو اے شیخ ذرا گرم رہوگے ÷ ٹھنڈا ہی نہ کر دیں تمہیں جنت کی ہوائیں

وہ غلط بھی کچھ کہیں گے تو وہی بجا رہے گا

جو نکل گیا زباں سے وہ نکل گیا زباں سے

شوخ طبعی نے کہیں کا بھی نہ رکھا ہم کو

درِ دوزخ پہ بھی رو کے گئے جنت کیسی

سخت جاں ہوں دست و بازو کا بھرم کھل جائے گا

وار کرنا سوچ کر بچ کر سنبھل کر دیکھ کر!

میں نے کہا تو یہ تھا کہ تقصیر ہو معاف

اس کے جواب میں جو سُنا کچھ نہ پوچھئے

ممکن ہے فرشتوں سے کوئی سہو ہوا ہو

میں اتنا گنہ گار کبھی ہو نہیں سکتا

اے پردہ نشیں دیکھ یہ دن رات کے پھیرے

میں گرد تو نہیں ہوں ترے کوچے کی زمیں کا

کہا تم نے سُنا میں نے اب اے اتنا بتا جاؤ

یہ وعدے ہیں کہ فقرے ہیں یہ باتیں ہیں کہ گھاتیں ہیں

کوئی دم ساز کوئی ہے جاں باز ÷ آپ کے ساز باز نے مارا

باتوں باتوں میں جو میں کچھ کہہ گیا ÷ ہنس کے فرمانے لگے کیا بات ہے

جنت اک چیز ہی سہی لیکن ÷ حشر تک انتظار کیا معنی

اس قدر جورِ حسیناں سے رہا تو فزدہ ÷ حوریں آئیں تو میں سمجھا کہ بلائیں آئیں

بدگمانی کی بھی عادت ہے زمانے کو بہت ÷ مجھ کو اچھا نہ کہو گے تو یہ اچھا ہوگا

گلہ نہیں ہے اگر آپ مجھ کو بھول گئے ÷ مرے خدا کو بھی عادت ہے بھول جانے کی

جوشش یہ دیکھو گنہ گاروں کی فرد ÷ پہلے نمبر میں تمہارا نام ہے

غزلیں

اعجاز صدیقی

نظامِ فکر نے بدلا ہی تھا سوال کا رنگ
جھلک اٹھا کئی چہروں سے انفعال کا رنگ

نہ گل کدوں کو میسّر، نہ چاند تاروں کو
ترے وصال کی خوشبو، ترے جمال کا رنگ

نظر اشارہ کناں لب حریفِ لفظ و صوت
وہ جذبِ شوق کا عالم یہ عرضِ حال کا رنگ

بھریں تو اور ہوں گہرے کھلیں تو اور ہوں تنگ
ہے اِن دنوں یہی زخموں کے اندمال کا رنگ

ذرا سی دیر کو چہرے دمک تو جاتے ہیں
خوشی کا رنگ ہو یا ہو غم و ملال کا رنگ

زمانہ اپنی کہانی سنا رہا تھا ہمیں
ابھر گیا مگر آغاز میں مآل کا رنگ

کوئی زباں کوئی طرزِ ادا نہ کام آئی
ہے لاجواب ابھی تک ہر اک سوال کا رنگ

پڑے ہوئے ہیں کشش و پیچ میں سبھی مہرے
جما ہوا نہیں کتنا بساطِ حال کا رنگ

مرے ہی چاکِ گریباں سے روز و شب کی نمود
مرے ہی زخم سے عبارت ہے ماہ و سال کا رنگ

اسیرِ وقت ہے تو، میں ہوں وقت سے آزاد
ترے عروج سے اچھا مرے زوال کا رنگ

بسانِ تختۂ گل میری فکر ہے آزاد
مثالِ قوسِ قزح ہے مرے خیال کا رنگ

عزیز قیسی

سب کو یقیں ہے ہم سا کوئی دوسرا نہیں
خلوت کدوں میں اُن کے کہیں آئینہ ہی نہیں

خود کیوں نہ بڑھ کے سنگ زنوں کو پکاریے
مدت سے اِس گلی میں تماشہ ہوا نہیں

وہ کھل کے آ گیا ہے تو خنجر لیے ہوئے
ورنہ کس آستیں میں خنجر چھپا نہیں

رکتے ہیں کوچہ کوچہ تو پھرتے ہیں شہر شہر
اب تک تو ہم کو اپنا ٹھکانہ ملا نہیں

تنہائی کا ہے جن کو گلا کون ہیں وہ لوگ
مجھ کو گلہ ہے میں کبھی تنہا ہوا نہیں

ملتے ہیں ایک ایک سے باہیں پسار کے
کیا کیجئے کہ اپنا کوئی آشنا نہیں

مجبوری کچھ تو ہوگی کہ سجدہ گزار ہیں
گر ہم خدا نہیں ہیں تو تم بھی خدا نہیں

قیسی صدا ملے ہیں، سرِ رہ، یہاں وہاں
گھر کس جگہ ہے اُن کا کسی کو پتہ نہیں

وہ ایک لڑکی کہ طائرِ خوش نوا
خزوں میں، غزالِ وحشت رسید مجھ پر
ختن ختن جیسے ہنس رہے تھے

وہ ایک بدلی کہ جس سے بوندیں
برس نہ پائیں، تو سیپ کے لب ترس رہے تھے
وہ ایک ناگن جو ہر سپیرے کی
دھن پہ بدمست ہو رہی تھی۔
وہ جاگتی تھی کہ صاحبانِ کہف کے
غاروں میں سو رہی تھی
رواں دواں عمر کے آئینہ کو پیہم
غرور و نخوت کے پتھروں سے
کچل کچل کر، وہ کور چشموں کے جیسے سُرمہ لگا رہی تھی
وہ اب بھی میٹھے برس کے خوابوں سے زندگی کو رجھا رہی تھی

وہ چہرہ تھا رائج الوقت سکہ
مگر کسی ایسی سلطنت کا جو ہاتھ سے کوئی پل میں نکلے
بدن کی قوسیں کہ دستِ پرکارِ سال و سن تھرتھرا سنبھلے
میں اُس کی ظلماتِ روح میں کل پتے سیاحت اُتر پڑا تھا
وہ شور تھا، بھیڑ تھی وہ ریلا
وہ کوئی کہرام تھا کہ میلا
میں محوِ نظارہ تھا اکیلا
کہ یوں بھی انجان اجنبی تھا، سراپا حیرت بنا کھڑا تھا

پھر اپنی آنکھوں سے میں نے دیکھا
قطار اندر قطار پتھر کے بُت کھڑے مسکرا رہے تھے
وہ دیوداسی بدن چرائے
لجائے، شرمائے، رسمسائے
چٹکتی پوروں کا پیار لے کر
کنواری کلیوں کا ہار لے کر

تصویر

زاہدہ زیدی

رینگتی بے دلی، گھٹن گرمی
سرنگوں فکر، منتشر احساس
مضمحل جسم، منتظر آنکھیں
گرتی مٹی، چٹختی دیواریں
جلتے تلوے، سلگتے راہ گزار
زخمی افکار، ٹوٹتی اقدار
ٹھٹھرے الفاظ، بے کفن معنی

سب لوازم پھر آج یکجا ہیں
ایک سادہ ورق اُٹھا لاؤں
اور پھر خامۂ تصادم سے
نئی تصویر اک بنا لاؤں!

وہ جب چڑھن چھونے جھک رہی تھی تو بت شوالے سجا رہے تھے

پھر اپنی آنکھوں سے میں نے دیکھا
بلور کی ہفت رنگ گڑیا
زمین پر چھن سے گر پڑی تھی
وجود کا ریزہ ریزہ چُن کر
برہنہ تن، بے کفن کھڑی تھی

وقت کو گزرتے کیا دیر لگتی ہے۔ کہنے کو تو نصف صدی سے زیادہ زمانہ گزرا مگر کل کی سی بات معلوم ہوتی ہے جب میں اپنے وطن بدایوں کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں پڑھتا تھا۔ اُسی زمانے میں میرے چند عزیز ایم اے او کالج علی گڑھ میں زیرِ تعلیم تھے۔ یہ لوگ جب تعطیل میں گھر آتے تو علی گڑھ کی خوشگوار یادیں سوغات میں ساتھ لاتے اور ہم لوگوں کو وہاں کے واقعات سناتے۔ انھیں میں ایک صاحب تھے جو مجھ سے تین چار سال بڑے ہوں گے۔ نہایت سنجیدہ و شائستہ، مہذب و متین، دیندار اور اخلاص شعار وہ جب مجھ سے ملتے تھے تو کالج اور بورڈنگ ہاؤس کی زندگی کا نقشہ کھینچ دیتے تھے۔ طلبہ کا رکھ رکھاؤ، اساتذہ کا اپنے شاگردوں سے میل جول، انگریز پروفیسروں کا بے تکلف لڑکوں کے کمروں پر آنا، اُن کی مشکلات سننا اور دکھ درد میں بھی اُن کا ہاتھ بٹانا، بیماری میں اپنی کوٹھی سے پرہیزی کھانا پکوا کر خود لانا اور اپنے سامنے پیار اور شفقت سے کھلانا، گاہے گاہے طلبا کو اپنے یہاں چائے پر بلانا، اُن کا اور اُن کی لیڈیز کا کمالِ محبت سے پذیرائی کرنا اور چلتے وقت برآمدے تک مشایعت کو جانا، غرض ایک عجیب اپنائیت کی فضا تھی جس کی نظیر کسی دوسری درس گاہ میں نہیں ملتی تھی۔ عزیز موصوف جب تک یہ باتیں کرتے میں ہمہ تن گوش بن کر سنتا اور دل ہی دل میں علی گڑھ دیکھنے کا شوق پرورش پاتا۔ سچ پوچھئے تو علی گڑھ میرے خوابوں کی بستی بن گیا تھا۔

کیا خبر تھی کہ یہ خواب ایک دن حقیقت کا روپ اختیار کرے گا اور چند سال بعد مجھے اُستاد کی حیثیت سے اُسی مرکزِ علم و ادب میں آنا ہوگا جو میرے خوابوں کی بستی تھا۔ ہوا یوں کہ جب میں الہ آباد یونی ورسٹی سے فارسی میں ایم اے کرنے اور پھر وہاں فارسی ادب میں ریسرچ کے دو سال گزارنے کے بعد وطن آیا تو ایک دن میرے محترم کرم فرمانے جو مجھ سے بے حد خلوص رکھتے تھے فرمایا کہ قریشی صاحب[1] آئے ہوئے ہیں، وہ تمھیں یاد کرتے تھے۔ یہ سن کر مجھے تعجب ہوا کیونکہ اب تک مجھے قریشی صاحب سے تعارف کی عزت بھی حاصل نہ تھی۔ بہر حال میں اُن کی خدمت میں گیا۔ بڑے تپاک سے پیش آئے اور اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد کہا کہ ہمارے یہاں ایک جگہ خالی ہوئی ہے۔ آپ آجائیں تو اچھا ہے۔ میں نے موصوف کی پیش کش کو شکریے کے ساتھ قبول کیا اور علی گڑھ جا کر مسلم یونی ورسٹی انٹرمیڈیٹ کالج میں لکچرار کی حیثیت سے کام شروع کر دیا۔ یہ دسمبر ۱۹۳۲ء کی بات ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ قریشی صاحب کون بزرگ تھے۔

---

[1] قریشی صاحب کی زوجۂ ثانیہ بدایوں کے خاندان سادات سے تھیں۔ اسی سلسلے میں موصوف اکثر بدایوں آتے رہتے تھے۔

پروفیسر عبدالمجید قریشی کا وطن تو پنجاب تھا لیکن وہ علی گڑھ میں طالب علمی اور ملازمت کا طویل زمانہ گزار چکے تھے اور نہ صرف یہ بلکہ وہاں کی زندگی میں اس قدر رچ بس گئے تھے کہ یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ اور علی گڑھ لازم و ملزوم بن گئے تھے مشہور تھا کہ میکڈورتی نے ڈاکٹر ضیاء الدین کو پیدا کیا، ڈاکٹر ضیاء الدین نے قریشی کو اور قریشی نے حافظ عثمان کو۔ یہ سب حضرات ریاضی میں امتیازی مرتبہ رکھتے تھے۔ غرض دو اور دو چار کی ممارست نے قریشی صاحب کو حقیقت پسندی سکھائی اور اسی کی بدولت اُن میں زندگی کے اقدار پر گہری نظر ڈالنے کی ادا آئی۔ اسی کے ساتھ اِن کو فلسفہ و ادب سے بھی خاصا ذوق تھا۔ شاید اِسی کا اثر تھا کہ وہ بہ یک وقت ایک بالغ نظر مدبر بھی تھے اور پاکیزہ جذبات کا پیکر بھی۔ مولانا روم نے جو کہا ہے کہ

کار پاکاں روشنی و گرمی است

خدا نے دماغ کی روشنی اور دل کی گرمی دونوں موصوف کی ذات کے اندر جمع کر دی تھیں۔ کشیدہ قامت، بارعب چہرہ اور شاندار مونچھیں۔ یہ تھے قریشی صاحب جو میرے علی گڑھ آنے کا باعث ہوئے۔ کبھی کبھی ایسا ہوا کہ لڑکوں نے ڈائننگ ہال کے انتظام سے ناراض ہو کر اسٹرائک کر دی اور تمام ارباب حل و عقد اُس گتھی کو سلجھانے سے قاصر رہے مگر قریشی صاحب نے جو سمجھتے تھے کہ کہاں نرمی کا محل ہے اور کہاں گرمی کا، منٹوں میں اپنے ناخن تدبیر سے اُس عُقدے کو یوں حل کر دیا کہ سب دنگ رہ گئے۔ علی گڑھ میں بڑے عظیم الشان مشاعرے ہوئے جن کا سہرا دو شخصوں کے سر رہتا۔ قریشی صاحب اپنی وجاہت سے طلبہ کے جوش و خروش کا بار سنبھالتے اور مولانا احسن مارہروی، نازک مزاج شعرا کی خاطر و مدارات کر کے کام نکالتے۔ میں نے ایسے افراد بہت کم دیکھے ہیں جن سے طلبہ ایک طرف ڈرتے ہوں اور دوسری طرف اُن کا دم بھی بھرتے ہوں۔ یہ بات قریشی صاحب میں پائی۔

جس کالج میں پہلی بار میرا تقرر ہوا اُس کے پرنسپل قریشی صاحب ہی تھے۔ وہ کلاسس یونی ورسٹی کے اور دو اسکول کے ملا کر انٹرمیڈیٹ کالج کی تشکیل عمل میں آئی تھی۔ یونی ورسٹی اور اسکول کا دائرہ عمل اُس سے الگ تھا۔ کالج کے اساتذہ میں چند اصحاب ایسے تھے جن کے علمی اکتسابات اور مخلصانہ تعلقات کی یاد اب تک دل میں جاگزیں ہے۔ ان میں مشتاق احمد صاحب خلف نواب وقار الملک مرحوم عبدالشکور صاحب، ڈاکٹر ناظم صاحب، محمد حاذق صاحب اور شیخ علی جواد صاحب مرحوم خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

عربی کی کہاوت ہے لِکُلِّ دَاخِلٍ دَھْشَۃٌ (ہر نو وارد کو گھبراہٹ کا سامنا ہوتا ہے) اس پر طرہ یہ کہ علی گڑھ کے طالب علموں کی شرارتوں کے قصے سن چکا تھا۔ تاہم کلاس لینا ضروری تھا۔ شروع شروع میں بعض طلبہ نے شوخ طبعی دکھائی مگر جلد ہی اُن کو سمجھ آئی۔ پھر تو یہ حال ہوا کہ کالج میں (اور کالج کے بعد یونیورسٹی میں) ان کا احترام اور میری شفقت ضرب المثل بن گئی۔ میں خدا کا شکر کرتا ہوں کہ علی گڑھ کے طویل زمانہ قیام میں ارباب اختیار کا معتمد علیہ۔ اپنے رفقائے کار میں مقبول اور اپنے شاگردوں میں محترم رہا۔ بعد کو قریشی صاحب نے یہ نکتہ سمجھایا کہ علی گڑھ کے طلبہ اپنے اساتذہ کا صحیح جائزہ لینا جانتے ہیں۔ اگر کوئی اُستاد نالائق ہوتا ہے یا خواہ مخواہ رعب جماتا ہے یا کام کرنا نہیں چاہتا تو وہ اُس کو چٹکیوں میں اُڑا دیتے ہیں لیکن اگر کوئی ٹھکانے کا آدمی پاتے ہیں تو اس کی دل سے عزت کرتے ہیں۔

میں جب علی گڑھ پہنچا ہوں تو وائس چانسلر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں تھے وہ ایک جمیل و شکیل انسان تھے اور عین مین انگریز معلوم ہوتے تھے۔ بلکہ انگریز کا تو صرف رنگ گورا ہوتا ہے۔ صاحب زادہ صاحب ہر طرح ایک پیکر جمال تھے۔ بچپن سے اُن کی قابلیت، علمیت، مذہبیت، دیانت داری اور حق پسندی کے چرچے کانوں میں پڑے تھے۔ مذہب سے لگاؤ تو ہمیشہ سے تھا لیکن آخر میں تو مذہب اُن کی پوری زندگی پر چھا گیا تھا۔ وہ قوم اور یونی ورسٹی کی خدمت کی سچی لگن رکھتے تھے اور دونوں کو بام عروج پر پہنچانے کے آرزو مند تھے بعض لوگ کہتے ہیں کہ مرحوم میں ضد اور اپنی رائے پر اصرار تھا۔ مگر میری ناقص رائے میں ہر اصول پرست اور حق پسند کو یہ مرحلہ پیش آتا ہے۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ مرحوم فالج کے حملے سے صاحب فراش اور نشست و برخاست سے معذور تھے ۲۹ء میں اچانک سنا کہ صاحبزادہ صاحب نے ایک زبردست پمفلٹ چھپوا کر تمام ممبران کورٹ اور دوسرے ذمہ دار اعیان قوم کو بھیجا ہے۔ پمفلٹ کیا تھا گویا بم کا گولا تھا جس نے علی گڑھ کی ساکن فضا میں قیامت کی ہلچل ڈال دی۔ جو تھا تصویر حیرت بنا ہوا تھا۔ ہر ایک کی زبان پر یہ الفاظ تھے "دیکھئے کیا ہوتا ہے خدا خیر کرے" پمفلٹ کا مضمون کچھ اس قسم کا تھا۔

" میں نے اپنی وائس چانسلری کے زمانے میں حد سے زیادہ کوشش کی کہ فلاں فلاں امور میں اصلاحات بروئے کار لاؤں مگر ہر موقع پر پرو وائس

چانسلر (ڈاکٹر ضیاء الدین احمد) میری کوشش کی راہ میں روڑے اٹکاتے رہے۔ اپنے انتخاب کے دوسرے روز ہی علی الصباح میں یونی ورسٹی کی مسجد میں گیا (یہ ماہ جنوری کی کوئی ابتدائی تاریخ تھی) اور موذن کی عدم موجودگی میں خود ہی اذان دی۔ امام صاحب بھی غیر حاضر تھے آخر بہ مشکل چار پانچ طالب علم جو آ گئے تھے۔ ان کے ساتھ فریضۂ فجر ادا کیا جب جناب ناظم دینیات سے اس عام بے توجہی کی وجہ پوچھی اور دینیات سے متعلق بعض مسائل پر گفتگو کی تو وہ کوئی جواب نہ دے سکے۔ حد یہ ہے کہ وہ یہ بھی نہ بتا سکے کہ ایک ناظم کے ذمے کیا فرائض ہوتے ہیں۔ ان وجوہ سے مجبور ہو کر میں یہ پمفلٹ شائع کرتا ہوں تاکہ ارباب اقتدار جلد اصلاح کی طرف متوجہ ہوں۔"

علیا حضرت سلطان جہاں بیگم والیۂ بھوپال ایک دردمند اور بیدار مغز رئیسہ اور علی گڑھ کی چانسلر تھیں اور مرحومہ کے فرزند نواب حمید اللہ خاں جو اعیان ملک میں ملی حمیت اور گہری بصیرت کا بے مثال نمونہ اور یونی ورسٹی کے اولڈ بوائے تھے اُن کے مشیر کار تھے جب اُن کی نظر سے یہ تحریر گزری تو اُن کے حکم سے ان شکایات مندرجہ بالا کی تحقیق کے لئے رحمت اللہ کمیشن کا قیام عمل میں آیا جس کے صدر سر ابراہیم رحمت اللہ اور ارکان دو ممتاز ماہر تعلیم انگریز تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کمیشن کے مصارف اٹھارہ ہزار روپے ہوئے جو اس زمانے میں بڑی رقم سمجھے جاتے تھے اور جو بیگم صاحبہ نے اپنی جیب خاص سے عطا فرمائے۔ ڈیڑھ دو سال کی مسلسل تگ و دو اور بند کمرے میں ذمہ دار اصحاب کی شہادتوں کے بعد خدا خدا کر کے کمیشن کی رپورٹ منظر عام پر آئی جس کا ماحصل یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو اُن کی خدمات سے سبکدوش کیا جائے اور ادارے کا چارج بانیٔ کالج کے نامور پوتے سید راس مسعود کو سونپا جائے جو اُس زمانے میں مملکت دکن کی تعلیمات کے اعلیٰ افسر تھے۔ منجملہ دوسری اصلاحات کے اساتذہ کا ردّ و بدل اور انٹرمیڈیٹ کالج کی موقوفی بھی عمل میں آئی۔ اس موقع پر صرف دو اُستاد کالج سے یونی ورسٹی میں ترقی پر لئے گئے: شیخ عبدالرشید اور راقم سطور۔ یہ غالباً ۱۹۳۰ء کی تعطیل گرما کا واقعہ ہے۔

سید راس مسعود کے نام نے درحقیقت جادو کا کام کیا۔ دیکھتے دیکھتے علی گڑھ کی فضا یکسر علمی و تعلیمی ہو گئی۔ اساتذہ میں ذمہ داری کا احساس اور طلبہ میں اپنے فرائض کا پاس پہلے سے دو چند ہو گیا جدھر دیکھو علمی چرچے، جہاں دیکھو تحقیق کے جلوے۔ نئے وائس چانسلر اپنی اصلاحی تجاویز کو روبہ عمل لانے کے لئے ایک مشہور ماہر تعلیم مسٹر ہارن کو پرو وائس چانسلر کی حیثیت سے ساتھ لائے تھے، جنہوں نے بڑی سرگرمی کے ساتھ حالات کو سُدھارا مگر افسوس کہ ایک سال کے اندر ہی علی گڑھ کی لو کا شکار ہو گئے: "خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود۔"

علی گڑھ آ کر راس مسعود نے اپنی پالیسی کے بارے میں جو پہلی زلزلہ فگن تقریر کی وہ عمر بھر بھولنے والی نہیں۔ وہ جس طرح ایک طلیق اللسان Conversationalist تھے اسی طرح ایک جادو بیان مقرر بھی۔ جب بولتے تھے ایسا لگتا تھا کہ ایک لشکر جرار دھاوا مارتا چلا آ رہا ہے۔ اُن کو اُردو اور انگریزی پر بے نظیر قدرت تھی۔ تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ اپنے مرحوم دادا کی امانت کی نگہداشت کرتے ہوئے ممکن ہے کہیں مجھ سے فیصلہ کرنے میں غلطی ہو جائے مگر میری نیت ہمیشہ نیک ہو گی۔

اب میں یونی ورسٹی کے شعبۂ فارسی میں منتقل ہو گیا۔ جہاں مدت تک لیکچرر اور ریڈر کے فرائض انجام دیتا رہا۔ یونی ورسٹی کی فضا کالج کی فضا سے ملتی جلتی تھی۔

نوٹ: یہ جو کہا گیا محض قول نہ تھا بلکہ پورے طور پر عمل سے ہم دوش۔ میں سمجھتا ہوں کہ مرحوم کے لغت میں قول بلا عمل کے الفاظ ہی نہ تھے۔ میں نے سر سید اور جسٹس محمود کو نہیں دیکھا۔ البتہ سید راس مسعود کو دیکھ کر کچھ اندازہ ہوا کہ عالی دماغ اور عالی ظرف ایسے ہوتے ہیں۔ ان سے پہلے نواب مزمل اللہ خاں صاحب (بھیکم پور) جو ایک نرم مزاج، علم دوست اور فیاض رئیس تھے منصب وائس چانسلری پر فائز تھے اور تمام سیاہ و سفید کا اختیار ڈاکٹر صاحب (ڈاکٹر ضیاء الدین) کے ہاتھ میں تھا اور یونی ورسٹی کے معاملات پُرانے ڈھرے پر چل رہے تھے۔ سید راس مسعود اور مسٹر ہارن کا آنا تھا کہ بالکل کایا ہی پلٹ گئی اور تمام امور میں خواہ تعلیمی ہوں یا انتظامی، کمیشن کی سفارشات کے مطابق عمل ہونے لگا۔ حکومت میں ان کا یہ وقار کہ بڑے بڑے گورنمنٹ آف انڈیا کے یوروپین افسروں کو آدھا نام لے کر پکارتے تھے۔ والیان ملک میں یہ اعزاز کہ اعلیٰ حضرت نظام سے یونی ورسٹی کے لئے لاکھوں لاتے تھے۔ پبلک لیڈروں میں یہ وقعت کہ اُن کی دعوت پر کبھی گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال اور کبھی علی برادران اور علامہ اقبال علی گڑھ آتے اور کئی کئی دن ان کے مہمان رہتے۔ یہ بھی سنا دوں کہ سید صاحب مرحوم کی خدمت میں میری باریابی کی تقریب کیونکر ہوئی۔ بات یہ تھی کہ سید صاحب لمبی تعطیل گزار کر یورپ سے تشریف لا رہے تھے اور اُن کے اعزاز میں اکثر کالج نے ڈنر

مگر زندگی یہاں زیادہ بھرپور، مکمل اور ہمہ جہتی نظر آتی تھی۔ گویا کالج دریا تھا اور یونی ورسٹی سمندر۔ حکام یونی ورسٹی ہمدرد تھے۔ رفقائے کار قدر دان اور طلبہ ادب شناس۔ پھر اور کیا چاہئے۔ اس سے زیادہ کی کبھی ہوس ہی نہ کی۔

یہ سمجھ لیا کہ یہ ایک عام درس گاہ نہیں ہے جس میں بڑے چھوٹے افسر اور ماتحت کا سوال ہو۔ بلکہ ایک کنبہ ہے جس کے اندر اُستاد بزرگ خاندان یا باپ کی حیثیت رکھتا ہے اور شاگرد خوردوں یا اولاد کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تمام طلبہ جن

کا انتظام کیا تھا میرے مخصوص کرم فرماؤں میں مرحوم عبدالعزیز پوری صاحب نے اصرار کیا کہ اس تقریب مسعود پر نظم ضرور ہونا چاہئے۔ مجی حاذق صاحب نے فرمایا کہ میں خوش الحانی کے ساتھ بلند آواز سے پڑھ دوں گا میں کہ بڑے لوگوں کے یہاں حاضر باشی اور معزز مہمانوں کی آمد پر قصیدہ نگاری خلاف وضع سمجھتا تھا اور اب بھی سمجھتا ہوں عذر کرنے لگا۔ بالآخر اُن کا اصرار میرے انکار پر غالب آیا اور میں نے ارتجالاً قاآنی کی زمین میں فارسی کے چند اشعار بطور تہنیت و تبریک لکھ لئے جب شب کو مجمع حضار میں پڑھے گئے تو سب نے بے حد پسند کئے اور سید راس مسعود کمال درجہ متاثر ہوئے۔ چنانچہ نظم کے اختتام پر مجھے طلب کیا اور نہایت اخلاق سے پرسش حال کر کے فرمایا کہ مجھ سے ملتے رہنا۔ مرحوم کی عادت تھی کہ جب کسی نئے شخص سے ملتے تو اس کا امتحان ضرور لیتے اور اس خوبی کے ساتھ کہ پتہ نہ چلتا کہ امتحان ہو رہا ہے میں جب پہلی بار کوٹھی پر حاضر ہوا تو یاد ہے کہ انہوں نے مجھ سے غالب کا حسب ذیل شعر دریافت فرمایا۔

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا
گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

جب میں نے صحیح مطلب بتایا تو بہت محظوظ ہوئے۔ اُن کے ذہن میں اُردو کلاسیکل لٹریچر کو مغربی GET UP کے ساتھ ارزاں قیمت پر گھر گھر پھیلانے کی اور ملک کے گوشے گوشے سے نوادر کتب لاکر علی گڑھ میں جمع کرنے کی ایک بڑی اسکیم تھی۔ جس کو ظاہر کر کے فرمایا کہ آیا تم اس میں مجھے مدد دے سکتے ہو میں نے عرض کی کہ جہاں تک میرے امکان میں ہے حاضر ہوں افسوس کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی اور یہ اسکیم قول سے فعل میں نہ آسکی۔ وہ علی گڑھ سے بددل ہو کر بھوپال تشریف لے گئے، اور وہیں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

راس مسعود کے علی گڑھ چھوڑنے پر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد جو پہلے پرو وائس چانسلر رہ چکے تھے۔ وائس چانسلر منتخب ہوئے۔ اگرچہ راس مسعود اور ڈاکٹر صاحب میں نظریاتی اختلاف تھا مگر ڈاکٹر صاحب کے دماغ کی رسائی، معاملہ فہمی اور کارگذاری میں کوئی شبہ نہ تھا۔ وہ ایک غریب گھر سے تعلق رکھتے تھے اور غریب طلبہ کی مشکلات

خوب سمجھتے تھے۔ وہ علی گڑھ کی ہر رگ سے واقف تھے اور اچھا کہو یا بُرا معمولی مہتر سے لے کر اعلیٰ پروفیسر تک کا تقرر اپنے ہاتھ میں رکھنا پسند کرتے تھے۔ علی گڑھ والوں کا TACT (محل شناسی) مسلم ہے۔ اور ڈاکٹر صاحب TACT کا کامل نمونہ تھے۔ TACT پر ایک قصہ یاد آیا جو ایک دفعہ موصوف ہی نے بیان فرمایا تھا۔ کہتے تھے کہ ایک مرتبہ کسی سرکاری کمیشن پر جانا ہوا جس کے ممبر میرے سوا دو اعلیٰ انگریز عہدہ دار بھی تھے۔ قیام کسی پہاڑی پر تھا جہاں ایک اُجڑے ہوئے ڈاک بنگلے اور ایک بوڑھے چوکیدار کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایک ساتھی نے کہا۔ ڈاکٹر! اس وقت چائے کی سخت خواہش ہے۔ تم کہا کرتے ہو کہ علیگیرین بڑے Tactful ہوتے ہیں اگر چائے پلواؤ تو جانیں۔ میں نے جواب دیا ٹھہریئے سب انتظام ہوا جاتا ہے۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ چوکیدار نے خبر دی کہ کوئی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ بلایا تو معلوم ہوا کہ علاقے کے تحصیلدار ہیں اور ہم لوگوں کی آمد کی خبر اخبار میں پڑھ کر کئی میل سے ملاقات کے لئے آئے ہیں۔ یہ کسی زمانے میں علی گڑھ میں طالب علم رہے تھے۔ میں نے اُن سے پوچھا کیا یہاں چائے کا بندوبست ممکن ہے۔ بولے۔ جی میں لیتا آیا ہوں۔ ذرا دیر میں میز چائے کے سامان، مکھن، توسٹ، کیک اور پھلوں سے بھر گئی۔ میں نے دونوں ساتھیوں کو آواز دی اور وہ یہ لوازم دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ ڈاکٹر صاحب پر اکثر اصحاب نکتہ چینی کرتے تھے لیکن اعتراض کے ساتھ ہی اُن کے دو وصفوں کا اعتراف بھی کرتے تھے یعنی اپنے مخالفوں کو بھی نقصان نہ پہونچانا اور علی گڑھ چھوڑنے پر بھی دلی کے زمانہ قیام میں فرزندانِ درسگاہ کے کام آنا اکثر دیکھا گیا ہے کہ ریل سے اُتر کر گھر آتے اور فوراً بغیر لباس تبدیل کئے اپنے دفتر میں بیٹھ کر کاغذات دیکھنے لگے۔ حد ہو گئی کہ گھر کے اندر بیوی پر سکرات کا عالم ہے اور وہ باہر دفتر میں بیٹھے ہوئے یونی ورسٹی میں کسی آنے والے معزز مہمان کی پذیرائی کے لئے ہدایات دے رہے ہیں۔ سر شاہ سلیمان کی وائس چانسلری کا دور بھی بڑا شاندار تھا۔ موصوف اُن اعلیٰ اوصاف کے حامل تھے جو کسی قوم کے لئے بھی باعث نازش ہو سکتے ہیں۔ قانون، ریاضی، سائنس عربی اور اُردو میں اُن کی ہستی نوادر عصر میں شمار ہونے کے قابل تھی۔ دماغ اور

میں شریف صاحبزادے امیرزادے، نواب زادے، متوسط حال اور غریب ہر درجے کے نمایندے تھے۔ پھر سب کی فطرت جدا طینت جدا طبیعت جدا، خصلت جدا۔ تاہم سب میرے خلوص کا جواب احترام سے دیتے تھے۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ وہ لوگ اپنی درسیات میں مدد لینے یا اپنی ذاتی مشکلات میں مشورہ چاہنے کے لئے[1] میرے مکان پر آئے ہیں، اور میں اپنی تمام مصروفیات چھوڑ چھ چھ سات سات گھنٹوں تک اُن کے کام میں منہمک رہا ہوں حقیقت یہ ہے کہ اس عظیم قومی درس گاہ کو محض اینٹ اور چونے کی عمارت تصور کرنا بڑی غلطی ہوگی۔ یہ سرسید اور اُن کے لائق رفقا[2] کے خوابوں کی تعبیر ہے۔

یہ وہ درس گاہ ہے جس نے ہر زمانے میں بڑے بڑے مردان کار پیدا کئے: آفتاب احمد خاں، سید طفیل احمد، میر ولایت حسین اور حبیب اللہ جیسے فدایان ملت۔ ڈاکٹر ضیاء الدین، ڈاکٹر ولی محمد، ڈاکٹر عبدالحق، مولوی عزیز مرزا جیسے فاضل عصر علی برادران، رفیع احمد قدوائی، راجہ مہندر پرتاپ، خواجہ غلام الثقلین، سر ضیائی ڈاکٹر محمود، خواجہ عبدالمجید، سابق صدر پاکستان محمد ایوب، شیخ عبداللہ، عبدالرب نشتر، نواب صاحب بھوپال جیسے ممتاز رہنما۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، غلام السیدین، نور عبداللہ جیسے ماہرین تعلیم، مولانا ظفر علی، میر محفوظ علی، قاضی عبدالغفار، مولوی عنایت اللہ۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، سجاد حیدر، سلطان حیدر، خوشی محمد ناظر، حسرت موہانی، فانی بدایونی جیسے کاملان ادب و شعرا اسی کی آغوش کے تربیت یافتہ ہیں۔ یہ وہ درس گاہ ہے جس کو ایشیا[3] میں مسلمانوں کا سب سے بڑا قومی و ثقافتی مرکز کہنا چاہئے۔ یہ دراصل سرسید کی علی گڑھ تحریک کا سب سے بڑا مظہر ہے۔

سرسید نے کن حالات کے تحت اس تحریک کی بنا ڈالی اُس کی تفصیل میں جانے کا نہ وقت ہے نہ ضرورت۔ کیونکہ سرسید کے سوانح اور درس گاہ کی تاریخ پر لکھنے والوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ البتہ اتنا یاد رکھنا چاہئے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکام رہنے کے بعد قوم کا حال سراسر تباہ تھا اور اُس کا مستقبل تمام تر تاریک نظر آتا تھا۔ بالکل یہ کیفیت تھی جیسے گھٹا ٹوپ تاریکی چھائی ہو، بجلی چمک رہی ہو، بادل گرج رہے ہوں، سمندر میں طوفان برپا ہو اور ایک شکستہ کشتی بھنور میں پھنس گئی ہو۔ ؂

شب تاریک و بیم موج و گردابے چنیں ہائل

---

[1] انہیں مخلصانہ تعلقات کا اثر ہے کہ اب بھی اس زمانے کے طلبہ جو اکثر بفضلہٖ اعلیٰ مناصب علم و عمل پر فائز ہیں جب مل جاتے ہیں تو انتہائی ارادت سے پیش آتے ہیں۔ [2] سید کے رفقا میں چراغ علی، سمیع اللہ خاں، محسن الملک، وقار الملک، زین العابدین، نذیر احمد، ذکاء اللہ، حالی، شبلی مشہور ہیں جن کو نورتن کہا جائے تو بجا ہے۔ [3] ایشیا کی قید اس لئے لگائی کہ افریقہ میں جامع ازہر مسلمانوں کا سب سے بڑا علمی مرکز ہے۔

زبان اس قدر عجلت سے کام کرتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ ادھر آپ نے اپنی بات تمام نہیں کی اُدھر انہوں نے آپ کا مافی الضمیر سمجھ کر جواب دینا شروع کر دیا۔ بے مثال قابلیت اور اعلیٰ دُنیاوی اعزاز کے باوجود وہ اسلامیت، مشرقیت اور کسر نفسی کا مکمل نمونہ تھے۔ شروع شروع میں جب وہ بیرسٹر ہو کر ولایت سے آئے اور اپنے والد ماجد کی خدمت میں الہ آباد حاضر ہوئے تو لوگوں نے دیکھا کہ جب والد جانے کے لئے اٹھنے لگے تو انہوں نے کمال ادب سے اُن کی نعلین اٹھا کر سامنے رکھ دیں۔ دیکھنے والوں نے اسی وقت اُن کے روشن مستقبل کی پیش گوئی کر دی چنانچہ وہ جوڈیشل سروس کے اونچے سے اونچے مناصب پر سرفراز ہوئے۔ علی گڑھ کی وائس چانسلری کے زمانے میں وہ دہلی سے ہر ہفتے میں دو دن کو تشریف لاتے اور اپنے سفر اور قیام کے مصارف کا بار خود اٹھاتے۔ حتیٰ کہ ڈائننگ ہال کے کھانے کے دام اپنی جیب سے دیتے اور رات کو کونسل کے کمرے میں آرام کر لیتے۔ نواب اسمٰعیل خاں ایک بھاری بھرکم پُروقار شخصیت والے وائس چانسلر تھے مگر وہ زیادہ دنوں تک وائس چانسلر نہ رہ سکے۔ اُن کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین آئے۔

ذاکر صاحب جس بلند و بالا شخصیت کے مالک اور دل و دماغ کی جن عظیم صلاحیتوں کے جامع تھے اِن سے ایک دنیا واقف ہے۔ لیکن صحت کے روز افزوں انحطاط نے موصوف کو علی گڑھ چھوڑنے پر مجبور کیا اور بعد کو حکومت ہند کے اصرار نے ان کو اپنی جانب کھینچ لیا۔ جہاں گورنری نیابت اور صدارت اُن کی پذیرائی کی منتظر تھیں۔ زیدی صاحب ڈاکٹر ذاکر حسین کے نقش قدم پر چلے اور خاصے کامیاب رہے۔ اُن کے بعد بدرالدین طیب جی کا زمانہ آیا اور علی گڑھ کے لئے نئی بشارت لایا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ایک آئی سی ایس یہاں کیا کامیاب ہوگا مگر طیب جی نے اپنی بے لاگ، کھری، مدبرانہ، اور ہمدردانہ روش سے اس طرح کام کیا کہ علی گڑھ والے اُن کو آج تک محبت اور عزت سے یاد کرتے ہیں۔

سکتے ہے ایسی حالت میں کشتی اور اُس کے ملاح پر جو کچھ گزرتی ہوگی سبکساران ساحل اس کا کیا اندازہ کر سکتے ہیں۔ یہ کشتی ملت کی کشتی تھی اور یہ ملاح سرسید۔

سرسید نے ۱۸۵۷ء کی شورش کے تباہ کن اثرات بچشم خود دیکھے یوں تو تمام ہندوستانیوں کو ناکامی کا خمیازہ اٹھانا پڑا مگر مسلمان خاص طور سے انگریزوں کے انتقامی جوش کا نشانہ بنے کیونکہ ہر جگہ ہندو مسلمانوں کی شورش کا واحد مقصد حکومت مغلیہ کے اقتدار کو بحال کرنا تھا۔ اُدھر انگریزوں کو مسلمانوں سے نفرت تھا اُدھر مسلمانوں کو انگریزوں سے وحشت۔ اس کے علاوہ انہوں نے اندازہ کیا کہ مسلمان مذہب کی جگہ توہمات میں گھرے ہوئے ہیں، جدید تعلیم کو کفر سمجھتے ہیں ادب میں تکلف اور لایعنی خیالات کے عادی ہیں، سیاست سے بیگانے اور بیہودہ رسموں کے دلدادہ ہیں اس لئے انہوں نے طے کیا کہ ان کو مذہب، تعلیم، ادب، سیاست اور سماج کے جدید عملی حقائق سے روشناس کیا جائے اسی تحریک کا ایک مظہر ایم اے او کالج تھا جو اب خدا کے فضل سے یونی ورسٹی بن چکا ہے۔ اس پر قوم کی طرف سے جس قدر اُن کی مخالفت ہوئی اس سے کون ناواقف ہے۔ ان امور کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہے۔ بایں ہمہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے بارے میں جو چند غلط فہمیاں ہیں اُن کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔

کہا جاتا ہے کہ اُن کا مطمح نظر صرف یہ تھا کہ مسلمانوں کو بڑے بڑے عہدے مل جائیں۔ ہمارے خیال میں معترض حضرات نے یا تو حقیقت کو سمجھا نہیں یا سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے اسٹریچی ہال کا سنگ بنیاد رکھے جانے کے وقت لارڈ لٹن سے صاف کہا تھا کہ "مجھے اُمید ہے کہ یہ پودا کبھی درخت بن جائے گا جس کی شاخیں برگد کی طرح دُور دُور پھیلیں گی اور یہاں سے فارغ ہونے والے ملک کے طول و عرض میں آزاد تحقیق رواداری اور اخلاق کا پیام پہونچائیں گے۔" کہا جاتا ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کو غلامی کا سبق پڑھایا۔ لیکن اعتراض کرنے والے اُن کی کتاب "اسباب بغاوت ہند" دیکھ لیتے تو ایسا کہنے کی جرأت نہ کرتے۔

کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ہندو مسلم تفریق کا بیج بویا مگر یہ الزام بھی عدم واقفیت پر مبنی ہے۔ خود سرسید رقم طراز ہیں: "میں نے بار بار کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ ہندوستان ایک دُلہن کی مانند ہے جس کی خوبصورت اور رسیلی دو آنکھیں ہندو اور مسلمان ہیں۔ اگر وہ دونوں آپس میں نفاق رکھیں گے تو وہ پیاری دُلہن بھینگی ہو جائے گی۔"

میرے زمانے میں جو اساتذہ یہاں برسرکار تھے اُن میں اکثر کی ہستی کسی یونی ورسٹی کے لئے بھی سرمایۂ مباہات ہو سکتی تھی۔ تاریخ میں پروفیسر حبیب، تعلیمات میں پروفیسر حبیب الرحمٰن، فلسفے میں ڈاکٹر ظفر الحسن، معاشیات میں ڈاکٹر ایل کے حیدر، سائنس میں پروفیسر بابر مرزا اور کرنا حیدر خاں، شعبہ دینیات میں مولانا سلیمان اشرف اور مولانا راغب بدایونی، عربی میں مولانا میمن، اُردو میں پروفیسر رشید احمد صدیقی اور مولانا احسن مارہروی وامثالہم کے علمی و عملی اکتسابات کے بیان کے لئے ایک دفتر چاہیئے، مگر بخوفِ طوالت چھوڑتا ہوں۔ البتہ جی نہیں مانتا کہ اپنے شعبے (فارسی) کے رفقاء کے بارے میں چند جملے کہے بغیر گزر جاؤں۔ شعبہ فارسی کے صدر ڈاکٹر ہادی حسن تھے جن کو قدرت نے غیر معمولی ذہن اور حافظہ دیا تھا۔ سرو قد، خوبرو، خندہ پیشانی کہ بات کریں تو منہ سے پھول جھڑیں۔ نقل کرنے پر آئیں تو روتوں کو ہنسائیں۔ جب وہ اسپیچ دیتے تھے تو ہزاروں کے مجمع پر مکمل سکوت چھا جاتا تھا —————— وہ جو کسی نے کہا ہے "کسی کی آنکھ میں جادو تری زبان میں ہے۔" شاید ان میں دونوں باتیں تھیں۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ جب وہ انگریزی میں تقریر ختم کر چکے تو فاضل صدر جلسہ مسٹر ریزیا تم پرو وائس چانسلر نے اعتراف کیا I can not express myself so beautifully as Dr.Hadi Hasan has done اسی طرح جب وہ فارسی میں گُل افشانیٔ گفتار پر آتے تو اچھے اچھے ایرانی فضلا تصویر حیرت بن جاتے۔ یونی ورسٹی میڈیکل کالج کے لئے قوم سے پچاس لاکھ کی رقم وصول کر لینا ڈاکٹر ضیاءالدین کی کوشش اور ڈاکٹر ہادی حسن کی کاوش ہی کا ثمرہ تھا۔ ہادی صاحب کی موت تمام احباب کے لئے دردناک حادثہ تھی۔

شعبے کے دوسرے اُستاد الحاج حمیدالدین خاں تھے۔ جو بفضلہٖ بقیدِ حیات ہیں۔ وہ علی گڑھ کے عاشق بھی ہیں اور ناقد بھی۔ وقت کے اتنے پابند اور اصول کے اتنے سخت کہ خواہ وائس چانسلر کے ہاں میٹنگ

ؔ میں سید صاحب کی اکثر تاویلات کو نہیں مانتا۔

ہو یا ایم اے کا کلاس ہو اگر اول الذکر کو کوئی کام لگ گیا یا آخر الذکر پانچ منٹ بعد آئے تو آپ قطعاً نہیں ٹھہرتے۔ پورٹ فولیو اٹھایا اور یہ جا وہ جا۔ نہایت بے لوث اور بے حد بے باک۔ لوگ اس کو اُن کی درشت مزاجی پر محمول کرتے ہیں۔ کریں میں تو اصول پرستی کہتا ہوں۔ یادش بخیر۔ محمد صادق انتہا کے باغ و بہار اور بلا کے بذلہ سنج۔ دوستوں کے دوست۔ ساتھیوں پر شفیق

قارئین شاید ناخوش ہوں کہ میں نے ابتک علی گڑھ کے عام ماحول اور خصوصاً وہاں کے طلبہ کی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ مجھے خود اس بات کا خیال ہے مگر کیا کیا جائے کہ بات میں بات نکلتی چلی آئی ورنہ دراصل ٹیپ کا بند تو یہی تھا میں تو یہ جانتا ہوں کہ علی گڑھ کی فضا بے تعصبی میں اور اس کے طلبہ امن پسندی میں مثالی حیثیت کے مالک ہیں۔ شروع سے علی گڑھ کے دروازے بغیر امتیاز مذہب و قوم ہر ایک کے لیے کھلے رہے ہیں شاید لوگوں کو یہ معلوم ہو کر تعجب ہوگا کہ ایم اے او کالج کے سب سے پہلے گریجویٹ بابو ایسٹری پرشاد ساکن ضلع علی گڑھ تھے۔ وہاں کے طویل زمانہ قیام میں میں نے اساتذہ کو بھی برتا اور طلبہ کو بھی پرکھا۔ لیکن بات چیت میں۔ برتاؤ میں، رکھ رکھاؤ میں کبھی یہ سوال نہیں اُٹھا کہ فلاں مسلمان ہے اور فلاں ہندو۔ یا عمر سنی ہے اور زید شیعہ۔ غور کیجئے تو یہ بڑی بات ہے۔ جمعہ یا عیدین میں جب اہلِ سنت کا ہجوم فریضۂ دوگانہ پڑھ کر مسجد سے باہر آتا ہے اور شیعہ حضرات نماز کے لیے داخل ہوتے ہیں تو وہ دلکشا منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

آج ہر جگہ نوجوانوں کی قانون شکنی حد سے تجاوز کر چکی ہے۔ علی گڑھ والوں کا ڈسپلن ضرب المثل ہوگیا ہے استثنائی صورتیں کہاں نہیں ہوتیں لیکن فیصلہ سوادِ اعظم کو دیکھ کر کیا جاتا ہے۔ ہمیں یاد ہے کہ جب گاندھی جی اور علی برادران نے ترک موالات کا فیصلہ کیا جب یورپ نے ترکی کے "مردِ بیمار" کا خاتمہ کرنا چاہا جب بہار اور کوئٹہ میں قیامت خیز زلزلہ آیا جب علی گڑھ میں سیلاب نے ستم ڈھایا تو یہی علی گڑھ کے فرزند تھے جو خدمتِ خلق کے جذبے سے سرشار اور سرفروشی کو تیار ہو گئے۔ آخر میں شاعر کا ہمنوا ہو کر مجھے یہی کہنا پڑتا ہے کہ ؎

دارم دلے ز آبلہ نازک نہاد تر
آہستہ پا نہم کہ سرِ خار نازک است (غالب)

واہی

دَل بَدلی

چلتے چلتے دفعتاً پڑی بدلے کا چلن ؛ ہے سیاست کے قلابازوں کا ایک مشہور فن
فائدہ ہوتا ہے وقتی طور پر اس کھیل میں ؛ گو ثقہ حضرات کہتے ہیں اسے بھٹیار پن
شاعروں نے بھی اسے اپنا لیا ہے آج کل ؛ کارآمد دیکھ کر یہ نسخۂ آہن شکن
ہو رہا ہے اس قدر مقبول یہ نسخہ کہ اب ؛ دَل بدلتے رہتے ہیں دن رات اربابِ سخن
نت نیا بہروپ لازم ہے پئے اظہارِ ذات ؛ جب نظر کے سامنے ہو فن برائے مکر و فن
وہ زمانہ جبکہ بزمِ شعر تھی اک رزم گاہ ؛ چھوڑ دی تھی ہر نئے شاعر نے رفتارِ کہن
گھولتے رہتے تھے وہ حضرات جامِ شعر میں ؛ نغمۂ بلبل کے بدلے شورشِ دار و رسن
ہوٹلوں میں بیٹھ کر ہوتا تھا ذکرِ انقلاب ؛ اپنے سر سے باندھے رہتے تھے تخیل میں کفن
اُن میں کچھ لیڈر صفت تھے اور کچھ والنٹیر ؛ جھنڈ میں شُترغاں کے جس طرح ہوں زاغ و زغن

نعرہ بازی میں اگر ہوتے تھے لیڈر پا و سیر
اُن کے ہر والنٹیر کا وزن ہوتا ڈیڑھ من

رفتہ رفتہ شور و غوغائے سخن کا جب تھما ؛ لگ گیا جب ماہ نخشب میں حوادث کا گہن
آ گئے کچھ اور کرتب باز، بزمِ شعر میں ؛ اک ذرا سا جانتے تھے جو گرہ بندی کا فن
سونگھ کر موسم کی بُو اور رُخ ہوا کا دیکھ کر ؛ کیچلی بدلی ہر اک والنٹیر نے دفعتاً
صبحدم دیکھا تو ٹیڈی سوٹ میں ملبوس ہیں ؛ پھینک کر چکے ہے اپنا انقلابی پیرہن
سر کے بالوں کی سفیدی ہوگئی غرقِ خضاب ؛ تہہ بہ تہہ غازہ لگا کر دور کی رُخ کی شکن
شاعری کی عمر تھی گو بیس یا پچیس سال ؛ لیکن اپنے فن میں بالقصد لائے بالپن
کر دیا بہرِ صدارت پیش اپنے آپ کو ؛ جب بنائی چند نومشقوں نے کوئی انجمن
اس طرح مشقِ پیشہ کرتے کرتے یہ والنٹیر ؛ بن گئے اب خام ذہنوں کے امامِ فکر و فن

اُن کا مقصد ہے اگر کچھ تو حصولِ منفعت
انقلابی شاعری ہو یا صداقتِ سخن

کشمیری کہانی

مغلی عفارا

علی محمد لون

لاتھر آج مرگیا

سلطان سوداگر اور محمد وطوائی اس کے جنازے میں شامل تھے۔ سلطان سوداگر کی پگڑی اُسی کے سر پر بڑی ڈھیلی ڈھیلی سی لگ رہی تھی۔ محمد وطوائی کے سارے بال سفید ہو چکے تھے اور اُس کی کمر دوہری ہو گئی تھی۔ میں نے سلطان سوداگر سے لاتھر کی موت کا سبب پوچھا۔ تو وہ بولا۔

"میرے عفارا کی آہ لے ڈوبی اسے۔"

یہ سن کر میں نے محمد وطوائی کی طرف دیکھا۔ جیسے اُس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ بات کیا ہوئی۔ اُس نے بھی یہی جواب دیا۔

"میرے عفارا کی آہ لے ڈوبی اسے۔"

عفارا سلطان سوداگر کا تھا یا محمد وطوائی کا۔ اس بات کا فیصلہ میں آج بھی نہ کر سکا اور اُن دنوں بھی نہیں کر سکا تھا جب عفارا ہمارے محلے کے بازار میں شیر کی طرح دہاڑا کرتا تھا اور سب اس سے خوف کھایا کرتے تھے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب کشمیر پر قبائلیوں نے حملہ بول دیا تھا اور کشمیریوں کو مغل بادشاہوں کی غلامی کے بعد پہلی بار بندوق اُٹھانے کا موقع ملا تھا۔ معمولی فوجی تربیت حاصل کرنے کے بعد کشمیری سپاہیوں کی چھوٹی بڑی ٹولیاں محاذِ جنگ پر جاتی تھیں اور ہندوستانی سپاہیوں کے شانہ بشانہ ملک کے بچاؤ میں شامل ہوتی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ملک کے اس حصے کا نظامِ حکومت اور لوگوں کی روزمرہ زندگی ایک شدید بحران کا شکار تھی۔ حملہ آوروں کو شکست دینے کا کام ترجیحی طور پر کیا جاتا تھا اور اس کے بعد دوسرے مسئلوں کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ حالات اس حد تک بگڑے ہوئے تھے کہ کئی معاملوں میں نراجیت کا سا احساس ہوتا تھا کوئی کسی کا پرسانِ حال نہ رہا تھا اس لئے جو سپاہی محاذوں سے گھروں کو لوٹ آتے وہ اپنے ہتھیار ساتھ ہی لایا کرتے تھے۔ بھری ناٹ تھری کی رائفلیں کندھوں سے لٹکائے اور کالے کالے فوجی جوتے پہنے ہوئے یہ لوگ گلیوں اور بازاروں میں شور مچاتے ہوئے گزرا کرتے تھے۔ گلی کوچوں اور بازاروں میں فوجیوں کا یوں گزرنا ہی دراصل اس کہانی کو جنم دینے کا ذمہ دار ہے۔

معلوم نہیں ملک کے دوسرے حصوں میں پلنے والے عام کتوں کا کیا عالم ہے۔ لیکن اپنے یہاں کے عام یا بازاری کتوں کی ایک بُری عادت یہ رہی ہے کہ وہ ہمیشہ موٹر سائیکل اور سپاہیوں کے پیچھے بھونکتے ہوئے دوڑتے ہیں۔ آج بھی ایسا ہوتا ہے اور شاید ہمیشہ ایسا ہوتا رہے گا۔ قبائلی حملے کے دنوں میں بھی ایسا ہی ہوا۔ محاذوں سے واپس آنے والے سپاہی کتوں کی اس عادت سے واقف تھے اس لئے وہ ہر کتے کو اپنی گولی کا نشانہ بنایا کرتے جو اِن پر بھونکتا تھا۔ کتوں نے یہ صورتِ حال دیکھ لی تو وہ کچھ دیر سپاہیوں سے دُور دُور ہی رہنے لگے۔ لیکن اب سپاہیوں کو کتوں کے شکار کرنے کا چسکہ پڑ چکا تھا اور وہ اس تاک میں لگے رہتے

تھے کہ کب کوئی آوارہ کتا سامنے سے گزرے اور وہ اُسے گولی کا نشانہ بنا دیں۔ اکثر ایسا ہی ہوا کرتا تھا کہ یہ سپاہی دکانوں کے سامنے، گلی کے نکڑ پر، آنگنوں میں سوئے ہوئے کتوں کو ٹھوکریں مار مار کر جگایا کرتے اور اس سے پہلے کہ کتا احتجاجاً بھونکتا گولی اس کے اندر چلی جاتی اور چیخ کے نکلنے سے پہلے ہی بے چارے کی جان نکل جاتی۔

مگر مغلی اور عفارا سپاہیوں کی ذرا بھر بھی پروا نہ کرتے۔ اس لئے نہیں کہ وہ کوئی اونچی ذات کے کتے تھے یا اس لئے بھی نہیں کہ وہ کسی بڑے آدمی کے پالتو تھے۔ وہ دونوں بالکل بازاری کتے تھے، نیچی ذات کے۔ لیکن سلطان سوداگر اور محمد و حلوائی کے پیار، دلار کی وجہ سے وہ بیچارے بازار کے مشہور اور جانے پہچانے کتے تھے۔ جس طرح معمولی تربیت پانے کے بعد ہمارے سپاہی بڑے بھروسے اور اعتماد کے ساتھ محاذوں پر لڑنے جاتے تھے اس طرح سلطان سوداگر اور محمد و حلوائی کی دیکھ بھال اور تربیت سے ان کتوں کو بھی اپنے آپ پر ایک اعتماد سا پیدا ہوا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ عام بازاری کتوں کی نسبت۔ زیادہ باتمیز اور عقلمند بھی تھے۔ اس عقل اور تمیز کی بدولت یہ جانتے تھے کہ سپاہی ان کو چھیڑنے کی جرأت نہیں کریں گے۔ بازار کے دو لڑاکو دکاندار ان کے مالک تھے اور ان ہی کے برتے پر یہ جہاں بھی اور جدھر بھی جس سپاہی کو بازار میں چلتا دیکھتے، آگا پیچھا دیکھے بغیر اس پر بھونکتے اور اُسے بھگانے میں ایک نامعلوم سی حیوانی خوشی محسوس کرتے۔ سپاہی بھی اس بات سے باخبر تھے اس لئے وہ بھی چپ رہتے اور کوئی خاص قدم نہ اُٹھانے میں ہی خیریت سمجھتے تھے۔ انہوں نے کبھی بھی مغلی عفارا کو چھیڑنے کی ہمت نہ کی کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ سلطان سوداگر اور محمد و حلوائی کی موجودگی میں ایسا کرنا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے برابر ہوگا۔ اور پھر سارے بازار کے دکاندار اور آوارہ لڑکے سلطان سوداگر اور محمد و حلوائی کی دیکھا دیکھی اُلٹا سپاہیوں کو ہی اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بنا دیتے۔ مغلی اور عفارا جیسے اس بات کو پوری طرح جانتے تھے۔ اس لئے وہ میاں بیوی اپنی دموں کو اوپر اٹھائے سارے بازار میں اس طرح گھوما کرتے تھے جیسے کہ اس بازار کی ساری زینت انہی کے دم قدم سے تھی۔

لیکن وجہ صرف اتنی ہی نہ تھی کہ سلطان سوداگر محمد و حلوائی اور بازار والوں کو ان کتوں سے بہت زیادہ اُنس تھا۔ اس کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ قبائلی حملے سے ہی جو اتھل پتھل واقع ہوئی، اُس میں ہمارے سماج کے سبھی طبقوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا لیکن پسماندہ طبقہ کے جوان اور نوجوان خاص طور پر دوسروں کی نسبت زیادہ دل جمعی اور بھروسے کے ساتھ نئے حالات کا ساتھ دیتے رہے کم از کم ہمارے محلے میں تو یہی صورت حال تھی۔ شروع شروع میں تو سبھی لوگ حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کے لئے کمربستہ ہو کر اُٹھے لیکن جوں ہی حالات ذرا سازگار ہونے لگے تو پڑھے لکھے اور کاروباری لوگ واپس اپنی اپنی سابقہ جگہوں اور کام پر چلے گئے۔ روزگار اور تعلیم کے ذرائع سے محروم طبقے کے نوجوان دل جمعی کے ساتھ فوج میں برابر شامل ہوتے گئے اور سچ تو یہ ہے کہ پہلے پہل بھی اسی طبقہ کے نوجوان محاذوں پر زیادہ کامیاب ثابت تھے۔ ہمارے محلے ہی کی مثال لیجئے۔ رحمان ہمارے محلے کے چماروں کا لڑکا تھا لیکن اس کا نشانہ کبھی خطا نہ ہوتا تھا۔ چالیس گز کی دوری سے کانٹے دار تار کو نشانہ بناتا اور اُس کے دو ٹکڑے کر کے چھوڑ دیتا۔ اس طرح کمہاروں کا جہاں کسی گپھا کے اندر چراغ جلا کر گپھا کے دہانے سے باہر اس کو نشانہ بناتا اور گولی کی آواز نکلنے کے ساتھ ہی چراغ بجھ جاتا۔ اس کے مقابلے میں لانسر پڑھا لکھا بھی تھا، اور اچھے گھرانے کا بھی۔ لیکن اس کا نشانہ ٹھیک نہ تھا سلطان سوداگر اکثر اُس کے نشانے کے بارے میں کہتا تھا۔

"ارے کس کی بات کرتے ہو؟ یہ تو دو گز کی دوری سے ہاتھی کو بھی نشانہ نہیں بنا سکتا۔"

خیر یہ تو بات ہی سے بات نکل آئی تھی۔ بات دراصل یہ تھی کہ سپاہیوں میں اکثر جوان پسماندہ ذاتوں اور طبقوں سے تعلق رکھتے تھے اس لئے بھی لوگ اُن کی کوئی خاص قدر نہ کرتے تھے۔ سپاہی بھی اس بات سے واقف تھے اور اس لئے بھی وہ مغلی اور عفارا کو چھیڑنے کی جرأت نہ کرتے لیکن لانسر اس لحاظ سے کسی سے کمتر نہ تھا اس لئے وہ کسی کی پروا نہ کیا کرتا تھا۔

لانسر کا وہ نام نہ تھا جو کہ لوگوں نے مشہور کر رکھا تھا اس کا اصلی نام حبیب جان تھا۔ وہ لیفٹننٹ لانسر کیسے بن گیا۔ وہ بعد میں پتہ چلے گا۔ وہ شکل و صورت سے خاصا خوبصورت تھا۔ گلابی رنگ تھا اُس کے چہرے

کا اور جسم بالکل صاف شفاف تھا۔ آنکھیں نیلی اور بال کسی حد تک بھورے۔ قد
میں اچھا خاصا تھا اس لئے جب اس نے فوجی وردی پہنی تو سچ مچ بالکل
بڑی لام والا گورا سا نظر آنے لگا۔ ایسا لگتا جیسے کہ تازہ تازہ ولایت سے
ادھر آیا ہو۔ سلطان سوداگر اور محمدو حلوائی نے اُسے ایک دن جو فوجی وردی
میں بازار سے گزرتے دیکھا تو وہ ایک دوسرے کو آنکھ مارنے لگے سلطان
سوداگر نے محمدو حلوائی سے پوچھا۔

"ارے یہ کون لاتھر صاحب آیا ہے ادھر؟"

"بھئی یہ تو اپنا حبیب جان ہے۔"

"کون یہ؟ یہ حبیب جان ہے؟"

سلطان سوداگر کو یقین نہ آیا۔ اس نے ایک بار پھر حبیب جان کو سر
سے پاؤں تک دیکھا لیکن حبیب جان تو اتنا اکڑا ہوا جا رہا تھا کہ اُس نے
سلطان سوداگر کی طرف دیکھنا گوارا نہ کیا اور چھاتی تان کے ناک کی
سیدھ میں چلا گیا۔ اس کی خوش قسمتی یہ تھی کہ اس وقت مغلی اور عفارا وہاں
نہ تھے ورنہ سلطان سوداگر اور محمدو حلوائی حبیب جان کو چھٹی کا دودھ یاد
دلاتے۔ سلطان سوداگر پیچ و تاب کھانے اور ہاتھ کاٹنے لگا۔ اس نے
محمدو حلوائی سے کہا۔

"محمدو دیکھا۔ اس نے تو میری طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔"

"کیسے دیکھتا سلطان۔ یہ تو سوچتا ہوگا کہ بندوق اٹھائی اور بڑا
تیر مارا۔"

"افسوس تو یہ ہے کہ مغلی عفارا اس وقت یہاں نہیں ہیں۔ ورنہ
سالے کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جاتا۔

"وقت ہی بُرا آیا ہے نہیں تو کل تک کوئی تھوکتا بھی نہ تھا اس پر۔"

سلطان سوداگر غصے میں بل کھاتا رہا لیکن بے بسی کی حالت میں اسے
پی کر رہ گیا۔ ہاں اُس نے اپنے دل میں ٹھان لی کہ اس سپاہی کی اکڑ فوں دور
کرنی چاہئے۔ نہیں تو سلطان سوداگر کی ساری ساکھ مٹی میں مل جائے گی۔ خیر اس
وقت تو اس سے کچھ بھی نہ بن سکا لیکن نفرت اور حسد کے مارے اُس نے زور
سے آواز دی۔

"ششکرا لفٹین لاتھر!"

بس پھر کیا تھا دو ہی دن میں حبیب جان کا نام لوگ بھول گئے اور
وہ لیفٹننٹ لاتھر کے نام سے بدنام ہو گیا۔ حبیب جان کے کانوں تک یہ بات
پہونچا دی گئی اور وہ کچھ چڑتا ہو گیا۔

ایک دن لیفٹننٹ لاتھر جانے کس محاذ سے لوٹ کر آیا۔ اب کی بار اُس
کے ساتھ اسٹین گن بھی تھی اور اس کی وردی پر ایک پھول بھی لگا تھا۔ بالکل وہی
ولایتی گورا سا۔ خوبصورت، سُندر اور سجیلا گورا، لیکن گھمنڈ میں چور۔ اس کے
بجائے کہ وہ سیدھے اپنے گھر چلا جاتا، وہ اپنی اسٹین گن وردی اور وردی
میں لگے پھول کی نمائش کے لئے بازار میں آیا۔ اپنی کرنی کے لئے کون کس
کو دوش دے سکتا ہے۔ سلطان سوداگر نے اُسے اپنی طرف آتے دیکھا تو
اُس کے منہ پر شیطانی مسکراہٹ ناچ اُٹھی۔ مغلی عفارا دوکان کے سامنے
آپس میں کھیل رہے تھے۔ بڑا پیارا تھا ان کا یہ کھیل۔ وہ ایک دوسرے
پر چڑھ پڑتے، ایک دوسرے کو گراتے، یوں ہی جھوٹ موٹ ایک دوسرے
کو کاٹتے اور دھیرے دھیرے غراتے تھے۔ سلطان سوداگر نے جوں ہی
لیفٹنٹ لاتھر کو اپنی دکان کے نزدیک آتے دیکھا، اُس نے کتوں کو
آواز دی۔

"مُغلی عفارا!"

آواز سنتے ہی کتے اپنا کھیل بھول گئے۔ وہ چوکنے ہو گئے۔ اور
اپنی دموں کو اُوپر اٹھا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔ سلطان سوداگر نے انہیں
شہ دی۔

"ہُش!"

مُغلی اور عفارا دونوں ایک ساتھ بھونکنے لگے اور سلطان سوداگر
اپنی دکان چھوڑ محمدو حلوائی کی دکان میں یہ کہتے کہتے گھس گیا۔

"میں نے تو اسے چڑانے کے لئے لیفٹین لاتھر کہا تھا۔ یہ تو سچ
مچ لیفٹین بن بھی گیا۔"

مغلی اور عفارا بھانپ گئے کہ سلطان سوداگر نے لیفٹننٹ لاتھر
کی طرف اشارہ کیا تھا اور وہ دوڑ لگا کر اُس کی اور چل پڑے جیسے شیر شکار
کی طرف دوڑتا ہے۔ لاتھر نے دُور سے ہی کتوں کو اپنی طرف آتے دیکھا۔
اُس نے کاندھے سے اسٹین گن اُتاری لیکن اس سے پہلے کہ وہ زمین پر
پوزیشن لے کر کوئی کارروائی کرتا، مغلی اور عفارا دونوں ایک ساتھ اس
پر چڑھ پڑے۔ اسٹین گن ایک طرف جا گری اور لاتھر کے منہ سے بڑی ہی

خوف زدہ چیخ نکلی۔

"میرے خدا - مار ڈالا"

اس پر سلطان سوداگر اور محمد وحلوائی نے زور سے قہقہہ لگایا۔ دوسرے دکان دار بھی زور زور سے ہنس پڑے۔ بچوں اور لڑکوں کی ایک چھوٹی موٹی فوج سی مغلی اور عفارا اور لاتھر کے ارد گرد حلقہ بنا کے کھڑی ہوگئی۔ خوش قسمتی سے سدارام کی دکان بند تھی اور لاتھر نے اس دکان کے تھڑے پر چھلانگ لگائی اور جب مغلی اور عفارا اس کی ٹانگوں کو کھرچنے اور کاٹنے کی کوشش کرنے لگے تو لاتھر کے منہ سے بڑی بے ہودہ سی چیخیں بلند ہوئیں۔

"ہائے ماں، ہائے ابا۔" لاتھر کی چیخ و پکار سن کر بازار والے کچھ شرمندہ سے ہوگئے لیکن بچوں اور لڑکوں نے زور زور سے تالیاں بجا کر آواز لگائی۔

"ہے ہے ہے ہے ہے ہے :"

بچوں کی "ہے" سن کر مغلی اور عفارا نے محسوس کیا کہ شاید کوئی تماشا ہوگیا ہے اس لئے وہ دونوں لاتھر کو چھوڑ بچوں کا حلقہ توڑ کر باہر نکل گئے اور ایک بار پھر پہلے کی طرح ایک دوسرے سے پیار کرنے میں مشغول ہوگئے۔ کتوں اور بچوں کو جانے دیجئے۔ سلطان سوداگر کو یہ احساس ہوا کہ یہ سب ٹھیک نہیں ہوا۔ گھمنڈی ہے تو کیا ہوا۔ ہے تو اپنے ہی محلّے کا۔ لوگ لاتھر کو اس طرح چیختے چلاتے اور ہائے ہو کرتے سنتے تو کیا وہ بھی اپنے لئے ہی شرمندگی بات نہ ہوتی؟ سلطان سوداگر ادھر اپنے دل میں ہی یہ سوچ رہا تھا اور ادھر لاتھر بچیار بولا :

"ہے سلطان سالے! مزا چکھاؤں گا تمہیں بھی اور تمہارے ان ذلیل کتوں کو بھی"

مغلی اور عفارا نے جب لاتھر کو غصے میں برستے ہوئے سنا تو وہ ایک بار پھر اپنا کھیل کود بھول بھال کر لاتھر کی طرف دوڑے۔ لاتھر اپنی اسٹین گن اٹھا چکا تھا۔ اس لئے اب کی بار اسے بھاگنے ہی میں اپنی خیریت نظر آئی۔

بازار کے سبھی دکان داروں اور بچوں نے لاتھر کے یوں بھاگنے پر زور زور سے تالیاں بجائیں، سیٹیاں بجائیں اور ہے ہے کی آوازیں دور تک لاتھر کا تعاقب کرتی رہیں۔ پھر اس کے بعد لاتھر جب تک گھر میں رہا۔ بازار کی طرف بھولے سے بھی نہ گزرا۔ گزرتا بھی کیسے۔ ایک طرف مغلی عفارا اس کی جان کے دشمن، دوسری طرف سارا بازار اور پھر شیطان بچوں کی ٹولیاں۔

اس کے بعد لاتھر وردی پر دو پھول لگائے چھٹی پر آگیا۔ مطلب یہ کہ وہ واقعی لیفٹننٹ بن گیا تھا۔ سلطان سوداگر اور محمد وحلوائی کو یہ بات ناگوار گزری اور پھر لاتھر نے اب کی بار کمر بند سے پستول بھی لگایا تھا۔ اس دن لاتھر بے دھڑک بازار میں آیا۔ مغلی اور عفارا اس وقت نہ جانے کہاں تھے۔ نہیں تو اس کی ساری اکڑ دھری کی دھری رہ جاتی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لاتھر نے پہلے ہی یہ دریافت کر لیا ہو کہ مغلی اور عفارا اس وقت سلطان سوداگر کی دکان کے سامنے نہیں ہیں۔ اس لئے وہ بڑے رعب کے ساتھ آیا اور سلطان سوداگر پر برس پڑا۔

"کہو سلطان کہاں چھپا رکھا ہے کتوں کو؟"

سچ تو یہ ہے کہ سلطان سوداگر کچھ ڈر ہی گیا۔ سوچنے لگا کہ اگر کہیں غصے میں لاتھر نے پستول نکالا اور داغ دیا تو خواہ مخواہ جان پر آ بنے گی۔ چاہے گولی نہ بھی مارے لیکن ساری اکڑ تو نکال ہی دے گا۔ اس لئے اس نے نرم لہجے میں کہا۔

"کہئے لیفٹیننٹ صاحب۔ طبیعت کیسی ہے؟"

"طبیعت؟ تمہیں مطلب؟"

" لاتھر نے جل بھن کر جواب دیا۔ محمد وحلوائی نے محسوس کیا کہ سلطان سوداگر کچھ ڈر گیا ہے اس لئے اس نے اپنی دکان سے چلا کر پوچھا۔

"کیوں بے سلطان؟ تو اس طرح رک رک کر بول کیوں رہا ہے؟"

"ارے نہیں تو۔ ہم بھائی آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔"

"شٹ اپ" لاتھر نے چلا کر کہا: تو اور میری برابری کرتا ہے؟ کتا کہیں کا؟"

محمد وحلوائی سے رہا نہ گیا۔ اس نے پہلے سے بھی زیادہ زور سے آواز دی۔

"بات کیا ہے سلطان؟ یہ آدمی کاہے کو انگریزی بگھار رہا ہے؟"

اب لاتھر محمد وحلوائی کی طرف مڑ گیا اور آنکھوں سے شعلے برساتا ہوا بولا!

"ابے او محمود سالے! تو چپ رہ نہیں تو مار مار کے تیرا کچومر نکال دوں گا۔ تو کون ہے بیچ میں بولنے والا؟"

اس سے پہلے کہ محمود حلوائی اس گالی کا جواب دیتا سلطان سوداگر نے بگڑے ہوئے حالات کو محسوس کر کے لاتھر سے کہا۔

"دیکھئے لیفٹین صاحب۔ جانے دیجئے اب جو ہوا سو ہوا۔ ہمارے ساتھ آپ کا کیا لین دین نہیں ہے۔"

"کچھ نہیں۔ لیکن تم نے اُن کمینے کتوں سے میری توہین کرائی۔"

"اچھا ان کی طرف سے میں معافی مانگتا ہوں۔ بس؟"

سلطان سوداگر ابھی مشکل سے معافی مانگ ہی چکا تھا کہ جانے منغل کہاں سے آگیا اور اُس نے لاتھر کی ٹانگوں کے درمیان منہ لے جاکر آہستہ سے 'عف' کی۔ لاتھر بھیری کی طرح بدک گیا اور اُس نے فوراً پستول نکال لیا اور چار قدم دُور جاکر نشانہ ٹھیک کرنے لگا۔ منغل ایک شیرنی کی طرح سینہ تانے اُس کے سامنے کھڑی رہی۔ سلطان سوداگر اور محمود حلوائی دونوں نے بیک وقت دکان سے چھلانگ لگائی اور وہ دونوں ایک ساتھ منغل کے سامنے ہو گئے۔ سلطان سوداگر اب غصّے میں بھنا کر بولا:

"او حبیب جان: تجھے کس بات کا گھمنڈ ہوگیا ہے۔ کیا پستول ہاتھ میں لے کر یہ سمجھتا ہے کہ ناحق کسی کا خون کر دے گا۔؟"

لاتھر نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ محمود حلوائی زور زور سے سب کو سُناتا ہوا بولا۔

"سلطان۔ میں بھی دیکھوں۔ کس مائی کے لال میں ہمت ہے، جو ہماری منغل پر ہاتھ اُٹھائے گا!"

اب تو سارا بازار اُمڈ پڑا اور لاتھر کے اردگرد لوگوں نے گھیرا ڈال دیا۔ لاتھر بھانپ گیا کہ حالات خراب ہو رہے ہیں اس لئے کچھ کہے سُنے بغیر گھر کی طرف چل دیا۔ منغل نے ایک بار پھر زور سے "عف" کی اور نہ جانے عفارا کہاں سے چھلانگتا پھلانگتا ہوا آگیا پھر دونوں نے لاتھر کو آڑے ہاتھوں لیا۔ لاتھر نے پستول نکالا اور گولی داغ دی۔ گولی منغل کے سر پر جا لگی اور وہ ڈھیر ہو گئی۔ عفارا نے لاتھر کی گردن کو دبوچنے کے لئے چھلانگ لگائی۔ لیکن لاتھر نے پستول کے کُندے سے اُس کے سر پر زور سے چوٹ ماری۔ عفارا چکرا کر نیچے گر پڑا اور لاتھر دُم دبا کر بھاگ اٹھا۔

عفارا ہوش میں آ تو گیا لیکن ایسا لگتا تھا جیسے پاگل ہو گیا ہو۔ کھانا پینا بھول بھال کر وہ بین کرنے اور رونے لگا۔ انسانوں ہی کی طرح اُداس اور غم زدہ ہو گیا۔ وہ منغل کی لاش کے اردگرد گھومتا رہا۔ اُسے سونگھتا رہا، چاٹتا رہا۔ لیکن جب منغل کے مردہ جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی تو وہ آسمان کی طرف منہ اٹھا کر زور زور سے رونے لگا۔ سلطان سوداگر اور محمود حلوائی نے لاکھ کوشش کی کہ منغل کی لاش کو وہاں سے ہٹائیں لیکن عفارا نے انہیں ایسا کرنے سے روکا۔ جوں ہی منغل کے قریب آئے۔ عفارا غرا کر کاٹنے کو دوڑتا۔ جیسے وہ سچ مچ ہی باولا ہو گیا ہو۔ عفارا کی یہ حالت دیکھ کر سلطان سوداگر اور محمود حلوائی بھی آپے سے باہر ہو گئے اور انہوں نے لاتھر کو مارنے کا عہد کیا اور وہ اس کے گھر کی طرف چل پڑے لیکن وہ اس سے پہلے ہی بھاگ چکا تھا۔

منغل کی موت کے بعد عفارا وہ پہلے والا عفارا نہ رہا وہ چالاک بیدار اور بہادر عفارا۔ اس کی تو جیسے کمر ہی ٹوٹ گئی۔ وہ روز بروز سوکھنے لگا وہ اب کسی کے پکارنے پر خوش نہ تھا اور نہ ہی کسی کے اکسانے پر دَوڑتا۔ اُس کی دم بھی ٹوٹ سی گئی۔ کان لٹک سے گئے اور آنکھیں بھی سکڑتے سکڑتے تقریباً بند ہی ہو گئیں۔ سلطان سوداگر اور محمود حلوائی نے لاکھ جتن کئے کہ عفارا ایک بار پھر زندگی کی طرف لوٹ آئے لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ الغرض سب عفارا کی طرف سے ناامید ہو گئے۔

تین مہینوں تک ایسی حالت رہی اور عفارا دھیرے دھیرے موت کے منہ کی طرف لڑھکتا رہا۔ اسی زمانے میں لاتھر ایک بار پھر گھر لوٹ آیا۔ وہ بازار سے گزرا۔ عفارا سو رہا تھا۔ اُس نے جیسے کچھ سونگھ لیا ہو۔ جوں ہی لاتھر اس کے قریب سے گزرا، عفارا نے منہ اوپر اٹھا لیا۔ پہلے لاتھر کی طرف ڈٹ کے دیکھا اور بمشکل ایک ٹانگ پر کھڑا ہو کر لاتھر پر بھونکا۔ لاتھر اب وہ پہلا سا بُزدل نہ رہا تھا۔ وہ بھی اپنی جگہ پر ڈٹ کر کھڑا رہا اور جونہی عفارا نے اُس کی طرف چھلانگ لگائی، لاتھر نے اُسے گردن سے پکڑ کر زمین پر پٹک دیا اور خود کچھ کہے بغیر ہی گھر کی طرف چل دیا۔

عفارا کانپتے کانپتے ایک بار پھر اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہوگیا۔ اس کے سارے بدن میں کپکپاہٹ سی دوڑ گئی اور وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھا کر لاتھر کے گھر کی طرف جانے لگا۔ تھوڑی دور چل کر اُس نے اپنے جسم کو زور سے جھٹک دیا جانے کیا بات ہوگئی۔ کہ اتنی زور سے پوری انگڑائی لی اور زور سے چلایا ــــ

"عت : "

اس کے بعد وہ شیر کی طرح اس کی طرف دوڑا، جدھر لاتھر چلا گیا تھا۔ سلطان سوداگر اور محمد و حلوائی بھی اُس کے پیچھے دوڑ پڑے۔ پھوڑ پھاڑ کر سارے دکان دار بھی لاتھر کے گھر کی طرف جانے لگے اور لاتھر کے گھر کے آنگن میں جمع ہوگئے۔ عفارا مکان کے اردگرد دوڑ رہا تھا اور اندر جانے کا راستہ تلاش کر رہا تھا۔ دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں اور لاتھر دوسری منزل کی کھڑکی سے آنگن کی طرف دیکھ دیکھ کر پستول کی گولیاں بھر رہا تھا۔

عفارا نے جونہی لاتھر کو دیکھا وہ چند قدم پیچھے چل کر دوڑا اور کھڑکی کی طرف چھلانگ لگائی۔ لاتھر نے گولی داغ دی۔ لیکن نشانہ خطا ہو گیا۔ سلطان سوداگر چیخ کر بولا۔

"ہو حبیب جان! او ہتیارے! کیا اب اس بیچارے کی بھی جان لینا چاہتا ہے۔ یہ تو پہلے ہی مر چکا ہے۔"

سلطان سوداگر کی بات سُن کر سب لوگ اس کی طرف داری کرنے لگے اور لاتھر کو گالیاں دینے لگے۔ کچھ لڑکوں اور بچوں نے تو دروازوں اور کھڑکیوں پر پتھر پھینکنا شروع کئے۔ لاتھر نے کھڑکی بند کر دی سلطان سوداگر نے عفارا کو پکڑ کر واپس اپنی دکان کے پاس لے جانا چاہا لیکن عفارا ایک نہ مانا۔ سلطان سوداگر زبردستی کرنے لگا تو عفارا نے اسے کاٹنے کی کوشش کی۔ آہستہ آہستہ سبھی لوگ چلے گئے لیکن سلطان سوداگر اور محمدو حلوائی رات بھر عفارا کے پاس ہی رہے۔ صبح کا تارا نکلا۔ عفارا مر گیا۔ اس کی نظریں اسی کھڑکی کی طرف دیکھ دیکھ کر جم گئی تھیں جہاں سے لاتھر نے گولی چلائی تھی۔

لاتھر مر گیا۔

سلطان سوداگر اور محمدو حلوائی کو یقین ہے کہ اُسے عفارا کی آہ لے ڈوبی۔ میں نہیں جانتا کہ کسی انسان پر کسی کی آہ بھی پڑتی ہے لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ لاتھر کے مرنے کے بعد جب بھی کوئی اس کا نام لیتا ہے تو سب کو وہ دن یاد آتا ہے جب عفارا لاتھر کے برآمدے میں اس کا انتظار کرتے کرتے موت سے ہمکنار ہوا تھا۔

غزل

مدت سے منتظر ہوں توجہ کچھ اب تو ہو
چشم کرم نہیں ہو تو چشم غضب تو ہو

بادہ نہیں تو خالی ہی ساغر اُچھالیے
کچھ اہتمام محفل جشن طرب تو ہو

تسکین قلب کا کوئی سامان چاہیے
جب "جان میکدہ" نہیں بنت عنب تو ہو

ہر رات ہی کی گود میں پلتی ہے صبح نو
جو طالب سحر ہے وہ مانوس شب تو ہو

عذر گنہ ہے واقعی بدتر گناہ سے
مجرم ہوں یہ بھی سچ ہے مگر کچھ سبب تو ہو

منزل کا پانا غیر یقینی نہیں مگر!
کچھ ذوق جستجو تو ہو حسن طلب تو ہو

واحدؔ بیان ذات ضروری سہی مگر
احساس فن ہو مقصد شعر و ادب تو ہو

واحدؔ پریمی

تہذیب و تمدن

سلطانہ آصف فیضی

ہر دور کا اپنا ایک فیشن اور طور طریقہ ہوتا ہے۔ نہ صرف لباس میں بلکہ معاشرت، طرزِ رہائش، خیال و گفتگو میں۔ ایک عربی کہاوت ہے کہ آدمی اپنے ماں باپ سے زیادہ اپنے دور سے قریب ہوتا ہے چنانچہ ہمیں آئے دن اس کا مشاہدہ ہوتا ہے کہ سیدھے سادے ماں باپ کا لڑکا زلفیں بڑھانے میں، تنگ لباس زیب تن کرنے میں اور سگریٹ پھونکنے میں اپنے زمانے اور دور سے زیادہ قریب ہے۔ نہ صرف ظاہری تتبع میں بلکہ اپنے خیال، نظریئے اور قدروں میں بھی اپنے دور کی پیداوار ہے۔

آج کل بہت سے لفظ عام طور پر سُنائی دیتے ہیں مثلاً کمیونزم۔ سوشلزم، کلچر، ترقی، نفسیات اور ذہنی الجھاؤ، جن کو ہم سمجھتے کم ہیں اور بولتے زیادہ ہیں۔ یہ الفاظ اخباروں میں پڑھتے ہیں۔ تقریروں میں سنتے ہیں۔ اور آپس میں بولتے ہیں۔ ان لفظوں کو سُن سُن کر ہماری الجھنیں بڑھتی جاتی ہیں مگر آج کے دور میں ان الفاظ کے معنی و مطالب سے واقفیت عین تمدن کی نشانی ہے۔

تہذیب کیا چیز ہے جس کو انگریزی میں سوی لائی زیشن Civilisation کہتے ہیں جو ایک لاطینی لفظ Civis سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہوتے ہیں "ایک شہری" تو گویا تہذیب وہ حالت ہے جو ایک شہری کے شایانِ شان ہو جو وحشت کے دور سے نکل کر ایک منظم زندگی گزارتا ہو اور جو اپنے اور دوسرے شہری کے حقوق و فرائض سے واقف ہو جس کے اطوار احسن اور طبیعت سُلجھی ہوئی ہو۔ جو خلیق، شائستہ اور متواضع ہو۔ جو غیر متمدن حالت سے نکل کر انسانیت کے حدود میں آگیا ہو۔ غرض کہ تہذیب کے دو معنی ہیں ایک تو انسانی ذہن کا ارتقاء و سُدھار اور دُوسرا انسانوں کے ذہنی نفاست و شعور کی بالیدگی سے بنی ہوئی معاشرت' ایسی ہی سوسائٹی متمدن کہلاتی ہے۔

تہذیب کے بعد آیئے کلچر کے معنی سمجھنے کی کوشش کریں۔ کلچر کا ماخذ ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنی ہیں زمین میں ہل چلانا اور بیج بونا جس کا مطلب ہوا انسان کی ذہنی تربیت۔ اس طرح کلچر گویا مصنوعی عمل ہے۔ جو انسانی ذہن کو بتدریج تربیت دے کر اس کو چمکا دیتا ہے، اس کو جِلا دیتا ہے اس کو صحیح مذاق سے آشنا کر کے لطیف و نفیس خیالات سے اس کو مزین کرتا ہے۔ گویا ذہنی ارتقا کی تربیت کلچر ہے۔ بیکن لکھتا ہے کہ انسان کے روحانی وصف کا نام کلچر ہے۔

صحیح معنی میں تہذیب و کلچر وہ چیز ہے جو انسان میں اونچے اقدار پیدا کرے جہاں عقل کی حکمرانی ہو۔ ٹائلر اپنی کتاب Primitive Culture میں اس کی وضاحت کچھ اس طرح سے کرتا ہے کہ کلچر ایک پیچیدہ عمل کا مجموعہ ہے جس میں ایک سوسائٹی کے افراد کی علمیت۔ ایمان و اعتقاد ہُنر، اخلاق، قانون۔ رسم و رواج اور عادت و اطوار سب داخل ہیں۔ اس

اس مضمون کا ماخذ A. A. A. Fyzee کی کتاب Islamic Culture Bombay, 1944 ہے۔

طرح سے کلچر کے معنی بہت وسیع اور خارجی ہیں۔ داخلی معنی میں کلچر وہ چیز ہے جہاں انسان اپنے خیالات کو صحیح تناسب میں جانچنے کا سلیقہ رکھتا ہو اور لطیف ذہنی لطافتوں سے محظوظ ہونے کا اہل ہو۔

کلچر کا عمل سے کیا واسطہ ہے ؟ انسانی عمل کی دو شکلیں ہیں۔ ایک تو عملی اور دوسری ذہنی و فکری۔ کلچر کا ذہنی اور فکری طریق عمل سے واسطہ ہے۔ لہذا ہمارا طریقہ عمل ہماری اعتقاد پر منحصر ہے کلچر اور عملی زندگی ایک دوسرے سے پیوستہ ہونے کے باوجود دو علیحدہ چیزیں ہیں۔ اپنے دور و وقت کے مطابق علم حاصل کر لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ مختلف چیزوں کی قدر و قیمت کا اندازہ حاصل کرنا، زندگی کو صحیح زاویے سے جانچنا، خیالات کو متوازن اور بے لاگ طریقے سے پرکھنا کلچر سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ سب سے اہم اور ضروری امر یہ ہے کہ کسی دوسرے کے نظریے اور فکری نصب العین سے آپ کو اختلاف ہو تب بھی اس کے خیال کی قدر کرنا چنانچہ مذہب، زبان، قومیت اور وطن یہ وہ ڈوریاں ہیں جن سے ایک ملک و قوم کی تہذیب و کلچر کا رنگین جامہ تیار ہوتا ہے ایک خاص فت میں ملک کی جو ذہنی سطح قائم ہو جائے وہ کلچر ہے۔ اسی لئے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مختلف تواریخی دور میں اور مختلف ملکوں میں ہم تہذیب و کلچر کا معیار بھی جداگانہ پاتے ہیں کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ کلچر کے کسی ایک پہلو پر ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ مثال کے طور پر دورِ وسطیٰ میں صرف مذہب ہی کو کلچر کا دروازہ سمجھا جاتا تھا۔ فنِ تعمیر میں بہترین کلیساؤں کی تعمیر یا آرٹ میں مذہبی پہلو پر حد سے زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ آج یہ خیال بالکل بدل چکا ہے۔ اس لئے مذہب پر ضرورت سے زیادہ زور دینا یا سیاسی مطالبے کے لئے اس کی اہمیت کو بڑھانا سماج کو متعصب بنانا ہے جس کے نتیجے میں سماجی زندگی میں لڑائی جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔ اس بات کی طرف خاص طور پر اشارہ کرنا مقصود ہے کیونکہ آج کل ہمارے ملک میں بھی کچھ لوگ مذہب کو غیر معمولی ہوا دے رہے ہیں اور اس کی بنیاد پر کلچر کی عمارت تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ غرض کہ تہذیب کا دائرہ عمل ہماری روزمرہ کی زندگی ہے اور کلچر کا تعلق ہمارے معنا اور مجلیٰ باطن سے ہے۔ دُنیا کی ہر زبردست تہذیب کسی قانون کے تابع رہی۔ چنانچہ دنیا کے کلچر کی عظیم الشان تہذیبیں پھلی پھولیں اور پھر مرجھا گئیں۔ دیکھا گیا ہے کہ ہر تاریخی دَور میں تہذیب کا ایک مرکز ہوا کرتا تھا جہاں سے اُس کی روشنی ہر طرف پھیل جاتی تھی چنانچہ گزشتہ چار یا پانچ صدی میں تہذیب اپنے سابقہ مرکز یعنی بغداد، سمرقند اور دہلی سے ہٹ کر مغرب میں روم، پیرس اور آکسفورڈ میں پہونچ گئی ہے۔

" اسلامی تہذیب" یا عربوں کی تہذیب صرف خالص مسلمانوں کی یا کسی ایک مذہبی فرقہ کی پیداوار نہ تھی بلکہ اس کی ترقی میں مسلمان، یہودی، عیسائی دہریئے سب کی سعی و کوشش شریک تھی، وہ سب کی انتھک محنت کا نتیجہ تھا۔ مسلمان فرمانرواؤں کے درباروں میں عیسائی طبیب و شاعر بھی پوری طرح نمایاں تھے۔ اگر مسلمان عالموں نے اپنے علم سے تہذیب کو چمکایا تو یہودی فلسفیوں کا حصہ بھی کم نہ تھا چنانچہ ایک ہی مذہب نے نہیں بلکہ بہت سے مذہبوں نے مل کے اسلامی تہذیب کی تعمیر میں شرکت کی اسی طرح نہ صرف ایک قوم بلکہ بہت سی قوموں کے افراد کا اس تعمیر میں حصہ تھا۔ عرب سریانی، ایرانی، ترک ہسپانی۔ مصری اور ہندوستانی۔ ہر ایک نے تہذیب کی شمع کی لو تیز کی بہت باریکی سے دیکھا جائے تو شاید ایرانیوں اور ترکوں کا اس میں زیادہ حصہ ہے۔ اس لئے اسلامی تہذیب کی عظمت و ترقی کو صرف عربوں کے قومی اقتدار یا خالص مذہبی جذبے پر محمول نہ کرنا چاہیئے۔ اس تہذیب میں ہندوستان کا بھی کم حصہ نہ تھا۔

عام طور پر جو عربی ہندسے رائج ہیں وہ ہندوستان سے گئے ہیں۔ پھر وہ یورپ میں رائج ہوئے۔ علم الجبرا عربوں نے ہندوستان سے سیکھا۔ مغل بادشاہوں کی عالیشان تعمیرات کی خوبصورتی اسلامی اور ہندوستانی فنِ تعمیر کا مشترک عمل ہے۔ ہند کے مسلم صوفیائے کرام جن کی ہندو اور مسلمان یکساں تعظیم و تکریم کرتے تھے قدیم ہندو فلسفہ سے بھی متاثر ہوئے۔ اسلام کے چند زبردست فقیہ و محدث ہندوستان نے پیدا کئے۔

کسی ملک کے لوگوں کا دوسرے ملک کے لوگوں سے میل جول کلچر کا پہلا ضروری لازمہ سمجھا جاتا ہے۔ جب تک مسلمانوں کے پاس تجارت کے راستے کھلے رہے تو ان کا اقتدار عیسائیوں سے زیادہ رہا۔ جب یہ راستے اُن کے ہاتھوں سے چھن گئے تو کلچر کی باگ ڈور بھی ان سے چھن گئی۔ کلچر کو بڑھانے میں صرف قومیت یا مذہب ہی کا ہاتھ نہ تھا بلکہ تجارتی میل جول اور قومی جوشش بھی شامل تھے۔ اور بقول ایک مستشرق عالم بارٹولڈ اسلامی کلچر کی فوقیت زیادہ تر تجارتی شاہراہوں نے بڑھائی اور لوگوں کے آپس کے میل جول نے اس کے مواقع فراہم کئے۔

اس کی دو مثالیں پیش کرتی ہوں۔ ایک تو دسویں صدی کا بغداد لے لیجئے۔ بغداد کا دوسرا نام "دارالسلام" تھا اس کو خلیفہ منصور نے دریائے دجلہ کے کنارے آباد کیا تھا۔ بغداد کے لفظی معنی ہیں "خدا کا عطیہ" جو عباسیوں

کا دارالسلطنت رہا ہے۔ اس شہر کی تاریخ کے ساتھ بہت رومان اور قصے کہانیاں وابستہ ہیں کیونکہ اس کے نام کے ساتھ ہارون الرشید کا نام ذہن میں آجاتا ہے۔

کوفہ اور بصرہ کے بعد یہاں علم صرف و نحو کا نیا مدرسہ شروع ہوا اور پھر یہاں سے یونانی علوم اور سائنس کی ترقی کی ابتدا ہوئی۔

خلیفہ منصور اور خلیفہ مامون کی علم کی سرپرستی و سخاوت کے زیر سایہ یونانی علوم نے فروغ حاصل کیا۔ اس طرح سے عربی کلچر میں ایرانی، یہودی، عیسائی اور سابعین کی مدد سے یونانی فلسفہ شامل ہونے لگا۔

الجبرا کا علم یونانیوں کے پاس نہیں تھا۔ اس لئے وہ ہندوستان سے لیا گیا۔ کوفہ، بصرہ اور حرّان کے مدرسے بغداد کی تابانی کے سامنے ماند پڑ گئے۔ یہیں دسویں صدی میں وہ زبردست فلسفیانہ کتاب تصنیف ہوئی جو ۵۰ قطعات پر مشتمل تھی۔ اور جس کا نام "رسائل اخوان الصفا" تھا۔ یہاں سے یہ کتاب پہلے سپل ہسپانیہ پہونچی پھر فارسی میں ترجمہ کی گئی۔ اس کتاب میں دوسری بہت سی باتوں کے علاوہ نو فلاطونی فلسفہ کے عنصر بھی شامل تھے۔ اس کتاب کے مصنف کا نام ایک معمہ رہا۔

"لوگارتم" (جو علم حساب کا ایک قاعدہ ہے) ایک یوروپی لفظ سے نکلا ہے۔ جو خود "ال خوارزمی" نام کا بگاڑ ہے۔ ال خوارزمی وہ زبردست ترک ماہر ہندسہ تھا جو خوارزم کا رہنے والا تھا۔ ایک دوسرے عالم ال بطلانی تھے جو حرّان کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے علم مثلث کو پختگی تک پہنچا کر سائنس کی ایک الگ شاخ بنا دی۔

چار صدی آگے بڑھئے تو چودھویں صدی میں ابن خلدون جیسے مورخ کی عالمانہ تصنیف نظر آتی ہے اس کا مقدمہ عالمگیر شہرت حاصل کر چکا ہے۔ اور تاریخ نویسی میں ایک ادبی کارنامہ مانا جاتا ہے اس کی علم تاریخ سات جلدوں پر مشتمل ہے۔ وہ عربوں کی برتری کا سبب اُن کی ذہانت و ذکاوت کے علاوہ اُن کا مختلف قوموں سے میل جول اور تبادلۂ خیالات کو قرار دیتا ہے۔ مسلمانوں کے تہذیب و تمدن کی تعریف کرتے ہوئے وہ یہ بھی پیش گوئی کرتا جاتا ہے کہ اس کو بھی ایک دن زوال آنے والا ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ ایک جگہ بتلاتا ہے کہ جس طرح دُنیا کی دوسری قومیں پیدا ہوئیں جوان ہوئیں اور پھر ان پر زوال آگیا۔ اسی طرح تاریخ و قدرت کے اس اٹل قانون سے یہ کلچر بھی بچ نہیں سکتا۔

اب آئیے اپنے گھر کو دیکھیں۔ سولہویں صدی میں بابر ہندوستان آیا۔ اس کے بعد پانچ مغل بادشاہوں نے یکے بعد دیگرے اس دیس میں حکومت کی مگر انہوں نے اس کو اپنا لیا۔ یہیں پیدا ہوئے یہیں رہے اور یہیں مرکر دفن ہوگئے اور آج وہ جو کچھ اپنے بعد چھوڑ گئے۔ فن عمارت۔ آرٹ اور پینٹنگ میں وہ ہندوستانی اور مسلم کلچر کا ایک حسین امتزاج ہے۔ اکبر کے دربار میں جو نورتن تھے اس میں ہندو مسلم دونوں تھے جنہوں نے ساتھ مل کر ہندوستانی کلچر کو مالا مال کیا۔ سنیا ایک یونانی تھا جو ماہر فن تعمیرات تھا۔ اس نے استنبول میں سلطان سلیم کی مشہور مسجد بنائی۔ (۱۵۶۶ء۔ ۷۴) اس نے ایران کے فن تعمیر سے بہت سے اثرات لئے تھے۔ اکبر نے اس کے شاگرد یوسف کو ہندوستان بلایا۔ چنانچہ اس زمانے کی شاہی عمارتیں، ایرانی، ترکی اور ہندوستانی فن تعمیر کا ایک خوبصورت امتزاج ہیں۔ فن تعمیر میں اسی امتزاج کے ارتقاء نے تاج محل کی صورت میں فن تعمیر کو انتہا تک پہونچا دیا۔

اسی طرح سے قلمی مصوری کا آرٹ ایران اور ہندوستان میں بہت ترقی یافتہ تھا اور آغا میراک اور بہزاد کی بنائی ہوئی قلمی تصاویر کا مقابلہ فرانجلیکو اور دوسرے عہد وسطیٰ کے اُستادانِ فن سے کیا جاسکتا ہے چنانچہ ابوالفضل لکھتا ہے کہ جب فتح پور سیکری بن رہا تھا اس وقت شاہی فن کاروں میں میر سید علی مسکین قلم کے ساتھ بساون۔ یشونت۔ تارا۔ مہیش اور کیم کرن بھی فن کاروں میں شامل تھے۔

جس طرح تاریخ ایک عہد اور اس زمانے کے لوگوں کے تجربات کی کہانی ہے اسی طرح تہذیب و کلچر بھی ایک عہد اور دور کی پیداوار ہے۔ اس لئے کلچر خواہ اسلامی ہو یا ہندوی اس کی تعبیر میں مذہب کو ضرورت سے زیادہ اہمیت نہیں دینا چاہئے۔ صحیح کلچر کی پرکھ اس دور کے انسانوں کی خوبیوں اور نمایاں کارناموں کے ذریعے کی جانی چاہئے۔ اور اُن کی قومی مذہبی، ادبی اور تاریخی خوبیوں کا اندازہ لگا کر پرکھنا چاہئے۔ ذہانت و ذکاوت فکر و قدر عالمگیر چیزیں ہیں۔ اور انسانیت کے سماجی و اخلاقی مسائل اس قدر یکساں ہیں کہ ہم کو ہر وقت انسانیت کی عام بہبود و اصلاح کی طرف نظر رکھنی چاہئے۔

دارالمصنفین (شبلی اکیڈمی) اعظم گڑھ ایک خالص علمی و تحقیقاتی ادارہ ہے، اس کا اصل مقصد علوم و فنون خصوصاً اسلامی علوم، ہندوستان کی تاریخ، اردو زبان و ادب کی خدمت، ان کے متعلق تحقیقات اور تالیف و تصنیف، مغربی زبانوں اور جدید علوم کی مفید کتابوں کا ترجمہ و اشاعت اور اعلیٰ مصنفین اور اہل قلم کی جماعت تیار کرنا ہے، ظاہر ہے کہ اس قسم کی خالص علمی جماعت کا قوم و ملک کے عام عملی کاروبار اور مشاغل نیز ہنگامہ آرا جدوجہد سے زیادہ واسطہ اور سروکار نہیں ہو سکتا بلکہ وہ ہر طرح کے مالی طمع و فریب اور دنیاوی عیش و عشرت سے بے نیاز اور بے پروا ہو کر قوم کی ذہنی نشو و نما، اس کی دماغی تربیت اور علم و فن کی مفید مقدس خدمت کا فرض انجام دینے میں مشغول رہتی ہے۔

لیکن علامہ شبلی مرحوم اپنی ذات سے ایک انجمن تھے۔ اُن کی شخصیت بڑی جامع، ہمہ گیر اور پُرکشش تھی اس لئے ملک و قوم کی کوئی انجمن، کوئی ادارہ، کوئی تحریک اور کوئی جماعت ان سے بے نیاز نہیں رہ سکتی تھی۔ قدرت نے اُن کو بڑا حساس، ذہین، بیدار دماغ اور درد مند دل عطا کیا تھا اس لئے قوم و ملک کے اہم مسائل و معاملات کو نظر انداز کر دینا اُن کے لئے ناممکن تھا ذاتی طور پر وہ قوم پرورانہ خیالات کے حامل اور ملک و وطن کی آزادی و اتحاد کے نہایت پُرجوش حامی تھے۔ انہوں نے اپنے ملی، قومی و سیاسی مضامین اور نظموں میں قوم و ملک کی آزادی کی کوششوں کو سراہا ہے اور ہندو مسلم اختلافات کی خلیج دور کرنے کی پُرزور کوشش کی ہے۔

قدرتی طور پر اُن کے یہ خیالات اُن کے تلامذہ اور دارالمصنفین کے کارکنوں میں بھی منتقل ہوئے، خصوصاً دارالمصنفین کے منیجر اور اس کے انتظامی امور کے ذمہ دار مولوی مسعود علی ندوی مرحوم کو تو پبلک کاموں اور سیاسی و قومی اشغال کا فطری ذوق تھا، خود علامہ شبلی مرحوم نے اپنے خطوط میں اُن کے ان اوصاف و کمالات کا ذکر و اعتراف کیا ہے، چنانچہ انہوں نے اپنے اُستاد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ملک و قوم کی اصلاح و ترقی کو اپنا نصب العین بنایا اور آزادی و اتحاد کی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم نے "دارالمصنفین کے جشن طلائی" کے موقع پر خطبۂ صدارت دیتے ہوئے فرمایا تھا۔

"ملکی سیاست کے میدان سے دارالمصنفین کو بحیثیت ایک علمی و ادبی ادارے سے کوئی تعلق نہیں رہا لیکن بشخصی حیثیت سے اس کے مرادو مرشد مولانا شبلی نعمانی سچے اور پکے قوم پرست مسلمان تھے اور اُس کے کارساز و کارپرداز مولوی مسعود علی صاحب ندوی بھی اُن کے ہی نقش قدم پر چلتے رہے اور دونوں نے اتحاد و آزادی کا ساتھ دیا اور تفریق اور غلامی کے رجحانات کی شدید مخالفت کی، اس لئے دارالمصنفین کے گوشہ نشین کارکنوں

میں قومی آزادی اور قومی یکجہتی کے جذبات رُوح رواں کی طرح سما گئے اور اُن کی تائید اور ہمدردی، اتحاد اور آزادی کے سب علمبرداروں خصوصاً قوم پرور مسلمانوں کے لئے قوت اور فیضان کے سرچشمے کا کام دیتی رہی۔"

علامہ شبلی مرحوم کے علمی جانشین اور دارالمصنفین کے پہلے ناظم مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کا ذوق اگرچہ خالص علمی تھا تاہم علامہ مرحوم کی طرح اُن کی شخصیت بھی نہایت جامع تھی اور انہوں نے دارالمصنفین کو نہ صرف ملک گیر بلکہ عالمگیر شہرت بخشی۔ ان کے گوناگوں کمالات نے اُن کی ذات کو بھی ہر شخص، ہر ادارہ اور ہر جماعت کا مرکز توجہ بنا دیا تھا۔ اس لئے عملی سیاسیات کی خارزار سے دامن کش رہنا اُن کے لئے بھی ناممکن تھا، انہوں نے اپنے اُستاد کے سیاسی مسلک کو اختیار کرکے اتحاد و آزادی کی تحریک کا ساتھ دیا۔ اس زمانے میں قوم و ملک کی اصلاح و ترقی کی جو تحریکیں اور آزادیٔ وطن کی جدوجہد کرنے والی جو تنظیمیں بھی قائم ہوئیں اُن سب کو سید صاحب کی جانب اور سید صاحب کو ان کی جانب متوجہ ہونا پڑا، یہ الگ بات ہے کہ قومی اشغال اور سیاسی تحریکوں سے وابستہ رہنے کے باوجود بھی وہ اُس کی آلودگیوں اور آلائشوں سے بالکل محفوظ رہے اور انہوں نے علمی شان و وقار کو ہمیشہ قائم و برقرار رکھا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں۔

"سید صاحب نے شروع سیاست میں حصہ لیا اور جنگ بلقان سے لے کر تقسیم ہندوستان تک ہر طرح کی سیاسی اور قومی تحریکوں کی نیچ اُونچ میں شریک رہے، کم خوش نصیب ایسے ہوں گے جنہوں نے سید صاحب کی طرح سیاست میں مسلسل حصہ لیا ہو اور سیاست کی آلائشوں سے پاک رہے ہوں۔ سیاست کے وسیلے سے کسی منصب پر پہنچنے کے کبھی درپے نہ ہوئے، انہوں نے اپنے لئے جو بلند سطح پہلے دن اختیار کرلی تھی اسی پر آخر دم تک قائم رہے۔" (معارف سلیمان نمبر ص۱۲۲)

سید صاحب کی باقاعدہ قومی اور سیاسی زندگی اس وقت شروع ہوتی ہے جب ۱۹۱۲ء کے آخر میں ٹرکی نے جنگ عظیم میں شرکت کا فیصلہ کیا، اس کے اس فیصلہ کا اعلان کرنا ہی تھا کہ مسلمانانِ ہند میں بھی جوش اور ہیجان پیدا ہوگیا اور اُن کے کئی سیاسی لیڈر قید و بند میں ڈال دیئے گئے۔ اس موقع پر جو نیا گروہ اُن کی قائم مقامی کے لئے آگے بڑھا۔ اس میں مولانا سید سلیمان ندوی بھی تھے۔ ۱۹۱۶ء میں علمائے بنگال کے کلکتہ کے سالانہ اجلاس کی جس میں تمام رہنمایانِ ہند شریک تھے، انہوں نے صدارت کی اور نہایت موثر خطبہ پڑھا، یہ پہلا خطبہ تھا جس میں جنگ کے ہیبتناک اثرات کے باوجود مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کا نام جو اس زمانہ میں نظر بند تھے، نہایت جرات اور بیباکی کے ساتھ لیا گیا تھا، اس خطبہ سے لوگوں کے دلوں سے انگریزوں کا رعب اٹھنے اور کم ہونے لگا۔

۱۹۱۹ء کا سال ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بڑا پُر آشوب تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد اسلامی ممالک خصوصاً ٹرکی پر نہایت سخت وقت آیا، اس کے حصے بخرے کر دیئے گئے، ٹرکی کا سلطان قسطنطنیہ میں اتحادیوں کے ہاتھوں بےبس ہو رہا تھا، ایسے نازک اور پُر آشوب وقت میں ہندوستان کے چند بہادر، غیور اور دردمند مسلمان رہنماؤں نے اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر مجلسِ خلافت کے نام سے ایک مرکزی مجلس بمبئی میں قائم کی۔ جس کی شاخیں آناً فاناً پورے ملک میں قائم ہوگئیں اور جس نے آگے چل کر ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد میں عظیم الشان قربانیاں اور حیرت انگیز کارنامے انجام دیئے، اس مجلس کی روح رواں تو علی برادران (مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی مرحومین) تھے لیکن مولانا سید سلیمان ندوی ناظم دارالمصنفین اور مولانا مسعود علی ندوی منیجر دارالمصنفین بھی اس میں بہت پیش پیش رہے اور جب ترک موالات کی تحریک شروع ہوئی اور مجلس خلافت اور کانگرس کے پلیٹ فارم مشترک ہوگئے تو اِن دونوں حضرات نے بھی ملک کا طوفانی دورہ کیا، سید صاحب نے قومی و ملی جلسوں میں ولولہ انگیز تقریریں کیں اور اخبارات و رسائل میں نہایت پرجوش انقلابی مضامین لکھے۔

جب مجلسِ خلافت کا پہلا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں ہوا تو اس میں سید صاحب کی موثر اور پُرسوز تقریر نے علماء اور ارباب سیاست کے درمیان حلقۂ اتصال کا کام کیا اور مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور چودھری خلیق الزماں کے اختلافات کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر ختم کر دیا۔ ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی مرحوم کی سرکردگی میں جو وفد خلافت یورپ کے لئے روانہ ہوا تھا اس کے تین ممبروں میں ایک سید صاحب بھی تھے۔ یہ وفد نیشنلزم اور پین اسلام ازم کو متحد کرکے ہندوستان کی آزادی کی جنگ لڑنے چلا تھا۔

مولانا سید سلیمان ندوی اور مولوی مسعود علی ندوی کی کوششوں سے اعظم گڑھ میں کانگرس کمیٹی قائم ہوئی جس کے ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۲ء تک

اوّل الذکر صدر اور موخرالذکر سکریٹری ہے۔ مولوی مسعود صاحب کی سرکردگی میں جب مئو (ضلع اعظم گڑھ) میں ایک لاکھ کے بدیسی سُوت کا بائیکاٹ کیا گیا تو گاندھی جی نے اراکین دارالمصنفین کو مبارکباد دی اور پنڈت جواہرلال نہرو نے اعظم گڑھ کو کھادی کا سنٹر قرار دیا بلکہ ۱۹۲۱ء میں احمد آباد کی کانگریس میٹنگ میں سید صاحب کو اس کی ورکنگ کمیٹی کا ممبر نامزد کیا گیا۔ اور جمعیۃ علمائے ہند کی مجلس عاملہ کے بھی وہ رکن مقرر کئے گئے۔ مولوی مسعود علی صاحب بھی اِن دونوں قوم و وطن پرور جماعتوں کی ورکنگ کمیٹی کے رکن تھے۔

پہلی ڈکٹیٹرشپ کے موقع پر گاندھی جی نے اپنی گرفتاری کے وقت مولانا سید سلیمان ندوی ناظم دارالمصنفین کو اِس رائے کے ساتھ ڈکٹیٹر نامزد کیا تھا کہ "ندوی بڑے چاتر ہیں، اُن کو بھی سات آدمیوں میں لے لیا جائے۔" ۱۹۳۰ء میں آخری نمک ستیہ گرہ کے موقع پر ڈاکٹر انصاری مرحوم نے اپنی گرفتاری کے وقت مولانا مسعود علی ندوی منیجر دارالمصنفین کو ڈکٹیٹر نامزد کیا تھا۔

جب گورنمنٹ ایڈ کی واپسی کی تجویز منظور کی گئی تو دارالمصنفین کے ناظم اور منیجر نے انتہائی مخالفتوں کے باوجود دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کی جس کے اہم عہدوں پر اس زمانے میں یہ دونوں حضرات نہ صرف فائز تھے بلکہ حقیقی اور اصلی کرتا دھرتا تھے، پانچسو ۵۰۰ ماہوار کی امداد واپس کر دی۔

دارالمصنفین کے کارکنوں ہی کے اہتمام میں پنڈت جواہرلال نہرو نے ایک ہزار والنٹیروں کے ساتھ قانون شکنی کی جس کی صوبہ کانگریس کے سیکریٹری کی حیثیت سے وہ خود اور ضلع کانگریس کے سکریٹری کی حیثیت سے مولوی مسعود علی صاحب قیادت کر رہے تھے۔

جب گیا میں سوراج پارٹی کا قیام عمل میں آیا تو اس پر پہلا مسلم دستخط مولانا مسعود علی ندوی منیجر دارالمصنفین کا تھا۔ اس کے بعد اعظم گڑھ کو پورے صوبہ میں نمایاں حیثیت حاصل ہو گئی اور پنڈت موتی لال نہرو نے شبلی اکیڈمی کو سوراج پارٹی کا مرکز قرار دیا۔

منیجر دارالمصنفین کے اہتمام اور نگرانی میں احمد آباد کے بعد پہلا پنڈال خالص کھدر کا اعظم گڑھ میں بنایا گیا جس میں پندرہ ہزار آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی اور جس کو تمام اکابر و زعماء نے حیرت اور دلچسپی سے دیکھا۔

دارالمصنفین کے ایک اہم رکن رکین اور مولانا شبلی مرحوم کے ممتاز اور نامور شاگرد رشید مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم بھی تھے۔ اُن کو اگرچہ سیاسی، ہنگامی اور عملی کاموں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رہتی تھی تاہم نظری حیثیت سے ہم اُن کا سیاسی مسلک بھی اپنے استاد کے مسلک کے موافق رہا۔ انہوں نے فرقہ پرور جماعتوں کو کبھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا اور اُن کی نگاہ توجہ کا مرکز بھی وہی علم بغاوت تھا جو سرفروشان آزادی نے برطانوی جبر و استبداد کے خلاف بلند کر رکھا تھا۔

دارالمصنفین کے دوسرے تمام رفقاء مصنفین بھی ہمیشہ ذہنی اور نظری اعتبار سے اپنے برادر رشد علامہ شبلی نعمانی مرحوم کے نقطۂ نظر سے ہم آہنگ رہے، اور سب قومی تحریکوں اور آزادی و حریت کی راہ میں جدوجہد کرنے والی جماعتوں سے یک گونہ وابستہ رہے۔ خصوصاً مولانا ابوالحسنات ندوی مرحوم، مولانا ابوالجلال ندوی، سید نجیب اشرف ندوی مرحوم، مولانا ریاست علی ندوی، مولوی محمد اویس ندوی، اور جناب یحییٰ اعظمی وغیرہ قوم پروری اور اتحاد و آزادی کی تحریک میں عملاً بھی نہایت سرگرم تھے۔ مولانا ابوالحسنات کا اگرچہ عین عالم شباب میں انتقال ہو گیا تھا تاہم تحریک خلافت اور ترک موالات کی تائید میں انہوں نے بعض مضامین اور رسالے لکھے تھے۔ مولانا ابوالجلال ندوی کو قوم پروری میں بڑا غلو تھا۔ سید نجیب اشرف ندوی مرحوم جب بی اے کے دوسرے سال میں تھے تو خلافت اور ترک موالات کی تحریکیں زوروں پر چل رہی تھیں۔ وہ قومی اور ملی جذبے سے اسقدر سرشار ہوئے کہ اپنی تعلیم چھوڑ کر اِن تحریکوں میں شریک ہو گئے۔ اسی زمانہ میں وہ دارالمصنفین سے وابستہ ہوئے جو اس وقت ایک اہم علمی ادارہ ہونے کے ساتھ ساتھ قومی سرگرمیوں کا بھی مرکز بنا ہوا تھا۔ یہاں آکر مرحوم نے خلافت تحریک میں پورا حصہ لیا اور اپنی تنظیمی صلاحیت کا ثبوت بھی دیا۔ کم سنی کے باوجود انہوں نے خلافت اور کانگریس کے کارکنوں کی بڑی اچھی رہنمائی کی۔ مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی اُن کی والدہ بی اماں، گاندھی جی، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہرلال نہرو جب جب اس ضلع کے دورے پر آتے تو مرحوم ان کے ساتھ ہوتے۔ بی اماں تو ان کو اپنے بیٹے کی طرح چاہنے لگی تھیں۔ وہ جلسوں میں تقریریں بھی کرتے۔ بعض موقعوں پر ان کی تقریریں اتنی باغیانہ اور آتش بار ہوتیں تو مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کہتے کہ یہ ایک روز ہم سب کو پھانسی کے تختہ پر پہونچادیں گے۔ انہوں نے سوراج سے متعلق گاندھی جی کے بعض انگریزی اور گجراتی رسالوں کے ترجمے بھی کئے تھے۔

مولانا سید ریاست علی ندوی، مولانا سید سلیمان ندوی کے شاگرد رشید دارالمصنفین کے مشہور مصنف اور قوم پرور مسلمان ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ قومی و

سیاسی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لیا، اعظم گڑھ میں ضلع کانگرس کمیٹی اور جمعیتہ علمائے ہند
دونوں کے برسہا برس تک صدر اور سکریٹری رہے۔ ہندوستان کے دوسرے وزیر اعظم
لال بہادر شاستری اور اگروانے شاستری وغیرہ اُن کے خاص اور بے تکلف دوستوں
میں تھے۔

جناب یحییٰ اعظمی دبستان شبلی و سہیل کے مشہور پختہ مشق شاعر اور عرصہ دراز سے
دارالمصنفین سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے اپنے اُستاد مولانا اقبال احمد خاں سہیل مرحوم
اور دارالمصنفین کے مصنفین و رفقاء کی طرح ہمیشہ اتحاد و آزادی کی تحریک کا ساتھ دیا
نوائے حیات اور نوائے عصر کے نام سے اُن کے کلام کے دو مجموعے شائع ہوئے ہیں،
ان سے ان کی قوم پروری اور حب الوطنی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کی ولولہ انگیز اور
پرجوش قومی، ملی اور سیاسی نظموں کو مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے
اکابر رہنماؤں نے بھی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔

دارالمصنفین کی علمی، تحقیقی اور تاریخی کتابوں میں بھی ہندو مسلم یکجہتی اور ملک
کی آزادی و اتحاد کے جذبہ کو ابھارنے اور فروغ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ علامہ شبلی کے
مجموعہ مقالات و رسائل میں اس نوع کے متعدد مضامین شامل ہیں اور مولانا سید سلیمان
ندوی نے اپنی مشہور و معرکۃ الآرا کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" میں ہندوؤں اور
مسلمانوں کو ان کا وہ عہد زریں یاد دلایا ہے جب دونوں گوناگوں تعلقات میں جکڑے
ہوئے تھے، یہ کتاب دراصل ان لکچروں پر مشتمل ہے جو سید صاحب نے ۱۹۲۹ء
میں ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی دعوت پر دئے تھے۔ اس کا ایک لکچر سن کر پنڈت
جواہر لال نہرو نے فرمایا تھا: "مولانا آپ نے تو متعدد سنسکرت کتابوں کو اُردو
میں منتقل کر دیا ہے۔"

دارالمصنفین کی اس اہم خصوصیت کا ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم نے اس
کے جشن طلائی کے خطبہ صدارت میں ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:-

"اس مکتب فکر کے مصنفوں نے جہاں کہیں اسلامی تہذیب کے تعلقات قدیم یونانی
ایرانی اور ہندی تہذیب سے دکھائے ہیں وہاں فصل کے بجائے وصل کے
پہلو کو ابھارا ہے اور قصہ سکندر و دارا مناسنے کی بجائے حکایت مہر و وفا
بیان کرنے کو ترجیح دی ہے۔ ہندوستان میں تاریخ نگاری کے اس
تاریک دور میں جب ہمارے اکثر مورخ اپنے مجازی استاد ازل کے
لے ہوئے کو طوطی صفت دُہرایا کرتے تھے اور قرون وسطیٰ کے ہندوستان
کو ایک بحر طوفان خیز بنا کر پیش کرتے تھے، جس میں اسلامی تہذیب اور
ہندو تہذیب کے دھارے ایک دوسرے سے الجھتے اور ٹکراتے رہتے تھے،
دارالمصنفین کے مورخوں نے یہ دکھانے کی کوشش کی کہ ان دونوں کا ملنا
تصادم نہیں بلکہ امتزاج، سنگھرش نہیں بلکہ سنگم تھا۔"

دارالمصنفین کی قوم پروری اور وطن دوستی کی وجہ سے قومی و سیاسی رہنماؤں اور
آزادی و حریت کے علمبرداروں نے اس کے کارکنوں سے ہمیشہ مخلصانہ روابط و
تعلقات رکھے، تحریک خلافت اور نان کوآپریشن کے زمانہ کے تقریباً تمام مشاہیر
رہنما اس کے مہمان ہو چکے ہیں اور اب بھی وہ ایسا مرکز ہے جہاں ہندو اور مسلمان
لیڈر آنے میں بڑی خوشی محسوس کرتے ہیں۔

گاندھی جی اپنے دورے کے سلسلے میں جب اعظم گڑھ تشریف لائے تو گو
انہوں نے دارالمصنفین میں قیام نہیں کیا تاہم کارکنان دارالمصنفین سے ملنے کے
لئے وہ یہاں خود آئے، جس وقت گاندھی جی یہاں آئے اس وقت لوگ مغرب کی
نماز ادا کر رہے تھے، چونکہ اس زمانہ میں دارالمصنفین کی مسجد تعمیر نہیں ہوئی تھی اس
لئے نماز ایک کھلی جگہ میں ہو رہی تھی، گاندھی جی یہ دیکھ کر وہیں کنارے گھاس پر نہایت
خاموشی کے ساتھ بیٹھ گئے، اور اپنے ساتھیوں کو بھی اشارے سے مودب اور خاموش
رہنے کی تاکید کی۔ بعد میں لالٹین کی روشنی میں اُن کو کتب خانہ دکھایا گیا، دارالمصنفین
کے ایک رفیق نے اُن کے سامنے دستخط کے لئے اپنی یادداشت کی کتاب پیش
کی تو انہوں نے اُردو میں دستخط کیا۔

پنڈت موتی لال نہرو اور پنڈت جواہر لال نہرو کا تو دارالمصنفین بے تکلف
گھر ہی تھا، یہ لوگ جب یوپی کے مشرقی اضلاع کا دورہ کرتے تو اعظم گڑھ ضرور آتے
اور ہمیشہ دارالمصنفین ہی میں قیام کرتے، مولوی مسعود علی صاحب بھی دورے میں
ان لوگوں کے ہمراہ ہو جاتے تھے۔ کبھی کبھی پروگرام کی زیادتی کی وجہ سے ان لوگوں
کو اعظم گڑھ پہونچنے میں دیر ہوتی اور کھانے کا وقت ہو جاتا تو مولوی مسعود علی
صاحب شبلی منزل سے کھانا منگوا کر راستے میں ہی وقت پر کھلا دیا کرتے تھے۔ ایک
دفعہ جواہر لال اور مولانا محمد علی کی اندارہ میں ٹرین چھوٹ گئی تو اعظم گڑھ کے مشہور
قومی کارکن امجد علی غزنوی سابق ایم۔ ایل۔ اے کے والد اسد علی خاں صاحب نے
جو سرکاری ملازم اور ریلوے میں اوورسیر تھے، ان قومی رہنماؤں کو اپنے ٹھیلے پر بٹھا کر
اندارے سے پھپھنا پہونچا دیا، اس کی وجہ سے اُن لوگوں کے پروگرام میں زیادہ
تاخیر نہیں ہوئی، البتہ اسد علی خاں صاحب اس جرم میں معتوب قرار پا کر سرکاری
ملازمت سے برخاست کر دئے گئے، مولوی مسعود علی منیجر دارالمصنفین بھی اس سفر

یں ان قومی رہناؤں کے ساتھ ساتھ تھے۔

پنڈت جواہرلال نہرو نے اس ادارہ سے نفس واپسیں تک اپنا تعلق برقرار رکھا اور اپنے عزیز دوست مولانا مسعود علی ندوی کو ہمیشہ یاد رکھا اور برابر ان کو خطوط بھی لکھتے رہتے تھے۔ پنڈت جی دارالمصنفین کے لائف ممبر بھی تھے ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد دارالمصنفین کی مالی حالت خراب ہوگئی تو پنڈت جی کے ایما، اور مولوی مسعود علی صاحب کی کوششوں سے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے اپنی وزارت تعلیم سے ساٹھ ہزار کی یکمشت رقم اس کو عطا کی۔

مولانا ابوالکلام آزاد کو شروع ہی سے اس ادارہ سے بڑی دلچسپی رہی ہے اس کے اغراض و مقاصد کا خاکہ تیار کرنے میں ان کا بھی ہاتھ رہا ہے، جناب رفیع احمد قدوائیؒ کو بھی اس ادارے سے بڑا تعلق خاطر تھا اور وہ بھی اس کے محسنوں اور لائف ممبروں میں تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم، اس کی مجلس انتظامیہ کے باقاعدہ ممبر تھے۔ انہوں نے اس کے جشن طلائی کی صدارت منظور فرماکر خاص طور پر اس سے اپنے گہرے تعلق اور غیر معمولی اخلاص کا ثبوت دیا۔

اس موقع پر مسز سوچیتا کرپلانی نے جو اس وقت اتر پردیش کی وزیر اعلیٰ تھیں۔ دارالمصنفین کی قدر دانی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی حکومت کی طرف سے اس کو دس ہزار روپے کی رقم عطا کی۔ اس وقت بھی دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے صدر مشہور قومی رہنما ڈاکٹر سید محمود ہیں۔ مرکزی وزیر جناب فخرالدین علی احمد صاحب اس کی مجلس انتظامیہ کے ممبر ہیں اور اتر پردیش کے موجودہ گورنر ڈاکٹر گوپالا ریڈی اس کے لائف ممبر ہیں۔

دارالمصنفین کے گوشہ نشین کارکن پہلے کی طرح اب بھی ملک کی سالمیت اور قومی اتحاد و یکجہتی کا مفید کام نہایت خاموشی سے انجام دے رہے ہیں اور اس کے موجودہ ذمہ دار شاہ معین الدین احمد ندوی اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے محبان وطن اور قوم پرور رہناؤں سے مخلصانہ روابط و مراسم قائم ہیں اور وہ اسلامی علوم و فنون کی خدمات انجام دینے کے ساتھ ساتھ اتحاد اور یکجہتی کے ضروری اور اہم کام سے بھی غافل نہیں ہیں۔ شاہ صاحب ہر مہینے معارف کے شذرات میں قومی و سیاسی مسائل پر اظہار خیال کرتے ہوئے قوم و ملک کو اصلی ترقی، حقیقی آزادی اور ملک کی سالمیت و اتحاد کی جانب برابر متوجہ کرتے رہتے ہیں اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے عہد وسطیٰ کے ہندوستان کے متعلق تاریخی کتابوں کا جو سلسلہ شروع کیا ہے۔ اُن سے بھی ایکتا، قومی یکجہتی، اور ہندو مسلم میل ملاپ کے کاز کو فروغ دینے میں بڑی مدد مل رہی ہے۔ صوبائی اور مرکزی حکومتوں نے اُن کی بعض کتابوں پر انعامات بھی دیئے ہیں۔

دارالمصنفین کے قومی و ملی خدمات اور اتحاد و آزادی کے بارے میں اس کے کارنامے اظہر من الشمس ہیں۔ اس کے بانی پہلے ناظم و منیجر نے قوم و وطن کی آزادی اور اتحاد کی جدوجہد میں اس وقت حصہ لیا تھا جب موجودہ سیاستدان اور لیڈر پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، تحریک آزادی کے جو قدیم رہنما باقی رہ گئے ہیں وہ اس کی گزشتہ شاندار خدمات سے پوری طرح باخبر ہیں لیکن نئی نسل کے لوگوں کو اس کی ان گزشتہ خدمات اور کارناموں سے کوئی خاص واقفیت نہیں رہ گئی ہے۔ اس لئے یہ "داستان کہن" دہرانے کی ضرورت پیش آئی ؎

اس واسطے چھیڑا ہے پروانوں کا افسانہ
شاید ترے کانوں تک پیغام عمل جائے

غزل

جاگتے در ہیں یہاں پر نہ کھلا پٹ کوئی
تیری بستی ہے کہ ویران سا مرگھٹ کوئی

اُف، یہ انساں ہیں کہ پتھر کی تراشی مورت
دل میں نرمی ہے نہ آنکھوں میں لگاوٹ کوئی

جب کبھی آتی ہے عارض پہ حیا کی سُرخی
اپنے ہاتھوں کو بنا لیتا ہے گھونگھٹ کوئی

سانس رنگینیٔ ماحول کی رک جاتی ہے
جب ہٹا دیتا ہے چہرے پہ گری لٹ کوئی

میری تنہائی کو پہناتی ہے خوشبو کا لباس
بسترِ یاد پہ مہکی ہوئی سلوٹ کوئی

رات بھر دل میں سُلگتے رہے زخموں کے الاؤ
رات بھر یونہی بدلتا رہا کروٹ کوئی

شام کے ساتھ ہی اک درد مرے دل میں خمار
ایسے آتا ہے کہ ہوتی نہیں آہٹ کوئی

فرزانہ احمد

کڑواہٹ

وہ غسل خانے میں بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ کہنیوں تک صابن کے روپہلی جھاگ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس کا جسم پسینے میں شرابور ہوا جا رہا تھا اور اس کے لمبے لمبے کالے بال بھیگ کر اس کے چہرے اور شانوں پہ چپک گئے تھے۔ وہ بڑی تندہی سے رگڑ رگڑ کر کپڑے دھو رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ کاش وہ اپنے منہ کی کڑواہٹ کو بھی اسی طرح رگڑ رگڑ کر دور کر سکتی۔ کاش ان کپڑوں کی طرح اس کے ماضی سے بھی زندگی کا سارا میل کٹ جاتا اور پھر سے ایک بار ایک نئے اور اُجلے مستقبل کی جستجو اس کے دل میں نئی اُمنگ، نئے ولولے اور نئے جذبات جگا دیتی۔ لیکن اس کے منہ کی یہ کڑواہٹ اُسے مستقبل کے اُجالوں سے دور بہت دور ماضی کے تنگ و تاریک ویرانوں میں گھسیٹ رہی تھی اور اُس کے حلق سے ہوتی ہوئی یہ کڑواہٹ جیسے اُس کے سارے جسم میں کسی زہر کی مانند سرایت کر گئی تھی اور یہ اب اس کے بدن کا ایک ایک عضو، ایک ایک جوڑ اُس کے زہر کی کڑواہٹ سے دُکھ رہا تھا۔ اس کے سینے میں جیسے ایک آگ تھی جس کے لپکتے ہوئے شعلوں سے اس کا سارا وجود تپ رہا تھا، سلگ رہا تھا۔

اُس نے دفعتاً صابن کے اُبلتے ہوئے جھاگ سے اپنے ہاتھ نکال لئے اور اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اُس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو اُمڈ آئے۔ اُس زمانے میں جب وہ کالج کی ایک الھڑ شوخ اور بے پروا طالبہ تھی تو میکبیتھ کے بارے میں پڑھا تھا کہ کس طرح اسکاٹ لینڈ کے بادشاہ کو قتل کرنے کے بعد اُس نے اپنے خون سے لت پت ہاتھوں کو بڑی حسرت سے دیکھ کر کہا تھا۔ "یہ خون کے داغ اب کسی طرح بھی مٹائے نہیں جا سکتے۔ ان دھبّوں کو دُنیا کے سارے سمندروں کا پانی بھی نہیں دھو سکے گا۔"

کیا اس کی قسمت میں بھی یہی لکھا تھا۔ کیا اس کا بھی یہی انجام ہونے والا تھا۔ کیا یہ کڑواہٹ، اس کے منہ کا یہ کسیلا پن، اس کے ماضی کی تلخیوں کو ایک بدنما داغ کی طرح ہمیشہ یونہی اُبھارتا رہے گا۔ کیا اس کا ضمیر ہمیشہ اُسے اسی طرح آواز دے کر کہے گا کہ تم خونی ہو۔ ہاں تم نے خون کیا ہے۔ پاسِ وفا کا، پیار کے اس مقدس رشتے کا جس کے فنا ہو جانے کے بعد زندگی میں سوائے تلخی اور کڑواہٹ کے کچھ اور نہیں رہ جاتا۔

اُس نے صابن سے بھرے ہاتھوں پر اپنی پیشانی ٹیک لی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کتنی بڑی نادانی کی تھی اُس نے۔ کیا پاگل پن تھا وہ۔ اُف میرے خدا۔ یہ کڑواہٹ۔ اور اُس نے بڑی زور سے غسل خانے کے چکنے فرش پر تھوک دیا۔

اُس کی زندگی کی کتاب کو بآسانی دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا تھا! ور ان دونوں کے بیچ میں ایک موٹی سی لکیر کھینچی جا سکتی تھی جس کے ایک طرف تو خوشیوں کی گود میں بتائے ہوئے جوانی اور الھڑپن کے وہ خوش گوار دن تھے جب وہ ایک بدمست ہرنی کی طرح طرح صحرا صحرا

فرزانہ احمد

علش گلشن گھوما کرتی تھی۔ ایک اعلیٰ خاندان اور اونچے گھرانے کی ہونہار اور قابل لڑکی جس کے حسن کی شمع جس محفل میں جل جاتی تو لوگ دیوانہ وار پروانوں کی مانند اُس پر نثار ہونے کی آرزو میں اپنے تن من دھن کی بازی لگا دیتے۔ اُس بے فکری کے زمانے میں اُسے ایسا لگتا جیسے اُس کی زندگی ایک میٹھا، مدھر اور سُریلا سا گیت ہو۔ کبھی نہ ختم ہونے والا —

تصویر کے دُوسری طرف اُس کی زندگی کا وہ باب شروع ہوتا تھا جہاں آکر مسرتوں اور شادمانیوں کے رنگین اجالوں کو قسمت کی تیرگی نے اپنے سائے میں آہستہ آہستہ جذب کر لیا تھا۔ یہاں تک کہ اُس کی خوشیوں اور مسرتوں سے بھرپور ہنستی مسکراتی دُنیا کو گہن لگ گیا تھا۔ اور اب مایوسی کے اس گہرے اندھیرے میں اُمید کی ایک ہلکی سی کرن بھی کہیں دکھائی نہیں پڑتی تھی۔ جس کی ضیا سے اُس کی بے نور بھی ہوئی زندگی میں خوشی کی کوئی لو ٹمٹمائے —

کہاں گئے وہ اُمنگوں بھرے خوشیوں سے سرشار شب و روز — کہاں گئے وہ اُس کی زندگی کے اُجالے — عندلیب نے سوچا — ایسا لگتا تھا کہ جیسے جو کچھ اُس نے دیکھا جو کچھ سُنا تھا وہ سب ایک خواب تھا۔ ایک رنگین سپنا۔ جو پلک جھپکنے میں یوں ٹوٹ کر بکھر گیا کہ وہ اپنی آرزوؤں اور ارمانوں کے ریزے چنتی رہ گئی۔

وہ مستی بھرے دن — جب اُس کی زندگی کسی سبک رفتار اور پُرسکون پانی کی سطح پر بہنے والی ناؤ کی طرح خراماں خراماں چلی جا رہی تھی کہ اچانک نجم کی آمد نے اُس کی زندگی کی کشتی کو ایک تیز و تند گرداب میں ڈال دیا اور اُس نے اپنی زندگی کے پتوار جذبات کے اس بہتے طوفان کے حوالے کر دیئے اور حالات کے بھنور میں پھنستی چلی گئی — ڈوبتی چلی گئی —

نجم ایک سادگی پسند آدمی تھا — اُس کی صورت شکل، رہن سہن، یہاں تک کہ اُس کے عادات اطوار نہایت ہی سادہ اور عامیانہ درجے کے تھے۔ وہ معمولی کپڑے پہنتا۔ معمولی کھانا کھاتا اور معمولی ریستوران میں معمولی سی کافی یا چائے پیتا — لیکن نجم کے اس عام سے چہرے کے پیچھے ایک غیر معمولی دماغ تھا۔ ایک غیر معمولی شخصیت تھی جو ایک مقناطیس کی طرح ہر آدمی کو اپنی جانب کھینچ لیتی۔ عندلیب بھی نجم کی اس مقناطیسی کشش کے دائرے میں آکر نکل نہ سکی اور پھر اُس کی طرف ایسی کھنچی جیسے لوہے کا ایک معمولی ٹکڑا غیر ارادی طور پر مقناطیس کی طرف کھنچتا چلا جائے —

نجم سے مل کر عندلیب اپنی سُدھ بُدھ کھو بیٹھی۔ وہ سب کچھ بھول گئی کہ وہ ایک اعلیٰ خاندان کی، امیر ماں باپ کی نازوں میں پلی لڑکی ہے۔ وہ یہ بھی بھول گئی کہ اُسے اپنی تعلیم پوری کرنا ہے اور بی اے میں فرسٹ ڈویژن حاصل کر کے اپنے ماں باپ کی برسوں کی آرزو پوری کرنا ہے۔ جب اُن کا سر فخر سے اُونچا ہو جاتا، اور وہ بڑے غرور سے اپنے دوست احباب و عزیز و اقارب سے کہہ سکتے: "کیا ہوا اگر ہمارے کوئی لڑکا نہیں ہے۔ ہماری عندلیب دس لڑکوں پر بھاری ہے۔ اس کی قابلیت اس کے حسن کا مقابلہ کوئی کر سکتا ہے؟" اور پھر وہ بڑے چاؤ سے بڑے ارمانوں سے اور بڑی دھوم دھام سے اپنی اکلوتی لڑکی کا بیاہ شہر کے کسی معزز اور رئیس گھرانے کے کسی تہذیب یافتہ ہونہار اور آن بان والے لڑکے سے کر دیتے جو عندلیب کی زندگی پر بہار بن کر چھا جاتا۔

لیکن عندلیب کو پہلے ہوش ہی کہاں تھا۔ جو وہ یہ سب باتیں سوچتی اسے تو صرف اتنا یاد تھا۔ کہ وہ نجم سے بے انتہا محبت کرتی ہے۔ اپنی رُوح کی گہرائیوں سے اُسے پیار کرتی ہے۔ اُسے لگتا جیسے نجم اور وہ ایک دوسرے کے لئے بنائے گئے ہوں۔ جیسے وہ جنم جنم کے ساتھی ہوں۔ اور دنیا کی کوئی طاقت اُن دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتی۔

سرمستی کے اسی عالم میں عندلیب سارے بندھنوں کو توڑ کر سارے رشتوں کو بھلا کر اور اپنی زندگی کے خوابوں کے سارے نقوش یکسر مٹا کر ایک نیا جہاں بسانے کے لئے نجم کے ساتھ نکل پڑی۔ محبت کی اُن انجان راہوں پر جہاں سے گزر کر اُسے ایک ایسی منزل تک پہونچنا تھا جہاں اُس کی آرزوؤں اور تمناؤں کی انجمن باہیں پھیلائے اُس کی منتظر تھی۔

پہلے پہل تو نجم جیسے غیر معمولی دل و دماغ والے انسان کی بیوی بن کر زندگی گزارنا عندلیب کو بڑا ہی اچھا لگا، بڑا ہی انوکھا لگا۔ گو نجم ایک معمولی سے دفتر میں ملازم تھا۔ لیکن محبت کا دولت سے کیا واسطہ — عندلیب اور نجم ایک دُوسرے کی محبت میں ایسے کھوئے کہ انہیں دنیا و مافیہا کی کچھ خبر ہی نہ رہی۔ جب نجم جذبات کا ایک طوفان اپنی آنکھوں میں چھپائے بڑی میٹھی نظروں سے عندلیب کی طرف دیکھتا تو عندلیب کے

دل سے یہی دعا نکلتی کہ کاش یہ انمول لمحے، یہ زندگی کے رس میں ڈوبی ہوئی رنگین ساعتیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُس کی باہنوں میں مقید ہوجاتیں اور وہ اپنی ساری عمر ایک دل فریب اور حسین خواب کے سائے تلے گزار دے۔

لیکن جب یہ خوبصورت سپنا ٹوٹا تو عندلیب نے دیکھا کہ اُس کے لائے ہوئے روپے پیسے اور زیورات اُن کی خوشیوں کی نذر ہو چکے تھے اور وہ ایک مدقوق، بسورتی، بھینچتی، چلاتی لڑکی کی ماں بن چکی تھی۔

پھر نہ جانے کیسے عندلیب کی ہنستی مسکراتی پُربہار زندگی میں تلخ حقیقتوں کا زہر گھلتا گیا۔ گھلتا چلا گیا — اب عندلیب میں نہ وہ شوخی رہی تھی، نہ وہ چنچل پن، اور نہ ہی حالات سے سینہ سپر ہو کر مقابلہ کرنے کی اُمنگ — وہ بجھی بجھی سی افسردہ سی دن بھر گھر کے کام کاج میں لگی رہتی۔ وہ سوچتی کیا اسی دن کے لئے اُس نے نجم سے شادی کی تھی کیا اسی لئے اُس نے اپنوں سے رشتہ توڑا تھا اور ایک نئے اور انجان شہر میں آکر اپنی دُنیا بسائی تھی، کہ سارا دن وہ چولہے چکی میں لگی رہے۔ اس کے یہ کومل کومل خوب صورت ہاتھ آٹا گوندھنے، جھاڑو لگانے، برتن مانجھنے اور ایک دم روتی کلبلاتی بچی کے گندے کپڑے دھونے کے لئے تو نہیں بنے تھے اور جس کے لئے یہ سب کیا تھا وہ بھی اس سے دُور دُور سا رہنے لگا تھا۔ نجم کو اب اپنی کتابوں اور پڑھنے لکھنے سے فرصت ہی کہاں تھی جو وہ اُس سے پیار محبت کی باتیں کرتا۔ اُس کے نرم ملائم ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگا کر کہتا کہ "تم تو اِس گھر کی رانی ہو تمہیں اتنا کام نہیں کرنا چاہیئے۔" اُس کی زندگی تو بس گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر تک محدود تھی۔ رات آٹھ بجے جب وہ آفس سے لوٹتا تو تھک کر اس قدر چور ہوتا کہ کھانا کھا کر سیدھے بستر پر جا لیٹتا اور پھر صبح ہی کی خبر لیتا۔ صبح نو بجے تک اخبار کو جونک کی طرح چاٹ ڈالتا اور پھر دفتر کو روانگی کا وقت سر پر آکھڑا ہوتا۔ بس یہی تھا اُن کی زندگی کا معمول۔ عندلیب کو اب اس گھر کی کوئی چیز بھی ایک آنکھ نہیں سہاتی تھی۔ اس گھر کے در و دیوار جیسے اُسے کاٹ کھانے کو دوڑ رہے تھے۔ اس چار دیواری میں اس کا دم گھٹنے لگتا اور وہ ایک بے بس پنچھی کی طرح پر پھڑ پھڑا کر اس قید خانے سے باہر نکلنے کے خواب دیکھا کرتی۔

عندلیب نے سوچا ایک زمانہ وہ تھا جب اُسے نجم کے ساتھ ایک معمولی سے ریستوران میں ٹوٹی پھوٹی سی پیالی میں چائے پی کر ایک گونہ خوشی ہوتی جیسے وہ اس ٹوٹی پیالی سے نہیں بلکہ اپنی امی کے ولایت سے منگوائے ہوئے خوب صورت سیٹ کی پیالی میں چائے پی رہی ہو۔ اور پھر جب وہ دونوں محبت کے نشے میں سرشار ہاتھوں میں ہاتھ دیئے باہر نکلتے اور نجم اُسے بڑے پیار سے اُس بوڑھے پان والے کی گندی دکان سے ٹھنڈا میٹھا رس میں ڈوبا ہوا بنارسی پان کھلاتا تو عندلیب کی خوشی کی انتہا نہ رہتی — لیکن آج جب وہ اپنے گھر میں اپنی ٹوٹی ہوئی چائے دانی اور بے رنگ چائے کی پیالیوں کو دیکھتی تو اُسے اُبکائی سی آنے لگتی اور اُس کا جی چاہتا کہ یہ سب برتن ایک ایک کر کے فرش پر دے مارے اور پھر اُن کی ٹوٹی ہوئی کرچیوں کے بیچ میں بیٹھ کر خوب قہقہے لگائے۔ اتنا ہنسے اتنا ہنسے کہ اُس کے آنسو نکل آئیں — اور پھر وہ اتنا روئے کہ اُس کا سارا گھر اُن آنسوؤں کے سیلاب میں بہہ جائے۔

پھر ایک دن ایک حادثہ ہوگیا — اُس روز اُس کی عزیز ترین دوست نائلہ کی شادی ہو رہی تھی۔ نائلہ اس کے پڑوس میں ہی رہتی تھی۔ عندلیب صبح ہی سے اپنی سہیلی کی شادی میں جانے کی تیاری میں لگی ہوئی تھی۔ شام ہوتے ہوتے اس نے گھر کا سارا کام کاج پورا کر لیا۔ بچی کو کھانا کھلا کر اور سُلا کر اُس نے اپنا گلابی جوڑا نکالا جسے کبھی وہ پہنتی تھی تو نجم مبہوت سا ہو کر اُسے تکتا رہ جاتا تھا — لیکن اب — اب تو نجم کو خبر بھی نہ ہوتی تھی۔ کہ وہ کیا پہنتی ہے کیا کھاتی ہے اور کیسے جیتی ہے۔ اور کل ہی نجم نے کہہ دیا تھا کہ وہ گھر ہی پر رہے گا اُسے شادی بیاہ کے ہنگاموں سے گھبراہٹ ہوتی تھی — چنانچہ عندلیب اکیلی ہی چلی گئی۔

نائلہ اپنے کمرے میں سُرخ جوڑے میں گٹھری سی بنی بیٹھی تھی — برات آنے میں ابھی دیر تھی۔ گھر کے سب لوگ کام کاج میں مصروف تھے۔ عندلیب نائلہ کے پاس جا کر بیٹھ گئی اور اُسے چھیڑنے لگی کہ اچانک ایک اجنبی اُن کے کمرے میں داخل ہوگیا — لانبا سا چھریرا بدن — گورا رنگ — نیلی نیلی آنکھیں اور چہرے پر ایک دلآویز مسکراہٹ — جانے کیوں عندلیب کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ دونوں کی آنکھیں ایک لمحے کے لئے چار ہوئیں اور پھر عندلیب نے گھبرا کر نگاہیں جھکا لیں۔ کوئی اس کے کانوں میں کہہ رہا تھا۔ "چشم بددور — اگر [illegible] سُرخ جوڑے میں آپ ہوتیں تو واللہ غضب ہوجاتا۔"

اچانک ناظمہ نے اپنا گھونگھٹ ہلکے سے کھسکا دیا۔ "انور تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آؤ گے۔" ناظمہ نے اُسے ڈانٹا۔ اور پھر بڑے پیار سے عندلیب کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہنے لگی "بُرا مت ماننا۔ یہ میرے چچا زاد بھائی ہیں انور ــــ ابھی ابھی جرمنی سے لوٹے ہیں اور سمجھتے ہیں یہاں کی لڑکیاں بھی اُدھر کی طرح بے باک ہوتی ہیں ــــ جان نہ پہچان بس چھیڑے جائیں گے۔" لیکن انور پر اس لیکچر کا ذرہ برابر بھی اثر نہیں ہوا۔ اُس نے اُس بے باکی سے اپنی نیلی نیلی آنکھوں کو عندلیب کے چہرے پر جماتے ہوئے کہا۔ "ایسے میں کوئی غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں۔" اور اس سے پہلے کہ ناظمہ اُسے مارنے دوڑتی وہ وہاں سے رفوچکر ہو چکا تھا ــــ

شادی کے اُس ہنگامے میں سارا وقت عندلیب کو ایسے لگا کہ جیسے دو نیلی نیلی آنکھیں اس کا تعاقب کر رہی ہوں۔ بار بار اُس کے کانوں میں وہی الفاظ گونجے۔ "اگر اس سُرخ جوڑے میں آپ ہوتیں تو غضب ہو جاتا ــــ اگر آپ ہوتیں تو ــــ " اور گھبرا کر عندلیب نے اپنے کان بند کر لئے۔ توبہ توبہ اُسے کیا ہو گیا تھا۔

گھر آ کر بڑی دیر تک عندلیب اپنا سراپا آئینے میں دیکھتی رہی۔ کیا ہوا اگر وہ اب ایک الھڑ دوشیزہ نہیں رہی تھی۔ کیا ہوا اگر اس کے گھنے کالے بالوں میں کہیں کہیں اکا دکا چاندی کا تار چمکنے لگا تھا اور اس کے گالوں کے گلاب اب زرد پڑنے لگے تھے۔ وہ اب بھی بے حد حسین تھی۔ اُس کی گہری جھیل جیسی سیاہ آنکھیں اُس کی ریشمی پلکیں اور اُس کے کنول کی پنکھڑی ایسے گلابی ہونٹ سب اس بات کا ثبوت تھے کہ اب بھی جس طرف اُس کی نظر اُٹھ جائے لوگ دل تھام کر رہ جائیں گے۔

ناظمہ کی شادی اور رخصتی کے بعد بھی انور ناظمہ کے گھر ٹھہرا ہوا تھا۔ ناظمہ نے اُسے بتایا تھا کہ وہ اور چند ہفتے وہاں رہے گا۔ اس نے مختلف جگہوں پر نوکری کے لئے درخواست دے رکھی تھی اور جیسے ہی کہیں بات بن جائے گی۔ وہ چلا جائے گا۔

عندلیب کو ہر دم چھیڑنا اب انور کا دستور بن گیا تھا۔ وہ کسی نہ کسی بہانے اُس کے گھر آ جاتا یا کسی کو بھیج کر عندلیب کو بلوا لیا کرتا اور عندلیب کے لاکھ منع کرنے پر بھی اپنی حرکتوں سے باز نہ آتا۔

ایک دن عندلیب ناظمہ کی امی سے مل کر واپس لوٹ رہی تھی کہ انور نے اُس کا راستہ روک لیا۔ عندلیب نے کترا کر نکل بھاگنا چاہا۔ تو انور بڑی گمبھیر آواز میں بولا ــــ عندلیب آخر تم کب تک یوں مجھ سے کتراتی رہو گی۔ میں اتنا بُرا تو نہیں ہوں۔" عندلیب نے محسوس کیا کہ انور کی آواز میں بے پناہ حسرتوں کا ہجوم پنہاں ہے ــــ اُس نے گھبرا کر انور کی طرف دیکھا۔ انور کی آنکھوں میں اُس کے دل کا سارا درد و کرب سمٹ آیا تھا۔ عندلیب کو لگا جیسے یہ ایک پل ایک صدی میں تبدیل ہو گیا ہو۔ وہ دونوں پتھر کی مورتیوں کی طرح کھڑے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ پھر انور کہیں دور سے بولا۔ "عندلیب مجھے تم سے بہت کچھ کہنا ہے کیا میں اُمید کر سکتا ہوں کہ تم مجھے اس کا موقع دو گی۔؟"

"لیکن انور ــــ " عندلیب ہچکچاتے ہوئے بولی۔ "یہ سب غلط ہے تم بھول رہے ہو کہ میں ایک شادی شدہ عورت ہوں۔ ایک بچی کی ماں ہوں اور . . . . . "

"میں سب جانتا ہوں۔" انور نے اس کی بات کاٹ کر کہا اور میں وہ سب بھی جانتا ہوں۔ جو تم مجھے بتانا نہیں چاہتی ہو۔ میں تمہارا دکھ بانٹنا چاہتا ہوں۔ عندلیب۔ بتاؤ کیا میں تمہیں اچھا نہیں لگتا ــــ ؟" اور انور نے بے خودی کے عالم میں اُس کا ہاتھ تھام لیا ــــ عندلیب کے جسم میں جیسے بجلی کوند گئی۔ وہ لرز کر رہ گئی۔ اُس کے پیر لڑکھڑانے لگے اور وہ وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔

رات اُس نے بڑی بے چینی کے عالم میں گزاری جب بھی آنکھیں بند کرتی انور کا سنجیدہ چہرہ اُس کے ذہن کے پردے پر اُبھرنے لگتا۔ اور اُس کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز اُس کے کانوں میں گونجنے لگتی۔

دوسرے دن ناظمہ کا ننھا منا بھائی اُس کے لئے ایک رقعہ لے آیا۔ کانپتے ہاتھوں سے جب عندلیب نے اُسے کھولا تو اندر انور کی تحریر تھی۔ لکھا تھا۔ "تم سے آخری بار التجا کر رہا ہوں کہ آج آ کر میرے دل کا حال سُن جاؤ۔ پھر میں تم سے کبھی کچھ نہ مانگوں گا۔ اور تمہاری دُنیا سے دُور چلا جاؤں گا۔ خدا کے لئے میری خواہش کو ٹھکرا نہ دینا۔ آج رات میں اپنے کمرے کے پیچھے والے برآمدے میں تمہارا انتظار کروں گا ــــ "

ــــ انور ــــ

عندلیب تذبذب میں پڑ گئی۔ وہ کیا کرے۔ دل و دماغ کی کشمکش جاری تھی ایک اُسے جانے پر اکسا تا تھا اور دوسرا اس کے قدموں میں بیڑیاں ڈالتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اُسے یہ کام نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن کوئی انجانی طاقت اُسے بار بار انور سے ملاقات کرنے پر اکسا رہی تھی۔

جب نجم آفس سے لوٹا تو حسب معمول کھانے سے فارغ ہو کر سونے کی تیاری کرنے لگا۔ عندلیب نے کہا۔ "بہت دن سے ناظم کا کوئی خط نہیں آیا ہے ذرا امی سے پوچھ آؤں کیا بات ہے۔" نجم نے نیند سے ڈوبی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھا اور سر ہلا دیا۔ اور عندلیب دھڑکتے دل اور لرزتے قدموں کے ساتھ انور کے کمرے کی طرف چلی

برآمدے تک پہنچتے پہنچتے اس کے ہاتھ پیر بُری طرح سرد ہو گئے۔ سر چکرانے لگا اور اگر انور نے آگے بڑھ کر اُسے مضبوط بازوؤں کا سہارا نہ دیا ہوتا تو وہ برآمدے میں دکھی چوکی سے ٹکرا کر گر پڑی ہوتی۔ انور نے آہستہ سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اُسے اپنے کمرے میں لے آیا۔

"تمہیں کیا کہنا ہے مجھ سے انور۔" اس نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا

"تم اچھی طرح جانتی ہو جو میں تم سے کہنا چاہتا ہوں۔" انور نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں عندلیب — بے پناہ محبت — تمہارے بغیر میری زندگی ویران رہے گی۔ کسی لق و دق صحرا کی طرح —"

"باتیں بنانی تو خوب آتی ہیں تمہیں —" عندلیب نے زیر لب مسکراتے ہوئے پیار بھری نظروں سے انور کی طرف دیکھا۔ ایک دم سے اس کا خوف نہ جانے کہاں رفوچکر ہو گیا تھا۔ وہ انور کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو۔ کاش تم مجھے پانچ سال پہلے ملے ہوتے۔"

"خدا کے لئے عندلیب مجھ پر رحم کرو ورنہ میں تباہ ہو جاؤں گا۔"

انور اس کے بالکل قریب آ گیا تھا اتنا قریب کہ اس کی گرم گرم سانسوں کی تپش سے اس کا چہرہ جلس رہا تھا اور پھر انور نے اُسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا اور اپنے جلتے ہوئے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔ اس کے ہاتھ آہستہ آہستہ عندلیب کے جسم پر پھیلنے لگے۔ اور عندلیب کو ایسا لگا جیسے ہزاروں ننھی ننھی چیونٹیاں اس کے بدن پر رینگ رہی ہوں۔ اور پھر سبھی دوریاں، سبھی فاصلے ہوا میں تحلیل ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔

اچانک برابر والے کمرے کی گھڑی کی ٹن ٹن نے عندلیب کے دل و دماغ میں طوفان سا برپا کر دیا۔ اُسے ایک جھٹکا سا لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھتے دیکھتے جاگ پڑی ہو۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ دُور بہت دُور کسی بچے کے رونے کی آواز مستقل اس کے کانوں میں سیسہ پگھلا رہی تھی اور گھڑی کی ٹن ٹن مستقل اس کے کانوں میں سیسہ پگھلا رہی تھی جیسے کسی خطرے سے اُسے خبردار کر رہی ہو — عندلیب نے ایک جھٹکے سے اپنے آپ کو انور کی گرفت سے چھڑا لیا، کانپتے ہاتھوں سے اپنی ساری کی شکنیں ٹھیک کیں اور بجلی کی سی سرعت سے کمرے سے باہر نکل آئی۔ انور اُسے پکارتا ہی رہ گیا لیکن عندلیب نے گھر آ کر ہی دم لیا۔

گھر میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مکمل سکوت — جیسے پُر زور آندھی اور طوفانی بارش کے ختم جانے کے بعد سکون چھا گیا ہو — نجم کبھی کا سو چکا تھا اور اس کی ننھی منی بیٹی بھی نیند کی دیوی کے زانو پر سر رکھے خوابوں کی دنیا میں گم تھی۔ عندلیب نے آئینے میں اپنے اجڑے ہوئے چہرے کا جائزہ لیا۔ دہشت زدہ آنکھیں، بکھرے ہوئے بال، بے رنگ اور غم و رنج سے سُرخ چہرہ۔ اس نے اپنا منہ نوچ لیا۔ یہ اچانک وہ دنیا کی بدصورت ترین عورت میں کیسے تبدیل ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا طوفان پھٹ پڑنے کے لئے بے قرار تھا اور اس کے منہ میں ایک عجیب سی کڑواہٹ پھیل رہی تھی جیسے کسی نے بہت ہی کڑوی دوا اس کے حلق میں انڈیل دی ہو اور اس کے حلق سے ہوتی ہوئی یہ کڑواہٹ اس کے سارے جسم میں زہر کی مانند پھیل رہی ہو — پھر وہ زار و قطار رونے لگی۔ اس نے اپنا منہ دوسری طرف نفرت سے پھیر کر فرش پر تھوک دیا۔ اُف یہ کڑواہٹ — آخ تھو — آخ تھو —

آج کل کے [illegible] ۱۹۸۰ء کے شمارے میں [illegible] ماڈرن آرٹ سے متعلق نہیں [illegible] شائع ہوا تھا اس مضمون میں شامل تصویریں [illegible] ماڈرن آرٹ [illegible] سے حاصل ہوئی تھیں اور [illegible] شکریہ کے ساتھ شائع کی گئی ہیں۔

حسرت شادانی

جنوں بخیر، ہر آفت سے کامراں نکلے
تلاشِ منزلِ جاناں میں ہم جہاں نکلے

ہم آ گئے رسن و دار تک محبت میں
تمہارے قول فقط زیبِ داستاں نکلے

ستم شعاروں نے ہر اک ستم کے بعد کہا
ہمارے دل کے ابھی حوصلے کہاں نکلے

نکلنا، اُن کا سجا کر وہ مانگ میں افشاں
کہ جیسے شب میں ستاروں کا کارواں نکلے

نہ جانے کون سی طاقت تھی جس نے روک دیا
جنوں کی راہ میں ہم جب بھی ناگہاں نکلے

میری تباہی کا افسانہ بن گئے ہمدم
وہ بال و پر جو پسِ شاخِ آشیاں نکلے

لگا کے خانۂ حسرت میں آگ، کہتے ہیں
اب آگ سے نہ کبھی دیکھنا دھواں نکلے

ضیا ساحری

رات رک جاتی ہے جب ذہنِ پریشاں کے قریب
درد کے پھول مہکتے ہیں رگِ جاں کے قریب

کتنے دل ٹوٹ کے بکھرے ہیں تمہیں کیا معلوم
آج حالات کے جلتے ہوئے زنداں کے قریب

آس کے دشت سے برہنہ قدم آئے ہوئے
خواب لیٹے ہیں امیدوں کے شبستاں کے قریب

دل کے جلنے کی مہک سے سب ہی گھبراتے ہیں
کون رکتا ہے، سلگتے ہوئے انساں کے قریب

دردِ دل، دردِ وفا، دردِ محبت کی قسم
رات بھر یاد تری تھی دلِ ویراں کے قریب

عمر نوخیز ہے ٹھہر و گے تو جل جاؤ گے
میری تپتی ہوئی سانسوں کے بیاباں کے قریب

تھی کشش ایسی نگاہوں میں خزاں کی اے ضیا،
لٹ گیا حسنِ بہار آ کے گلستاں کے قریب

منہاج احمد رہبر

روتا شبِ حیات کی ظلمت کا چھوڑ دیئے
تاریکیوں سے بڑھ کے اُجالے نچوڑ لیئے

دل آپ کا بھی توڑ نہ دے گردشِ حیات
اس بے رخی سے آپ مرا دل نہ توڑیئے

ہر موج بن کے اٹھتی ہے طوفاں یہیں سے آج
ساحل کے اعتماد پہ کشتی نہ چھوڑیئے

زم زم کا واقعہ بھی ہے انساں کا معجزہ
صحرا کی گرم ریت سے پانی نچوڑیئے

رکھیئے خودی کا پاس بھی کچھ بندگی کے ساتھ
ہر سنگِ آستاں پہ نہ سر اپنا پھوڑیئے

غم موجدِ خوشی ہے جہانِ حیات میں
درکار ہے خوشی تو نہ منہ غم سے موڑیئے

رضا اشک بستی پوری

فصلِ گل بھی آئی ہے اور پون بھی سنکی ہے
پھر بھی ان فضاؤں میں کیفیت جلن کی ہے

کیا پتہ کہ یہ کیسے پیار کا جنازہ ہے
لوگ یوں تو کہتے ہیں پالکی دلہن کی ہے

ہائے کیا صحرا ہے، اُف یہ کس کی تربت ہے
آہ یہ کلی تنہا! جانے کس چمن کی ہے

یہ جو نوعِ انساں کی باہمی لڑائی ہے
ہو نہ ہو یہ سب سازش شیخ و برہمن کی ہے

تو میری سہیلی ہے، تو تو جانتی ہوگی
تجھ سے کیا کہوں پگلی! کامنا کیا من کی ہے

عوامی ادب اپنی خاص اصطلاح میں وہ ادب ہے جس کے خالق بہ حیثیت مجموعی خود عوام ہی ہوتے ہیں۔ یعنی جس کا کوئی جانا پہچانا خالق نہ ہو بلکہ جو نسل در نسل، سینہ بہ سینہ تخلیق پاتا منتقل ہوتا چلا آیا ہو اور جو ابھی تک ضبط تحریر میں نہ آیا ہو۔ ہندوستان کے اور علاقوں اور دیگر زبانوں کی طرح دکن اور دکنی کا دامن بھی عوامی ادب کے ہیرے موتیوں سے بھرا پڑا ہے۔ لیکن ماہرین لسانیات اور محققین علم و ادب کی نگاہ جوہر شناس نے اس طرف ہنوز کوئی خاص اور باضابطہ توجہ نہیں کی ہے۔

بلا کسی خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسانی تہذیب و تمدن اور علم و ادب کے شعوری ارتقا سے پہلے انسانی احساسات و جذبات کا وسیلۂ اظہار نثر سے زیادہ نظم ہی کے پیرائے میں رہا ہے۔ ایسے اولین دور میں ظاہر ہے کہ ہم علم و فن کے اداروں اور مدارس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس لئے ایسے دور میں تخلیق پایا ہوا علم و ادب انفرادی سے زیادہ اجتماعی نوعیت کا حامل ہوگا۔ جو مختلف ادوار، مختلف علاقوں اور مختلف نسلوں میں تقسیم ہوتا رہا ہوگا۔ اس تقسیم کے ساتھ ساتھ اس میں کمی و بیشی کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ دکنی، عوامی ادب اور لوک گیتوں کی تاریخ بھی ایک ایسے ہی دور کی یادگار ہے جس کے آغاز اور ابتدائی مرحلوں کو پوری طرح پردۂ خفا سے باہر لانا مشکل ہے۔ لیکن یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ دکنی بالکلیہ ایک عوامی زبان رہی ہے اور اس کا عوامی ادب بالخصوص لوک گیت کسی اور زبان کے سرمایہ کی بہ نسبت کچھ کم مالا مال نہیں ہیں۔ آج بھی دکن کے طول و عرض میں ان کو بالکل صحیح و سالم رنگ و روپ میں نہ سہی مگر کچھ مسخ شدہ حالت یا کچھ ترمیم و اضافے کے ساتھ دیکھا سنا جا سکتا ہے۔ ان میں گھرانوں، فرقوں اور علاقوں کی تبدیلی اور مرور مدت کے ساتھ ساتھ بدلے ہوئے مزاج اور لب و لہجہ کا فرق بھی نمایاں ہوتا رہتا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کا یہ خیال درست ہے کہ گیت مزاجا نسوانیت کی غنائی اظہار کی ایک صورت ہے اور گیت عورت کے جسم کا اظہار نہیں بلکہ اس کی پکار ہے۔ لیکن اگر گیت کی تعریف یہی قرار دی جائے تو میرے خیال میں گیت کی صنف سخن کے ساتھ پورا پورا انصاف نہیں ہو سکتا کیونکہ اس میں نہ صرف مردانہ احساسات و جذبات کا گرم گرم تموج ہی ملتا ہے۔ بلکہ ساز دف کے تال و سُر پر رقص کرتی، عورتوں کی جماعتوں، ٹولیوں اور مردوں کی ٹکڑیوں اور ڈولوں کے شوخ و سنجیدہ تصورات و خیالات سماجی و مذہبی مسائل و معاملات، تصوف و تشکر، عبادت و ریاضت کی وارفتگی کے علاوہ انگڑائیاں لے کر بیدار ہونے والی شوخیوں و شرارتوں اور کھیل کود کی رنگ برنگی دلچسپیاں بھی نظر آتی ہیں۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ گیت بہ اعتبار موضوعات و مضامین اور بہ لحاظ اسالیب و آہنگ غزل کی طرح بلکہ غزل سے بھی بہت زیادہ وسیع متنوع و مختلف ہوتے ہیں۔ یہ لوک گیت وقتی اور عوامی ہونے کی وجہ سے بڑی حد تک زبان و بیان اظہار و ابلاغ کے قواعد و شرائط سے بے نیاز ہوتے ہیں۔

بے محل نہ ہوگا اگر میں دکنی لوک گیتوں کی بعض خصوصیات کی طرف اشارہ کرتا چلوں جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ گیت کا دامن بڑا وسیع اور کشادہ اور اس کا آنچل بڑا رنگا رنگ ہوتا ہے۔ یوں تو دکنی لوک گیتوں میں دکنی زبان کی عامیانہ اور دیہی خصوصیات بھی ملتی ہیں مگر ان میں فنکارانہ ذہانت، عالمانہ مہارت کی کمی کے باعث کہیں قواعد زبان کی غلطیاں پائی جاتی ہیں تو کہیں بے وزن و بے بحر مصرعوں کی تک بندی بھی ملتی ہے جو برس ہا برس کے تصرف اور عمومیت کے عمل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ان گیتوں کو خواہ وقتی جذبات و احساسات کی طرح میں بہنے والے چشموں سے تعبیر کریں جو اپنی روانی کے آپ مالک ہوتے ہیں یا طبیعت کی آزادروی اور مزاج کی بے ساختگی کے پرچموں سے تشبیہ دیں جو اپنی آن بان سے لہراتے ہیں۔ مگر فکر و خیال کے ان مرقعوں میں عوامی زندگی کی چھاپ بڑی گہری ہوتی ہے۔ ویسے تو دکنی لوک گیتوں کی کئی قسمیں ہیں جن میں سے ہر ایک

قسم ایک علیحدہ مضمون کا مطالبہ کرتی ہے مگر ہم یہاں صرف چند ہی نمونے پیش کریں گے۔

ڈھولک کے گیت

دکنی لوک گیتوں میں جو گیت آج بھی بکثرت و بآسانی دستیاب ہوتے ہیں اُن میں ڈھولک کے گیت نہ صرف بڑے دلچسپ اور پُرلطف ہوتے ہیں بلکہ یہ ہماری عوامی زندگی کے رسم و رواج کا ایک لازمی جزو بن چکے ہیں۔ یہ بات تحقیق طلب ہے کہ ہماری تہذیب میں ڈھولک کب ایجاد ہوا اور پہلا ڈھولک کا گیت کب اور کہاں گایا گیا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ حضرت امیر خسرو کے بعد جب کہ ہمارے معاشرے میں موسیقی اور شاعری کے تال میل کا احیا عمل آیا تھا کسی وقت کہیں رواج پا گیا ہو جس کی روایت آج بھی شمال اور دکن میں بلا لحاظ مذہب و ملت تقریباً ہر گھر نے میں چلی آ رہی ہے۔ دکھ درد کی حالتوں میں اظہارِ غم کرنا اور نشاط و انبساط کے موقعوں پر اظہارِ مسرت کرنا فطرت انسانی کا خاصہ ہے۔ خوشیوں کی ہر تقریب مثلاً شادی بیاہ، بسم اللہ خوانی، عقیقہ، گل پوشی، عید و تہوار وغیرہ میں اعلیٰ طبقات اور ادنیٰ طبقات میں یکساں طور پر ڈھولک کے گیتوں کا رواج ہے۔ طبقہ امراء و نوابین میں یہ خوشگوار فریضہ مراثنوں کے حصہ میں آتا تھا جو آج کے بدلے ہوئے حالات میں مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ خوشیوں کے موقعوں پر آج بھی گھر گھر ڈھولک بج اٹھتے ہیں۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ان گیتوں کا سلسلہ کم عمر بچیوں سے شروع ہو کر شادی شدہ و غیر شادی شدہ بوڑھی اور بیوہ خواتین کے بھی ذوق و شوق اور ان کی گہری دلچسپیوں کے باعث رات رات بھر چلتا رہتا ہے۔

خواہ وہ دولہا ہو کہ دلہن یا کوئی اور پھول پہننے والا اس کی گل پوشی کی رسم کی ادائیگی، تہذیبی روایت کے مطابق صندل لگا کر شروع کی جاتی ہے اور ساتھ ہی شریکِ محفل تقریباً تمام خواتین ڈھولک پر یہ گیت چھیڑتی ہیں۔

صندل لگاؤ او مرے ہریالے بنے او مرے شہزادے بنے
تیرے صندل کو لاگے ہیرے جڑا لگے رے
موتی لاگے رے بنے او مرے ہریالے بنے او مرے شہزادے بنے

پھر اس کے فوری بعد پھول پہناتے وقت گایا جانے والا جو مشہور گیت ہے اس کے بول یوں ہیں۔

دیلان میں پہنائے ہار۔ کیا خوشنما لگا کے
مالی نے لایا دونا مالن نے لائی ہار
اماں نے پہنائے ہار۔ کیا خوشنما لگا کے

کبھی کبھی یہ گیت بھی گایا جاتا ہے ؎

پھولوا پہنانے آئی آج رے۔
میں تو پھولوا پہنانے آئی
پھولوا پہنانے آئی منجا بٹھانے آئی آج رے
میں تو پھولوا پہنانے آئی

اور جب گل پوشی کی رسم انجام پا جاتی ہے تو پہلے پھول پہنانے والی خاتون پھر شریکِ محفل تمام خواتین کچھ سکے دولہے دولہن یا پھول پہننے والے پر سے وارتی ہیں اور بلائیں لیتی ہیں۔ اس موقعہ پر سب کو یہ گیت خود بخود یاد آجاتا ہے ؎

بنے پہ سے کیا کیا واروں گے ماں
دولے پہ سے کیا کیا واروں گے ماں
ہیرے بھی واری موتی بھی واری
بنے پہ سے منگا واروں گے ماں

شادی بیاہ کے ایسے سینکڑوں گیت مروج ہیں جن کا پیرایہ خوبصورت غنائیت پُر کیف ہوتی ہے اور پھر ڈھولک کی تھاپوں کا زیر و بم جوان دلوں کی آرزوؤں و امنگوں کی سُریلی رس بھری آوازیں ایک سحور کن ماحول پیدا کر دیتی ہیں جیسے دلہن کو مانجے بٹھاتے وقت کا یہ گیت ؎

میے اوپر چھتا دولن بی کا منجا
بنا بول کو بیجا سجاؤ ذرا اچھا
ہاتھاں پاواں لالو، ہتھیلیوں میں تارے
بنا پوچھا بی بی کو، کون سہیلیاں سنوارے
عارس کے بال بڑے، شوکی شال پہ گرے
ہلو کھو خوشبو بانے، موگرا ڈول کو پاسے

اسی قسم کے دو گیت اور ملاحظہ ہوں ؎

تجے نیند و لگے ہریالی بنو، شہزادی بنو
تجے منجا بٹھانے تری اماں کھڑی ہیں گے ہریالی بنو شہزادی بنو

تجھے حمام کرانے تری بہناں کھڑیں گے ہریالی بنو۔ شہزادی بنو
تجھے کپڑے پہنانے تری خالائیاں کھڑیں گے ہریالی بنو شہزادی بنو
تجھے سہرا بندھانے ترے باوا کھڑیں گے ہریالی بنو۔ شہزادی بنو
تجھے گود وا ٹھانے ترے ماموں کھڑیں گے ہریالی بنو۔ شہزادی بنو
تجھے نیند و لگی گے ہریالی بنو شہزادی بنو

دلہن کھڑی جی کمرے میں
ہلسی جی من من میں
پیا کے گھر جانا ہے
گلا ترا نکلس ساجے
چھڑا پیا کے وداع کردوں
پھولوں سے گلا بھر دوں
پیا کے گھر جانا ہے

کاناں تیرے جھمکے ساجے
آ ٹرن پیا کے وداع کردوں
پھولوں سے گلا بھر دوں
پیا کے گھر جانا ہے
ہاتھاں تیرے پہونچی ساجے
جوڑا پہنا کے وداع کردوں
پھولوں سے گلا بھر دوں
پیا کے گھر جانا ہے

ان کے علاوہ ڈھولک کے گیتوں میں طنز و مزاح کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔ خاص کر سمدھنوں کا ایک دوسرے پہ حملہ کرنا معرعوں معرعوں میں فقرے کسنا اور طعنے دینا۔ سالیوں اور بہنوئیوں کے مذاق دولہے کی باتیں اور بہت ساری دلچسپ باتیں، مختلف تشبیہات و استعاروں کے سہارے بیان کی جاتی ہیں جیسے ڈھولک کی شوخ و شنگ تھاپوں اور ہمجولیوں کے قہقہوں میں خوشی و مسرت کے غیر مغلوب جذبات میں دولہے والے دلہن کی ماں کا مذاق دیکھئے کس طرح اڑاتے ہیں ۔

جھمکے سے ٹوٹے انار سمدن سالو اوڑھے
سمدن کے آنکھاں دیکھو املی کے چیخے دیکھو
کیا خاصہ کاجل لگائے سمدن سالو اوڑھے
سمدن کے ہاتھاں دیکھو ادرک کے پنجے دیکھو
کیا خاصہ چھلے جمائے سمدن سالو اوڑھے
سمدن کے بالاں دیکھو ٹوٹی سو جھاڑو دیکھو
کیا خاصہ گجرا لگائے سمدن سالو اوڑھے

جواب میں دلہن کی ماں بھی طیش میں آکر ساری معروضیات کو بھول بھال کے کرکس لیتی ہے اور حلق صاف کرکے اپنی ٹولی کے ساتھ ڈھولک کے محفل کی رونق اور دلچسپی کو اور بڑھا دیتی ہے ۔

اگے ماں آگئے بنے کے لوگ
لوگ آتے بولے فرش کرائی
زمین پہ بیٹھنے کے لوگ
لوگ آتے بولے بریانی پکائی
دلیے کے کھانے کے لوگ
لوگ آتے بولے لیمن منگائی
سندھی کے پینے کے لوگ
اگے ماں آگئے بنے کے لوگ

چکی نامے

چکی ناموں کا شمار بھی دکنی لوک گیتوں کی قدیم اصناف سخن میں ہوتا ہے جنکی ایک واضح روایت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز اور ان کے بعد اُن کے معتقدین و متابعین کے ہاں بھی مختلف رسالوں اور تصانیف میں ملتی ہے۔ بیسویں صدی کے ایسے سائینسی ترقیات کے زمانے میں آج بھی ہندوستان کے پس ماندہ، کم ترقی یافتہ دیہی رقبہ جات میں رات گئے یا صبح سویرے سکوت اور سناٹے کے عالم میں آبادیوں کے مختلف گوشوں سے چکی پیسنے کی مخصوص و مسلسل آوازوں کے ساتھ جفاکش عورتوں کے بیٹھے بیٹھے بول بھی سُنائی دیتے ہیں۔ ان چکی ناموں میں اکثر و بیشتر عرفان و تصوف، محنت و ریاضت کی زندگی کی عکاسی پائی جاتی ہے۔ گو کہ ان میں تصوف کا رنگ غالب رہتا ہے مگر پھر بھی ان میں ہمیں گھریلو زندگی اور دیہی معاشرت کے روزمرہ کے تجربات بھی مل جاتے ہیں۔ مثلاً

اندھیری رات تاروں میں
بھائی رہتے میں چاند چاندنی میں
اجلی اجلی یہ کون پیر کی درگاہ
سن کے درود بھیجی خواجہ کا گلبرگہ
اندھیری رات تاروں میں
نیونا زنگیوں کی نیوڑ گے اں ڈالی

نکو توڑ وبھائی بہین ہے نیچے والی
اللہ کی درگاہ میں فرشتوں کی بھیڑ
اس میں مرے پیر صاحب دستگیر
اندھیری رات تاروں میں

دھپکالے کی دھوپ نہیں دیتی گے سایہ
بن چھتری کے آیا بھائی کا منہ کملایا
اندھیری رات تاروں میں

سورج منہ پھیرا گوروگھر کو آیا
میرا جی گھبرایا لال گھر کیوں نہیں آیا
اندھیری رات تاروں میں

بھائی مرا جیو، بھاوج میری ناندو
چندن کے ناؤں کو لال گنوائے باندو
اندھیری رات تاروں میں

گھنگرو کی کاٹھیوں کا بیل آیا باڑے میں
دوڑ کے بلا لیوں گی بھائی آیا بولا نے
اندھیری رات تاروں میں

زمین کو اساں کو نیئں لگی گے سیڑھی
پیر کی ہمت بڑی دامن پکڑ کر کھڑی
اندھیری رات تاروں میں

چکی نامے ڈھولک کے گیتوں کی بہ نسبت زیادہ طویل نظمیں ہوتی ہیں۔ اسس لئے چکی نامے ڈھولک کے گیتوں کی بہ نسبت زیادہ طویل نظمیں ہوتی ہیں اس لئے ایک ہی چکی نامے میں مختلف مضامین باندھے جاتے ہیں، جن کو موقع محل کے اعتبار سے گانے والیاں اپنی اپنی پسند سے برتتی رہتی ہیں، مثلاً ذیل کے چکی نامے کو دیکھئے۔ اپنے روایتی صوفیانہ انداز سے شروع ہو کر معاشرتی زندگی کی کن کن روایات کو سمیٹتے ہوئے اور کہاں ختم ہوتا ہے ؂

اللہ صاحب کی رات جاگی گے ماں
میرے من کی مراداں میں پائی
خواجہ خضر کے جہاز چھوڑائی گے ماں
تخت رواں پہ ناچ کرائی
حضرت بی بی کی سینک کھلائی گے ماں
تارا منڈل کے گوٹے لگائی

پھر شادی بیاہ ہی کے معاملات ؂

بیٹی منگنے گئی تو ذات پوچھتیں میری
بھاؤ چندن چوکی کھولوں گی سات پیڑی
اللہ صاحب کی رات

شب گشت نکلیا بنا ماں شب گشت میں شہنیاں
باز دے بھونیاں ماں اڑیں گے رو ما لاں

بھائی، بھاوج، دیور، دیورانی اور نند کے تذکرے

بھائی کے گھر کو گئے تو بھاوج اڑی تیڑی
رکھ دے ساڑی چولی بھائی سے مِل کو چلی
دیورانیاں جٹھانیاں مِل چلے پانی کو
رستے دلو جانے کو دیور کی رانی کو
نند کا گے ناطہ مجھے نیں گے سہاتا
سالو کی بھریوں میں سروالے کا کانٹا

اور دامادوں سے شکایت

دامادوں کا کھانا دودھ پہ کی ملائی
گاؤں سارا ڈھونڈلی ایکساں کالی گائی
داماد آتا کر کو مرغا مرغی کاٹی
اس کے منہ میں ماٹی ایک نہ چھوڑا بوٹی

جاگیردارانہ نظام زندگی کے ہمارے معاشرے کی بعض تہذیبی جھلکیاں

چوڑی والے داتا چوڑیاں پہناؤ مجھے
کچہری میں راجا انعام دیں گے تجھے
درباری راجے کو دربار میں بیٹھیں گے
الماس کے طرّے کو جوہری پرکھیں گے
کونا پینا گے ماں نئیں ہوتا مرے سے
لال کو تکہ کو بھیجی باندیوں لاؤ جاگیرے

اور پھر آخر میں اُن کا وہی ابتدائی مذہبی رنگ

اللہ کی بندگی   نئیں ہوتی مِرے سے
کیا کرتے کیا جانو   میں ڈرتیو تیرے سے
اللہ صاحب کی رات

اس طرح مختلف رنگوں اور مختلف مزاجوں کے اور بھی بیسیوں چکی نامے ہیں جو اب تک ہمارے اس ترقی یافتہ دور میں اسلاف عہد رفتہ کی یادگار بن کے رہ گئے ہیں۔ بجز بہت ہی چھوٹے قصبوں اور دیہاتوں کے اب ہماری شہری زندگی میں گھروں میں چکیوں کے پیسنے کا رواج ہی باقی نہیں رہا اس لئے چکی ناموں کی تخلیق پر اب ایک روک لگ گئی ہے۔

لوریاں

ڈھولک کے گیتوں اور چکی ناموں کے بعد دکنی لوک گیتوں کی ایک قابلِ ذکر صنفِ سخن، لوریوں پر مشتمل ہے۔ اُن کا بنیادی موضوع محدود ہونے کی وجہ سے اُن میں دیگر لوک گیتوں کا سا تنوع اور تعدد نہیں پایا جاتا اور اس وجہ سے اُن کی بازیافت بھی نسبتاً کم ہی رہی ہے اُن کے اظہار و بیان کا موضوع بچپن اور نیند ہی ہوتا ہے۔ یہ ممتا کے گہرے سمندر اور میٹھے سُروں کی دھیمی لہروں پہ ڈولنے والے سپنوں کے سفینوں کے لئے مخصوص ہیں۔ فی الحال دکن میں مروجہ لوریوں کے چند ٹکڑوں کو بطور نمونہ درج ذیل کیا جاتا ہے

او او ہائی ماں   او او ہائی گے
نیند کو آشیا تانا   نیند کے کرتا بہانے
یہ نیند گھولے تانے   باداہی نیندوں میں
جھو ہائی ماں

مرے گھر میں نانا   گھر دیتا نورانا
اللہ کی درگاہ میں   بھیوں گی شکرانا
تانی کا نواسہ   ناریل بن میں پیاسا
نانی بھیجے خاصہ   دودھ بھرا بتاشہ
میرے گھر کے پیچھے   میرا تن کا گلہ
وہ دن دکھاؤ اللہ   تانے کی لسم اللہ جھو ہائی ماں

ماں کے علاوہ کوئی اور رشتہ دار خاتون جیسے پھوپھی وغیرہ بچی کو پالنے میں جھولاتے ہوئے جب کبھی لوری گاتی ہے تو اس میں یوں اضافہ کرتی جاتی ہے

بھائی تیری بیٹی   شال اوڑھ کے سوتی
پھوپی بل بل جاتی   بھتیجی بہو ہوتی
بھائی تیری بیٹی   دے میرے بیٹے کو
کچھ نئیں مانگتی تھوڑا   جہیز میں ہاتھی گھوڑا
جھو ہائی ناں

ان لوریوں میں ہمارے بیشتر فن پاروں کی طرح سماج میں طبقاتی رکھ رکھاؤ، رہن سہن اور اونچ نیچ کی دلچسپ کشمکش بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ جیسے یہ لوری کیا ہمارے جاگیردارانہ ماحول کی آئینہ دار نہیں ہے ؟

او میرے رانی کے جائیے   سو جا للو ہائے
میرے لال کو بھوک ہو لاگے   کیا رے کروں پکوان
چھوٹی بڑی چڑیاں پکڑا منگوائی   نوکروں کا دوں کی بگھار
او میرے رانی کے جائیے . .
رانی کا جایا راجا کنوریا   باندی کا جایا غلام
گھوڑی کا جایا الل بچھڑا   کھیلے کا چوگان
اور میرے رانی کے جائیے . . .

ان لوریوں کے علاوہ جن میں ماں کی محبت آرزوؤں و ارمانوں کی چٹکی چاندنی اور اس کے خوابوں کی رنگین بہاریں نظر آتی ہیں لیکن ایسی لوریاں بھی ملتی ہیں جو لوری کے بنیادی موضوع سے ہٹ کر کہی گئی ہوں ایسی لوریوں میں بعض اوقات دلچسپ مکالماتی انداز بھی پایا جاتا ہے جیسے ۔

خاتون : پاؤں کے پیزب رکھولے رے بھوئی۔ ندیا اتا روپا رسائے
بھوئی گنگا اتا روپار

مجھوٹے : پاؤں کے پیزب نئیں ہونا بی بی چلنا ہمارے ساتھ۔ ابی بی بی چلنا ہمارے ساتھ۔ دن کو کھلاؤں گا بھون کچوڑی رات کو اڑھوں گا شال۔ ابی بی بی رات کو اڑھوں گا شال۔

خاتون: جل جائے تیرا شال دوشالہ اس میں بھیوں کے باس۔ اے بھوئی اس میں جنکوں کی باس۔
پاؤں کے پیزب رکھولے رے بھوئی . . . .

الاؤ کے گیت

بہمنی سلطنت کے قیام کے ساتھ ہی دکن میں ہند ایرانی مذہب و

وثقافت اور زبان و تہذیب کا رنگ گہرا ہونے لگا تھا۔ ان علاقوں کے حاکم ایران وترکستان سے آئی ہوئی نسلوں سے تعلق رکھتے تھے ان کے حلقۂ احباب اور حکومتی نظم و نسق میں ایرانی اور ترکی نسل کے افراد کو نمایاں مقام حاصل رہتا تھا۔ اور خاص کر فارسی علم و ادب کے سلسلے میں بھی ایرانی علماء کی بڑی آؤ بھگت کی جاتی تھی۔ چونکہ شاہی خاندان کا تعلق ہمیشہ اہلِ تشیع حضرات ہی سے رہا اس لیے محرم کی تقاریب کو ان علاقوں میں خاص اہمیت دی جاتی رہی۔ تقریباً سارے ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے بڑے خلوص و پیار اور عقیدت کے جذبات سے ایک دوسرے کے نظریات و عقائد کا احترام کرتے ہوئے محرم جیسے تہواروں کا بھی مشترکہ دلچسپیوں کے ساتھ اہتمام کرنا شروع کیا۔ اس طرح محرم میں آج بھی تقریباً سارے دیش میں ہندو مسلم دونوں دوش بدوش نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے کی تحقیق میں ہمیں الاؤ کے گیت (جس کو دکنی میں الاوے کے گیت کہتے ہیں۔) دکنی اور دکنی سے زیادہ کنڑی، مراٹھی، تلگو وغیرہ زبانوں میں ملتے ہیں۔ خاص طور پر کرناٹک کے علاقوں میں خصوصی اہتمام سے الاؤ کھیلنے اور اس کے گیت گانے میں بڑے جوش و خروش سے مظاہرہ کیا جاتا ہے جو ایک خالص کرناٹک اثر معلوم ہوتا ہے۔ عاشورہ خانوں میں اور ان کے آس پاس گلیوں اور تعزیوں کے جلوس و سواریوں کے وقت پُر ہجوم میلے لگتے ہیں اور ان میلوں میں رنگ برنگ کے شملوں، سفید کرتے اور دھوتی کو بلا لحاظ مذہب و ملت تقریباً سب ہی من چلے لوگ اور زندہ دل انسان زیب تن کرتے ہیں جو باہمی خلوص و پیار یگانگت و اتحاد کی نشانیاں ہوتی ہیں۔ ان دنوں جگہ جگہ عورتوں اور مردوں کی علیحدہ علیحدہ ٹکڑیاں، عاشورہ خانوں کے صحنوں میں الاؤں کے ارد گرد یا افتادہ میدانوں میں الاوہ کھیلتی اور الاوے کے گیت گاتی نظر آتی ہیں۔ جن کی زبان مخلوط اور مقامی آب و رنگ، لب و لہجہ الفاظ اور محاورے کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ دکنی لوک گیتوں کی یہ ایک نمایاں خصوصیت ہے۔

مثلاً کرناٹک میں ؎

سیاں اللہ بندالا۔ عشق الانا

یا پھر تلنگانہ میں ؎

اماں بی بی فاطمہ لالہ

مہاراشٹر میں نوجوانوں کی حلہ واری ٹولیاں اپنے مخصوص ملبوسات میں سج دھج آتی ہیں اور الاوہ کھیلنے اور اس کے گیت گانے کے فن میں اپنی مہارت اور خوبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہ صرف خود ہی خوشی و مسرت حاصل کرتی ہیں۔ بلکہ دوسروں کو بھی مسرور و محظوظ ہونے کا سامان کرتی ہیں۔

الاؤ کے گیت واقعاتِ کربلا کے علاوہ دیگر مقامی، مذہبی، سیاسی و سماجی حادثات و حکایات پر بھی مشتمل ہوتے ہیں۔ ان میں طنز و مزاح و ظرافت کی دلچسپ آمیزش بھی ہوتی ہے جو دیکھنے اور سننے ہی سے تعلق رکھتی ہے۔ چھٹے نظام حیدرآباد میر محبوب علی خاں کے دورِ حکومت میں ایک بار دریائے موسیٰ میں جو شہر حیدرآباد کے بیچ سے بہتا ہے ایک بھیانک طغیانی آئی تھی جس سے پایۂ تخت کو زبردست دھکا پہونچا تھا۔ اس واقعہ کو بھی الاؤ کے گیتوں میں بیان کیا جاتا ہے

الاؤ کے گیتوں کا تذکرہ "کلغی و طرے" کے بغیر تشنہ ہے۔ دراصل یہ مخصوص قسم کے الاؤ کے گیتوں کی ایک مقامی اصطلاح ہے۔ مختلف ٹکڑیاں ان کو سوال و جواب کے انداز میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے جذبے کے تحت پیش کرتی ہیں۔ بزرگانِ دین کے معجزات و کرامات کے تذکروں کے علاوہ بعض اوقات ان میں ذہانت و فراست کی آزمائش کی پہیلیاں اور چٹکلوں کے قسم کی چیزیں بھی بیان کی جاتی ہیں جن کا جواب دینا مقابل کی دوسری ٹکڑی پر لازم ہو جاتا ہے۔ اس طرح یہ سلسلہ بعض صورتوں میں کئی دنوں تک جاری رہتا ہے۔ یہاں اس قسم کی کوئی مثال رقم کرنا مشکل ہے۔

اس طرح دکنی لوک گیتوں کی اور بہت سی قسمیں ہیں جیسے بھجن براکھاتہ، جھولے اور کھیل کود کے گیت وغیرہ لیکن ملک کی معاشی و معاشرتی علمی و ادبی ترقیات کے ساتھ ساتھ ہماری تہذیب و تمدن کے دھاروں کی رفتار و روش میں بھی زبردست تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں عوامی اور دیہی زندگی کے ہر شعبہ حیات میں انقلابی تغیرات ظہور پذیر ہو رہے ہیں، اشاعتِ علم، صحافت کی ترقی، ریکارڈس، لاؤڈ اسپیکرز، ٹیپ ریکارڈ ریڈیو، ٹیلی ویژن کی ایجادات اور ہماری تہذیبی و معاشرتی زندگی کے مختلف رسوم و رواجوں اور تقریبات پر بھی فلمی گیتوں کی بے پایاں اثر اندازی سے ہندوستان کی مختلف زبانوں کے عوامی گیتوں وغیرہ کی طرح دکنی لوک گیت بھی شدید طور پر متاثر ہو رہے ہیں تعجب نہیں کہ مزید پچاس ساٹھ برسوں بعد ان کی سرچشمے بھی پوری طرح خشک ہو جائیں۔

دِلّی کا پرانا قلعہ

رام پرکاش راہی

زمانے ڈھل گئے حالات کی تحریر باقی ہے
پرانے حسن کی ٹوٹی ہوئی تصویر باقی ہے
نہ وہ شمشیر باقی ہے نہ وہ توقیر باقی ہے
مگر تاریخ میں لپٹی ہوئی تعمیر باقی ہے
فضائے ہست کے راہی مقامِ بود پر پہنچے
نقوشِ رہگزر میں پرتوِ رہگیر باقی ہے
جو شہرت عام تھی پہلے گئی صدیوں کے مدفن میں
مگر آثار میں سمٹی ہوئی تشہیر باقی ہے
بقا کے خواب سارے ڈھل گئے خوابِ مسلسل میں
یہ اُن خوابوں کی پتھرائی ہوئی تعبیر باقی ہے
عیارِ عام صرفِ کم نگاہی ہے تو رہنے دو
دلِ شاعر کی آنکھوں میں ابھی تنویر باقی ہے
طلائی نقرئی تحریر کے سانچے میں ڈھلنے کو
رگِ تخیل پر اک نشترِ تاثیر باقی ہے
یہ بنیادوں کی گہرائی یہ دیواروں کی بے باکی
جہاں تمہید قائم ہے وہاں تعمیر باقی ہے
یہ بے ترتیب پتھر جھاڑیاں کھنڈرے یہ ہریالی
کہیں تخریب قائم ہے کہیں تعمیر باقی ہے
سرشکِ یاد ناممکن سہی دنیا کی آنکھوں میں
زبانِ حال پر اک عالمِ تقریر باقی ہے
یہ خلوت زارِ رعناؤں سے وابستہ ہے راہی
مگر اب تو فقط اک خوابِ بے تعبیر باقی ہے

یوسف جمال

سوز افروز خلش زاروں میں ڈھونڈو مجھ کو
لالہ و گل میں نہیں خاروں میں ڈھونڈو مجھ کو

میں گلستاں کی فضاؤں میں ملوں گا نہ کبھی
کوہساروں پہ کبھی غاروں میں ڈھونڈو مجھ کو

سوز میں ڈوبے ہوئے نغموں کا خالق ہوں میں
ساز کے ٹوٹے ہوئے تاروں میں ڈھونڈو مجھ کو

اونچے محلوں میں ملے گا نہ کبھی میرا وجود
چھوٹے کاشانوں کی دیواروں میں ڈھونڈو مجھ کو

مجھ کو ساحل کی ہواؤں میں نہ پاؤ گے کبھی
آؤ دریاؤں کی منجدھاروں میں ڈھونڈو مجھ کو

حال کے لمحوں کی تصویر دُھندلی ہے بہت
دورِ ماضی کے فسوں کاروں میں ڈھونڈو مجھ کو

کون ہوں میں مرے اشعار بتا دیں گے جمال
سرِ قرطاس جگر پاروں میں ڈھونڈو مجھ کو

"سرو چراغاں" (شعری مجموعہ)

مصنف — مقصود عرفان

ناشر :- قصرِ ادب پبلیکیشنز ، پری گھاٹ بھوپال

قیمت : تین روپے صفحات ۱۴۳

مقصود عرفان کے شعری مجموعہ "سرو چراغاں" سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ترقی پسند نقطۂ نظر کے ایک خوش گو اور کہنہ مشق شاعر ہیں یہ شعری مجموعہ گیارہ نظموں ، چھتیس غزلوں اور کچھ قطعات پر مشتمل ہے اور اس میں دو تعارفی مضامین بھی شامل ہیں۔ مصنف کی شخصیت پر قمر جمال کا ایک مختصر مضمون اور شاعری پر اختر سعید کا مضمون۔ اختر سعید کے الفاظ میں "بحیثیت مجموعی ان کے ہاں اجتماعی مقصد کی لگن نظر آتی ہے جس کا رشتہ انسان دوستی سے ملتا ہے۔"

زبان کی روانی اور براہِ راست اظہار مقصود عرفان کی شعری تخلیقات کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ان کی نظموں میں پرجوش خیالات، خوبصورت الفاظ اور کامیاب ترکیبوں کی کمی نہیں لیکن ان میں مرکزی تجربہ اور موضوعات کے اعتبار سے بڑی حد تک یکسانیت اور سطحیت ہے۔ فارم یا ہیئت کے اعتبار سے بھی یہ نظمیں کم و بیش ڈھیلی ڈھالی اور سپاٹ ہیں۔ ان نظموں کے موضوعات، اندازِ بیان اور نقطۂ نظر میں ترقی پسند تحریک کے اکثر سربرآوردہ شاعروں کی جھلک نظر آتی ہے۔ "آج کی رات" میں مجاز کا اثر نمایاں ہے "دو نظریئے" فیض کی نظم "دو عشق" کی یاد تازہ کرتی ہے۔ "کونسا گیت سنوگی" اختر سعید کے الفاظ میں جاں نثار اختر کی نظم "کونسا گیت سنوگی انجم" کے اجمال کی تفصیل ہے اور "ہمارے منصوبے" اور "نشیب و فراز" اندازِ فکر، آہنگ اور ڈکشن کے اعتبار سے سردار جعفری کی نظموں سے قریب ہیں۔

اختر سعید مقصود عرفان اور ان کے پیش رو ترقی پسند شعراء کے نقطۂ نظر اور اسلوب کی مشترک خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "دراصل خیالات کی یکسانیت کا سبب حالات کی یکسانیت تھی اگر جلتی ہوئی ریت سب ہی مسافروں کے تلوے جھلسا رہی ہو تو آبلوں کا ذکر بھی عام ہوگا۔" لیکن یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ یہ خطرہ اس شاعری میں زیادہ پیدا ہوتا ہے جس کے محرک خارجی تاثرات ہوں اور جس کی بنیاد متعین خیالات اور مروجہ نظریات پر ہو، مقصود عرفان کی شاعری بھی بڑی حد تک اسی قسم کی شاعری ہے۔ اس میں تلاشِ ذات، تلاشِ معنی، نفسیاتی کش مکش اور تشکیک کے عناصر کی کمی کا احساس بڑی شدت سے ہوتا ہے اسی لئے دورِ حاضر کی نمائندہ شاعری میں اسے جگہ نہیں دی جا سکتی۔ تاہم یہ کہنا سراسر غلط ہوگا کہ مقصود عرفان کی شاعری تمام تر صدائے بازگشت ہے۔ اس شعری مجموعے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ ایک پرخلوص اور کامیاب شاعر ہیں اور ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ان صلاحیتوں کا اظہار ان کی غزلوں میں زیادہ بھرپور ہوا ہے۔ ان غزلوں میں داخلیت اور انفرادیت کی کمی نہیں، ان کا مستقل موضوع حسن و عشق کی کیفیات ہیں اور تفکر اور خارجی ماحول کے شعور کی آمیزش نے اس کو ایک خاص توازن اور شگفتگی عطا کی ہے۔ ان کی غزلوں کے بیشتر اشعار بڑے ترشے ہوئے ہیں۔ الفاظ کا ترنم، ترکیبوں کا حسن، لہجہ کی شائستگی، ایک پراثر سادگی اور سوز و گداز ان کے اچھے اشعار کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

آخر میں، اردو شاعری کے ان "پرستاروں" سے، جو تہذیبی سرگرمیوں سے رابطہ تو قائم رکھنا چاہتے ہیں لیکن شاعری میں کسی نئے تجربے کی تپش اور نئے احساس کی چوٹ برداشت نہیں کر سکتے۔ گزارش ہے کہ وہ چند مشہور ترقی پسند شاعروں کے کلام سے شعریت کے آخری قطرے نچوڑنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ مقصود عرفان جیسے شاعروں کی طرف بھی توجہ فرمائیں۔

(زاہدہ زیدی)

منور لکھنوی شخصیت اور شاعری

مولفہ : راج نراین رازؔ
ناشر : نصرت پبلشرز وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنو ۳
قیمت : ۷ روپے ۵۰ پیسے

حال میں جناب منورؔ لکھنوی کی یاد منائی گئی اور اس موقع پر موصوف کی حیات وشاعری اور علمی و لسانی خدمات کا تجزیہ اور احاطہ کرنے والے مقالات پر مشتمل اس کتاب کا اجرا کیا گیا۔ اس تالیف کے مولف راج نراین رازؔ نے تگ ودو اور کد وکاوش کے بعد ایک معیاری اور وقیع کتاب کو خاصے اچھے ڈھنگ سے زیور طباعت سے آراستہ کرکے پیش کیا یہ نہ صرف اُن کی ایک علمی و ادبی خدمت ہے بلکہ اُردو ادب میں منور لکھنوی کے حقیقی مقام و مرتبہ کے تعین کرنے میں مددگار بھی ثابت ہوگی۔ منور لکھنوی کی شخصیت، شاعری اور دیگر علمی و ادبی خدمات کے تعلق سے ہر اہم موضوع پر راج نراین رازؔ نے واقعی ان حضرات کے مقالات اکٹھا کئے ہیں جو اپنے اپنے میدان کا خاصہ تجربہ گہرا شعور و ادراک بھی رکھتے ہیں۔ اس طرح مختلف زمروں اور عنوانوں کے تحت ۱۹ مقالات کو یکجا کرکے منور لکھنوی کی حیات اور ان کے کارناموں کے مطالعہ کو مکمل بنایا گیا ہے۔ شخصیت کے عنوان کے تحت جو مقالات پیش کئے گئے ہیں ان میں منور لکھنوی کے داستانِ حیات بھی ایک ہے جس کو خود منور صاحب ہی نے نہایت پر اثر انداز میں سپرد قلم کیا ہے۔ گوپی ناتھ امن صاحب نے اپنے مضمون، منور۔ جیسا میں نے انہیں دیکھا میں جو باتیں کہی ہیں اور جس انداز سے کہی ہیں بڑی دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔ سید آفاق حسین آفاق کا مضمون بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ شاعری کے زمرے میں شمیم حنفی، سلیم اخترؔ اور راج نراین رازؔ کے مقالات جامع ہیں۔ نظم کے سلسلے میں لکھے گئے مقالات ومضامین میں شہاب جعفری، اور عطاء اللہ پالوی کے مقالے بالترتیب منور کی قومی نظمیں اور منور۔ کائنات دل کی روشنی میں قابل ذکر ہیں۔ تراجم کے باب میں نسیم عرفاں (شارب ردولوی) گیتا گووند (علی جواد زیدی) کار سیمبھو (جگن ناتھ آزاد) شکنتلا (محمود ہاشمی) سے اس کتاب کی علمی و ادبی اہمیت اور افادیت اور بڑھ گئی ہے۔

سادہ مگر خوبصورت گرد پوش، مضامین کا حسن ترتیب، مولف کے شائستہ مذاق و ذوق کی دلیل ہیں۔ کتابت وطباعت بھی مناسب اور گوارا ہے۔

(ابو النعیم سحر)

گرمیٔ اندیشہ : صغیر احمد صوفی

گرمیٔ اندیشہ جناب صغیر احمد صوفی کا دوسرا شعری مجموعہ ہے۔ صوفی صاحب نے اُردو شاعری کے دو ہے دیکھے ہیں۔ یہ صوفی صاحب کی سلامت روی ہے کہ انہوں نے نہ تو ترقی پسندی کی بلند آہنگی سے بے جا اثر لیا اور نہ موضوعات میں ویسی رومانویت برتی اور اب جب کہ نئی شاعری کی جدتوں اور بدعتوں کا دور دورہ ہے، انہوں نے اپنی شاعری کو چیستاں نہیں بنایا۔ اسے دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ صوفی صاحب نے اپنے فن کو اپنی ذات کے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے۔ فیشن سمجھ کر اختیار نہیں کیا۔ ان کے یہاں پایا جانے والا سلامت روی کا یہ جذبہ، اعتدال اور توازن ہی وہ بنیادی عناصر ہیں جنہوں نے صوفی صاحب کے شعری کردار کی صورت گری میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ صوفی صاحب کی غزلوں اور نظموں میں سانس لینے والا شخص اس اعتبار سے صحت مند اور لائق رشک ہے کہ وہ حالات و عوامل میں ایک منطقی ربط پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ نہ مایوس لمحوں میں منہ بسورتا ہے۔ اور نہ مسرور لمحوں میں جامے سے باہر ہوتا ہے۔ وہ نہ محض جذبہ ہے اور نہ محض ذہن، بلکہ ان دونوں کا ایسا امتزاج ہے جو نہ صرف صحت مند انسانوں کی پہچان ہے بلکہ جو شعر کی تخلیق کے لئے بھی ازبس ضروری ہے۔

گرمیٔ اندیشہ میں غزلیات کے ساتھ ساتھ نظمیات بھی شامل ہیں۔ اُن کی نظمیں پابند ہیں۔ ان کی غزلوں نظموں کی زبان اور اسلوب کے خدوخال بڑے مانوس ہیں۔ انہوں نے ہیئتی تجربے نہیں کئے۔ اسالیب وتراکیب میں آزادی یا یوں کہئے کہ بے راہ روی سے کام نہیں لیا۔ شاید اس لے کہ انہوں نے ان مانوس پیرایوں کو اپنے فکر وفن کے اظہار کے لئے ناکافی نہیں پایا اور اپنی جگہ یہ امر واقعی دامن توجہ کھینچتا ہے۔ اس کے باوجود بقول ڈاکٹر خلیل الرحمان "پورے مجموعے کے مطالعے کے بعد جس شخص کے خدوخال ذہن میں اُبھرتے ہیں، وہ آج ہی کا انسان ہے، تنہا، تلاش، مجبوری، محرومی کا احساس، اجنبیت، غم رفاقت، تشنگی اور مسلسل تشنگی کا شکار ..."

۲۲۸ کے ۸۰ صفحات کے اس مجموعے کے دام پانچ روپے ہیں۔
ملنے کا پتہ : پی پی پبلی کیشنز ۴۹۳ بازار چتلی قبر دہلی ۶

(راج نراین رازؔ)

ضروری اطلاع دسمبر کے شمارے میں صفحہ ۴۴ سے صفحہ ۴۸ تک کی کتابوں پر تبصرہ جناب پرکاش ملیانی کا ۲۶ سے صفحہ ۲۸ کا اشاعت نہ ہوسکا۔

بچوں کی پیدائش میں وقفہ کیلئے

فی زمانہ بچوں کی پیدائش اتفاق کی بات نہیں
یہ آپ کے اختیار میں ہے۔ نرودھ
استعمال کرنے سے آپ کے بچے تبھی
ہونگے جب آپ چاہیں گے، اتفاق
سے نہیں۔

بچہ اور ماں کی صحت کیلئے

ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ بچے کو شروع کے تین
برسوں میں زیادہ توجہ درکار ہوتی ہے
پھر بچے کی پیدائش کے بعد ماں کو اپنی
صحت بحال کرنے میں بھی وقت لگتا ہے۔
نرودھ استعمال کرکے آپ اگلے بچے کی
پیدائش ملتوی کر سکتے ہیں۔

نرودھ (کنڈوم)، اعلیٰ کوالٹی کے ربڑ سے
بنتا ہے۔ دنیا بھر میں لوگ اسے استعمال
کرتے ہیں کیونکہ یہ فیملی پلاننگ کا آسان
و محفوظ طریقہ ہے۔ اس کے استعمال سے
صحت کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔

نرودھ استعمال کیجئے

فیملی پلاننگ کیلئے
اعلیٰ کوالٹی کے
ربڑ کنڈوم
15 پیسے کے 3
سرکاری امداد سے کم دام

نرودھ ہر جگہ ملتا ہے۔
پروویژن اسٹور، کریانہ فروش،
کیمسٹ، جنرل مرچنٹ، پان فروش
وغیرہ کی دکانوں پر بکتا ہے۔

صرف
5 پیسے
خرچ کرکے
آپ
اپنے کنبے
کو
محدود رکھنے
کی طاقت
حاصل کرسکتے ہیں

۲۲ نومبر ۱۹۷۰ء کو وگیان بھون نئی دہلی میں صدر جمہوریہ ہند شری وی وی گری نے خلائی سائنس کی بین اقوامی کانفرنس کے ۶۲ ویں جنرل اجلاس کا افتتاح کیا اور فضا اور خلا میں غیر معمولی کارنامے انجام دینے والے افراد کو ۱۹۶۹ء کے انعامات دیئے۔

(تصویر میں بائیں سے دائیں) بی وی وولینو اور ای دی کمرونیو (سوویت یونین) نیل اے آرم سٹرانگ اور چارلس کون راڈ (جونیئر) (امریکہ) اور جے ایل ارسٹی (اسپین)

۲۱ نومبر ۱۹۷۰ء کو فلموں کے سالانہ انعامات کی تقسیم کی سترہویں قومی تقریب مدراس میں ہوئی جس میں متعدد فلمی فن کاروں کو ایوارڈ دیئے گئے۔ تقریب کی صدارت مرکزی وزیر اطلاعات ونشریات نے کی۔ (تصویر میں) تامل ناڈو کے وزیر اعلا شری کرونا ندھی ہندوستانی فلموں کی سابقہ مشہور وممتاز اداکارہ دیویکا رانی کو داداصاحب پھالکے ایوارڈ دے رہے ہیں۔
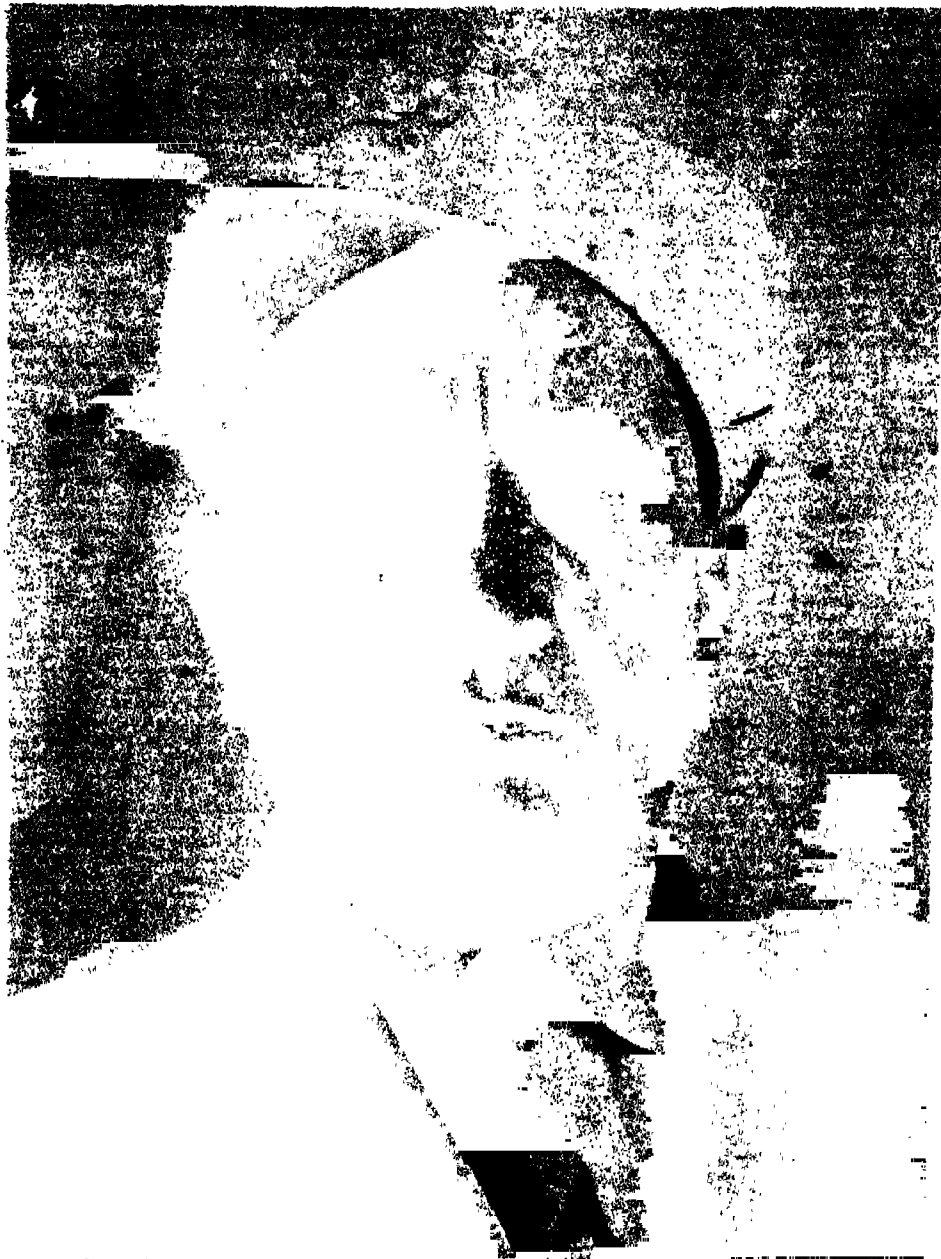
ہندوستان کے مشہور سائنسداں سی وی رامن

(۷ نومبر ۱۸۸۸ء — ۲۱ نومبر ۱۹۷۰ء)

Vol. 29 No. 6 AJKAL (Monthly) January 1971

Edited and Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi.
Printed by Skylark Printers, 11355 Idgah Road, New Delhi-55
Regd. No. D-509

مارچ ۱۹۷۱ء

۶۰ پیسے
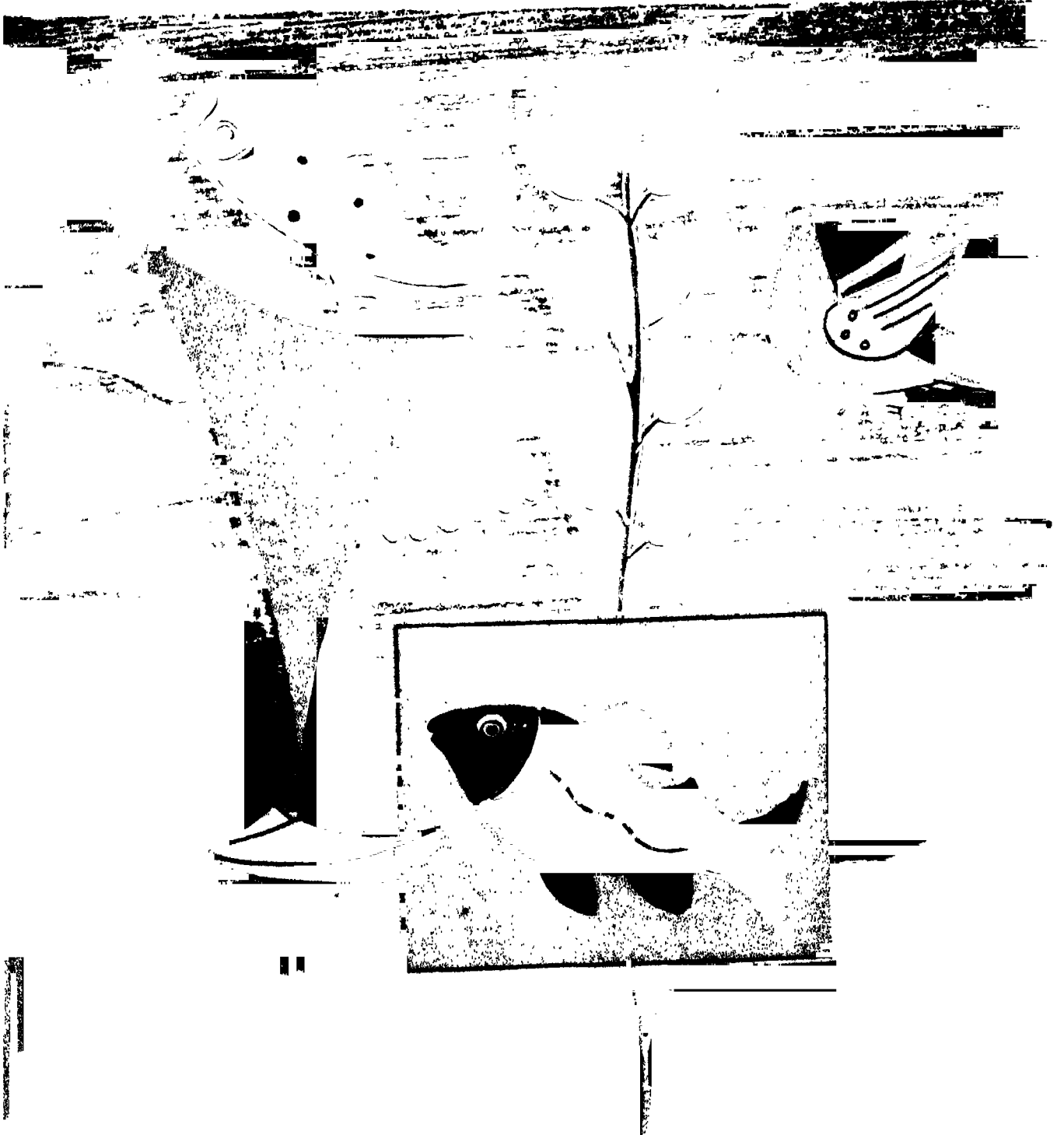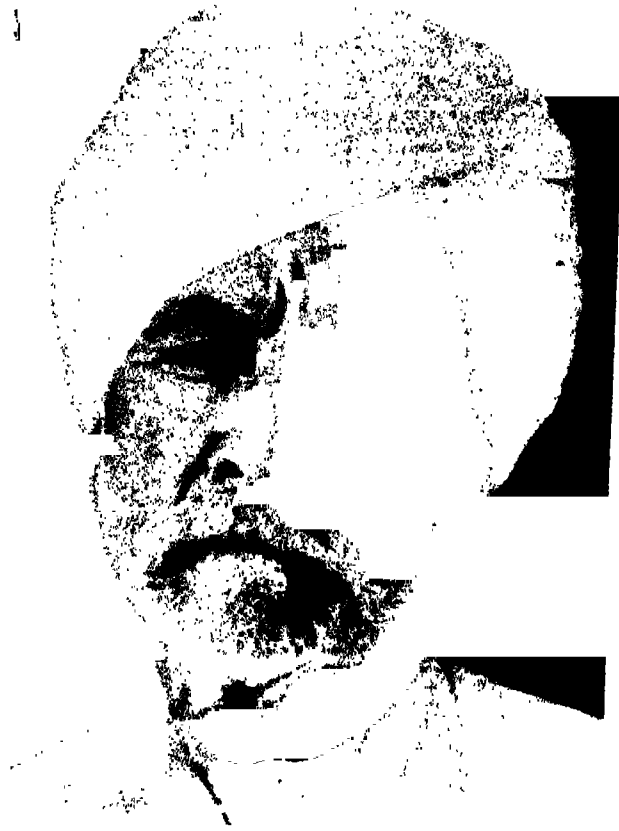
پدم
شری
کا
اعزاز
پانے
والے
اُردو
شعراء
جوش ملسیانی
جناب حیات اللہ انصاری
پ کے ناول لہو کے پھول کو ساہتیہ اکادمی نے اُردو کی بہترین تخلیق قرار دیا ہے
ساحر
لدھیانوی
غلام ربانی
تاباں

اردو کا مستقبل عام ماہنامہ

آجکل

نئی دہلی

ایڈیٹر
شہباز حسین

*

سب ایڈیٹر
نند کشور وکرم

جلد ۲۹ — شمارہ ۸

۱۹۷۱ء

ملاحظات

۳ جنوری ۱۹۷۱ء کو وزیر اعظم ہند شریمتی اندرا گاندھی نے وشاکھا پٹنم میں فولاد کے ایک کارخانے کا سنگِ بنیاد رکھا۔ یہ کارخانہ ۵ ارب روپے کی لاگت سے تعمیر ہوگا اور اس سے لگ بھگ ۱ لاکھ ۵۰ ہزار افراد کو روزگار ملے گا۔ ملک میں تعمیر و ترقی کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے پیشِ نظر لوہے اور اسپات کی مانگ میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔

آزادی کے وقت ملک میں فولاد کے صرف دو نجی کارخانے تھے جن کی سالانہ پیداوار پندرہ لاکھ ٹن تھی۔ اس کمی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جنوری ۱۹۵۴ء میں ہندوستان اسٹیل لمیٹڈ کی داغ بیل ڈالی گئی جس کے زیرِ انتظام رورکیلا، بھلائی اور درگاپور میں اسپات کے تین کارخانے کھولے گئے، پرائیوٹ سیکٹر کے دونوں کارخانوں کی پیداوار بڑھانے کے لئے مالی امداد دی گئی۔ اس طرح ۱۹۶۱ء تک ملک میں ۶۰ لاکھ ٹن فولاد پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا کی گئی۔ مزید ضرورتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تیسرے پلان کی مدت ۶۶-۱۹۶۱ء میں بھلائی کے کارخانے کی پیداواری صلاحیت ۲۵ لاکھ، اور رورکیلا کی ۱۸ لاکھ ٹن اور درگاپور کی ۱۶ لاکھ ٹن مقرر کی گئی۔ مگر فولاد کی مانگ میں اضافہ جاری ہے لہٰذا بوکارو میں اسپات کا ایک بہت بڑا کارخانہ زیرِ تعمیر ہے۔ چوتھے پلان کے اختتام تک اسپات کی مانگ ۱۵۰ لاکھ ٹن تک پہنچ جانے کی توقع ہے۔ اس خیال کے تحت جنوبی ہندوستان میں سیلم، ہوسپٹ اور وشاکھا پٹنم کے مقام پر تین متوسط درجے کے کارخانے کھولنے کی منظوری دی گئی ہے جس میں وشاکھا پٹنم کے کارخانے کی تعمیر شروع ہوگئی ہے۔ ایسی بنیادی صنعتیں ملک کی خوشحالی کی ضامن ہیں۔

حال میں ساہتیہ اکادمی نے ہندوستان کی جن مختلف علاقائی زبانوں کے لئے انعام دینے کا اعلان کیا ہے ان میں اُردو کے ممتاز صحافی، افسانہ نویس اور ناول نگار جناب حیات اللہ انصاری کا ناول "لہو کے پھول" بھی شامل ہے۔

"لہو کے پھول" اُردو کا ضخیم ترین ناول ہے جو پانچ جلدوں میں ہے اور ۲۹۶۲ صفحات پر محیط ہے۔ اس قابلِ قدر تصنیف کو ادبی حلقوں میں بے حد سراہا گیا تھا۔ ادارہ اس اعزاز پر موصوف کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔

اچھے شاعر کے لئے اچھا انسان ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہو یا نہ ہو مگر جناب شاہ عزیز بخش صدیقی پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ وہ اُردو کے ممتاز اور منفرد شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بڑی دلنواز شخصیت کے مالک تھے۔ اور سادگی اور شرافت، انکسار و استغنا، اور نیکی و اخلاص کا مجسمہ تھے۔ اس زمانے میں بہت کم انسان ایسے ہوتے ہیں۔

۲۲ اور ۲۳ جنوری کی درمیانی شب میں شاہجہاں پور (یوپی) کے ایک مشاعرے میں شریک تھے کہ دل کا دورہ پڑا جس سے جانبر نہ ہو سکے۔ ان کی موت واقعی ایک عظیم سانحہ ہے۔ ابھی تو کوشش پر آوازیں بھی واضح ... کہاں پہ تو نے کہانی کا اختتام کیا

پاکستان کے ممتاز اُردو ادیب اور شاعر جناب عابد علی عابد کا ۲۰ جنوری کو لاہور میں انتقال ہو گیا۔ آپ کی عمر ۷۵ سال تھی۔

آپ نے مختلف حیثیتوں میں اُردو کی اہم خدمت انجام دی ہے۔ آپ کی موت اُردو کے لئے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے

ادارہ اُردو کے ممتاز ... شاعر جناب ... کے انتقال پر ... اظہار کرتا ہے۔

خودکلامی

علی جوّاد زیدی

میں نہ کہوں تو کون کہے گا ؟
صحراؤں کے دکھ کی کہانی، ذرّوں کے مایوس فسانے
ارض و قمر کا دردِ جدائی، بستیوں کے جگ مگ ویرانے
پتی پتی سوکھی ہوئی سی، گوشہ گوشہ اُجڑا ہوا سا
بستی بستی گھائل سپنے ، لاکھ شکاری، لاکھ نشانے
میں نے سیتے دامن دامن، کانٹوں میں مدفون تبسّم
دل نے بکھیرے صحرا صحرا، پھولوں کے محبوس ترانے
دیدۂ تشنہ لباں نے بھی دیکھی، سوکھے دریاؤں کی روانی
چشمِ تمنا میں بھی ناچے، اُبھرے ہوئے غمگین زمانے
بے خود محفل کیا سمجھے گی، تشنہ لبوں نے کیا کیا دیکھا
چھلکے ہوئے تو پھر بھی غنیمت، لیکن یہ چھلکے پیمانے!

میں نہ کہوں تو کون کہے گا ؟
میں نے ننھا بچپن بھی دیکھا ہے، ولولۂ فکرِ سرکش کا
یہ میری گودی میں کھیلی ہے، میں نے اسے چلنا سکھلایا
یہ روٹھی تو منایا میں نے، مچلی تو بہلایا میں نے
روئی تو کھانا کھلایا میں نے، گرنے لگی تو میں نے سنبھالا
اس کی خاطر تتلایا ہوں، اور خود بچہ کہلایا ہوں
مہد سے محفل تک لایا ہوں، طفل تا بہ شباب دانا
بات کرے گی سب سے چھپا کر، راز کہے گی کانوں میں جاکر
بھولنے لگی باہر آکر، مصلحتوں کا جال کے پردا
میں یہ سب جھیل ہوں جانے، اس پاگل دنیا کی کہانی
[illegible] کے گا، اس آتی گھٹا کا کنارا!

میں نہ کہوں تو کون کہے گا ؟
چھوٹی سی تھی دل کی انگنائی، جس میں گھٹا دکھ دردِ جہاں کا
سانس چلی جب اندر دیکھا تیر لگا جب باہر جھانکا
تیر چلیں یا پتھر برسیں، دل جل جائیں، نظر ٹھٹک جائے
پھر بھی کافر آس نہ ٹوٹے، حوصلہ تو دیکھو انسان کا
رام اور کرشن کی لَے گونجے گی، سقراط و عیسیٰ اٹھیں گے
شنکر و موسیٰ ابھریں گے، میں شک کرنے والا کہاں کا
انسانی امید کے نغمے، نانک اور گوتم چھیڑیں گے
گاندھی کی صورت دھارے گا، وقت کا تیور ترچھا بانکا!
آج بھی کوئی ہمت باندھے، اس سے ابھی اس کو ٹوکے
آج بھی کوئی ہنس کر کرے، استقبال غم و حرماں کا

میں نہ کہوں تو کون کہے گا ؟
ایک بھیانک خاموشی میں، چاند ہمارا کھویا کھویا،
اک میلی سی چادر اوڑھے، جاگا جاگا سویا سویا،
گھبرایا سا اُلجھا اُلجھا، ہانپ رہا ہے کانپ رہا ہے
اکثر شاید یہ بھی ہوا ہے، خود بھی رویا میں بھی رویا
بھولی محبت، بھرنے ہی آنسو، عشق و محبت پہلو بہ پہلو
چاند! مگر پھر بھی تجھے بخشا، تو نے غبارِ غم بھی تو دھویا
تاریکی میں لپٹی دنیا، سہمی سہمی ڈول رہی ہے
ڈھلک رہی ہے، بول رہی ہے "اب وہ کاڑھ جو پہلے بویا"
میں نہ کہوں تو کون کہے گا، دنیا جھوٹی چاند بھی جھوٹا
یہ تاریکی فکر سحر ہے، یہ خاموشی اک لب گویا
میں نہ کہوں تو کون کہے گا ؟

سعید احمد اکبر آبادی

میری پیدائش آگرہ میں ۱۹۰۸ء میں ہوئی میرے والد ڈاکٹر ابرار حسین صاحب مرحوم کو جن کی بڑی فکر تھی کہ تعلیم کے ساتھ میری تربیت اور نگہداشت بھی خاطر خواہ طور پر ہونی چاہئے۔ اس بنا پر میری ابتدائی تعلیم مکان پر ہی ہوئی۔ ایک مولوی صاحب جو میرے اتالیق تھے فارسی عربی پڑھاتے تھے اور ایک ماسٹر صاحب ہماری شام کے اوقات میں دو گھنٹہ انگریزی حساب اور جغرافیہ کی تعلیم دیتے تھے۔ میری خوش قسمتی تھی کہ مولوی صاحب جن کا نام خورشید علی تھا اور ماسٹر صاحب دونوں ہی اردو ادب و شعر کا ذوق رکھتے تھے اس سے خود مجھ میں اردو شعر و شاعری اور اس کے ادب کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا لیکن اس زمانے میں میرے ادبی اور شعری مطالعہ کا شوق پرواز مرزا داغ دہلوی کے مختلف دیوانوں اور ہلکے پھلکے افسانوں اور ناولوں تک محدود رہا۔ مکان پر تین برس تک تعلیم پانے کے بعد والد صاحب نے فیصلہ کیا کہ اب میں پہلے عربی اور اسلامی علوم و فنون کی تکمیل کر لوں اور اس کے بعد انگریزی کے امتحانات پاس کر کے اسے بھی پورا کر لوں۔ اس تجویز کے ماتحت مجھ کو پہلے مراد آباد اور پھر دیو بند بھیج دیا گیا جہاں چھ برس رہ کر میں نے نصاب کی تکمیل کی یوں تو الحمد للہ کہ دیو بند میں جس سے بھی درس لیا وہ اپنے فن کا مسلمہ استاد اور ماہر تھا لیکن یہاں سب سے زیادہ میں جن سے متاثر ہوا وہ تین استاد تھے ایک مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاوی۔ جو منطق اور فلسفہ کے امام تھے دوسرے مولانا محمد اعزاز علی جن کو عربی زبان اور اس کے صرف و نحو پر غیر معمولی عبور حاصل تھا اور تیسرے مولانا محمد انور شاہ الکشمیری رحمۃ اللہ علیہم اول الذکر دونوں اساتذہ کے فیض درس و تعلیم سے عربی زبان و ادب کے مطالعہ کا ذوق اور کسی مسئلہ پر بحث کرتے وقت منطقی اور فلسفیانہ استدلال کا سلیقہ تھوڑا بہت آ کچھ پیدا ہو گیا تھا لیکن جب مولانا محمد انور شاہ الکشمیری کے درس بخاری میں پہنچا تو بالکل یہ محسوس ہوا کہ گویا ایک کوچۂ تنگ سے نکل کر اچانک ایک نہایت وسیع و عریض اور سر سبز و شاداب چمن میں آ پہنچا ہوں جہاں جلوۂ گل کی فراوانی ہر شخص کو ہر رنگ میں وا ہو جانے کی دعوت دے رہی تھی کہنے کو یہ درس حدیث کی ایک کتاب (صحیح بخاری) کا تھا لیکن اسلامی علوم و فنون کا وہ کونسا شعبہ تھا جس کے مسائل زیر بحث نہ آتے ہوں اور شاہ صاحب ان پر نہایت سیر حاصل محققانہ گفتگو نہ کرتے ہوں۔ ان کا مطالعہ جس قدر وسیع تھا حافظہ بھی ایسا ہی تھا۔ دوران تقریر میں کتابوں کے حوالے کے ساتھ ان کی عبارتیں بھی نقل کرتے چلے جاتے تھے۔ پھر ان کے ہاں نقل ہی نہیں تھی بلکہ مختلف کتابوں اور ان کے مصنفین سے متعارف کراتے اور ان کے کارناموں پر ناقدانہ تبصرہ فرماتے تھے۔ حضرت شاہ صاحب کی نجی گفتگو بھی علمی اور ادبی انداز کی ہوتی تھی۔ اس بنا پر موصوف کے درس اور اس کی صحبت کا اثر یہ ہوا کہ مجھ میں علمی اور فنی مسائل پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے اور تحقیق سے کام لینے کا جذبہ اور سلیقہ پیدا ہوا نصاب تعلیم میں جو کتابیں درج تھیں اب میں انہیں کا پابند نہیں رہا بلکہ ہر فن کی درسی کتابوں کے ساتھ دوسری غیر درسی کتابیں بھی پڑھتا رہتا تھا۔ حصول علم کے لئے اگر بے تعصبی شرط اولین ہے تو مجھ کو اعتراف کرنا چاہئے کہ مجھ میں اس خو کا پیدا ہونا شاہ صاحب کی ہی دین ہے۔

شاہ صاحب کے درس سے ایک اور فائدہ یہ ہوا کہ طبیعت دقت پسندی کی خوگر ہو گئی اور سوقیانہ شاعری اور سستے قسم کے افسانوں سے ابا کرنے لگی۔ اسی زمانہ میں میں نے اردو ادب کا مطالعہ کیا تو اردو کے عناصر خمسہ میں سے کوئی نہیں تھا جس کی اکثر و بیشتر کتابیں میں نے نہ پڑھی ہوں۔ ان کے علاوہ پنڈت رتن ناتھ سرشار کا فسانہ آزاد اور سیر کہسار، عبد الحلیم شرر کے تاریخی ناول، راشد الخیری کے مختصر افسانے، خواجہ حسن نظامی کے تخیلی مضامین اور نیاز فتحپوری کے انشائیے اور شہاب کی سرگزشت یہ سب کتابیں پڑھ ڈالیں لیکن سب سے زیادہ طبیعت جس سے متاثر ہوئی وہ مولانا شبلی نعمانی کی شخصیت ہے میں نے مولانا کی اکثر و بیشتر کتابیں پڑھی ہیں لیکن الفاروق اور شعر العجم دو ایسی کتابیں ہیں جنہوں نے طبیعت پر بہت گہرے اور دور رس اثرات پیدا کئے۔ الفاروق تحقیق کا شاہکار ہے

ہے ہی، زبان و بیان اور فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بھی اس کا کوئی جواب اب تک پیدا نہیں ہو سکا ہے۔ رہی شعر العجم تو اس میں شبلی کا جو اصل کارنامہ ہے اور جس میں میرا خیال ہے ایران میں بھی ابھی تک ان کا کوئی حریف پیدا نہیں ہو سکا وہ شعر العجم کا چوتھا اور پانچواں حصہ ہے جن میں فارسی شاعری کا عہد بہ عہد ارتقاء اور ہر عہد کی لفظی و معنوی خصوصیات اور ان کے اسباب و عوامل پر شبلی نے اس مہارت فن، وسعت نظر، دقت نگاہ سے اور پھر اس درجہ شستہ و رفتہ اور بے ساختہ اور برجستہ زبان میں بحث کی ہے اور اس میں زبان و بلاغت کے وہ عجیب و غریب نازک اور لطیف نکتے پیدا کئے ہیں کہ بے ساختہ سطر سطر پر احسنت اور مرحبا کی صدا نکلتی ہے۔ شبلی تاریخ کا ذوق اور اس کا وسیع مطالعہ رکھتے تھے۔ اور ساتھ ہی منطق اور فلسفے کے بہت اچھے عالم تھے۔ شعر و ادب کا ذوق فطری تھا۔ طبیعت میں جودت و شگفتگی بلا کی تھی۔ ان سب چیزوں کے بیک وقت اجتماع نے اردو زبان کے کلاسیکل مصنفین میں شبلی کی شخصیت کو بہت بلند اور نمایاں کر دیا ہے۔ مجھے اس کا یقین ہے کہ دقیق سے دقیق علمی بحث کو جس قدرت کلام کے ساتھ دلآویز شگفتہ زبان میں شبلی لکھ سکتے تھے ان کے جانشین سید سلیمان صاحب ندوی اور تلمیذ خاص عبدالسلام ندوی کو بھی وہ بات نصیب نہ ہوئی۔ میرے شعبہ میں کوئی طالب علم پی ایچ ڈی میں داخلہ لیتا ہے تو میں اس کو شروع کے دو تین مہینوں میں مولانا شبلی کی خاص خاص کتابیں غور اور توجہ سے پڑھنے کا مشورہ دیتا ہوں تاکہ اسے معلوم ہو سکے کہ کسی موضوع پر گفتگو کرتے وقت کس طرح اس کے مختلف اجزاء اور عناصر کا تجزیہ کر کے ہر ہر جز پر الگ الگ بحث کی جاتی ہے اور اس کے لئے اسلوب نگارش کس قسم کا ہونا چاہئے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ حضرت شاہ صاحب سے مجھ میں جس علمی و تحقیقی ذوق کی تخم ریزی کی تھی اس کی آبیاری مولانا شبلی کی کتابوں نے کی۔ اسی کا یہ اثر تھا کہ دیوبند کی طالب علمی کے زمانے ہی میں میں قاہرہ سے المقتطف اور الہلال جو بلند پایہ علمی ماہنامے تھے منگواتا اور بڑے شوق سے ان کا مطالعہ کرتا تھا اور اردو رسائل میں نگار اور معارف زیر مطالعہ رہتے تھے جیسا کہ شروع میں عرض کر آیا ہوں اردو شعر و شاعری کے میرے مطالعہ کا آغاز داغ کے دواوین سے ہوا تھا لیکن اب غالب، مومن اور میر کے کلیات و دواوین مطالعہ میں رہتے تھے۔ غالب کی متعدد شرحیں بھی پاس رہتی ہیں لیکن شعر کے معاملہ میں بجائے شرح کے خود اپنے ذوق پر بھروسہ کرنے کا عادی رہا ہوں اس بنا پر شرح سے استفادہ کی نوبت کم ہی آتی تھی۔

جس زمانہ کا یہ ذکر ہے اس زمانہ میں مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال دونوں کا غلغلہ بلند تھا۔ مجھ ایسے مفلس اور تنگدست طالب علم کے لئے یہ کیونکر ممکن تھا کہ ان سے بے اعتنائی برتتا چنانچہ ان دونوں کو بھی میں نے پڑھا اور بار بار پڑھا۔ مولانا ابوالکلام کا الہلال (دور اول) اور البلاغ [illegible] لیکن ان کے مختلف مضامین کتابی صورت میں طبع ہو کر نکلتے تھے۔ [illegible] مسئلہ خلافت اور ترجمان القرآن ان کا بھی بڑا چرچا تھا لیکن مجھ پر سب سے زیادہ [illegible] ترجمان کا ہے تذکرہ جسے کو سوانح عمری ہے۔ وہ درحقیقت اردو ادب میں انشاء اور خطابت کا شاہکار ہے۔ یہی وہ انشاء ہے جس کی نسبت مولانا حسرت موہانی نے کہا تھا:

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
شعر حسرت میں وہ مزا نہ رہا

تذکرہ کے بعض مقامات بار بار پڑھے یہاں تک کہ صفحے کے صفحے زبانی یاد ہو گئے اور اس کا اثر یہ ہوا کہ میری تحریر میں بھی یہ رنگ جھلکنے لگا۔ میری عمر ساڑھے پندرہ برس کی ہو گی بجنور سے سید حبیب ایک روزنامہ سیاست کے نام سے نکالتے تھے۔ انہوں نے بقرعید کے موقع پر اس کا ایک خاص نمبر قربانی نمبر کے نام سے شائع کرنے کا اعلان کیا میں نے بھی ایک مضمون لکھا اور ڈرتے ڈرتے سید حبیب کو بھیج دیا۔ مضمون پر میں نے اپنا نام تو لکھا تھا لیکن کچھ خوف اور کچھ شرم اپنا پتہ نہیں لکھا تھا۔ جب یہ شاندار خاص نمبر چھپ کر آیا تو اب تک یاد ہے مجھے یہ دیکھ کر کس درجہ خوشی ہوئی تھی کہ میرا مضمون (جو عمر میں پہلی مرتبہ طبع ہوا تھا) بڑے اہتمام سے نمایاں طور پر شائع ہوا تھا اور میرے نام کے ساتھ حضرت مولانا لکھا تھا۔ درحقیقت یہ سب کچھ نتیجہ تھا اس بات کا کہ مولانا ابوالکلام کی تحریریں مکرر سہ کرر پڑھنے کی وجہ سے میری تحریر میں ابوالکلامیت پیدا ہو چلی تھی لیکن یہ رنگ نبھ نہیں سکتا تھا۔ (اور سچ تو یہ ہے کہ خود مولانا سے نہیں نبھ سکا) اس لئے جب طبیعت علمی اور سنجیدہ مضامین پڑھنے کی طرف مائل ہوئی تو یہ رنگ ڈھلتا اور صاف ہوتا چلا گیا۔ رہا ترجمان القرآن تو اس میں سورہ فاتحہ کی تفسیر میرے نزدیک تفاسیر کے پورے ذخیرہ میں ایک گل سرسبد کی حیثیت رکھتی ہے اور اس نے فکری اعتبار سے ایک ایسی راہ دکھائی ہے جو درحقیقت ہے تو قرآن کی ہی راہ لیکن لوگوں نے اس کو نظر انداز کر رکھا تھا۔ وحدت دین قرآن کا وہ موضوع گفتگو ہے جس کو بار بار مختلف پیرایۂ بیان سے بیان کیا گیا ہے اور دعوت محمدیہ میں اس کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی کی ہے لیکن کیسی عجیب اور سخت افسوسناک بات ہے کہ ہمارے علمائے تفسیر نے اس مضمون کو سب سے کم شائستۂ اعتنا سمجھا ہے۔ علمائے سلف میں سب سے پہلے شاہ ولی اللہ ہیں جنہوں نے اس موضوع پر اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں وضاحت اور تفصیل سے لکھا ہے اور شاہ صاحب کے بعد پھر مولانا کا ہے حق یہ ہے کہ مولانا نے تو اس پر قلم ہی توڑ دیا ہے۔

اردو شاعروں میں قدیم و جدید اچھے اور برے سب ہی پڑھ ڈالے ہیں لیکن غالب اور اقبال دو ایسے شاعر ہیں جن کو صرف پڑھا نہیں ہے بلکہ ہم نے انہیں زندگی کے سفر میں اپنا رفیق، ساتھی اور رہنما بنا لیا ہے۔ طبیعت پر جب کبھی رنج و غم، فکر و تشویش یا اداسی یا پژمردگی کی کیفیت طاری ہوئی ہے میں نے اقبال کی کوئی نظم یا غزل پڑھنی شروع کر دی ہے یا دیوان غالب ہاتھ میں لے کر گنگنانے لگا ہوں اور میں نے محسوس کیا ہے کہ جیسے اداسی اور دلگرفتگی کے بادل چھٹ رہے ہیں اور دل میں عزم و حوصلہ اور ایمان و ولولہ کی چاندنی چٹک رہی ہے۔ غالب نے موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟ کہہ کر زندگی کا ایک رخ بیان کیا ہے لیکن اقبال نے:

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ

اور

"زمانہ باتو نسازد تو با زمانہ ستیز" کا نعرہ لگا کر غم اور حوادث روزگار کا مقابلہ کرنے کا عزم اور حوصلہ بخشتا ہے گویا ایک نغمہ پیش کرتا ہے اور دوسرا اس مرض کے لئے نسخۂ شفا کی نشاندہی کرتا ہے۔ غالب اور اقبال دونوں زندگی اور اس کے معاملات و مسائل کو ایک خاص نقطۂ نظر سے دیکھنے کا سلیقہ پیدا کرتے ہیں۔ ایک ایسا خاص نقطۂ نظر جس کے آئینہ میں زندگی ایک بار گراں اور بوجھ نہیں بلکہ ایک عطیۂ خداوندی اور نعمت حقیقی نظر آتی ہے۔

میں نے تاریخ، فلسفہ، شعر و ادب اور اسلامیات پر عربی فارسی اُردو اور انگریزی میں سینکڑوں کتابیں اعلیٰ اور بلند پایہ مصنفین کی پڑھی ہوں گی اور ظاہر ہے کہ کوئی عمدہ کتاب اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہتی۔ ان سب کا ذکر ممکن ہے اور نہ ضروری۔ عربی زبان و ادب میرا خاص اور محبوب مضمون رہا ہے۔ اور اس کا ذوق طبعی اور فطری ہے۔ فارسی شعر و ادب سے بھی مجھے بڑی دلچسپی رہی ہے خاقانی، انوری، عرفی، نظیری اور قاآنی کو خود پڑھا ہی نہیں بلکہ برسوں تک دلی یونیورسٹی میں آنرز اور ایم اے (فارسی) کی کلاسوں کو ان کا درس دیا ہے لیکن جہاں تک عقیدت اور ارادت کا تعلق ہے وہ مجھے سب سے زیادہ خواجہ حافظ سے رہی ہے۔ رنج و غم کی کیفیت ہو یا کسی قسم کی پریشانی اور تشویش کی ہر حالت میں دیوان حافظ میرا مونس و ہمدم اور غم خوار ثابت ہوا ہے بلکہ بعض مواقع پر حضرت لسان الغیب نے میری بروقت رہنمائی کر کے نقصان عظیم سے بچا لیا ہے اس سلسلے کے واقعات تو کئی ایک ہیں لیکن یہاں دو واقعے بیان کروں گا۔ بہت عرصہ پہلے کی بات ہے۔ بدایوں کے ایک رئیس میرے بڑے بے تکلف اور عزیز دوست تھے۔ اس زمانہ کے رئیس عموماً جیسے ہوتے تھے سب کو معلوم ہے یعنی زندہ دل اور رنگین طبع۔ ایک مرتبہ انہوں نے مجھ کو آموں کی فصل میں انبہ خوری کے لئے بدایوں مدعو کیا اور میں وہاں پہنچ گیا۔ پہلا دن تو خیریت سے گزرا لیکن دوسرے روز کیا ہوا؟ شب کے دس ساڑھے دس بجے کا وقت ہوگا میں حسب معمول سونے کے لئے پلنگ پر لیٹ گیا تھا کہ اتنے میں یہ دوست آئے اور مجھے اپنے ساتھ ایک نہایت آراستہ و پیراستہ کمرہ میں لائے، میں یہاں پہنچا تو دیکھا کہ عالم ہی کچھ اور ہے۔ محفل نشاط گرم ہو رہی ہے اور ایک نازنین خوش جمال۔

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن
اُمنگوں کی راتیں مرادوں کے دن

اپنے سازندوں کے ساتھ رونق بزم ہے۔ گانا شروع ہوا تو محسوس ہوتا تھا پوری فضا نغمہ بار ہو گئی ہے اور ؎ ساقی بہ جلوہ دشمن ایمان و آگہی
مطرب بنغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے

کا منظر تھا۔ دوسرے دن میں بدایوں سے رخصت ہو گیا۔ لیکن یہ صحبت شب بالاستعجال ہو گئی۔

دل میں آکر نہ دل سے پھر نکلے
تم تو ارمان ہو گئے دل کے

میں نے اپنے دوست کو اس کیفیت سے مطلع کیا تو انہوں نے کہا کہ اس میں پریشانی کی کونسی بات ہے۔ میرا گھر آپ کا گھر ہے۔ جب دل چاہے بے تکلف آجایئے اور جب تک جی چاہے یہاں رہیئے۔ میں نے سوچا کہ یہ سب کچھ ممکن ہے لیکن آخر اس کا انجام کیا ہوگا جب الجھن زیادہ بڑھی تو حسب معمول حضرت خواجہ سے رجوع کیا۔ اب دیوان کھولتا ہوں تو پہلا شعر جو نظر آیا وہ یہ تھا۔ ؎ من گدا ہوس سرو قامتے دارم
کہ دست در کمرش جز بسیم و زر نہ رسد

اس شعر کا نظر آنا تھا کہ کسی نے دل و دماغ کی مکمل تنقیہ اور تزکیہ کر دیا۔ اور پھر اس کے بعد نہ کبھی ادھر کا رُخ کیا اور نہ کبھی خیال ہی آیا۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ اینگلو عربک کالج دہلی میں جو اب دلی کالج کہلاتا ہے عربی کے ایک لیکچرر کی پوسٹ کا اشتہار ہوا۔ ایک درخواست میں نے بھی بھیجدی لیکن انٹرویو کے بعد کالج کی انتخابی کمیٹی میں اختلاف ہو گیا۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں جو چیرمین تھے میرے حامی تھے اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی رائے ایک اور امیدوار کے حق میں تھی جب اختلاف زیادہ بڑھا اور مصالحت کی کوئی صورت ہی پیدا نہیں ہوئی تو فیصلہ یہ ہوا کہ اس پوسٹ کو فارسی کے لیکچرر کی پوسٹ میں تبدیل کر دیا جائے۔ یہاں مجھ کو مایوسی ہوئی تو طبیعت پر اس کا بُرا اثر پڑا۔ اسی پریشانی اور دل گرفتگی کے عالم میں دیوان حافظ سے فال نکالی تو یہ شعر نکلا

گرچہ منزل بس خطرناک ست و مقصد ناپدید
ہیچ راہے نیست کو را نیست پایاں غم مخور

یہ شعر پڑھتے ہی سکون سا ہو گیا، اور خدا کی شان چند روز کے بعد ہی میری درخواست اور کوشش کے بغیر سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی کے پرنسپل مسٹر مکرجی نے مجھ کو اپنے ہاں بلا کر کہا کالج کو آپ کی ضرورت ہے۔ میں درخواست کرتا ہوں آپ ہمارے کالج میں لیکچرر کی پوسٹ قبول کر لیں۔ چنانچہ میں لیکچرر ہو گیا اور ایک برس کے بعد ہی جونیئر گریڈ سے سینئر گریڈ میں منتقل کر دیا گیا۔

دیوبند سے فراغت کے بعد میں مولانا محمد انور شاہ الکشمیری اور ان کی جماعت جو تحریک اصلاح مدرسہ کے سلسلے میں دارالعلوم سے مستعفی ہو گئی تھی۔ ان کے ساتھ ڈابھیل ضلع سورت کے مدرسہ جامعۂ اسلامیہ میں مدرس ہو کر ڈابھیل چلا گیا یہ [illegible] کی بات ہے یہاں میں کم و بیش تین برس رہا ہوں گا۔ زمانۂ قیام میں گاندھی جی نے نمک سازی کے لئے ڈانڈی کا مشہور مارچ کیا تھا۔ یہ غالباً [illegible] کی بات ہے اس مارچ کے سلسلے میں گاندھی جی ہمارے جائے قیام ڈابھیل سے دس گیارہ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں جس کا اس وقت نام یاد نہیں آتا وہاں سے گزرنے والے تھے ہم لوگوں کو یہ معلوم ہوا تو مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی مرحوم، مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی اور یہ خاکسار ہم تینوں نے اس موقع پر

گاندھی جی کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ کر لیا اور ہم وہاں پہنچ گئے۔ یہ گاؤں ایک بہت ہی
معمولی اور چھوٹا سا گاؤں ہے لیکن آج یہاں ہزاروں انسانوں کا مجمع تھا۔ کانگریس لگی ہوئی تھی
جیسے کوئی بڑا میلا ہوتا ہے اور جنگل میں منگل کا سماں تھا۔ گاندھی جی کی عظمت سے میں پہلے سے واقف
تھا لیکن اس دن اندازہ ہوا کہ درحقیقت وہ اپنے علمی اور عملی قوا اور ذہنی صلاحیتوں کے
لحاظ سے کتنے بڑے انسان ہیں اور انہوں نے کس ریاض اور محنت سے اپنے آپ کو بنایا
ہے۔ ہوا یہ کہ ہم جب اس گاؤں میں پہنچے تو گاندھی جی اس وقت تک نہیں آئے تھے تھوڑی ہی
دیر کے بعد دور سے چند انسانوں کا قافلہ آتا ہوا نظر آیا۔ اب غور سے دیکھا تو گاندھی جی آگے
آگے لکڑی ہاتھ میں لئے تیز قدم اٹھاتے چلے آ رہے ہیں اور چند لوگ ہیں جو اُن کے ساتھ ہیں۔
خیال تھا کہ گاندھی جی بارہ میل پیدل چل کر آ رہے ہیں۔ اس لئے یہاں پہنچکر وہ آرام کریں گے اور
سستائیں گے۔ لیکن یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ گاندھی جی کا اس وقت نہ سانس
پھولا ہوا تھا اور نہ تھکن کے مارے ان پر اضمحلال کا کوئی اثر تھا۔ وہ یہاں پہونچے، نہائے دھوئے
اپنی غذا کھائی (اس وقت دن کے بارہ بجے کا وقت ہوگا) اور پھر بالکل تازہ دم ہوکر ایک
شامیانے کے نیچے جہاں پہلے سے اُن کی نشست کا انتظام تھا آکر بیٹھ گئے۔ اس وقت
عام ملاقات کی اجازت نہیں تھی لیکن ہم نے اطلاع کرائی تو انہوں نے فوراً بلا لیا۔ ہم اندر گئے
تو دیکھا ایک ٹانگ پر ٹانگ رکھے گاندھی جی بالکل سیدھے بیٹھے چرخہ کات رہے ہیں اور سیٹھ
جمنالال بجاج اور تین چار اور اشخاص ان کے سامنے بیٹھے ہیں۔ کمال یہ تھا کہ اُن میں سے
دو صاحبوں کو بیک وقت بعض ضروری خطوط املا کرا رہے تھے۔ باقی اصحاب سے تحریک کے
سلسلہ میں بعض اہم معاملات پر گفتگو بھی کرتے جاتے تھے اور ادھر ہاتھ چرخہ چلانے میں
مصروف تھے۔ یہ تینوں کام بیک وقت نہایت منظم اور باقاعدہ ہو رہے تھے۔ کیا مجال کہ
کسی میں کوئی رخنہ پیدا ہو جائے۔ ہم تینوں خدمت میں حاضر ہوتے تو انہوں نے مسکراتے ہوئے
ہمارا سواگت کیا اور اپنے قریب بٹھا لیا۔ شروع میں ہمارے مدرسہ کا کچھ حال اور ہمارے
اساتذہ کی خیریت دریافت کی اور پھر بولے کہ میں نے اخبار میں پڑھا ہے کہ مولانا محمد انور شاہ صاحب
نے پشاور میں تقریر کرتے ہوئے ایک حدیث بیان کی ہے جس میں پیغمبر صاحب نے فرمایا ہے کہ تین
چیزوں پر کوئی ٹیکس نہیں لگایا جاسکتا اور وہ ہیں نمک، گھاس اور پانی۔ یہ کہنے کے بعد گاندھی جی نے
ہم سے پوچھا کہ کیا یہ خبر صحیح ہے اور کیا واقعی حضرت محمد صاحب نے ایسا فرمایا ہے۔ ہماری طرف
سے مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے جواب دیا۔ ہاں گاندھی جی! یہ حدیث بالکل صحیح ہے۔
یہ سن کر گاندھی جی کا چہرہ خوشی کے مارے چمک اٹھا اور وہ بے تاب ہو کر کہنے لگے اب مجھ کو اس بات کا یقین
ہو گیا کہ میں نے جو سمجھا ہے وہ بالکل درست ہے۔ اس کے بعد فرمایا اچھا، میں اپنا آدمی آپ
کے ساتھ بھیج دوں گا۔ آپ وہ حدیث مع حوالے کے اصل عربی کے لفظوں میں اور پھر اس کا اُردو
ترجمہ لکھ کر بھیجیے، اسے میں چھپوانا چاہتا ہوں۔ وہ آدمی ہمارے ساتھ آیا اور ہم سے وہ حدیث مع
ترجمہ کے لے گیا۔ گاندھی جی کو اس [illegible] سے اتنی خوشی ہوئی کہ جب سہ پہر میں تین بجے ایک عظیم الشان

جلسہ عام میں انہوں نے تقریر کی (اور اس جلسہ میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے بھی تقریر کی تھی) تو
انہوں نے ہم لوگوں کی یہاں آنے اور ہم سے اپنی بات چیت کا بھی ذکر کیا اور اس بات کو پھر دہرایا کہ
پیغمبر صاحب کا یہ قول سنکر مجھ کو بڑی قوت حاصل ہوئی ہے۔

بہرحال اس روز میں نے گاندھی جی میں اُن کی بہت غیر معمولی حاضر جوابی، ذہنی اور عملی
طاقت و قوت کا جو مشاہدہ کیا میں اُسے کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ ایک مرتبہ مولانا حفظ الرحمٰن
صاحب نے جو میرے قریبی رشتہ سے بڑے بھائی ہوتے اور مجھ سے بے حد محبت کرتے تھے،
بیان کیا کہ ایک موقع پر مولانا ابوالکلام آزاد سے گاندھی جی کا ذکر آیا تو اگرچہ مولانا بڑے سے
بڑے آدمی کی تعریف میں بے حد بخیل واقع ہوئے تھے لیکن اس وقت انہوں نے گاندھی جی کی
ذہانت، دور رسی اور ان کی روحانی اور اخلاقی طاقت کا تذکرہ اس والہانہ انداز سے کیا کہ
میں حیران رہ گیا۔ اس سلسلہ میں مولانا نے گاندھی جی کے متعدد چشمدید واقعات سنائے۔ ان میں
ایک واقعہ یہ بھی تھا کہ جب گاندھی جی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں جا رہے تھے تو اس سلسلہ کے
جو کاغذات اور دستاویزات وغیرہ تھے وہ سب انہوں نے روانگی سے چند گھنٹے پہلے منگوا
لئے اور ایک دو گھنٹہ میں ان کو پڑھ لینے کے بعد ہم سب ارکان ورکنگ کمیٹی سے گفتگو کی تو مولانا
فرماتے تھے میں سخت حیران ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کانفرنس میں جو مسائل زیر بحث آئیں گے
گاندھی جی نے ان سب کا مطالعہ بڑی وسعت اور دقت نظر سے کر لیا ہے۔ اور اب کسی مسئلہ کا
کوئی پہلو بھی ایسا نہیں ہے جس پر وہ بصیرت اور خود اعتمادی کے ساتھ گفتگو نہ کر سکیں۔

یہ تو خیر مولانا ابوالکلام آزاد کی بات تھی۔ وہ لوگ جو گاندھی سے سیاسی اختلافات
رکھتے تھے اُن کی عظمت کا اعتراف اُن کو بھی تھا۔ چنانچہ میرے ایک دوست جو ایک روزنامہ کے
ایڈیٹر اور مسٹر محمد علی جناح سے بہت قریب اور کسی حد تک بے تکلف تھے۔ ایک مرتبہ انہوں
نے کہا کہ بمبئی میں گاندھی ـ جناح گفت و شنید ختم ہو گئی اور جناح صاحب دہلی تشریف
لائے اور میں ان کی خدمت میں حسب معمول حاضر ہوا تو انہوں نے بمبئی کی گفتگو کے متعلق اپنے
تاثرات بیان کرتے ہوئے جہاں اور بہت سی باتیں کہیں یہ بھی فرمایا، گاندھی جی کی دماغی
طاقت غیر معمولی معلوم ہوتی ہے۔ جب وہ بولتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ زبان کے ساتھ
وہ اپنے دل کی طاقت بھی استعمال کر رہے ہیں اور مجھ کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں جس سے اپنے
بچنے کے لیے مجھ کو بھی اپنی قوت ارادی سے بہت کچھ کام لینا پڑا۔"

گاندھی جی کو اس قدر دیکھ کر مجھ کو یقین ہو گیا کہ کوئی شخص یونہی بڑا نہیں بن جاتا بلکہ
قدرت جس کو دنیا کی کوئی عظیم شخصیت بنانا چاہتی ہے تو اس میں کچھ غیر معمولی اوصاف
و کمالات بھی ودیعت کر دیتی ہے۔ بدقسمتی سے آج بات بات میں ہندو مسلم کا سوال پیدا
ہو جاتا ہے لیکن میری پیدائش اور پھر نشو و نما اور تربیت ایسے گھرانے میں ہوئی جہاں اس
قسم کی باتوں کا کہیں گذر ہی نہیں تھا۔ میرے والد ماجد آگرہ کے مشہور و معروف ڈاکٹر تھے
سرکاری ملازمت کے علاوہ ان کی پریکٹس جتنی ہندوؤں میں تھی مسلمانوں میں نہیں تھی۔

اس کے علاوہ مسلمانوں میں پایا جاتا اور میل ملاقات کی رسم دونوں فرقوں کے لوگوں سے یکساں
تھی کچھ ہندو گھرانے تھے جن کے بچے بچیاں والد صاحب کو چاچا اور والدہ مرحومہ کو چاچی اور
چچی کہا کرتے تھے۔ جب میری بہن کی شادی ہوئی تو رات میں بارات کے ساتھ سینکڑوں خاص
ہندو مسلمان بھی مدعو تھے۔ کھانے سے فراغت پا کر سب لوگ رخصت ہو گئے لیکن چند عمر رسیدہ
ہندو تھے جو بیٹھے رہے۔ جب رات زیادہ ہوئی اور والد صاحب نے ان سے کہا: اچھا! اب
آپ بھی جائیے آرام کیجئے تو مجھے اب تک یاد ہے انہوں نے کس محبت سے ایک خاص تاثر کے
لہجہ میں کہا تھا واہ! ڈاکٹر صاحب ابھی بٹیا کا ڈولا تو اٹھا نہیں ہم گھر کیسے چلے جائیں چنانچہ کافی
رات گئے جب بہن رخصت ہو گئی تو یہ بھی گھروں کو واپس لوٹے۔

اس ماحول میں اور ایسی سوسائٹی میں رہنے کا ہی یہ اثر تھا کہ ۱۹۴۶ء کے ماہ دسمبر کا ذکر ہے
ایک مرتبہ میں اور والد صاحب دہلی سے مراد آباد جا رہے تھے اور انٹر کلاس میں بیٹھے تھے۔ یہ ڈبہ اوپر
تلے مسافروں سے بھرا ہوا تھا اور اس میں میرے اور والد صاحب کے علاوہ کوئی تیسرا مسلمان نہیں
تھا۔ راستے میں مغرب کی نماز کا وقت ہوا تو والد صاحب نے اسی عالم میں تھیلے سے جانماز نکالی اور
دو ہندو جو ہمارے ہی پاس بیٹھے تھے بڑی سادگی اور بھولے پن سے ان کے کاندھوں پر ہاتھ
رکھ کر والد صاحب نے فرمایا اچھا ذرا کھڑے ہو جانا میں نماز پڑھ لوں۔ والد صاحب کا یہ کہنا
تھا کہ اس وقت کی فضا کے پیش نظر میرا دل دھک دھک کرنے لگا کہ خدا خیر کرے اب کوئی اور
قیامت نہ ٹوٹ پڑے۔ لیکن میری توقع کے بالکل برخلاف وہ دونوں فوراً کھڑے ہو گئے اور
بولے: لیجئے صاحب اب تو جگہ کافی ہو گئی نماز پڑھ لیجئے۔ اب میں نے یہ دیکھا تو اپنی سیٹ پر
سے کھڑا ہو گیا اور ان دونوں سے کہا کہ آپ یہاں بیٹھئے والد صاحب جب تک نماز پڑھیں گے
آپ کی بجائے میں کھڑا رہوں گا لیکن انہوں نے میری پیش کش بالکل قبول نہیں کی اور مسافروں
میں سے دو تین ہندو ایک ساتھ بول اٹھے: ارے سب مسلمان ان بڑے صاحب جیسے ہوں جو
بھگوان کی پوجا سچے دل سے کریں تو کون کمبخت ہوگا جو ان سے دشمنی کرے گا۔ اس واقعہ کو
دیکھ کر مجھ کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ جس طرح بدی متعدی بیماری ہے اسی طرح نیکی بھی متعدی ہے۔
یعنی اگر آپ کا دل کسی کی طرف سے صاف ہوتا ہے تو اس کے دل میں بھی آپ کی طرف سے میل نہیں
ہوگا لیکن اگر آپ کے ہی دل میں کدورت اور عناد ہے تو پھر آپ کو اس سے صفائی قلب و
خلوص کی امید رکھنا عبث ہے چنانچہ ایک روایت میں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بھی
ہے "اگر تم یہ معلوم کرنا چاہتے ہو کہ تمہارے دوست کا رویہ تمہارے ساتھ کیا ہے تو تم خود اپنا
محاسبہ کر کے یہ دیکھو کہ تمہارا رویہ اس کے ساتھ کیا ہے"۔

بہر حال میری تربیت ایسے گھرانے میں ہوئی۔ پھر عربی کی تعلیم دیوبند میں ہوئی۔ مدرسہ
دیوبند بھی جو تحریک آزادی میں کانگریس کے دوش بدوش رہا ہے اور اس کے بعد میں
ایم اے میں طالب علم رہا سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی کا اور پھر برسوں تک اسی کا اسٹاف
ممبر رہا اور اس کالج کا حال جو تھا (معلوم نہیں اب کیا ہے) کہ یہاں اساتذہ اور طلبا میں
ہر مذہب کے لوگ ہوتے تھے لیکن سب آپس میں پیار محبت کے ساتھ ایک ہی خاندان کے
افراد کی طرح رہتے تھے۔ یہ کالج مشن کا ہے اس نے سوشل معاملات میں یہاں نہ کسی کے ساتھ
امتیاز برتا جاتا ہے اور نہ اونچ نیچ کا معاملہ ہوتا ہے۔ کیشب چندر ناگ اس کالج میں اقتصادیات
کے پروفیسر تھے۔ تھے بنگالی مگر دلی میں رہتے ہوئے مدت ہو گئی تھی اس لئے اردو خاصی
اچھی بول لیتے تھے۔ میں نے ان کو کبھی مغربی لباس میں نہیں دیکھا ایک کرتہ اور ایک دھوتی
اور ایک چادر ان کا ہمیشہ کا پہناوا تھا۔ رہن سہن اور کھانے پینے میں بھی کٹر قدامت پسند
تھے۔ ہر مدہ کو ہمارے کالج میں شب ضیافت (Guest Night)
ہوتی تھی جس میں بیرونی مہمانوں کے علاوہ پورا اسٹاف شریک ہوتا اور اس روز ڈنر بھی بڑا
شاندار ہوتا تھا لیکن ہمارے ناگ صاحب کا کھانا بغیر گوشت کے اور خاص گھی میں تیار ہوتا
تھا اس موقع پر بھی گھر سے تیار ہو کر آتا تھا۔ شاید آپ کو یہ سن کر تعجب ہو کہ اس درجہ قدامت
پسندی اور کٹر پن کے باوجود ناگ صاحب میرے نہایت عزیز اور مخلص دوست تھے اور
بے تکلف بھی اس درجہ کہ کشمیری گیٹ میں رہتے تھے بعض اوقات کالج سے واپسی میں میرا ان
کا ساتھ ہو جاتا۔ تو وہ اپنے مکان پر پہنچ کر مجھ کو بھی سواری سے اتار لیتے۔ ان کی بیوی کا تو عرصہ
ہوا انتقال ہو گیا تھا گھر میں ایک لڑکا اور دو لڑکیاں تھیں۔ گھر میں پہونچتے ہی ناگ صاحب
کے حکم سے لڑکیاں آلو کے چاپ تیار کرتیں اور گرم گرم کڑھائی میں سے نکال کر ہم دونوں کو
کھلاتی رہتیں۔ ناگ صاحب کو سگریٹ کا بہت شوق تھا لیکن گھر پر حقہ استعمال کرتے تھے۔
. . . . . جب آلو کے چاپ اور اس کے بعد چائے سے فراغت ہو گئی تو ایک لڑکی
جھٹ حقہ بھر لائی اور ہمارے سامنے رکھ دیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ سخت قدامت پرست ہونے
کے باوجود ناگ صاحب اصرار کرتے کہ حقہ کا پہلا کش میں ہی لوں۔ مجھ کو اس کی فرمائش کی تعمیل
کرنی پڑتی۔ اس کے بعد وہ کش لیتے اور یہ دور اسی طرح گھنٹہ آدھ گھنٹہ چلتا رہتا۔ ابھی پانچ برس
ہوئے ناگ صاحب کا انتقال ہو گیا جس کا مجھے بڑا صدمہ ہوا لیکن ان کی محبت شرافت اور خلوص
یہ وہ صفات ہیں جو مجھ کو رہ رہ کر یاد آتی اور تڑپا جاتی ہیں۔ میں اس کو کبھی بھول نہیں سکتا کہ ۳۱
جنوری ۱۹۶۸ء کی شام کو جب میں پرنسپل کلکتہ مدرسہ کے عہدہ کا چارج لینے کے لئے کالج سے
تعلق منقطع کر کے احباب کالج سے رخصت ہو رہا تھا تو میری طرح دل گرفتہ اور اداس تو سب
ہی تھے لیکن ناگ صاحب پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے اور ان کی وجہ سے مجھ کو بھی اپنے
آپ کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس طرح میں ناگ صاحب کے علاوہ ہندو مسلمان اور مسیحی
اساتذہ اور طلبا میں اور بھی کتنے ہی ایسے احباب تھے جن سے میرے تعلقات گہرے اور
مخلصانہ تھے ان کی داستان کے لئے ایک اور مقالہ درکار ہوگا۔ میری عمر کم و بیش اٹھارہ
برس جو سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی اور اس کے ذریعے دہلی یونیورسٹی اور اس کے بعد
کلکتہ مدرسہ کلکتہ کے ساتھ تعلق میں مجموعی طور پر بسر ہوئے ہیں میری زندگی میں سنگ میل کی
حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ اس زمانہ میں میری سوسائٹی بڑی متنوع و ہمہ جہتی تھی جس میں ہر مذہب

وملت اور مشرب و مسلک کے لوگ شامل رہے ہیں اور اس بنا پر مجھ کو موقع ملا ہے کہ میں انسانی نفسیات کا مطالعہ زیادہ وسعت کے ساتھ کر سکوں۔ اس مطالعہ کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کا احترام اور اس کی خدمت کا جذبہ جو مجھ میں پہلے سے موجود تھا وہ اور پختہ ہو گیا ہے اور میں انسان کے عظیم مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔ میری بڑی لڑکی کی کلکتہ میں شادی ہوئی اور میں نے کم و بیش آٹھ سو آدمیوں کو عصرانہ دیا۔ تو ایک مقامی اُردو روزنامہ نے لکھا کہ آج تک ہم نے کلکتہ میں کوئی ایسی پارٹی نہیں دیکھی تھی جس میں حکومت کے افسر، وزیر، ہندو مسلمان، یورپین اینگلو انڈین مسٹر اور مولانا، کانگرسی اور کمیونسٹ، پروفیسر اور تاجر، بنگالی اور غیر بنگالی اس درجہ مختلف مشرب و مسلک اور مذہب و زبان کے لوگ شریک ہوں۔

جب کلکتہ پہونچا تو اس زمانہ میں ڈاکٹر کاٹجو مغربی بنگال کے گورنر تھے۔ ان کے بعد پروفیسر مکرجی وہاں کے گورنر ہوئے۔ یہ عجیب و غریب شخصیت کے مالک تھے گورنر ہونے سے پہلے کلکتہ یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر اور صدر شعبہ تھے۔ آزادی کے بعد جو دستور ساز اسمبلی بنی یہ اس کے نہایت فعال اور باثر ممبر تھے چنانچہ دستور کی ترتیب اور اس کی زبان کی صحت میں ان کا بڑا دخل رہا ہے۔ مذہبًا عیسائی تھے لیکن عقیدۃً و عملاً مہاتما گاندھی کے نہایت سچے اور مخلص پیرو تھے۔ لباس اور غذا دونوں بہت سادہ رکھتے تھے۔ گورنر کی تنخواہ میں سے صرف ڈھائی سو روپے ماہوار لیتے تھے۔ باقی رقم خیراتی کاموں اور خصوصًا تعلیم کے لئے مخصوص کر دیتے تھے چنانچہ ان کے انتقال کے بعد اخبارات سے معلوم ہوا کہ انہوں نے عورتوں اور پسماندہ طبقات کی تعلیمی اعانت و امداد کے لیے پانچ لاکھ روپے کی اور بعض اور کاموں کے لے تین چار لاکھ روپے کی وصیت کی ہے۔ پروفیسر کرجی سے پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب میں پرنسپل کلکتہ مدرسہ کی حیثیت سے ان سے راج بھون میں ملا اور ان سے کلکتہ مدرسہ کے جلسۂ تقسیم اسناد کی صدارت اور خطبہ پڑھنے کی درخواست کی۔ موصوف نے نہ صرف یہ کہ میری درخواست بڑی خوشی سے منظور کر لی بلکہ دیر تک مسلمانوں کے معاملات و مسائل پر بڑی یکسوئی اور توجہ کے ساتھ گفتگو فرماتے رہے۔ جب میں رخصت ہونے لگا تو فرمایا میں اب ایک ایسی جگہ پر ہوں جہاں میں براہ راست مسلمانوں کی مشکلات اور ان کی دشواریوں سے واقف نہیں ہو سکتا لہٰذا جب کبھی ان معاملات و مسائل کے سلسلہ میں میری امداد کی ضرورت ہو آپ بے تکلف اگر مجھ کو ان سے باخبر کریں۔ اس کے بعد فرمایا۔ میں بہت خوش ہوں گا اگر آپ یوں بھی مجھ سے وقتاً فوقتاً ملتے رہیں۔ میں نے ان سے وعدہ کیا اور چلا آیا۔ چنانچہ میں ان کے پاس گورنمنٹ ہاؤس کبھی کبھی بلا بھی جاتا تھا اور اس کے علاوہ بعض سرکاری اور غیر سرکاری تقریبات میں وہ بھی یاد فرماتے تھے۔ ان کی وضعداری کا عالم یہ تھا کہ کلکتہ یونیورسٹی کی ملازمت کے زمانے میں وہ جس محلہ میں رہتے تھے اس میں ایک مسلمان نیچہ بند کی بھی دکان تھی پروفیسر مکرجی کو حقہ پینے کا بھی شوق تھا اور اس تقریب سے ان کا مسلمان نیچہ بند کے ہاں آنا جانا اور اس سے ملنا جلنا تھا۔ اپنی اس وضعداری کو انہوں نے گورنر ہونے کے بعد بھی اس طرح قائم رکھا کہ عید بقرعید پر اس شخص کے آکر گلے ملتے

لئے اور اس کے بیوی بچوں کے لئے برابر تحفے تحائف بھیجنے اور کبھی کبھی کار بھیج کر اس کو اپنے ہاں بلاتے اور خاطر مدارات کرتے تھے۔

کلکتہ مدرسہ کا جلسہ تقسیم اسناد جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ پروفیسر مکرجی حسب وعدہ اس میں تشریف لائے۔ صدارت کی، اسناد تقسیم فرمائیں اور پھر مسلمانوں کے تعلیمی مسائل پر ایک نہایت بصیرت افروز خطبہ پڑھا۔ جلسہ کے بعد عصرانہ کا انتظام تھا۔ میں موصوف کے پاس بیٹھا ہوا تھا جب میں نے چکن سینڈوچ اور پیسٹری وغیرہ کی پلیٹ ان کے سامنے پیش کی تو انہوں نے ہنستے ہوئے معذرت کی اور فرمایا۔ اگر آپ اب سے بیس برس پہلے یہ پیش کش کرتے تو میں ضرور قبول کر لیتا مطلب یہ تھا کہ اب ادھر بیس برس سے وہ صرف سبزی خور ہی نہیں ہو گئے ہیں بلکہ کوئی ایسی چیز بھی نہیں کھاتے جس سے بد ہشی پن کی بو آتی ہو چنانچہ بالائی، مٹھائیاں اور پھل ان میں سے تھوڑا تھوڑا لے کر انہوں نے تناول فرمایا اور بس!

اب پروفیسر کرجی کا ذکر آیا ہے تو انہیں جیسے ایک اور بزرگ کا بھی تذکرہ سن لیجئے۔ ڈاکٹر آر کے سوفٹ کلکتہ کے ایک نامی گرامی ڈاکٹر ہیں۔ اصلاً پنجابی ہندو ہیں لیکن ان کا خاندان ایک عرصہ سے یہاں آباد ہے اور ان کا پورا گھرانہ "این خانہ ہمہ آفتاب است" کا مصداق ہے یعنی ان کے علاوہ، ان کی بیوی، لڑکا، بہو، بیٹی اور داماد ماشاء اللہ سب ڈاکٹر ہیں۔ اور خوش اخلاقی اور ملنساری میں ایک سے ایک بڑھ کر۔ کلکتہ کے ایک بہت مشہور اور پرانے کانگرسی رہنما پروفیسر رام۔ اے رحیم میرے اور ڈاکٹر سوفٹ کے مشترک دوست تھے میں ان سے اکثر ڈاکٹر صاحب کی انسان دوستی اور جذبۂ خدمت خلق کی داستانیں سنتا تھا اور خوش ہوتا تھا لیکن میری پہلی ملاقات اس طرح ہوئی کہ ایک روز اچانک مغرب کے بعد وہ میرے یہاں پہنچ گئے اور اپنا تعارف کرایا اور ساتھ ہی بولے مجھ کو پروفیسر رحیم سے معلوم ہوا کہ آپ کا ایک لڑکا کئی برس سے ایک دماغی مرض میں گرفتار ہے آپ اس کی وجہ سے بہت پریشان ہیں اور علاج پر روپیہ پانی کی طرح بہانے کے باوجود اب تک اس کو افاقہ نہیں ہے تو میں آپ کے اس لڑکے کو دیکھنا چاہتا ہوں شاید میں آپ کی کچھ خدمت کر سکوں۔
میں ان کے اس بے محابا انداز کرم گستری سے شرم کے مارے پانی پانی ہو گیا
—— ان کا بے حد شکریہ ادا کیا اور بچہ کو اندر سے بلا کر ان کے سامنے پیش کیا انہوں نے دیر تک اس کا معائنہ کیا حالات پوچھے اور تسکین اور تشفی کی باتیں کہیں میں نے ڈرتے ڈرتے فیس پیش کی تو بولے فیس کیسی؟ کیا آپ نے مجھ کو بلایا تھا؟ میں تو خود ہی آیا ہوں اور صرف اسی قدر نہیں بلکہ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اب یہ بچہ آپ کا نہیں میرا ہے۔ چنانچہ انہوں نے علاج شروع کیا اس سلسلہ میں کبھی ہفتہ میں ایک مرتبہ وہ اپنے صاحبزادے کو بھیجتے تھے اور کبھی بچے کو خود اپنے گھر بلاتے تھے۔ بچہ جب کبھی ان کے ہاں جاتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنے کسی قریبی رشتہ دار کے مکان میں آ گیا ہو۔ مٹھائی پھل اور چائے سے اس کی تواضع ہوتی تھی۔ اور ڈاکٹر صاحب کی بیوی اولاد کا سا اور ان کی بہو

اور لڑکی سوال جیسا سلوک کرتی تھی۔ فیس کا یا کار کے پٹرول کی قیمت کا تو ذکر ہی کیا ہے۔
ڈاکٹر صاحب کا یہ معاملہ تو وہ تھا جو انہوں نے خود میری ذات کے ساتھ کیا اور جس
کو میں کبھی فراموش نہیں کرسکتا اب ان کا ہی ایک اور واقعہ سنئے۔ پروفیسر اے
رحیم نے ایک دن سنایا کہ ڈاکٹر سونث ایک دن میرے مکان پر بیٹھے گفتگو کر رہے
تھے اسی اثنا میں ان کو معلوم ہوا کہ جو حجرے میں سے امام کا لحاف اور گدا اور ایک
رضائی لے گئے ہیں اور اب پروفیسر صاحب چندہ کر رہے تھے کہ امام صاحب کے
لئے وہ چیزیں مہیا کر دی جائیں۔ ڈاکٹر صاحب کو اس کا علم ہوا تو وہ بہت بگڑے
اور بولے آپ لوگ بھی غضب کرتے ہیں بھلا کب یہ چندہ پورا ہوگا اور کب اس سے
یہ چیزیں خریدی جائیں گی۔ آخر امام صاحب آج کی رات اس سردی میں کیسے کاٹیں
گے۔ اس کے بعد انہوں نے پروفیسر صاحب سے کہا: رحیم یہ چندہ بند کرو اور جس
سے وصول کر لیا ہے اُسے واپس کر دو میں ابھی ان سب چیزوں کا انتظام کئے دیتا
ہوں۔ چنانچہ یہ کہہ کر فوراً اٹھے اور کلکتہ کے مشہور بازار اسپلینیڈ سے نہایت عمدہ
بنا بنایا ریشمی ابرہ کا لحاف، ایک گدا، ایک رضائی اور ایک تکیہ خرید کر ایک ڈیڑھ
گھنٹہ کے بعد واپس پہونچے اور رحیم صاحب سے بولے بتائیے، مسجد کہاں ہے؟
رحیم صاحب نے ہر چند منع کیا کہ آپ خود نہ جائیے میں بھجوا دوں گا مگر ڈاکٹر صاحب
بالکل نہ مانے اور آخر یہ سب چیزیں ٹیکسی میں لے کر خود مسجد میں پہونچے اور امام صاحب
کے حوالے کیں تب ان کی بے چینی دور ہوئی اور انہیں اطمینان ہوا۔

یہ تو بڑے لوگوں کی باتیں اور اُن کے اخلاق کا ذکر تھا اب ذرا معمولی درجے کے
اور گمنام لوگوں کا بھی ایک واقعہ سن لیجئے۔ کلکتہ کی ریاستی شاخ انجمن ترقی اُردو کی دعوت
پر کل ہند انجمن ترقی اُردو کا سالانہ جلسہ تھا اور اس تقریب کے سلسلے میں انڈو پاک مشاعرہ
بھی تھا۔ مشاعرہ جس کا داخلہ ٹکٹ سے تھا۔ شروع ہو چکا تھا۔ میں کانفرنس کے صدر
استقبالیہ کی حیثیت سے جناب روش صاحب صدیقی کو ایک ٹیکسی میں لے کر مشاعرہ
گاہ پہنچا اور ٹیکسی کا کرایہ پوچھا ریٹ کے لگ بھگ ہوتا تھا پیش کیے تو ٹیکسی کے ڈرائیور نے
جو ایک سکھ تھا، مجھ سے پوچھا یہ اندر پنڈال میں کیا ہو رہا ہے"؟ انڈو پاک اُردو مشاعرہ
میں نے جواب دیا۔ اب اس نے پوچھا آپ کے ساتھ کون صاحب آئے ہیں؟ میں نے
کہا "حضرت روش صدیقی جو بہت مشہور اور مقبول شاعر ہیں"۔ بس یہ سننا تھا کہ سردار
جی بولے "تو صاحب! اب میں آپ سے کرایہ نہیں لوں گا"۔ میں نے پوچھا "بھئی یہ
آخر کیوں"؟ سردار جی نے جواب دیا "دیکھئے آج کل اُردو کی جو حالت ہے اس کی
وجہ سے ہر اُردو بولنے والے کا فرض ہے کہ جو کچھ وہ اس زبان کے لئے کرسکتا ہے وہ
کرے اور پھر یہ شاعر تو اُردو کا جھنڈا اونچا کئے ہوئے ہیں اور شاعر اپنے شعروں سے ہمارا
دل خوش کرتے ہیں اس لئے ان کی خدمت کرنا ہمارا ویسے بھی فرض ہے۔ اس
گفتگو کے بعد میں نے ہر چند اصرار کیا لیکن سردار جی ایک نہ مانے اور کرایہ نہیں لیا
تب میں نے ان کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور مشاعرہ کا ایک اعزازی ٹکٹ ان
کے حوالہ کیا کہ جہاں چاہیں بیٹھ جائیں۔

اس قسم کے واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ قومی یک جہتی پیدا کرنے کا
سب سے زیادہ موثر ذریعہ یہ ہے کہ مختلف مذہب و زبان اور مختلف رنگ و نسل
کے لوگوں میں باہم سوشل تعلقات ہوں تاکہ وہ ایک دوسرے کے جذبات و احساسات
کو اچھی طرح سمجھیں اور اس طرح ایک دوسرے کی عزت کرنا اور اس کے ساتھ ہمدردی
اور خیراندیشی کا معاملہ کرنا سیکھیں۔

موسمِ آرزو

ساجدہ زیدی

کہیں پہ جلتے رہے دل کی آرزو کے دیئے
کہیں پہ بجھنے لگے دیپ کبھی نگاہوں کے
سمٹ گئے، کبھی جوشِ جنوں سے دریا سے
بکھر گیا کبھی تارِ نظر کبھی راہوں میں
کبھی تھی وقت کے سینے میں آرزو پیوست
جلس گئی کبھی دوپہرِ زیست میں ہر سانس
کبھی تو نالۂ شب چیرتا تھا سینۂ شب
گزر گئی کبھی اک عمر، جیسے مہر بہ لب
حکایتِ لب و رخسار گاہ شعلہ طراز
طویل شب کبھی، اور اپنے سانس کی آواز
وہ انتظار کبھی جس میں ہر نگاہ کے ساتھ
سمٹ کے آگئی خود آرزو کی روحِ جمیل
وہ بے یقینی کا موسم کبھی کہ جس میں وجود
خود اپنے سائے کی مانند بے نشان رہا
کبھی وہ دل میں تمناؤں کا ہجوم کثیر
کہ جم گئی وہیں محفل جہاں قیام ہوا
کبھی وہ ذہن کا خالی مکاں کہ فکرِ حبیب
بھی اس دیار سے دامن کشاں رہی برسوں
کتابِ عمر کے کتنے ورق پلٹ ڈالے
مگر نگاہِ پریشاں ٹھہرتی ہی نہیں:

غزلیں

اختر علی تلہری

نہیں ہے برّشِ تیغِ جفا وہ میرے قاتل کی
نگاہِ حسرتِ آگیں دیکھ لی کیا اپنے بسمل کی

میرا عشقِ جنوں مشرب ستم سے دب نہیں سکتا
ہیں زندانِ بلا میں بھی وہی آزادیاں دل کی

ابھی گرداب کی طوفاں نفس موجوں سے لڑنا ہے
ابھی مجھ کو نہیں ہے فکر عشرت گاہِ ساحل کی

مقدر اس کا ہے پامالِ گامِ رہرواں ہونا
خبر کیا خاکِ جادہ کو طربہائے منازل کی

کہیں سے تیشۂ فرہاد مل جائے تو لطف آئے
بہت یاد آرہی ہے اُس بتِ شیریں شمائل کی

بچھاتا ہے زمانہ راہ میں کس شوق سے آنکھیں
ذرا توقیر دیکھو اپنے پابندِ سلاسل کی

بہارِ گلشنِ ہستی سمائے کیا نگاہوں میں
حیاتِ مختصر دیکھے ہوئے ہوں شمعِ محفل کی

گلوں کا رنگ و بو جنت بداماں ہی سہی لیکن
میرے کانوں سے ٹکراتی ہیں فریادیں عنادل کی

منادی عشق نے آخر مری وہ شانِ خودداری
چلا ہوں پھر اُسی ظالم سے کہنے داستاں دل کی

خبر بھی ہے تجھے اے مہرِ طلعت کہکشاں رفعت
ترے جلوؤں کی ہیں مشتاق نظریں اہلِ محفل کی

ہے اختر ذوق خود ہی رہنما اس صعب منزل میں
مجھے حاجت نہیں فنِ قوافی و فواصل کی!

غلام ربّانی تاباں

آئینہ ٹوٹ گیا، عکس بھی ٹوٹا ہوگا
کس نے سوچا تھا یہ انجامِ تمنا ہوگا

رات اُمڈی ہی چلی آتی ہے طوفاں کی طرح
بجھ گئی درد کی قندیل بھی اب کیا ہوگا

سر چھپانے کا کوئی شوق کرے گا ساماں
زلف کا سایا نہ ہو دار کا سایا ہوگا

تیز تر وقت کی رفتار ہوئی جاتی ہے
دمِ سجود شام کہ پیغامِ سحر کیا ہوگا

مسکراتے ہوئے زخموں کے حسیں پھولوں پہ
بے نیازی کو تری پیار تو آیا ہوگا!

(قطعہ)

تیری محفل نہ سہی درد کی محفل ہوگی
زندگی کے لئے کوئی تو سہارا ہوگا!
فکر ٹوٹے ہوئے خوابوں سے حرارت لے گی
دل پہ بیتے ہوئے ایام کا سایا ہوگا

کٹ رہی ہیں بس اک اُمید پہ راہیں تاباں
بے ٹھکانوں کا بھی کوئی تو ٹھکانا ہوگا!

میر اور یقین

نثار احمد فاروقی

میر نے ایک بار سرہند کا سفر کیا تھا یہ (۴۸-۱۷۴۷ء / ۱۱۶۱ھ) کا واقعہ ہے۔ اس زمانے میں وہ عظیم اللہ صوبیدار مالوہ کے بیٹے نواب رعایت خاں کی سرکار سے وابستہ تھے اس وابستگی کا واقعہ میر نے یوں لکھا ہے کہ ایک دن خان آرزو نے کھانے پر بہت بُرا بھلا کہا میر بغیر کھانے اُٹھ گئے اور اُن کے گھر سے نکل کر جامع مسجد کا رستہ لیا۔ قاضی حوض پر ان کی ملاقات علیم اللہ نامی کسی شخص سے ہوئی اس نے خود ہی پوچھا "تم میر محمد تقی میر ہو؟" انہوں نے کہا تم نے کیسے پہچانا؟ وہ کہنے لگا "تمہاری سودائیانہ وضع تو مشہور ہے" رعایت خاں نے جو عظیم اللہ خاں کا لڑکا اور اعتماد الدولہ قمر الدین خاں کا بھانجا ہے جب سے تمہارے اشعار سنے ہیں تم سے ملاقات کرنے کا بہت مشتاق ہے اگر تم میرے ساتھ چل کر اس سے ملو تو میرے لئے بھی باریابی کا بہانہ ہو جائے گا میں جاکر ملا، بڑی شرافت سے پیش آیا اور مجھے اپنا رفیق بنا لیا اس کی ملازمت سے مجھے فائدہ پہنچا اور تنگ دستی سے چھٹکارا مل گیا"[1]

فارسی میں میر نے عظیم اللہ خاں کو "یزنۂ قمر الدین خاں" کہا ہے "یزنہ" کا مطلب ترکی زبان میں شوہرِ خواہر یعنی بہنوئی ہوتا ہے۔[2] اس رشتے سے رعایت خاں بھانجا ہوا زیادہ صحیح رشتہ یہ ہے۔

میر رعایت خاں — میر محمد امین خاں

عظیم اللہ خاں ↓ رعایت خاں

نواب قمر الدین خاں ↓ دختر منسوب بہ رعایت خاں

نور النساء بیگم (منسوب بہ عظیم اللہ خاں)
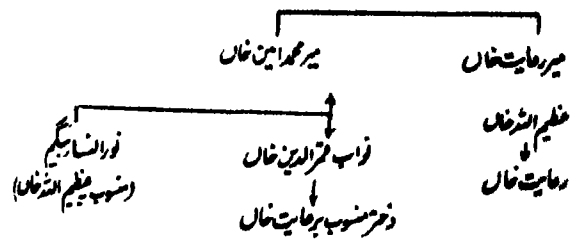
میر کا تعلق ملازمت ۱۷۴۷ء میں کسی وقت قائم ہوا۔ اسی زمانے میں لاہور کے گورنر شاہنواز خاں نے احمد شاہ ابدالی کو دعوت نامہ بھیجا کہ اگر آپ ہندوستان پر حملہ کریں تو میں اس شرط پر آپ کا ساتھ دوں گا کہ بعد حصول فتح مجھے عہدۂ وزارت دیا جائے۔ احمد شاہ ابدالی یہ دعوت پاکر وسط دسمبر ۱۷۴۷ء میں پشاور سے روانہ ہوا۔ ۸ جنوری ۱۷۴۸ء کو لاہور کے قریب شاہدرہ میں خیمہ زن ہوا۔[4] اس سازش کے خطرناک نتائج پر غور کرتے ہوئے شاہنواز خاں کے ماموں نواب قمر الدین خاں نے شاہنواز خاں کو امداد دینے سے روک لیا مگر ابدالی نے پیش قدمی جاری رکھی اور شاہنواز خاں کو شکست دے کر قلعۂ لاہور پر قبضہ کر لیا جب قلعہ دہلی میں لاہور کے سقوط کی خبر پہنچی تو محمد شاہ نے جو ان دنوں بیمار تھا شہزادہ احمد شاہ، نواب قمر الدین خاں، راجا جے سنگھ سوائی (جے پور) کے لڑکے ایشور سنگھ وغیرہ کی نگرانی میں دو لاکھ فوج بھیجی اور جو ۲۵ فروری ۱۷۴۸ء کو سرہند پہنچی۔ اسی لشکر میں رعایت خاں بھی تھا اور اس کے ہمراہ میر تقی میر شریکِ کارواں تھے۔ ابدالی نے ۲ مارچ ۱۷۴۸ء کو سرہند پر قبضہ کر کے لوٹ مار شروع کر دی۔ ۱۱ مارچ ۱۷۴۸ء جمعہ (مطابق ۲۲ ربیع الاول ۱۱۶۱ھ) کو تقریباً دس بجے دن کے نواب قمر الدین خاں اپنے خیمے میں چاشت کی نماز پڑھ رہے تھے کہ ناگاہ توپ کا ایک گولا اُن کی ٹانگ میں آکر لگا جس کے صدمے سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔[5]

---

[1] میر کی آپ بیتی (طبع اول ۱۹۵۷ء) ص ۹۸-۹۹

[2] ذکر میر (طبع اول) ص ۶۷

[3] خواجہ احمد فاروقی نے اپنی کتاب میں ایک جگہ لکھا ہے: "یہ عظیم اللہ خاں کا بیٹا اور قمر الدین خاں۔۔ کا بہنوئی تھا" (میر تقی میر حیات اور شاعری ص ۱۱۲) اسی طرح ص ۴۴ پر ہے: "میر رعایت خاں سے ذکر ہو گئے۔ یہ عظیم اللہ خاں کے بیٹے اور۔۔ قمر الدین خاں کے بہنوئی تھے" حالانکہ میر نے فارسی میں یوں لکھا ہے "رعایت خاں کہ پسر عظیم اللہ یزنہ اعتماد الدولہ قمر الدین خاں باشد" (ذکر میر ص ۶۷) اس سے بھی ظاہر ہے کہ "یزنہ" کی نسبت عظیم اللہ اور قمر الدین کے مابین ہے اگر رعایت خاں مراد ہوتا تو واوِ عطف آتی "کہ پسر عظیم اللہ خاں و یزنۂ قمر الدین خاں" مگر اسی کتاب میں فاروقی صاحب نے ڈاکٹر عبدالحق پر اعتراض کیا ہے کہ مولوی عبدالحق نے یزنہ کا ترجمہ نواسا کیا ہے جو صریحاً غلط ہے۔" (ص ۴۴۵)

[4] احمد شاہ ابدالی کے حملوں کی تفصیلات کے لئے فارسی میں سیر المتاخرین دیکھی جائے۔ اس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ انگریزی میں سرکار کی کتاب کے علاوہ گنڈا سنگھ کی قابلِ قدر تصنیف "احمد شاہ درانی" ملاحظہ ہو۔ میر نے جس حملے کا بیان ذکر کیا ہے۔ یہ ابدالی کا پہلا حملہ تھا۔

[5] سیر المتاخرین ۱۹/۳ ۔ ماثر الامرا ۱/۳۵۸

نواب معین الملک نے اس خبر کو صیغۂ راز میں رکھا اور وہ خود نواب قمرالدین خاں کے ہاتھی پر سوار ہو کر مقابلے کے لئے نکلا۔ اتفاق سے ابدالی کے توپ خانے میں آگ لگ گئی اور اس کی فوج کے ہاتھی بھاگنے لگے، تقریباً ایک ہزار فوجی جل کر بھسم ہو گئے۔ مجبوراً ابدالی کو میدان سے ہٹنا پڑا اور شاہی فوج نے میدان مار لیا۔ اس واقعے کی تاریخ "فتح خداساز" (۱۱۶۱ھ) ہے۔ جب اس فتح کی خبر دہلی کو بھیجی گئی تو محمد شاہ نے ازراہ خوشنودی معین الملک کو لاہور کا گورنر مقرر کر دیا۔ وہ اپنی وفات تک (۳ر نومبر ۱۷۵۳ء) اس عہدے پر فائز رہا۔ رعایت خاں معین الملک کے ساتھ جنگ میں شریک تھا، جب وہ لاہور کو روانہ ہوا تو رعایت خاں نے صفدر جنگ کے ساتھ دہلی کا رخ کیا۔ ابھی یہ قافلہ پانی پت پہنچا تھا کہ محمد شاہ کے انتقال کی خبر معلوم ہوئی۔ شہزادہ احمد شاہ ساتھ ہی تھا۔ صفدر جنگ نے اسے تخت نشین کیا، احمد شاہ نے اسے وزارت پر فائز کر دیا۔ [53]

اسی زمانے میں جاوید خاں خواجہ سرا کا عروج شروع ہوا۔ اسے نواب بہادر کا خطاب مرحمت ہوا اور میر بھی اس کے دامن دولت سے وابستہ ہو گئے۔

اندازہ یہ ہے کہ رعایت خاں کی سرکار سے میر کا تعلق اواخر ۱۷۴۷ء سے اواخر ۱۷۴۸ء تک تقریباً ایک سال رہا۔ صفدر جنگ نے بخشی گری کا عہدہ نواب سادات خاں ذوالفقار جنگ کو دے دیا۔[54] سادات خاں نے راجا ابھے سنگھ والی جودھپور کے چھوٹے بھائی بخت سنگھ کو صوبہ اجمیر کی نیابت دے دی اور اس طرح دونوں بھائیوں کو آپس میں لڑوا دیا۔ بخت سنگھ نے اپنی فوج کی کمان رعایت خاں کے سپرد کر دی اور اسے اپنے ساتھ لے کر اجمیر کا سفر کیا۔ اس وقت بھی میر تقی میر رعایت خاں کے ہمراہ تھے۔ سانبھر کے مقام پر فوجوں میں مقابلہ ہوا۔ ابھے سنگھ نے میدان ہاتھ سے جاتا دیکھا تو ملہار راؤ ہولکر کو ثالث بنا کر صلح کر لی۔ اب میر سانبھر سے اجمیر آئے اور انہوں نے درگاہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی زیارت کی اور آس پاس کی سیر کر کے پھر سانبھر کو واپس ہو گئے جہاں رعایت خاں کا لشکر خیمہ زن تھا۔[55]

اس موقع پر رعایت خاں اور راجہ بخت سنگھ کی کسی معاملے میں بدکلامی ہو گئی۔ رعایت خاں کی طرف سے ستار قلی خاں کشمیری نے راجہ بخت سنگھ کو گالیاں دے ڈالیں۔ اس سے رنجش اور بڑھی اور یہ خدشہ پیدا ہو گیا کہ رعایت خاں اور بخت سنگھ کی فوجیں ایک دوسرے کے مقابل نہ آ جائیں۔ رعایت خاں نے میر تقی میر کو بھیجا کہ بخت سنگھ سے معذرت کریں اور یقین دلائیں کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ سفارت کے یہ فرائض میر نے انجام دیئے[56] مگر بخت سنگھ کا دل صاف نہیں ہوا۔ اس نے رعایت خاں کے رسالے کی تنخواہ بے باق کر کے رخصت کر دیا۔ رعایت خاں اپنے متوسلین کو لے کر دہلی آ گیا۔ میر بھی آ گئے۔

اسی زمانے میں ایک چاندنی رات کو رعایت خاں کے سامنے ڈوم کا لڑکا میٹھا گا رہا تھا۔ خاں نے میر سے کہا کہ اسے اپنے ریختہ کے دو تین شعر یاد کرا دو۔ یہ دھن بنا کر سنا دے گا۔ میر کو یہ بات ناگوار گذری کہ انہیں ایک ڈوم کے لڑکے کو تعلیم کی خدمت سپرد کر دی گئی۔ طوعاً و کرہاً اسے شعر تو یاد کرا دیئے مگر اگلے دن سے رعایت خاں کے دربار میں جانا چھوڑ دیا۔ رعایت خاں نے بطور تلافی میر کے چھوٹے بھائی میر محمد رضی کو اپنے پاس سے گھوڑا دے کر ملازم رکھ لیا۔ مدت کے بعد ملاقات ہوئی تو معذرت بھی کی، میر نے بھی گذشتہ را صلوٰۃ کہی۔

کچھ زمانے کے بعد وہ اسد یار خاں کے توسط سے جاوید خاں خواجہ سرا کی سرکار سے وابستہ ہو گئے۔[57] اسد یار خاں[58] نے گھوڑے اور نوکری کی شرط معاف کرا دی گویا برائے نام خدمت رہی وظیفہ مقرر ہو گیا۔

یہ روداد ہے رعایت خاں سے وابستگی کی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں رعایت خاں کا کچھ تعارف کرا دیا جائے۔ نظام الملک آصف جاہ اول کے مورث اعلیٰ شیخ سمرقندی صدیقی تھے۔ ان کے دو فرزند ہوئے ایک کا نام میر بہاء الدین تھا۔ دوسرے میر عابد قلیچ خاں (متوفی ۱۰۹۸ء) تھے۔ میر بہاء الدین کے دو فرزند

---

[53] میر کی آپ بیتی (طبع اول)، ص ۹۸ ۔ ۱۰۰ ۔ ذکر میر (طبع اول)، ص ۹۸ ۔ ۹۹

[54] میر کی آپ بیتی ص ۱۰۱

[55] میر کی آپ بیتی ص ۱۰۲

[56] میر کی آپ بیتی ص ۱۰۲

[57] جاوید خاں خواجہ سرا نے احمد شاہ بادشاہ کی ماں کے ذریعے نواب بہادر کا خطاب حاصل کیا تھا۔ یا امور سلطنت میں اس حد تک دخیل ہوا کہ صفدر جنگ نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے اسے دعوت کے بہانے گھر بلایا (۸ر شوال ۱۱۶۵ھ / ۲۸ر اگست ۱۷۵۲ء) اور قتل کر کے لاش دریا میں پھنکوا دی۔ کئی ہزار متوسلین جو اس کی سرکار سے وابستہ تھے بے روزگار ہو گئے۔ ان میں میر تقی میر بھی تھے۔ اب میر نے مہا راجہ دیوان ... کی ملازمت کر لی۔ ذکر میر ص ۷۲ ۔ میر کی آپ بیتی ص ۱۰۶

[58] اگرچہ اسد الدولہ اسد یار خاں انسان تخلص بھی تھا، ان کا انتقال ربیع الاول ۱۱۵۸ھ مارچ ۱۷۴۵ء میں ہو چکا تھا (تاریخ محمدی: ۱۲۰) اور جاوید خاں کا عروج ۱۱۶۱ھ کے بعد ہوا ہے۔ غالباً یہ دوسری شخصیت ہے۔

تھے. ایک نواب رعایت خاں (متوفی ۱۱۵۳ھ) دوسرے نواب محمد امین خاں (متوفی ۱۱۳۳ھ/۱۷۲۰ء) بد رعایت خاں کو میر عابد قلیچ خاں کی دختر فاطمہ بیگم (وفات ۱۱۵۳ھ) منسوب ہوئی تھیں. ان کے بطن سے نواب ظہیر الدولہ عظیم اللہ خاں بہادر مجاہد جنگ صوبیدار مالوہ (وفات ۱۱۵۷ھ/۱۷۴۴ء) پیدا ہوئے تھے. اور انہیں میر محمد امین خاں (وفات ۱۱۳۳ھ/۱۷۲۰ء) کی بیٹی نور النساء بیگم منسوب تھیں. ان کے بطن سے رعایت خاں پیدا ہوا تھا جو میر تقی میر کا مربی ہے. اس رعایت خاں کو میر محمد امین خاں کی پوتی یعنی نواب قمر الدین خاں (وفات ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) کی بیٹی منسوب تھیں. قمر الدین خاں کی دوسری بہن نواب زکریا خاں (وفات ۱۱۵۸ھ/۱۷۴۵ء) کو بیاہی تھیں جن سے شاہنواز خاں پیدا ہوا تھا جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے.

میر عابد قلیچ خاں کے ایک بیٹے میر شہاب الدین (غازی الدین خاں) فیروز جنگ تھے اور ان کے فرزند ریاست حیدر آباد کے بانی آصف جاہ اوّل (وفات ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) تھے. یہ ایک ہی خاندان کے کل افراد کا شجرہ نہیں ہے. چند اہم نام گنائے گئے ہیں [۱] ان میں کوئی لاہور کا گورنر ہے کوئی مالوے کا، کوئی حیدر آباد کا، کوئی وزیر اعظم ہے. غرض اس خاندان کے تمام افراد معزز عہدوں پر فائز رہے اور شاہی خاندان کے بعد عزت و وجاہت اور اقتدار و ثروت میں انہیں کا درجہ تھا. مگر میر کی بد دماغی کا یہ عالم تھا کہ رعایت خاں کی ذراسی فرمائش سے برافروختہ ہو گئے.

سفر سرہند کا دوسرا حوالہ میر نے اپنے تذکرہ نکات الشعراء میں دیا ہے، انہوں نے انعام اللہ خاں یقین کے حال میں لکھا ہے: "پدرش اظہر الدین خاں نام دارد، با جدش در سرہند ملاقات کردہ بودم بسیار آدم با مزہ یافتہ، بسلوک پیش آمدہ و ضیافت فقیر کردہ تا دیر نشستہ صحبت مستوفی داشتم. شعر بطرز می گوید" [۳] اس سے ظاہر ہے کہ سفر سرہند (۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء) کے دوران میر نے یقین کے دادا سے ملاقات کی تھی. انہوں نے میر کی اچھی خاطر مدارات کی. غالباً کھانے پر بھی مدعو کیا. دیر تک گفتگو رہی. وہ اپنے طرز کے شعر بھی کہتے تھے. انعام اللہ خاں یقین کے لئے بیشتر تذکرہ نگاروں نے [۱] "نبیرۂ شاہ گل وحدت" لکھا ہے. چنانچہ دیوان یقین کے مرتب مرزا فرحت اللہ بیگ بھی لکھتے ہیں.

"یقین... کے دادا حضرت شیخ عبد الاحد نقشبندی مجددیؒ اپنے کمالات باطنی کی وجہ سے مرجع خلائق تھے. تو ان کے نانا نواب حمید الدین خاں اپنی شجاعت و بہادری کے باعث سلطنت کے رکن رکین مانے جاتے تھے. ان کا سلسلہ نسب اگر ددھیال کی طرف سے چوتھی پشت میں حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانیؒ اور بنیسویں واسطے سے خلیفہ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ تک پہنچتا تھا تو ننھیال کی جانب سے چوتھی پشت میں باقی خاں قلماق چیلہ شاہجہانی سے جا ملتا تھا... حضرت شیخ احمد سرہندی کے بعد آپ کے دو فرزند شیخ احمد سعید اور شیخ محمد معصوم وسادۂ ہدایت وارشاد پر بیٹھے. شیخ احمد سعید کے بعد ان کے فرزند شیخ عبد الاحدؒ المعروف بشاہ وحدت، متخلص بہ گل، سجادہ نشین ہوئے. یہ انعام اللہ خاں یقین کے دادا ہیں. آپ کی شہرت کا یہ حال تھا کہ میر تقی میر جیسا بد دماغ شخص ان کی خدمت میں حاضر ہوا... شیخ عبد الاحدؒ کے فرزند شیخ اظہر الدین سرہند چھوڑ دہلی آئے. یہاں آپ کے خاندانی فضائل کا ہر شخص معتقد تھا. سب نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور نواب حمید الدین خاں نے اپنی صاحبزادی کی شادی آپ سے کر دی" [۲]

زمانۂ مابعد میں میر کے مؤرخ اور نقاد ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے میر کے سفر سرہند کا علیحدہ عنوان کے تحت ذکر نہیں کیا اور اس بات کو سرے سے لائق اعتنا نہیں سمجھا کہ میر نے انعام اللہ یقین کے دادا سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے اور تذکرہ نگاروں نے ان کے دادا کا نام عبد الاحد عرف شاہ گل وحدت بتایا ہے. جنہوں نے مؤلف روضۃ القیومیہ کی روایت کے مطابق ۲۷ ذی الحجہ ۱۱۲۷ھ (مطابق ۲۴ دسمبر ۱۷۱۵ء) کو انتقال کیا. بندرابن خوشگو نے عہد فرخ سیری میں ۱۱۲۰ھ/۱۷۰۸ء وفات ہونا

---

[۱] اسی خاندان کے ایک فرد اور نظام الملک آصف جاہ اوّل کے پوتے نواب عماد الملک نے (۱۱۶۵ھ/۱۷۵۱ء میں) نواب صفدر جنگ سے سازش کر کے احمد شاہ سے میر الامراء کا منصب حاصل کر لیا. احمد شاہ نے صفدر جنگ کی سازشوں سے عاجز آکر نواب انتظام الدولہ پسر نواب قمر الدین خاں کو وزارت عظمیٰ دے دی جو عماد الملک کا ماموں بھی ہوتا تھا. عماد الملک نے احمد شاہ کو اندھا کر کے تخت سے اتار دیا جس کا بیان میر نے بھی کیا ہے (ذکر میر ص ۲۴، میر کی آپ بیتی ص ۱۰۹) اور عالمگیر ثانی کو اس کی جگہ بادشاہ بنا دیا. (۱۰ شعبان ۱۱۶۷ھ/۲ جون ۱۷۵۴ء)

[۳] نکات الشعراء (طبع اوّل) ص ۸۵

[۱] یقین کے سلسلے میں ملاحظہ ہوں: نکات الشعراء ۹۳-۸۴، مخزن نکات ۴۹، گردیزی ۱۴۶، چمنستان شعراء ۱۷۱-۳۶۳، گلشن گفتار ۴۹-۴۴، میر حسن ۲۰۲، تذکرۂ ہندی ۲۷۵-۲۷۸، مسرت افزا ۱۷۴-۱۷۹، مجموعہ نغز ۲: ۳۵۵، مجمع الانتخاب قلمی ورق ۸۸ ب (تین تذکرے ۱۴۰)، تذکرہ ضیغم قلمی ۱۰۹، تذکرہ بے جگر قلمی ورق ۷۲ ب، تذکرۃ الشعراء قلمی ورق ۹۰ الف، رائج الشعراء قلمی ورق ۷۴ ب، دیوان جہاں ۲۷۸، گلشن سخن ۲۴۳، سرور ۸۲۵، شیفتہ ۲۴۳، شمیم سخن ۲۵۹، اشپرنگر ۲۲۳، گلزار ۲۶۱-۲۵۹

[۲] دیباچہ دیوان یقین (طبع ۱۹۳۰ء) ص ۱۰-۱۱

بیان کیا ہے، لیکن زیادہ صحیح ۱۱۲۶ھ/۱۷۱۴ء ہے جو ایک قطعہ تاریخ وفات سے ثابت ہے۔[1]

میر کی ولادت کا سنہ متفقہ طور پر ۱۱۳۵ھ/۲۳-۱۷۲۲ء ہے اور وہ شاہ گل وحدت کی وفات سے کئی سال کے بعد عالم وجود میں آئے ہیں۔ تو آخر ان کی ملاقات کس طرح ہوگئی۔

واقعہ یہ ہے کہ میر نے وحدت کو قطعاً نہیں دیکھا تھا۔ پھر انہوں نے نکات الشعراء میں غلط بیانی کیوں کی؟ انہوں نے یقین کے دادا کے دھوکے میں کسی اور سے ملاقات کی ہوگی؟ ایسا بھی نہیں ہے۔ وہ یقین کے دادا سے ملے تھے اور شاہ گل وحدت سے نہیں ملے تھے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے؛

حضرت خواجہ محمد سعید (۱۰۰۵-۱۰۷۰ھ) کے سات فرزند تھے[2]: ۱۔ عبداللہ ۲۔ محمد خلیل اللہ ۳۔ محمد شاہ فرخ (۱۰۳۸ھ/۱۶۲۹ء-۱۱۲۲ھ/۱۷۱۰ء) ۴۔ شیخ سعدالدین ۵۔ شاہ عبدالاحد المعروف بہ شاہ گل وحدت (۱۰۴۹ھ/۱۶۳۹ء-۱۱۲۶ھ/۱۴-۱۷۱۳ء) ۶۔ نام معلوم نہیں ۷۔ محمد یعقوب۔

شیخ عبدالاحد وحدت کے چار فرزند اور تین صاحبزادیاں تولد ہوئیں۔ سب سے بڑے محمد ابو حنیفہ[3] تھے جن کے پوتے شیخ محمدی المعروف بہ شاہ بھیک ہوئے۔ دوسرے کا نام محمد جواد تھا، تیسرے محمد نقی اور چوتھے نورالحق تھے۔ خواجہ محمد سعید کے ساتویں فرزند محمد یعقوب کی اولاد میں عصمت اللہ تھے۔ ان کے چار فرزند اور ایک دختر تھیں۔ بڑے کا نام صفت اللہ تھا، یہ لاولد فوت ہوئے، دوسرے سلطان المشائخ، تیسرے ولی اللہ، چوتھے غلام الٰہی تھے۔ دختر کا نام جاناں بیگم تھا۔ عصمت اللہ کے یہی تیسرے بیٹے اردو کے مشہور شاعر شاہ ولی اللہ اشتیاق دہلوی[4] ہیں، جن کا حال قدیم تذکروں میں ملتا ہے اور جنہیں غلطی سے شاہ ولی اللہ دہلوی فرزند شاہ عبدالرحیم دہلوی سمجھ لیا جاتا ہے۔ شیخ عبدالاحد وحدت کے تیسرے فرزند محمد نقی شاعر تھے، اور تقی تخلص کرتے تھے۔ ان کے دو فرزند ہوئے، بڑے کا نام محمد ظہوراللہ تھا۔ یہ مجذوب تھے اور غیر معقب رہے۔ دوسرے محمد اظہرالدین ہیں جنہیں خانی کا خطاب تھا اور نواب محمد اظہرالدین خاں[5] مبارز جنگ کہلاتے ہیں، انہیں نواب عبیدالدین خاں کی دختر منسوب ہوئیں۔

اظہرالدین خاں کے تین بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ بڑے محمد عرفان اللہ بچپن میں مر گئے تھے، منجھلے محمد احسان اللہ اور چھوٹے محمد انعام اللہ تھے۔ یہی اردو کے مشہور شاعر انعام اللہ خاں یقین ہیں۔ محمد احسان اللہ کے دو فرزند تھے محمد مشتاق تو بچپن میں فوت ہوئے اور دوسرے شاہ محمد آفاق، مشہور نقشبندی بزرگ ہیں جو ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ء میں پیدا ہوئے۔ اور (۷ر محرم ۱۲۵۱ھ/۵ر مئی ۱۸۳۵ء) کو انتقال کیا۔ شاہ محمد آفاق کے اولاد نرینہ نہیں تھی، دو صاحبزادیاں بی بی عائشہ اور بی بی فاطمہ یادگار چھوڑیں۔

انعام اللہ خاں یقین کے تین فرزند اور دو دختر یادگار رہیں، مقبول النبی[6]، صمصام اللہ اور مرید حسین۔ ایک دختر مبارک بیگم تھیں دوسری کا نام معلوم نہ ہوا۔

سہولت کے لئے یہاں خاندان یقین کا شجرہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ باہمی قرابت

---

[1] گلشن وحدت (مرتبہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں)؛ مقدمہ نزہتہ الخواطر ۱۳۵/۶ میں ہے کہ ولادت ۱۰۵۰ھ میں ہوئی، انتقال ۲۰ر ذی الحجہ ۱۱۲۰ھ کو دہلی میں ہوا۔ جسد سرہند لے جا کر دفن کیا گیا لیکن تاریخ ۱۱۲۶ھ ہی زیادہ صحیح ہے۔

[2] انساب الطاہرین (قلمی) مولفہ شاہ محمد عمر نقشبندی مجددی

[3] ان کا نام انساب الانجاب، وغیرہ میں محمد ابو حنیفہ بھی ملتا ہے۔ اور یہی زیادہ معروف ہے۔ شاہ محمد عمر نے خود اپنے قلم سے ابو حنیفہ لکھا ہے۔

[4] اشتیاق کے لئے درگا داس نے تذکرہ سفینۂ عشرت (تالیف ۱۱۷۵ھ/۱۷۶۱ء) میں لکھا ہے؛ شاہ ولی اللہ اشتیاق تخلص، درویشے بود بعنی آشنا، در کوٹلہ فیروز شاہ واقع دہلی کہنہ اقامت داشت در نیم ودو صدو چہل و چند دامی اجل را بیک قبول گفت (قلمی نسخہ کتب خانہ خدا بخش (پٹنہ) ورق ۵۰۔الف)، یہ عبدالغنی بیگ قبول کے شاگرد تھے (باغ معانی قلمی ورق ۵۰ب)

مزید حالات کے لئے رجوع شود: نکات الشعراء، ۲۶؛ مخزن نکات، ۱۸؛ گردیزی، ۸؛ مسرت افزا، ۲۰؛ میر حسن، ۸؛ تذکرہ گلشن ہند (حیدری)، ۴۴؛ عیارالشعراء خوب چند ذکا (قلمی خدا بخش) ورق ۲۸۔الف؛ خمخانہ جاوید، ۱؛ ۳۰۸

• رسالہ ہندوستانی (الہ آباد) ۱۹۳۸ء

[5] نواب اظہرالدین خاں بھی شاعر تھے۔ تذکرہ باغ معانی مولفہ نقش علی (قلمی نسخہ خدا بخش پٹنہ) میں ورق ۲۵۰ب کے حاشیے پر لکھا ہے: "اظہرالدین خاں اظہر تخلص نبیرۂ شیخ گل است الناپذیر شیخ احمد مجدد الف ثانی... بمصاہرت عبیدالدین خاں بہادر معتز بود در فن شعر شاگرد شاہ قابل مرحوم است پسرش یقین تخلص از شعرائے شیوا بیان ہندی زبان زماں است" اظہر کا ایک فارسی شعر دیا ہے۔

پیشتر ز وصل درد و غم نصیب ما شود
دل ز ما گم می شود دلدار تا پیدا شود

[6] مقبول النبی بھی شاعر تھے۔ ان کا حال تذکرہ مسرت افزا (معاصر پٹنہ)، ص ۱۹۹ میں ملے گا۔

[7] عیارالشعراء خوب چند ذکا (قلمی نسخہ خدا بخش) ورق ۸ب

کاحال یک نظر واضح ہو جائے۔ اس کی تیاری میں کتاب انساب الانجاب (طبع ۱۳۳۴ھ) خواجہ محمد حسن اور شاہ محمد عمر نقشبندیؒ کی قلمی بیاض سے مدد لی گئی ہے جس کا نام انساب الطاہرین ہے۔ ان کے علاوہ الیانع الجنی، تذکرۃ الانساب (مولفہ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ)، نزہتہ الخواطر (مولفہ سید عبدالحیٔ) اور ہدیۂ احمدیہ بھی پیش نظر رہی ہیں۔ شجرے کے غیر ضروری افراد کا یہاں ذکر نہیں کیا گیا۔

اِنعام اللہ خاں یقین کا شجرۂ نسب

خواجہ محمد سعید نقشبندیؒ[1] (وفات ۱۰۷۰ھ)

- شاہ عبدالاحد وحدت[2] (ف ۱۱۲۶ھ)
  - نورالحق
  - محمد نقی
    - محمد ظہیر اللہ
    - محمد ظہیر الدین خاں
      - فاطمہ بیگم
      - مریم بیگم
      - عائشہ بیگم
      - محمد انعام اللہ خاں یقین
        - دختر
        - مبارک بیگم
        - مرید حسین
        - صمصام اللہ
        - مقبول النبی[4]
      - محمد احسان اللہ
        - شاہ محمد آفاق نقشبندی[3] (ف ۱۲۵۱ھ)
        - محمد مشتاق
      - محمد عرفان اللہ
  - محمد جواد
  - محمد ابو حنیف
    - محمد ذکی
      - شیخ محمد مشہور بہ شاہ بھیک
  - دختر
- محمد یعقوب
  - عصمت اللہ
    - شاہ ولی اللہ اشتیاق دہلوی (ف بعد ۱۱۴۴ھ)

اس شجرے سے پہلی بار یہ معلوم ہوگا کہ شاہ ولی اللہ اشتیاق دہلوی سے یقین کا کیا رشتہ ہوگا؟ یقین کے کتنے بھائی بہن تھے۔ اور ان کی اولاد ذکور و اناث کتنی تھی۔ نیز شاہ محمد آفاق دہلوی[3] ان کے بھتیجے تھے۔ اور یہ بات بھی روشن ہو جائے گی کہ سرہند میں میر تقی میر نے ان کے دادا محمد نقی[5] سے ملاقات کی تھی۔ جو شاہ عبدالاحد المعروف بہ شاہ گل وحدت تخلص کے بیٹے تھے۔ اس شجرے کی روشنی میں دیکھئے تو فرحت اللہ بیگ کے محولہ بالا بیان میں آتنی باتیں محتاج اصلاح ہیں۔

(الف) یقین کا نسب شیخ مجدد الف ثانی تک چار واسطوں سے نہیں پانچ سے منتہی ہوتا ہے۔

(ب) شیخ عبدالاحد وحدت یقین کے دادا نہیں پر دادا تھے۔ ان کے دادا کا نام محمد نقی تھا اور

(ج) میر نے ان سے ہی ملاقات کرنے کا حال نکات الشعرا میں لکھا ہے۔

مقدمہ دیوان یقین میں اس کے علاوہ بھی بعض امور اصلاح طلب ہیں۔ ان سے ہم نے دوسرے مضمون میں بحث کی ہے جو اس کے بعد آئے گا۔

(۲)

مناسب ہوگا کہ یہاں یقین کی ننھیال کا بھی کچھ ذکر کر دیا جائے۔ نواب

---

[1] خواجہ محمد سعید کے فرزند محمد فرخ شاہ کے صاحبزادے علی رضا سے ولی گجراتی بیعت تھے۔ (گلشن وحدت ص ۴۴)

[2] وحدت صاحب تصانیف تھے۔ (نزہتہ الخواطر ۱۳۵/۶) ان کے مکتوبات کا مجموعہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے ۱۹۶۶ء میں کراچی سے شائع کیا ہے جس کا نام گلشن وحدت ہے۔ اسے وحدت کے خلیفہ محمد مراد کشمیری نے فراہم کیا تھا جن کا ذکر ولی گجراتی کے اس شعر میں ہے: ؎

مقصود دل ہے اس کا خیال اے ولی مجھے
جو جگ زباں کا ورد محمد مراد ہے

نیز دیکھئے روضۃ القیومیہ ۲۹۵/۱، سفینۂ خوشگو: ۶۹، ہمیشہ بہار: ۲۶۰

[3] شاہ محمد آفاق نقشبندی کے لئے رجوع شود آثار الصنادید (طبع ۱۹۶۵ء) ص ۲۴۴

[4] فرحت اللہ بیگ نے یقین کی صاحبزادیوں کا تذکرہ نہیں کیا۔ بظاہر وہ ان سے بے خبر ہیں۔ اولاد ذکور کی ترتیب بھی یوں لکھی ہے کہ بڑے فرزند مرید، منجھلے صمصام اور چھوٹے مقبول (مقدمہ دیوان یقین ۲)، لیکن انساب الطاہرین (قلمی) سے معلوم ہوتا ہے کہ بالعکس صحیح ہے۔ یعنی بڑے لڑکے مقبول تھے اور چھوٹے مرید۔

[5] ان کا نام شیخ محمد عمر نقشبندیؒ نے اپنی بیاض میں محمد نقی ہی لکھا ہے۔ یہی قدرت اللہ شوق نے تکملۃ الشعرا، قلمی ورق ۳۱۵۔ الف میں لکھا ہے (نسخہ رام پور) مگر لچھمی نرائن شفیق کے تذکرہ باغ معانی (قلمی نسخہ پٹنہ) میں ورق ۴۴۔ الف غلطی سے ان کا ترجمہ حرف ت میں درج ہے اور نام محمد تقی بتایا ہے۔ "محمد تقی تقی تخلص، خلف وحدت، این مطلع از و میر لطف اللہ سہرندی در تذکرہ خود نوشتہ"

مفت است یار طرفہ سیہ مست می رود
فردا قیامت است، شب اندست می رود

حمیدالدین خاں نیمچہ[1] تو مشہور شخصیت ہیں۔ انہوں نے ۸ر صفر ۱۱۴۱ھ/۱۳ر ستمبر ۱۷۲۸ء کو ۶۵ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ ان کے باپ کا نام سردار خاں ہے۔ یہ ۱۱۰۳ھ/۱۶۹۱ء میں فوت ہوئے اور دادا باقی خاں تھے۔

حمیدالدین خاں کے ایک فرزند عبدالباقی خاں[2] تھے اور دو صاحبزادیاں تھیں ایک نواب اظہرالدین خاں کو منسوب ہوئیں گویا انعام اللہ خاں یقین کی والدہ تھیں اور دوسری ہدایت اللہ خاں بن عنایت اللہ خاں[3] کشمیری کو بیاہی تھیں۔ ہدایت اللہ نے ۱۱۴۴ھ/۱۷۳۱ء میں بہ عمر ۳۵ سال انتقال کیا۔ یہ انعام اللہ خاں یقین کے خالو تھے۔

میر نے اپنے تذکرہ نکات الشعراء میں لکھا ہے کہ "یقین کے بارے میں لوگ کہتے ہیں مرزا مظہر انہیں شعر لکھ کر دیا کرتے ہیں اور شاعری میں اپنا وارث بنا لیا ہے۔ اس بات پر ہنسی آتی ہے کیوں کہ ہر شے وارث کو پہنچ سکتی ہے مگر شعر۔ مثلاً اگر کوئی اپنے باپ کے اشعار پر بھی متصرف ہو یا اس کا مضمون اڑا لے تو اُسے بھی چور ہی کہا جائے گا"۔ پھر آگے چل کر کہتے ہیں کہ ملاقات سے اتنا تو اندازہ ہو ہی جاتا ہے کہ "ذائقہ شعر فہمی" مطلق نہیں ہے اسی وجہ سے لوگ ناموزوں ہونے کا گمان کرتے ہیں۔ ایک طبقے کا یہ بھی خیال ہے کہ یقین کے اشعار نقص سے خالی نہیں ہیں۔ پھر ایک شخص سے روایت کی ہے کہ عطیۃ اللہ خاں پسر عنایت اللہ خاں کے گھر یقین بیٹھے تھے اور کہہ رہے تھے کہ جب سے استاد نے میرے سر پر ہاتھ رکھا ہے میری شاعری میں نمایاں ترقی ہوگئی ہے۔ شخص مذکور (راوی) نے اس پر سب کے سامنے بلند آواز سے نظامی کا مصرع پڑھ دیا؛

شد آں مرغ کو خایہ زریں نہاد

اس پر یقین بوکھلا گئے۔[4]

ان باتوں سے قطع نظر یہ دیکھئے کہ عطیۃ اللہ خاں کون تھے؟[5] عنایت اللہ خاں کشمیری (ف ۱۱۳۸ھ/۱۷۲۵ء) کا حوالہ اوپر آچکا ہے۔ ان کے پانچ فرزند تھے۔
۱۔ ہدایت اللہ خاں ۲۔ ضیاء اللہ خاں ۳۔ روح اللہ خاں ۴۔ عبیداللہ خاں ۵۔ عطاء اللہ خاں۔ ہدایت اللہ خاں کے بیٹے کا لقب بھی ہدایت اللہ خاں تھا جو یقین کے خالو تھے اور عطاء اللہ خاں کا لقب عطیۃ اللہ خاں تھا۔ بعد کو انہیں بھی "عنایت اللہ خاں" خطاب خاندانی عطا ہوا اور کشمیر کی صوبیداری تفویض کی گئی۔ وہاں ۱۱۵۴ھ/۱۷۴۱ء میں کسی نے انہیں شہید کر دیا تھا[6]۔ اس سے واضح ہو گیا ہوگا کہ عطیۃ اللہ خاں یقین کے خالو ہدایت اللہ خاں کے چچا تھے۔ یقین کی ننھیال کے یہ رشتے تو ہمیں معلوم ہیں۔ ممکن ہے کہ باہم رشتہ داری کا یہ سلسلہ اور وسیع رہا ہو اور خود یقین کی بیوی بھی اسی خاندان کی فرد ہوں۔ میر نے صرف عطیۃ اللہ خاں کے مکان پر یہ لطیفہ پیش آنے کا ذکر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ خود عطیۃ اللہ خاں تو ۱۱۵۴ھ میں مر چکے تھے اور مرزا مظہر جان جاں (ف ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۰ء) بقید حیات تھے۔ لطیفہ ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۰ء کے بعد کا ہوگا۔ اگر اس میں نظامی کے مصرع سے مرزا مظہر کی وفات کا کنایہ نہیں ہے۔ بدیں صورت میر ۱۱۹۵ھ کے بعد لکھنؤ جا چکے تھے اور اس لطیفے کو زمانہ مابعد کا اضافہ ماننا پڑے گا۔ ترجمہ یقین اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ خود یقین بھی زندہ ہیں۔ ان کی وفات ۱۱۶۹/۱۷۵۵ء میں ہوئی ہے۔[7]

---

[1] حمیدالدین خاں کے لئے رجوع شود؛ مآثرالامراء ۱: ۶۰۵۔ تاریخ محمدی: ۶۸، ۱۹۹

[2] ان عبدالباقی خاں کے فرزند مرزا مغل جرأت شاگرد سودا تھے۔ یہ بریلی میں رہتے تھے۔ (عیارالشعراء قلمی ورق ۸۰ ب)

[3] عنایت اللہ کشمیری عہد اورنگ زیب کی مشہور شخصیت ہیں، ربیع الاول ۱۱۳۸ھ/ ۲ر نومبر ۱۷۲۵ء میں فوت ہوئے ۵۰ سال عمر پائی۔ ہفت ہزاری ہفت ہزار سواری ان کا منصب تھا۔ (مآثرالامراء ۲: ۸۲۸) دیکھئے؛ تاریخ محمدی ص ۱۱، ۱۹۵

[4] نکات الشعراء (طبع اول) ص ۸۵

[5] واقعات کشمیر؛ ۲۵۵ تاریخ محمدی؛ ۱۱۹، ۲۲۰

[6] واقعات کشمیر؛ ۲۵۵ میں قاتل کا نام "دیارام نوکر عمدہ ابوالبرکات خاں" بتایا ہے محمدی: ۲۲۰

[7] چمنستان شعراء (بحوالہ عبدالحکیم حاکم) ۱۳۳ نیز تاریخ محمدی (قلمی: رامپور) تحت ۱۱۶۹ھ

ھندوستان کی مسجدیں

سامنا

ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔
وہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ بے فکر، منہ سے دھواں اگلتا ہوا، بڑبڑاتا ہوا، بار بار سر کو جھٹکے دیتا ہوا۔

"تم قاتل ہو۔" میں نے اس کو کٹہرے میں کھڑا کر دیا۔

"تم بڑے مکار ہو۔" اس نے اپنی بڑی بڑی دھانی ہوئی آنکھیں میری آنکھوں میں ڈال دیں۔ میری آنکھوں میں کیکٹس اگنے لگے۔ اس کی آنکھوں نے بڑے زور سے قہقہہ لگایا میں ڈر گیا۔ وہ کٹہرے ہی میں تھا۔ مگر یہ کٹہرا الیوژن بھی تو ہو سکتا ہے۔ میں نے کٹہرے کو چھو کر دیکھا۔ سب ٹھیک تھا۔ میں محفوظ تھا۔

"بولو، بولو، تم کیا کہتے ہو۔" کٹہرے سے آواز آئی۔

"کیا کہوں؟"

"بتاؤ تم مکار ہو یا نہیں۔؟"

"میں پوچھتا ہوں تم نے قتل کیوں کیا؟"

"قتل میں نے کیا؟ قتل ہوا کون؟"

"یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔"

کٹہرے سے پھر قہقہہ پھوٹ پڑا۔ کمرہ دھوئیں سے بھر گیا۔ نہ جانے کمرہ تھا یا کھلا میدان یا دریا۔ دریا ہی تھا۔ پانی کی سطح پر لاش تیر رہی تھی اور اندھیرے میں چاندی کی طرح چمک رہی تھی پانی میں۔ جہاز کنارے سے بہت دور تھا۔ یہ سب تھا مگر سب کمرے میں تھا اور کمرہ سگریٹ کے دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے کٹہرے کو چھو کر دیکھا۔ سب ٹھیک تھا میں محفوظ تھا۔

خدا و اماں کہرے کی طرح ہے۔ ہر چیز دھندلی ہے، سرد ہے، بے ضرر ہے، خاموش ہے، ایک کہرا سا ہوا میں چمکوں کی طرح بکھرتا ہے، تیرتا ہوا آتا ہے اور مجھ سے لپٹ جاتا ہے۔ ٹھنڈی سی نمی میرے ہونٹوں اور آنکھوں کو چومتی ہے اور میری روح میں گھل جاتی ہے جس کی خاموشی خالی کنوئیں کی طرح گونج رہی ہے۔

بیئر کا مگ جھاگ سے بھرا ہوا ہے میں بیئر کا مگ اٹھاتا ہوں اور منہ سے لگاتا ہوں۔ جھاگ میری مونچھوں میں پھنس جاتا ہے۔ بیئر زبان پر تیرتی ہے۔ یہ بیئر نہیں ہے۔ جھاگ بھی نہیں۔ بس ایک مزا ہے جو زبان پر تیرتا ہے۔ نہ جانے بوتل کتنی دیر برف کے نیچے دبی رہی ہے لیکن اب بیئر گرم ہو رہی ہے۔ جھاگ بھی گرم ہو رہا ہے۔ موسم گرم ہے۔ ایئر کنڈیشنر گھن گھن کر رہا ہے۔ اس کی ٹھنڈک قالین میں جذب ہو رہی ہے۔ اٹھاؤ مگ پیو پیو۔ میں پی رہا ہوں مزا تلخ ہے۔ زبان تلخ ہے۔ تلخی تلخی میں گھل رہی ہے سمندر کے جھاگ کی طرح۔ شام کے وقت۔ شام جو تمہارے چہرے پر کتنی جھریاں ابھر آئی ہیں۔ تمہارا چہرہ پیش دالان ہے۔ چہرہ پیش دالان ہے جس پر جھریاں ابھر آئی ہیں۔ وقت جھریاں ڈال دیتا ہے وقت جھریاں مٹا دیتا ہے، وقت ہونٹ بھی ہے، بوسہ بھی ہے، وصال بھی ہے، وقت پھولوں سے بھرا درخت بھی ہے۔ وقت بیئر کا مگ ہے۔ جو خالی ہو چکا ہے۔ جس میں جھاگ بھرا ہوا ہے۔ وقت میرا بازو ہے۔ وقت کسی کی کمر ہے۔ نانسنس! مجھے نیند آ رہی ہے۔ پیو اور پیو۔ یہ بوتل زیادہ ٹھنڈی ہے۔ یہ بوتل زیادہ دیر تک برف میں دبی رہی ہے۔ ہر چیز برف میں دب کر رہ جاتی ہے۔ برف میں یا مٹی میں۔ صرف وقت ہے جس کو نہ برف میں دبایا جا سکتا ہے۔ نہ مٹی میں۔ لیکن جب تم بیئر کا دسواں مگ بھی خالی کر لو گے تو میں تمہیں دبا دوں گا۔ مجھے؟ کیوں؟ کیونکہ تم وقت نہیں ہو۔ دبا دو۔ برف میں؟ نہیں مٹی میں! کیوں! کیوں کہ تم قتل ہو چکے ہو۔ جو قتل ہو جاتا ہے۔ اسے مٹی میں دبا دیا جاتا ہے

وہ اب بھی کٹہرے میں کھڑا تھا۔ وہ اپنے ہونٹوں کا جھاگ چاٹ رہا تھا۔ اس کا لمبوترا چہرہ نیلا پڑ گیا تھا۔ زہر اس کی نس نس میں بس گیا تھا جھاگ تک کا رنگ نیلا تھا۔ میں سانپ کے زہر کا رنگ دیکھ رہا ہوں مجھے فیصلہ کرنا ہے۔ مجھے کینچلی سے نکلنا ہے میں اپنے زہر کو پہچانتا ہوں۔ مجھے اپنا زہر پینا ہے۔ مجھے اپنے زہر کے ساتھ سفر کرنا ہے مجھے نس نس میں بسنا ہے۔

شکار کٹہرے میں کھڑا تھا۔ شکار کا رنگ نیلا تھا۔ جھاگ سفر کر رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر پپڑیوں کی طرح جم رہا تھا۔ "تم کٹہرے میں بند ہو اور میں آزاد ہوں۔ اب تم میرا سر نہیں کچل سکتے۔ میں پھن پھیلا سکتا ہوں جہاں چاہوں رینگ کر جا سکتا ہوں قتل ہونے کے بعد بھی چلتا ہوں۔ مگر یوں کہ آہٹ نہیں ہوتی۔"

آہٹ اور آہٹ :

شکار کے ہونٹوں پر جمی ہوئی پپڑیوں سے چھری کی دھار کی طرح روشنی پھوٹی
مگوں میں ٹھنڈی تولیں خالی کی جا رہی ہیں لیکن مگ خالی ہیں۔ نئی قالین پر تیر
رہی ہے خاموشی بول رہی ہے۔ کمرے میں سرگوشیوں کے سوا کچھ نہیں۔

تم جو کچھ کہہ رہی ہو میں سمجھتا ہوں۔ میں نے تم کو نہیں بلایا تم خود آئی ہو اور اس طرح آئی ہو، تم بھی انجان، میں بھی انجان۔ میں ہوں، تم ہو۔ ہمارے لباسوں کا ڈھیر ہے۔ چند لمحوں کا ملبہ ہے ہم زندگی بھر لباسوں کے ڈھیر میں لمحوں کے ملبے تلے دبے رہتے ہیں لیکن اب ہم آزاد ہیں۔ ہمارے لباس بھی آزاد ہیں۔ ہم رات کی طرح ہیں جس نے اپنا چولا اتار دیا ہے ہم شبیہ ہو گئے ہیں۔ خواب کی طرح۔ لباس ہمیں بھاری بنا دیتے ہیں۔ لباس جھوٹ کی طرح ہیں۔ لباس ہمارا وزن بڑھا دیتے ہیں۔ ہمارے جسم کتنے ہلکے ہیں۔ شعلے کی طرح۔ تم تھک رہی ہو اور شعلے بجھ رہے ہیں۔ پھر اپنی سانس کا بوجھ بڑھ رہا ہے اب رومانی باتیں نہ کرو صفحۂ بھیگے ہوئے لباس کی طرح ہیں۔ بوجھل۔ لباس کا بوجھ بڑھ رہا ہے وہ کیا چیز تھی جو تمہیں یہاں لائی اس اندھیرے کمرے میں۔ اس اندھیرے میں جو بات تم نے سرگوشی میں کہی ریگستانی بگولے کی طرح ہے بگولہ اٹھا اور سو گیا۔ تم بھی سو گئیں صرف وہ بات جاگ رہی ہے جو تم نے سرگوشی میں کہی۔ وہ ہی ایک بات۔ پیاس۔ صدیوں پرانی پیاس۔ تمہارا چہرہ کتنے رنگ بدلتا ہے۔ تجربے نے تمہیں تھکا دیا ہے۔ تمہاری سانس اب بھی قابو میں نہیں۔ خاموش پڑی رہو۔ میں پھر سے جاگ رہا ہوں اور تم پر چھا رہا ہوں تم سے بے نیاز ہوں لیکن میرا جسم آزاد ہے۔ تم بھی مجھ سے بے نیاز ہو۔ لیکن تمہارا جسم آزاد نہیں کیونکہ تمہیں اپنے جسم کا احساس ہے۔ مجھے کوئی احساس نہیں۔ احساس کے قیدی، احساس کے قیدی! میں انہیں نہیں جانتا۔ وہ مجھے نہیں جانتے۔ شعلے بجھ جاتے ہیں تو بوجھ بڑھ جاتا ہے لیکن میں بوجھ نہیں ہوں۔ میں اپنے بوجھ سے الگ ہوں میں الگ ہوں۔ سانس لے میں قیدی نہیں ہوں۔ قیدی: میں ٹھنڈی سانس لے رہا ہوں۔ لیکن میں اپنی ٹھنڈی سانس سے بلند ہوں، بلند :

یہ سب کتنا عجیب ہے ؛

دونوں، تھکے ہوئے، بیکار سے، لاشوں کی طرح، سیدھے سیدھے، پڑے ہیں۔

یہ سب کتنا عجیب ہے۔ تم غلط سمجھے۔ میں اس لئے نہیں آئی تھی۔ ہاں: میں اکثر غلط سمجھتا ہوں اور میں اب بھی یہی سمجھتا ہوں۔ تم اس لئے تو آئی تھیں۔ اور اب سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ ہم سیدھے سیدھے، پاس پاس پڑے ہیں۔ ہمارے جسموں کا رنگ، جو دو سانچوں میں ڈھلا ہوا ہے، اندھیرے میں کافور کے ڈھیر کی طرح نظر آ رہا ہے۔ کیا کہا۔ ہا ہا! میں یہاں اس لئے نہیں آئی تھی۔ میں ہمیشہ لباس میں چھپی رہی ہوں۔ راز کی طرح میرا انتظار کرتی رہی۔ برسوں۔ کوئی آئے اور یہ راز کھول دے۔ کھول دے، کھول دے، پلٹے۔ کوئی نہیں۔ میں نے اپنے آپ کو بچا بچا کر رکھا۔ الہامی کتاب کی طرح جزدان میں چھپا کر۔ میری بات مان لو۔ میں یہاں اس لئے نہیں آئی تھی۔ لیکن جب یہاں آئی تھی تو دیکھا تمہاری باتوں اور میری باتوں نے ایک سنگم سا بنا دیا ہے۔ ہمارے وصال کی سطح ہمارے جینے کی سطح ہے۔ ہمارے جینے کی سطح ہمارا ذہن ہے، ہماری سوچ جو موم بتی کی طرح لوٹ رہی ہے وہی ہے اور باقی کچھ نہیں۔ باقی دو جسم ہیں۔ ہاں باقی دو جسم ہیں اور دو جسم پاس پاس لیٹے ہیں۔ تھکے ہوئے، ویران، خالی، ہم لیٹے ہیں اور اندھیرے میں اپنے پیروں کو دیکھ رہے ہیں۔ پیر پرچھوں کی طرح منہ کھولتے ہیں۔ اور اونگھنے لگے ہیں۔ پلنگ کے چوہے ہم خوبصورت ہیں۔ ہم جی رہے ہیں۔ لیکن لگتا ہے ہم مر چکے ہیں۔

کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ میں قصاب ہوں۔ میری دکان میں ذبح کی ہوئی بکریاں کیلوں سے لٹک رہی ہیں اور میں باری باری سے ان کی کھال اتار رہا ہوں۔ خون سے لت پت رانوں پر ہاتھ پھیر رہا ہوں۔ سڈول اور سرخ رانیں جن سے بھاپ اٹھ رہی ہے۔ آہستہ آہستہ شام کے وقت جنگل کو چھوڑتی ہوئی سرد روشنی کی طرح۔

"میں کب تک کٹہرے میں کھڑا رہوں گا۔؟"

" فیصلے کا انتظار کرو۔"

" میں کسی چیز کا، کسی کا، انتظار نہیں کر سکتا۔"

"انتظار نہیں کر سکتے۔ تو جہنم میں جاؤ۔"

"کیوں ؟"

" جو انتظار نہیں کر سکتے۔ وہ جہنم میں چلے جاتے ہیں۔"

اس نے کٹہرے کی ریلنگ کو زور سے دبوچ لیا۔ اس کا مبوتر اچہرہ اور لمبا ہو گیا اور تانبے کی طرح چمکنے لگا۔ اس کی مٹھیوں کی رگیں رسی کی طرح ابھر آئیں۔ اس کی آنکھیں ایک دھبے پر جم گئی تھیں وہ اسی ایک دھبے کو گھورے جا رہا تھا۔

" میں انتظار کروں گا آخر تک انتظار کروں گا۔ میں جانتا ہوں تم بھی تمہیں اپنے جرم کا اقرار کرو گے۔"

" کرو، کرو انتظار۔"

" تم مسکرا رہی ہو۔ میں بھی مسکرا رہا ہوں۔ تم اور میں، دونوں کتنے دھندلے ہو گئے ہیں۔ ہم اسی طرح سمٹے لیٹے کہرے کی طرح پگھل جائیں گے مٹ جائیں گے۔

ہا ہا ہا :

" تم بڑے مکار ہو۔ اب جب مہینوں اور برسوں کا ڈھیر لگ چکا ہے۔ میں تم سے اپنا حساب چکانا چاہتا ہوں۔"

رات آہستہ آہستہ دھندلکے میں ڈوب رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں کھڑکی کے باہر درختوں کی پھنگیں بھیگی ہوئی لکڑیوں کے ڈھیر کی طرح خاموش نظر آئیں گی جب پو پھٹتی ہے یہی ہوتا

بھیکیوں کے ڈھیر گودڑیوں کی طرح کھل جاتے ہیں۔
"جاڑے کی رات ہے اور تم کو پسینہ آ رہا ہے۔" کٹہرے میں آواز گونجی اور دیواروں میں کیلوں کی طرح پیوست ہو گئی۔

گرم پانی کی لہر ہمارے اوپر سے گزر چکی ہے۔ اس کو بھی جانے صدیاں بیت گئیں۔ میں اس وقت قصاب کی دکان پر پڑا ہوا چھچھڑا ہوں۔ بلی میرے پاس گھر خرخرا رہی ہے! اس کا پیٹ بھرا ہوا ہے۔ اس کی آنکھوں میں، اس کی روح میں اور رووئیں میں نیند ہے۔ میں اپنے آپ سے ہٹ کر اپنے آپ کو دیکھ رہا ہوں۔ سکڑا ہوا، سر تندی اور متوج سے الگ، جھلی ٹھنڈا، باسی بے جان گوشت کا ٹکڑا۔ آخر میں یہی ہوتا ہے۔ بے جلالی کا انجام میں اس کے نہیں آئی تھی۔ میں اس لئے نہیں آیا تھا۔ وہ سمٹ جاتی ہے اور سیدھی لیٹی لیٹی پوچھتی ہے۔ کچھ پوچھتی ہے میرے پورے جسم میں جھرجھری سی دوڑ جاتی ہے۔ میرے جسم کے انگنت مسان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور اگر کچھ ہو گیا۔ دیکھو فرش پر۔ ہا ہا ہا! وہ کروٹ بدل لیتی ہے۔ اس کا جسم گرم ہو جاتا ہے۔ اس کے رووئیں رووئیں سے سورج کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں۔ حوا نے آدم سے یہی پوچھا تھا۔ آدم بے چارا۔ تنہا خاموش انسان۔ وہ میرے وجود کو انہی باتوں سے گرم کر دیتا ہے۔ پگھلا دیتا ہے۔ یہ میری ٹریجڈی ہے۔ لیکن اس وقت میں اپنے آپ سے بلند ہو چکا ہوں۔ یہ بھی میری ٹریجڈی ہے۔ بات یہ ہے کہ میں نے وہ کر دکھایا جو پہلے کسی سے نہیں ہو سکا۔ میں نے سیکس کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا ہے

یہ معاملہ پرانا ہو چکا ہے۔ کئی دن ہو چکے ہیں اور میں اس عورت کو بھول چکا ہوں جو صرف اپنے ذہن کی سطح پر جیتی ہے۔ عورت، جو روزمرہ کو ایک روحانی تجربہ اور معجزہ بنا دیتی ہے۔ ہا ہا ہا! ایک سرسری سی ملاقات، ایک ہلکا سا اشارہ، ایک ذرا سا فلرٹیشن، ایک ادھ ادھورا فقرہ، ایک ذرا سی کھوئی کھوئی کیفیت، سگرٹ کے لگاتار کش، ووڈکا اور پکاسو کی باتیں، کچھ اسپنج، کچھ کتابوں کا ذکر۔ اور سارا تجربہ کیا سے کیا ہو گیا وہ چلی گئی اور بالکل روایتی معشوقوں کی طرح کہہ گئی۔ خط لکھنا۔ کتنی عجیب بات ہے خط۔ اگر میں ایسے تمام تجربوں کے بعد خط لکھنا شروع کر دوں تو ساری تنخواہ ٹی اے سمیت ڈاک خانے کے پیٹ میں چلی جائے۔ وہ دھندلکے میں چلی گئی۔ بستر پر میرے پاس ایک شکن ہے اور کچھ بھی نہیں۔ میں قصاب ہوں اور ذبح کی ہوئی بکریوں کی کھال اتار رہا ہوں اور میرا کسی بکری سے جذباتی رشتہ نہیں ہے۔ میں غیر رومانی آدمی ہوں۔ میں نت نئے تجربوں میں جیتا ہوں۔ میری سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ میں کسی عورت کو مایوس نہیں کر سکتا۔ اور یہی میری کمی ہے شاید عورت کی بھی۔ ان ہی باتوں میں عمریں گزر جاتی ہیں۔ ان ہی باتوں میں صدیاں بیت جاتی ہیں یہ ثابت کرنے میں کہ میں تم سے مختلف ہوں۔ میں وہی ہوں جو تم نہیں ہو۔ بلکہ شاید، میں جو ہوں تم نہیں ہو سکتے۔ حالانکہ میں جو ہوں سو ہوں اس میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ میں وہی ہوں جو میں ہو سکتا تھا جو میں ہو سکتا ہوں وہی ہوں۔ بتاؤ اس میں میرا کیا کمال ہے؟ ہے تو سہی۔

ہلو ہلو How do you do? ہلو ہلو۔ کہئے مسٹر سوانیڈسو رات کیسی کٹی۔ رات؟ کیسی رات؟ میری زندگی میں رات نہیں ہوتی۔ دن بھی نہیں ہوتا۔ وقت کو رنگوں میں تقسیم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جی ہاں کتنے کلر بلائنڈ ہوتے ہیں۔ سیاہ اور سفید سفید اور سیاہ کتنے کتنے مزے میں ہیں۔ انہیں رنگوں اور رنگوں کے شیڈ سے کوئی مطلب نہیں۔ مجھے بھی رنگوں اور رنگوں کے شیڈ سے کوئی مطلب نہیں اس لئے میں بھی مزے میں ہوں۔ ہلو ہلو۔ مسٹر سوانیڈسو۔ کمرہ آپ کے سگار کی وجہ سے کتنا خوشبودار ہو رہا ہے جی میں ہوانا سگار پیتا ہوں۔ میں ہوانا سگار پر مرتا ہوں۔ مجھے اس سے جنگل کی خوشبو آتی ہے۔ جنگلوں میں بسی ہوئی خون کی خوشبو۔ جنگل کتنا اندھیرا ہے۔ لیکن اس کے درختوں سے روشنی پھوٹ رہی ہے۔ اس جنگل کا کیا نام ہے؟ مجھے ناموں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وقت کے ساتھ یہ خوشبو بھی اڑ جائے گی۔ ہر چیز گزر جاتی ہے۔ ہماری اچھی اچھی باتیں، ہماری عادتیں، ہماری بناوٹیں۔ حماقت کی باتیں کرنے سے بہتر ہے کہ سگار پیو اور یوں بن جاؤ جیسے کچھ سوچ رہے ہو۔ داڑھی بڑھا لو اور سمجھو تمہارا چہرہ جنگل ہے جس میں چھاپے مار رہتے ہیں جس میں اس صدی کے سارے چھاپے مار چھپے ہوئے ہیں۔ چھاپہ مار۔ اسی لئے تو میں ہوانا سگار پر مرتا ہوں میں تمہاری داڑھی پر جان دیتا ہوں جس سے روشنی پھوٹ رہی ہے۔ اس روشنی نے میرے چہرے کو مقدس بنا دیا ہے۔ روشنی جنگل کو مقدس بنا دیتی ہے جو آدم کی طرح قدیم ہے۔

"میں تمہارے پُراسرار ہونٹوں میں دبے ہوئے پراسرار سگار کے پراسرار مرغولوں میں چکر لگاتی ہوئی باتوں میں نہیں آؤں گا۔" کٹہرے میں کھڑے پُراسرار ملزم کے ہونٹ مڑ گئے تھے۔ اس کا چہرہ یرقانی چہرے کی طرح ستا ہوا تھا۔ زرد پہاڑی ڈھول کی طرح۔

"تمہیں سزا ہو چکی ہے۔ جس کو سزا ہو جاتی ہے۔ وہ سزا کاٹنے پر مجبور ہے۔ تمہاری انتہائی باتوں کا عدالت پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔" وہ گھبراہٹ کے کھنڈر سے نکل رہا تھا۔ اسے اطمینان تھا کہ وہ کٹہرے کے باہر تھا۔

مسٹر سوانیڈسو کے ہونٹ سوکھ رہے تھے گلے میں کیکٹس اگ رہے تھے۔

میں نے بہت کھیل کھیلے ہیں، جی نہیں پاپڑ آپ نے بیلے ہوں گے۔ مجھے پاپڑ بیلنے کا شوق نہیں ہے مجھے معلوم ہے آپ بھیجے کے شوقین ہیں — بھیڑ کے بھیجے کے — جی ہاں بھیڑ کے — بھیڑ شریف جانور ہے۔ سر جھکائے اپنی اون میں اپنی پیشانی۔ آپ مسکراتے ہیں تو بالکل بھیڑ معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کے جسم پر اون بالکل نہیں۔ اس سے لوگوں کو شبہ ہو سکتا ہے کہ آپ بھیڑ نہیں۔ آپ کوئی اور جانور ہیں۔ بھیڑ کا اون اتر جائے تو کتنی گھناؤنی معلوم ہوتی ہے۔ اس کی کھال۔ آپ کی معلومات بس کھال ہی تک ہے۔ میں بھیڑ کے اندر کا مسافر

ہوں۔ ایسے مسافر ہو۔ چلتے ہو تو تمہارے کھروں سے گرد اُڑتی ہے۔ اُڑتی ہوگی۔ میں دُور کا مسافر ہوں۔ یہ گرد بھی دُور تک جائے گی۔

مسٹر سوا ینڈ سو کے منہ سے وہسکی کی بو آرہی ہے۔ آنکھیں دیکھو۔ چہرہ۔ اس کے خون میں وہسکی ملی ہوئی ہے۔

کیا نام بتایا آپ نے بھلا سا۔ مسٹر کون؟ خیر چھوڑیئے نام میں کیا دھرا ہے میری رگوں میں خون ہے ہی نہیں۔ اس لئے ملاوٹ کا سوال نہیں اٹھتا۔ سنو تم اس چیک پر دستخط کر دو۔ اگر تم اجازت دو تو آج یہیں منگوا لوں ایک بوتل۔ مسٹر سوا ینڈ سو کا گلا سُوکھ رہا ہے اور آنکھیں پتھرا رہی ہیں۔ منگوانے کی کیا ضرورت ہے۔ میرے سیف میں موجود ہے۔ Nothing like it تمہارے کمرے میں سب کچھ موجود رہتا ہے۔ سب کچھ نہیں۔ بہت کچھ کمیشن میں نکل جاتا ہے۔ لیکن یہ بوتل کمیشن نہیں ہے۔ دماغ کے کام کا کوئی کمیشن نہیں ہوتا۔ ہاہاہا۔ تم بوتل خالی کرو۔ جب یہ بوتل خالی ہو جائے گی میں اس میں یہ کاغذ بھر دوں گا۔ جس پر تمہارے ہاتھوں کی روشنائی پھیلی ہوئی ہے۔ اس سے جو شراب کشید ہوگی اس کی بات ہی اور ہوگی۔ تب میں کہوں گا Nothing like it۔ اور میں امر ہو جاؤں گا۔ کیا میں تمہاری سیکریٹری کے ساتھ سو سکتا ہوں؟ Not that I am keen on it لیکن اس کی آنکھوں کی التجا مجھ سے انکار نہیں ہو سکتا۔ یار وہسکی بول رہی ہے۔ کمیشن بول رہا ہے۔ دماغ کے کام کا کوئی کمیشن نہیں ہوتا۔ ہاہاہا۔ خیر اس کی بات چھوڑو۔ اس کی بات چھوڑو۔ ہاں سوئی تو ضرور وہ میرے ساتھ، لیکن اس کا سونا اشلیل کا سونا تھا۔ وہ میرے پہلو میں لیٹی تھی بالکل برابر برابر۔ لیکن مجھے پورے وقت یہ احساس تھا کہ میں اس کے دماغ کے ساتھ سو رہا ہوں۔ میرے پہلو میں اس کا دماغ تھا اور کچھ نہ تھا۔ تمہاری سیکریٹری کی بات اور ہے میرے پہلو میں وہ ہوگی، سب کچھ ہوگا۔ That's fine. لیکن پہلے مسٹر سو اینڈ سو بلینک چیک پر دستخط کر دیجئے۔ پھر وہ آپ کے کمرے میں پہنچ جائے گی۔ وہ کون وہی، کوئی ہو، کوئی ہو، فرق کیا پڑتا ہے اور یہ دستخط۔

اس کا پیرتانی چہرہ اور زیادہ طیوترا ہو گیا تھا۔ خود اس کا جسم بھی کھنچ گیا تھا۔ اس کا سر جیسے کہ پھیلا ہوا تھا۔ عدالت کی چھت بہت نیچی ہوتی ہے۔ جب پست میں کیسی کیسی باتیں منہ سے نکل جاتی ہیں۔ اس کا سوٹ بہت ڈھیلا تھا۔ سرمئی ڈھیلا ڈھالا سوٹ۔ دانت زرد تھے۔ تمباکو کی طرح وہ کھانس رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پھرائی تھیں اور انگلیاں لرزتی تھیں۔ اس کے سرد پتھروں نے چھتری سی بنا دی تھی۔ پتھر گھبرائے ہوئے سے تھے اور وہ چہروں سے بھی زیادہ بگڑا ہوا تھا۔ عدالت میں خلیت کا پہرہ ہونا چاہیے۔

تم اسی طرح پڑی دیتی رہیں اگنے کا پرزہ دو۔ میں سب سمجھتا ہوں۔ تم جاگ رہی ہو تم آرہی ہو۔ میں آرہا ہوں۔ زندگی ہوا کی صبح کی طرح اڑتی چلی جاتی ہے۔ اور میں جل رہا ہوں۔ تمہاری آگ میں۔

دیکھو ایسا ہے کہ تم میرے لیے اجنبی ہو۔ ہاں تم بھی اجنبی ہو۔ میں کسی رشتہ پر یقین نہیں رکھتی۔ میں بھی کسی رشتے کا پجاری نہیں ہوں۔ میں ہوا کی طرح ہوں آزاد۔ میں بھی آزاد اور گرم۔ آگ کی طرح۔ میں جلتی ہوں نہ بجھتی ہوں۔ بجھتی ہوں جلتی ہوں۔ یہ شاعری ہے ہاں یہ شاعری ہے۔

وہ ساری یا ندھ رہی ہے۔ الہامی کتاب کو جزدان میں رکھ رہی تھی۔ قرینے سے اس کے سامنے اس کے ہاتھ دکھائی نہیں دے رہے تھے لیکن کنگھا کٹی ہوئی زلفوں میں دوڑ رہا تھا۔ بالوں میں کوئی الجھاؤ نہیں تھا کنگھا آرام سے سفر کر رہا تھا۔ چہرے پر غازے کی تہیں جم رہی تھیں۔ کھڑکی کے باہر سڑک پر گرد اُڑ رہی تھی۔ جھنگی جھاڑو دے رہا تھا۔ جھاڑو سے گرد اُڑ رہی تھی۔ کنگھے سے بال سنور رہے تھے غازے سے چہرہ دمک رہا تھا۔ چہرہ اس کی طرف مڑا وہ اب تک مسہری کے کنارے بیٹھا ہوا تھا۔ سر جھکائے۔ اس کے لمبے لمبے بال اس کے چہرے کو چھپائے ہوئے تھے۔ بالوں سے سگار کا دھواں چھن رہا تھا۔ اس کا چہرہ دھوئیں میں کھویا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی دھوئیں میں کھوئی ہوئی تھیں۔ چہرہ جو اس کی طرف مڑا مسکرا رہا تھا۔

"تم پچھتا رہے ہو؟" آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

وہ اسی طرح بیٹھا رہا، سر جھکائے، اس کے لمبے بالوں سے دھواں چھنتا رہا۔

"دو اجنبی دور تک ساتھ سفر نہیں کر سکتے۔"

"کوئی دُور تک ساتھ سفر نہیں کر سکتا۔"

"کوئی نہیں؟"

"کوئی نہیں۔"

اس نے سر کو جھکا دیا۔ دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔ باہر روشنی تھی اور روشنی میں گرد تیر رہی تھی۔

جب آہٹیں دور چلی گئیں اور دروازہ آہستہ آہستہ دوبارہ بند ہو گیا تو گرد اور روشنی آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں۔

وہ تھوڑی دیر جھکا رہا تھوڑی دیر تک۔ یکایک شعلہ سا چمکا، شعلہ سا، وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے ہیولے کو آئینے میں دیکھا۔ آئینے میں اب وہ نہیں تھی۔ وہ تھا اکیلا۔ سانولا، میلا، بالوں سے بھرا ہوا، ریچھ جیسا ہیولا وہ مڑا اور باتھ روم میں چلا گیا۔

تجربہ تجربہ اور تجربہ۔ بہت سے تجربے اس کی آنکھیں بند تھیں۔ پانی سر سے پاؤں تک بہہ رہا تھا۔ پانی کے ساتھ میل بہہ رہا تھا۔ میل پسینے کی۔ غازے کی

خوشبو، دفتروں کی مہک، ہونٹوں کی گرمی، اجنبیت کی سپردگی سب، دوری کا احساس، کچھ کھو کے
کچھ پانے کا بھرم سب

رات ختم ہوئی۔ دن شروع ہوا۔

وہی پرانی فائل، وہی پرانا قلم، وہی پرانے نوٹ، وہی پرانے دستخط۔ رومال میں
پٹرول کی بو بس گئی ہے۔ وہی پرانی بو۔ تو تو یس یس۔ وہی پرانی تو تو، وہی پرانی یس یس۔
سوٹ نیا ہے۔ ٹائی نئی ہے میں وہی ہوں۔ وہی میں۔ مجھے زکام ہے۔ یہ پٹرول کی بو نہیں
ہے۔ یہ ڈیٹلپش کی بو ہے۔ لیکن یہ میرے لئے ہے۔ جو کچھ ہے میرے لئے ہے، زکام،
پٹرول اور ڈیٹلپش کی بو اور رات کی یاد۔ یہ سب کتنا رومانٹک ہے۔ تو تو یس یس۔
میں نے سب طے کر لیا ہے۔ ہاں میں نے طے کر لیا ہے میں دیمک ہوں۔ تم بھی دیمک
ہو۔ میں کاغذ کو چاٹ رہا ہوں میری روح بھی کاغذ کی طرح سفید ہے۔ قاعدے سے
کٹی ہوئی۔ جو چاہو اس پر لکھ دو۔ میں اسی کاغذ پر لکھا ہوا ہوں میں چمک رہا ہوں روشنائی
کی طرح۔ میں لکھا ہوا ہوں اور پھیل رہا ہوں۔

یہ روز روز کا قصہ ہے۔ اکتاہٹ یہاں سے شروع نہیں ہوتی۔ کہیں اور سے
شروع ہوتی ہے۔ یہاں تک پہونچتی ہے۔ شاید یہاں سے آگے تک جاتی ہے۔ شاید
میں اپنے آپ کو اس اکتاہٹ سے الگ الگ رکھتا ہوں۔ اس اکتاہٹ سے ہر
چیز سے۔

وہ میرا پیچھا کر رہا ہے میں اپنا پیچھا کر رہا ہوں۔ میں اور قاتل۔ دونوں ایک دوسرے
کا پیچھا کر رہے ہیں۔

وہ کئی پیالیاں کافی کی خالی کر چکا ہے۔ اس کے ہاتھ بہت سے کاغذوں، بہت
سے چیکوں پر دستخط کر چکے ہیں۔ اس کا رنگ اور سنولا گیا ہے۔ اس کے بال اس وقت
بھی چہرے پر جھکے ہوئے ہیں۔ اب بھی بالوں سے سگار کا دھواں چھن رہا ہے۔ اس
کے سوٹ کا نیلا رنگ اس کے چہرے کے رنگ میں جذب ہو رہا ہے۔ اور سگار کے
دھوئیں سے چھن رہا ہے۔

"تو یہ کام ہو جائے گا؟"

"ہو جائے گا۔"

"سچ۔ Very nice of you."

"سوچ لیجئے کہیں آپ اپنی رائے کا اظہار کرنے میں جلد بازی سے تو کام نہیں لے
رہے ہیں؟"

"میں نے سوچ لیا ہے۔"

خاموشی ہے۔ وقفہ ہے۔ ہاتھوں میں رعشہ ہے۔ قلم تھک رہا ہے۔ قلم جو
صرف دستخط کرتا ہے۔ کتنی جلدی تھک جاتا ہے۔ کئی پیالیاں کافی کی خالی ہو چکی ہیں۔ وہ
اٹھتا ہے اور اپنی کرسی کو پیچھے ڈھکیلتا ہے۔ کھڑکی کے پاس جاتا ہے۔ نیچے سڑک کو
دیکھتا ہے۔ انسان بہہ رہے ہیں بڑا ٹرانسپورٹ کے ریلے جا رہے ہیں۔ گرد اڑ رہی ہے
مکانوں کے بالائی خطوط افق میں جذب ہو رہے ہیں۔ دھوپ ہے مگر سورج نہیں ہے زرد
دھوپ ہر چیز کا شیڈ بدل رہی ہے۔ اس کا ہیولا، نیلے سوٹ میں، کمرے کے ایک کنارے
سے دوسرے کنارے تک جاتا ہے۔ وہ بھی اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہے عمارتیں
اونچی ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ موسم بدل رہا ہے اور میں دستخط کر رہا ہوں۔ کاروبار اچھا
چل رہا ہے۔ لیکن یہ کاروبار کس کا ہے۔ میں اس کاروبار کا کون ہوتا ہوں۔ میری رگوں
سے سارا خون نکل چکا ہے۔ ایک دن اور ختم ہوا۔ جہاں دن ختم ہوتا ہے وہاں رات
شروع ہوتی ہے۔ ایک بار پھر۔ وہی پٹرول کی بو، وہی گرد، وہی راستے۔

کمرے کے سارے بلب جل رہے ہیں۔ لیکن کمرے میں اندھیری رات کا بسیرا
ہے وہ ہے اور اس کا قاتل ہے اور کٹہرا ہے۔ قاتل کا منہ بند ہے۔ مگر اس کی آواز گونج
رہی ہے۔ تم سب کچھ دیکھ سکتے ہو، اپنے چہرے کی جھریاں نہیں دیکھ سکتے۔ دل کی
جھریاں دکھائی نہیں دیتیں۔ چہرے کی دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن تم یہ بھی نہیں دیکھ سکتے۔
تم بہت تھک گئے ہو۔ تھکن نے تمہارا قد اور لمبا کر دیا ہے۔ قد اور تمہاری گردن
اور تمہارا چہرہ۔ تمہارے ہاتھوں میں رعشہ ہے۔ تم کھنچ گئے ہو۔ آنکھوں میں
اوس سی جھلملا رہی ہے۔ بجھا ہوا سگار تمہارے ہاتھ سے چھوٹ کر قالین پر گر گیا ہے۔
تم چپ ہو، یہ وقت بولنے کا ہے۔ مگر تم چپ ہو۔ تم تن کر کھڑے ہو گئے ہو تم زندگی
بھر یہی کرتے رہے ہو۔ اب بھی تم تن کر کھڑے ہو۔ لیکن تمہاری کمر میں خم ہے۔ لگتا
ہے سر پر بہت بڑی چٹان اٹھائے ہوئے ہو۔ چٹان دکھائی نہیں دیتی۔ مگر وہ سر پر
دھری ہوئی ہے۔ کچھ اس کے بوجھ سے کچل جاتے ہیں۔ کچھ اسے ڈھکیل کر پہاڑ کی چوٹی تک
لے جاتے ہیں۔ ہر رات۔

نکالو سیلر سے وہی بوتل جو آدھی بھری ہوئی ہے اور خالی کر دو۔
کیا سوچ رہے ہو بھلا یہ وقت سوچنے کا ہے۔ یہ وقت پینے کا ہے آخری گھونٹ۔
تمہارے ہاتھوں میں رعشہ بڑھ رہا ہے گویا ہے کوئی کیڑا تار آستین میں چھپا
تمہاری رگوں کو نوچ رہا ہے۔ تمہاری جھریاں اور گہری ہو گئی ہیں تمہاری
آنکھیں ایک ہی نقطے پر جمی ہوئی ہیں تمہارے ہونٹ سوکھ رہے ہیں یہ ٹھنڈا گلاس بھی
ہونٹوں کی خشکی دور نہیں کر سکتا۔
کس کا انتظار ہے تمہاری آنکھوں کو۔ دروازے کی طرف نہ دیکھو وہاں کوئی
نہیں کسی کے قدموں کی آہٹ نہیں۔
میں کٹہرے میں کھڑا ہوں اور تمہاری بے بسی کا تماشا دیکھ رہا ہوں تمہارے
لمبے چہرے پر پسینے کی لہریں تیر رہی ہیں۔ نہیں اور پسینہ تم تو اتنے ٹھنڈے رہے

زندگی بھر اور اب اس آخری لمحے میں اتنا پسینہ۔ تم میری باتوں کو مسکرا کر ٹالنے کی کوشش نہ کرو۔ اب تم مجھے نہیں ٹال سکتے۔ بہت ٹالا تم نے۔ لیکن اب وقت اپنا کھیل کھیل چکا۔ تم ہار چکے ——— وہ ہونٹ چبا رہا تھا۔ وہ کھڑا ہوا اس کا قد اور لمبا ہو گیا اس کا سر چھت کو چھو رہا تھا۔ اس نے کپڑے اتار دیئے۔ جوتے، کپڑے، بنیان اور انڈرویر۔ وہ مسہری پر لیٹ گیا۔ سیدھا اس کا جسم پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں پھنک رہی تھیں۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور کٹہرے کی طرف دیکھا۔ کٹہرے اور اس کے درمیان ایک تپائی تھی تپائی پر خالی بوتل تھی اور تپائی کو گھور رہی تھی۔

تم غلط ہے۔ میں ہار نہیں مانوں گا۔ تم میرے قاتل ہو۔ میں اپنے قاتل کو ساتھ لے جاؤں گا۔ میں ہمیشہ زندگی سے کترا تا رہا۔ کترانا بھی بڑا آرٹ ہے لیکن زندگی اپنا سب کچھ مجھ پر لٹاتی رہی۔ یہ بھی بڑا آرٹ ہے۔ میں نے کبھی کسی کا ساتھ نہیں دیا۔ لیکن بہتوں نے میرا ساتھ دیا۔ خود ہی بے وجہ لوگ آئے اور انہوں نے مجھ سے سمجھوتہ کیا۔ میں نے کسی سے سمجھوتہ نہیں کیا۔

"جس سے سمجھوتہ کیا جاتا ہے وہ بھی کسی سے سمجھوتہ کرتا ہے۔"

اپنی نہ ہانکو۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ کسی کے پاس وقت نہیں ہے۔

"جانتا ہوں ہم وقت کی جیب میں ہیں لیکن ہماری جیب خالی ہیں۔"

"میں نے کہا نا کہ چالاکی کی باتیں نہ کرو۔"

" Bloody Hoax "

اس نے اپنی مسہری کی سفید چادر سے اپنے جسم کو ڈھک لیا۔

یہ میرا کفن ہے۔ اپنی مسہری، اپنی چادر، اپنا کفن۔ بہت کم لوگ ہیں جو اپنی لاش کو لیں دیکھتے ہیں۔ مسہری پر رکھی ہوئی لاش اور اب میں تم کو نہیں دیکھ سکتا۔ نہ تو تم کو، نہ کٹہرے کو جس نے خود بنا لیا ہے۔ تمہارے لئے۔

میں تمہاری آنکھوں سے اوجھل ہوں لیکن میں تمہیں دیکھ سکتا ہوں۔ تمہارا کفن بلور کی طرح چمک رہا ہے۔ تمہارا جسم ننگا ہے۔ سیدھا۔ تم نے نہ جانے کب سے شیو نہیں کیا ہے۔ تمہارے چہرے پر داڑھی اگ آئی ہے۔ حیرت ہے۔ شام تک تو تم کلین شیو تھے اس وقت بھی جب تم آخری گلاس کا آخری گھونٹ پی رہے تھے۔ تم نے سینے پر ہاتھ باندھ رکھے ہیں۔ تمہاری آنکھیں بند ہیں۔ ہونٹ خاموش ہیں دل ساکت ہے نبض چھوٹ چکی ہے تمہارے چہرے پر پسینہ موم کی طرح خشک ہو گیا ہے۔ موم کی تہہ نے تمہیں ممی بنا دیا ہے۔ اگر میں تمہیں اٹھاؤں اور لے جا کر تمہارے آفس کے ایرکنڈیشنڈ کمرے میں تمہاری گھومتی ہوئی کرسی پر تمہیں بٹھا دوں تو کل صبح کیا ہو گا ——— تمہاری سکریٹری شیشے کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھتی بھی نہیں وہ بے تکلف ہے اور تمہارے موڈ کے موسم کو جانتی ہے۔ وہ دھڑ سے دروازہ کھولتی ہے اور بے ساختہ کہتی ہے۔ گڈ مارننگ سر! اور تمہاری کرسی کی طرف لپکتی ہے لیکن جب وہ

تمہاری گود میں بیٹھتی ہے تو کرسی خود بخود گھوم جاتی ہے اور وہ گرتے گرتے تمہارا چہرہ دیکھتی ہے۔ وہ بے ہوش ہو جاتی ہے اور تمہاری زردی اس کے اوپر گر جاتی ہے منہ کے بل۔

میرے پاس ایسی مہمل باتیں سننے کا وقت نہیں۔

"وقت میرے پاس بھی نہیں۔ لیکن تمہاری آواز آج بھی میرا پیچھا کر رہی ہے۔"

میری آواز۔ میری کوئی آواز نہیں۔ اب تم آزاد ہو۔ میری آواز کے ساتھ وہ کٹہرا بھی مٹ گیا جو میں نے تمہارے لئے بنایا تھا۔ اب آشنا کرو۔ مجھے اٹھاؤ اور راتوں رات لے چلو۔ اپنے ہاتھوں سے قبر کھود و اور مجھے اس میں ڈال دو۔ مجھے اور وہ سب کچھ جسے تم ہوس کہتے ہو۔ میں چاہتا ہوں۔ میرے بعد وہ سب کچھ، جو مجھ میں ہے، دنیا میں نہ ہو۔

"ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔"

کوئی دروازے سے کان لگائے کھڑا ہے اور خاموشی کی صدا سن رہا ہے۔ صندلی چہرہ روشن ہے۔ آنکھیں پھیلی ہوئی ہیں، بال سیاہ ہیں اور سر کالی بلی کی طرح چمک رہا ہے۔ ایک پیکر سا جو شعلے کی طرح لپک رہا ہے لیکن دروازہ بند ہے۔ اندر خاموشی ہے۔ مسہری پر سفید چادر کفن بن چکی ہے۔ اب دستک سے کیا ہو گا۔

یہ شخص مر کر بھی جھوٹ بول رہا ہے۔ دروازہ کھل جائے تو میں اس سے صرف اتنا کہوں۔ تم اب بھی جھوٹ بول رہے ہو۔ اور جب تم مجھ سے جھوٹ بول رہے تھے، تب بھی میں یہ جانتی تھی۔ تم سمجھ رہے تھے میں تمہارے لئے جی رہی ہوں جب کہ میں اپنے لئے جی رہی تھی۔

کفن میں وہ مسکرایا۔ اس نے چادر منہ سے ہٹائی۔ اس نے قاتل کو بانہوں میں سمیٹ لیا۔ قاتل اس کے سینے میں جذب ہو گیا۔ اس نے کفن نوچ کر پھینک دیا۔ وہ بچھو کے کے سی طرح مسہری سے تڑپا۔ لپک کر اس نے دروازہ کھول دیا۔ کمرہ خوشبو سے بھر گیا۔

ممی کے چہرے پر موم کی زردی دوپہر کی دھوپ کی طرح چمک رہی تھی۔ ہاتھ کا رعشہ ختم ہو چکا تھا۔ گلاس پر اس کی گرفت مضبوط تھی۔

اس نے خوشبو کے کان میں کہا

"میں نے قاتل کو اپنے سینے میں دفن کر لیا ہے۔"

خوشبو کا چہرہ خون کی طرح سرخ ہو گیا۔

"تم کتنے بڑے قاتل ہو!"

اس کے چہرے پر پھر موم کی تہیں جم گئیں۔ اور اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس کا ہاتھ لرز نے لگا۔ گلاس خالی تھا۔

مسہری پر سفید چادر کفن بن چکی تھی۔

غزلیں

آنکھوں سے چل کر دیکھی تھی، اس کے پاؤں پڑی پگڈنڈی
نظریں گھوم رہی ہیں۔ پل چھن در در پگڈنڈی پگڈنڈی

ایک سا گبرو کیا جانے کس بستی کس پردیس سدھارا
پاؤں کے تلووں سے آچمٹی ہر ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی

گرد یہاں کی سیدھا من میلا کرتی ہے، بس میں ہو تو
شہر کی سڑکوں پر بچھوا دوں کوسوں دھول بھری پگڈنڈی

ٹیڑھا میڑھا پن رستے کا اپنی آنکھوں کا دھوکا ہے
بہروپے سوانگ رچا ہے ورنہ جیسا من ویسی پگڈنڈی

دل آوارہ گرد ہو تو کیا دیواریں کیسے دروازے
من پر پہرا بیٹھا ہو تو جیسا گھر ویسی پگڈنڈی

میں نے قتل کئے ہیں اپنے کالے ہاتھوں وقت، فاصلہ
چونسٹھ گھڑیوں دھیان اُسی کا چاروں سمت وہی پگڈنڈی

اشک وفا کو شیلف پہ رکھ کے خالی جیب چلو اس رستے
اتنا بوجھ نہ ڈھو پائے گی تنگ لباسوں کی پگڈنڈی

بمل کرشن اشک

شہاب عراقی

کبھی جو چاند سے سورج قدم ملا کے چلا
سیاہ پڑتا گیا چہرہ پھول سے دن کا

یہ جھلملاتے ستارے بھی ڈوب جائیں گے
نہ کھینچ دن کے طلب گار رات کا پردا

بجھی ہوئی ہے نظر زہر کی تمازت سے
چمک رہا ہے اندھیرے میں سانپ کا چہرا!

اُبل رہی ہے ندی کپکپائی پلکوں پر
بہاؤ تیز ہے پگھلی ہوئی چٹانوں کا

سمندروں کا لہو خشک ہو گیا شاید
بہا رہا ہوں خیالوں میں ریت کا دریا

نگاہ لعل و گہر کی تلاش میں نکلی!
ہتھیلیوں کی ہے قسمت میں سرخ انگارا

وہاں نہ جاؤ کہ رنگوں کے امتزاج کے ساتھ
کھڑا ہے دن کے اُجالے میں رات کا سایا

تنہائی میں دُکھتے لمحے جب کچھ یاد دلاتے ہیں
سائے سائے کتنے چہرے آنکھوں میں پھر جاتے ہیں

اب تو اچھے دل والوں کا قحط سا پڑتا جاتا ہے
لیکن نقلی چہرے والے دل اپنا بھرماتے ہیں

چھو جاتی ہے جب بھی آکر یادوں کی پُروائی سے
ننھے ننھے کتنے دیپک پلکوں پر جل جاتے ہیں

اپنوں میں بیگانہ بن کر زندہ رہنا مشکل ہے
لیکن دیکھ زمانے ہم کو، ہم جی کر دکھلاتے ہیں

جانے کب سے ہم بیٹھے ہیں سوچوں کے چوراہے پر
زندگی کا میلہ ہے جگ، ہم بھی دیکھے جاتے ہیں

وشوا ناتھ

۱۹۱۴ء میں جب میں ایم اے۔ او کالج علی گڑھ میں داخلے کے لئے آیا تو میرے ہم وطن، ہم سبق اور دوست حضور عالم بھی میرے ساتھ تھے۔ ہم دونوں کے والد میر محفوظ علی اور محمد اکرام عالم بھی سرسید کے زمانے کے اولڈ بوائے تھے۔ ہم پہلی مرتبہ گھر سے نکلے تھے اور بورڈنگ کی زندگی ہمارے لئے بالکل نئی تھی۔ سرسید ایسٹ کے کمرہ ۵ میں جگہ ملی جس سے ایک کمرہ اُدھر نمبر ۱۳ کرکٹ کپتان کا کمرہ تھا۔

اُس زمانے میں الہ آباد یونیورسٹی جس سے علی گڑھ ملحق تھا امتحانات کے نتائج کا اعلان شروع میں کردیا کرتی تھی اور نئے کلاسوں میں داخلہ مل جاتا تھا۔ جون میں پڑھائی تو کچھ نہیں ہوتی البتہ دھما چوکڑی خوب مچی رہتی تھی۔ جو لڑکے اپنے اسکول سے اور بالخصوص باہر سے آتے ان کی کبھی گرم اور کبھی ٹھنڈی فاختہ اڑتی تھی۔ چارپائیاں اُلٹی جاتی تھیں اور سب سے بڑھ کر موسم کی پہلی بارش میں مَدرانٹ ہوتا تھا۔ جون ختم ہوتے ہی کالج بند ہوجاتا اور تین مہینے بعد یکم اکتوبر کو کھلتا تھا۔

اس کا تو کوئی سوال نہیں کہ جن لوگوں نے یہ چیزیں دیکھی ہیں۔ انہیں یہ باتیں سُن کر ایسا معلوم ہوگا جیسے ان کی آنکھوں کے سامنے وہی ماحول وہی فضا وہی گہما گہمی اور وہی چہل پہل موجود ہے جو اُن کے زمانہ میں تھی۔ سوال صرف یہ ہے کہ کیا وہ لوگ بھی یقین کریں گے جنہوں نے اس مادر علمی کی آغوش میں تعلیم نہیں پائی اور جن کو یہ نہیں معلوم کہ یہاں کے زمین و آسمان کچھ اور ہی ہیں۔ میرا مطلب ہے سرزمین علی گڑھ سے، زندہ باد علی گڑھ۔

اُس زمانہ میں بہت سے کام "ٹریڈیشن" کی بنا پر کے جایا کرتے تھے۔ کالج کی زندگی میں اُس ٹریڈیشن کو ضابطۂ فوجداری اور قانون تعزیرات سے زیادہ اہمیت تھی۔ تحریک ترک موالات سے علی گڑھ کی زندگی میں ایک بھونچال آگیا تھا۔ سب پُرانے طلبار کے بیک وقت نکل جانے کی وجہ سے وہ تمام خصوصیات بڑی حد تک زائل ہوگئیں، جو بڑی محنت اور مصیبت سے پیدا کی جا سکی تھیں اور جو سینہ بہ سینہ چلی آرہی تھیں۔

جس ٹریڈیشن کا اوپر ذکر ہوچکا ہے، اس کے اعتبار سے قاعدہ یہ تھا کہ بیک پارک کے ہر کمرے میں دو پُرانے لڑکوں کے ساتھ ایک نئے کو رکھ دیا جاتا تاکہ نہ صرف یہ کہ وہ گھبرائے نہیں بلکہ پڑھنے لکھنے سے بڑھ کر وہ اٹھنا بیٹھنا اور بات چیت کرنا سیکھ جائے اور اس میں وہ تمام خصوصیات پیدا ہوجائیں جن کی وجہ سے علی گڑھ والا چشم بد دُور آج بھی دُور سے دیکھ کر پہچان لیا جاتا ہے۔

یوں تو اُس زمانے کے علی گڑھ کے ہر بات نرالی تھی اور متاع عزیز کی طرح دل اور دماغ کے گوشوں میں رچی بسی ہے مگر دو واقعات ایسے ہیں جو بھولتے ہی نہیں۔ ایک تو پہونچتے ہی پیش آیا اور دوسرا ایک سال بعد وقوع پذیر ہوا۔ وقت گزرتے دیر نہیں کل کی سی بات ہے کہ اب سے چھپن برس پیشتر یعنی ۲۵ مر

۲۰ جون ۱۹۶۱ء کو جب کہ شدید گرمی پڑ رہی تھی صبح دس گیارہ بجے کے وقت ایک
دم گھٹا چھا گئی اور دیکھتے دیکھتے موٹی موٹی بوندیں گرنی شروع ہو گئیں۔ دس منٹ
کے اندر اندر خوب بارش ہونے لگی اور لوگ اپنے اپنے کمروں سے نکل کر برآمدے
میں جمع ہونے لگے۔ صحن کے چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں جو پانی جمع ہو گیا تھا اس
کی وسعت بڑھتی گئی اور دیکھتے دیکھتے پورا صحن زیرِ آب ہو گیا۔ جل تھل بھر
گئے۔ نہ آسمان نظر آ رہا تھا نہ زمین، اُمنڈ اُمنڈ کے بادل آ رہا تھا اور بارش
ہو رہی تھی۔ اتنے میں کمرہ ۲۲ کی طرف کچھ گڑبڑ ہوئی اور میں نے دیکھا کہ
سرور خاں[1]، اسد[2]، انور[3]، آغا مرزا[4]، فتح محمد[5] وغیرہ کسی شخص کو حلقہ میں لئے
ہوئے برآمدے میں سے صحن میں کود پڑے۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ بیچ
کے بچوندیا بنیا جھانگیر تھے: جن پر کوئی پانی اچھال رہا تھا اور کوئی مٹی پھینک
رہا تھا۔ ایک طرف سے کسی نے اُن کی ٹانگ پکڑ کر ایسا گھسیٹا کہ یہ اپنی تن و توش
وہ زمین بلکہ پانی ناپنے لگے۔ ان لوگوں کا بارش میں اس طرح کود پڑنا گویا
ایک سگنل تھا جس کے بعد ہر شخص نے کسی نہ کسی کی دستگیری فرماتے ہوئے اس
کو پانی میں ڈھکیل دیا۔ حضور عالم[6] اور میں اس عجیب منظر کو پوری طرح دیکھ ہی
نہ پائے تھے کہ قریب کے کمروں سے زین العباد، مرزا اختر حسین[7]، حبیب بخش
پھونکا[9] برآمد ہوئے اور ہم دونوں کو پانی میں پہونچا بھی دیا۔ جن لوگوں نے
بھاگنے کی کوشش کی یا کمروں میں بند ہو گئے اُن کے ساتھ "پا بدست
دگرے دست بدست دگرے" والا عمل ہوا اور اُن کو پانی میں خوب خوب
غوطے دیئے گئے۔ ایک گھنٹے سے زیادہ دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا اور
بدرائٹ بخیر و خوبی ختم ہوا۔

سرسید ایسٹ کی اس ونگ میں ان دنوں ننھے خاں بیرر متعین تھے۔ اس
وقت ننھے خاں کی صورت آنکھوں میں پھر گئی۔ ۱۹۶۱ء میں اونکی عمر ساٹھ کے
لگ بھگ ہوگی۔ پیرانہ سالی کے باوجود سینہ تان کر یوں چلتے تھے جیسے کڑی
کمان کا تیر، دُبلا پتلا جسم، لمبے لمبے ہاتھ پاؤں کوئی پونے چھ فٹ سے نکلتا ہوا
قد، کھلا گندمی رنگ، مونچھوں کی لبیں کٹی نہیں بلکہ منڈی ہوئی اور شرعی تل چٹی
ڈاڑھی، سر یا تو گھٹا ہوا یا بہت چھوٹے چھوٹے کھچڑی بال جن کے اوپر تن زیب
کی ایک دوپلی ٹوپی رکھی جس میں خاصے یا نینون کی سنجاف لگی ہوئی، ململ کا
کرتا اور ڈھیلا ڈھیلا چوڑی دار پاجامہ، ہمیشہ پہنے رہا کرتے تھے۔ شہر کو جاتے
تو کبھی سفید اور کبھی کسی اور رنگ کی شیروانی پہنتے تھے۔ اللہ جھوٹ نہ بلوائے
تو ننھے خاں کے پیر میں ہر مہینہ ایک نیا جوتہ نظر آتا۔ کبھی ڈاسن کا ولایتی جوتہ تو
کبھی کانپوری بروگ شو، کبھی آگرے کا پمپ تو کبھی فلکس کا فل سلیپر، کسی زمانہ
میں دلی کی سلیم شاہی جوتی تو کبھی لدھوڑے خاں کا دیا ہوا پیچ کام کا پوٹھواری
جوتہ، حد یہ تھی کہ میں نے انہیں ٹینس شو اور بغیر تسموں کا کرکٹ بوٹ تک پہنے
دیکھا۔ لوگوں سے سنا تھا کہ ننھے خاں بہت قدیم ملازم ہیں جتنے دن وہ ہماری
سائیڈ میں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ہم اُن کی سائیڈ میں رہے ان کا طرز
عمل ہم فرسٹ ایر والوں کے ساتھ کچھ ایسا تھا کہ اُس کو الفاظ کا جامہ پہنانا بھی
مشکل ہے۔ وہ گستاخ نہیں تھے، عدول حکمی نہیں کرتے تھے اور غیر حاضر بھی نہیں
ہوتے تھے لیکن اُن میں متانت اور سنجیدگی اس غضب کی تھی کہ ہم لوگ

---

۱ سرفراز خاں صاحب کے چھوٹے بھائی چھوٹے ہونے کی وجہ سے دس سیر کم یعنی دو من سے کچھ
اوپر ہوں گے۔ ڈکشنری پر طبلہ بہت ہی عمدہ بجاتے تھے ۲ علی گڑھ کے مایۂ ناز ہاکی کے
لیفٹ ان پلیر ۳ اسد کے چھوٹے بھائی رائٹ آوٹ ہاکی پلیر ۴ آغا مرزا گول کیپر تھے اور
عمر بھر یعنی کم از کم بارہ سال ہاکی کے گول کیپر رہے، کپتان ہوئے، ڈپٹی کلکٹر اور سٹلمنٹ کمشنر
ہو کر ریٹائرڈ ہوئے۔ اپنے وطن بریلی میں دو سال قبل اللہ کو پیارے ہو گئے ۵ ہاکی فرسٹ
الیون میں اسد کا سیدھا بازو، رائٹ اِن کھیلتے تھے۔ فرنٹیر پراونس کے رہنے والے
تھے سنا ہے پاکستان گورنمنٹ میں ٹرانسپورٹ کے وزیر ہو کر ریٹائر ہوئے ۶ سلطنت مغلیہ
کے حکمرانوں کے چشم و چراغ اُن کے مورث شہزادہ برجیس قدر دہلی سے لکھنؤ آکر بس گئے
تھے۔ بات کرتے ہوئے ہکلاتے تھے مگر گاتے وقت بالکل نہیں۔ شاہی خاندان سے متعلق
تھے اس لئے گانے ناچنے میں اپنے والد سے سبقت لے گئے تھے۔ فنی واقفیت بڑے
سے بڑے گویے سے بڑھ کر تھی مگر کوئی شخص اُن کا گانا سننے کو تیار نہ ہوتا تھا کیونکہ
آواز انتہائی کریہہ تھی اور گلے میں نہ لوچ تھا اور نہ تاثیر۔ سنا ہے ڈپٹی کلکٹر ہو گئے تھے۔
سنا ہے وہ بھی جنت کو سدھارے ۷ آگرہ کے رہنے والے نہایت ممتاز کرکٹ پلیر
اور ٹیم کے وائس کپتان۔ محکمۂ جنگلات میں بہت اونچے عہدے پر تھے ۸ مغل
بادشاہوں کی اولاد میں سے جو بنارس میں قیام پذیر ہو گئی تھی، سینیر فورڈ مانیٹر ہوئے
سنا تھا کہ ڈھاکہ یونی ورسٹی میں رجسٹرار ہو گئے تھے۔ دوست نواز اور بڑی محبت والے
۹ کرکٹ پلیر پھونکا نام رکھ دیا گیا تھا۔ نواب صاحب بھوپال ساتھ لے گئے
اور وہیں ملازمت کی۔

مرعوب ہوجاتے تھے۔ان کا رکھ رکھاؤ، اُن کی بُردباری، اُن کی کم سخنی، اُن کا رعب داب اور دُوسرے ملازموں کے دلوں میں اُن کی وقعت اور عزّت ننھے خاں کی ایسی خصوصیات تھیں جن سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ سر سید کی آنکھیں دیکھے ہوئے ہیں۔غالبا بلکہ یقیناً وہ خود بھی ان چیزوں کو سمجھتے اور کبھی کبھی اُن سے فائدہ بھی اٹھا لیتے تھے۔

ڈنر ٹائم کے بعد کپڑے بدل کر حضور عالم اور میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ننھے خاں باہر سے آئے اور بیک رُوم میں چلے گئے۔ پانچ منٹ بعد واپس ہوئے ہمارے بھیگے ہوئے کپڑے اُن کے ہاتھ میں تھے۔ باہر جاتے ہوئے ایک سیکنڈ کے لئے ٹھہر کر فرمایا "قاعدہ ہے کہ پہلے ڈنر ٹائم کے کپڑے جو بھیگتے ہیں ہمارے ہوتے ہیں، اس لئے میں یہ کپڑے لئے جاتا ہوں۔ اُن کا فقرہ سُن کر حضور عالم اور میں ایک دُوسرے کی صورت دیکھنے لگے جب تک ہم سمجھیں کہ اُن کے کہنے کا کیا مطلب ہے ننھے خاں کمرے سے باہر جا چکے تھے ہم لوگ ننھے خاں کو نہ جھوٹا سمجھ سکتے تھے نہ سچا کبھی خیال ہوتا کہ انہوں نے سچ کہا ہوگا۔ پہلے ڈنر ٹائم کے بھیگے ہوئے کپڑے واقعی بیرے لوگوں کو ہی ملا کرتے ہوں گے اور کبھی سوچا کہ ننھے خاں ایکٹوِٹی (ACTIVITY) کر گئے ایسا بھی کیا کہ بیرے کپڑے ہی لے جائیں۔ آخر دل کو یوں سمجھا لیا کہ انہوں نے کوئی درخواست تو کی ہی نہ تھی جو نامنظور کر دی جاتی، وہ تو استحقاقاً کپڑے اٹھا کر چل دیئے۔ یہی مہربانی کیا کم تھی کہ انہوں نے ہم کو قاعدہ بتا دیا، اگر اتنا بھی نہ بتاتے تو ہم ان کا کیا بگاڑ لیتے۔ بہرحال ہم دونوں نے یہی تصفیہ کیا کہ اس واقعہ کا ذکر کسی سے نہ کریں اور اپنے کو شماتت ہمسایہ سے بچالیں۔

خیال فرمائیے کہ جس زمانے میں ننھے خاں جیسے بیرے کام کرتے ہوں اُس زمانہ میں طالب علم کیسے ہوتے ہوں گے۔

اب سنئے جون ۱۹۱۵ء کا واقعہ۔ فرسٹ ایر اور تھرڈ ایر کے داخلے ختم ہوتے ہی بورڈنگ کی وہی زندگی شروع ہوئی جس کا ایک ورق تو آپ ملاحظہ فرما چکے دوسرے ورق پر ایک مرض اور اس کا علاج درج ہے جس کی نظیر کہیں مل سکی ہو تو بتائیے۔

پکی بارک کے کمرہ نمبر ۴۸ میں جو تین طالب علم جمع ہوئے اُن میں سب سے سینئر ایک تھرڈ ایر کے طالب علم تھے۔ نام کی مناسبت سے حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کا وہ سرکاری خطاب یاد آجاتا ہے جو انہوں نے واپس کیا اور جس کے بعد قوم نے اُن کو مسیح الملک بنا دیا تھا۔ گفتگو، وضع قطع اور نشست و برخاست میں کچھ لکھنویت پائی جاتی تھی، حالانکہ دلی اور لکھنؤ سے اُن کو دور کا بھی واسطہ نہ تھا، آڑو، بیچی، خوبانی، سردلی اور بالخصوص پونڈا ہی ایسی چیزیں ہیں جو اُن کے وطن کا اتہ پتہ دیتی ہیں غرضکہ یہ صاحب تو تھے تھرڈ ایر میں اور میں تھا سیکنڈ ایر میں۔ داخلے کے وقت انہوں نے بہت کوشش اور پیروی کر کے ——— اپنے ہم وطن اور شاید کچھ "بیچ" میں والے کو اپنے کمرے میں لے لیا جو کالجیٹ اسکول ہی سے میٹرک پاس کر کے آیا تھا۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ایسے طالب علم جو یہیں کے سکول سے پاس ہو کر کالج میں آتے تھے۔ باہر سے آنے والوں کے مقابلہ میں زیادہ امپارٹنٹ (Important) زیادہ پُرمذاق اور بطورِ خاص ممتاز خیال کئے جاتے تھے۔ کبھی کبھی یہ چیز اس وجہ سے نبھ جاتی کہ بڑا بھائی یا کوئی اور عزیز کالج میں موجود ہوتا اور کچھ لوگوں سے پہلے ہی جان پہچان ہوجاتی۔ لیکن ہر چیز اپنے حدود ہی میں رہ کر اچھی معلوم ہوتی ہے۔ تجاوز کرتے ہی مصیبت ہی شروع ہوجاتی ہے۔ اب سنئے کہ کمرہ نمبر ۴۵ ایس ایس ویسٹ میں کیا ہوا۔

جن نوواردکا اوپر ذکر آچکا ہے اُن کا نام صاف تو نہیں بتاؤں گا یوں سمجھ لیجئے کہ اُن کا نام لفظ "طاہر" کا افعل التفضیل تھا جس کے شروع میں "خواجہ" اور آخر میں "حسن" لگا لیجئے۔ رہنے والے وہ بھی سینئر صاحب ہی کے وطن کے تھے اور سُنا ہے کہ آئندہ زندگی میں انہوں نے پونڈے یعنی شکر ہی کا کاروبار بھی کیا بسہولت کی خاطر میں اس گفتگو میں اُن کو خواجہ کے نام سے یاد کروں گا۔ خواجہ صاحب پڑھنے لکھنے کے معاملے میں خاصے ذہین اور تیز تھے ساتھ ہی تیز و طرار بھی واقع ہوئے تھے۔ لیکن ایک مصیبت یہ تھی کہ اُن پر اگر کسی شخص کی نگاہ پڑ جائے تو اُس نگاہ کا ٹھہر جانا بھی یقینی تھا۔ پندرہ سولہ برس کا سِن، نہایت موزوں قد، سڈول جسم گورا رنگ، صراحی دار گردن، کتابی نقشہ، پتلے پتلے ہونٹ ستواں ناک، بھرے ہوئے رخسار، کشادہ ابرو، اور اونچی سی پیشانی آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ میں نے آنکھوں کا ذکر نہیں کیا۔ سبھی ملا کے گئے تھے۔ اتنے اچھے اور دیدہ زیب چہرے پر آنکھ چھوٹی رہ گئی تھی۔ بڑی تو ضرور معلوم ہوتی تھی مگر اتنی بھی نہیں کہ اڑوس پڑوس اور سائیڈ والے آتے جاتے گنگنا رہے

نہوں اور موقع ملنے پر فقرہ چست نہ کر دیتے ہوں۔ خواجہ صاحب کو فقرہ چست کرنا اور کھنکانا نہایت ناگوار گزرتا اور وہ خیال کرتے کہ کالبیٹ اسکول سے آنے والے طالب علم کی اس سے بڑھ کر اور کیا توہین ہو سکتی ہے کہ اس کو بنایا جائے۔ چنانچہ ہمت کر کے کبھی فقرہ کا جواب دیتے اور کبھی فقرہ چست کرنے میں خود سبقت فرماتے۔ یہی سبقت اُن کے لئے بلائے بے درماں ثابت ہوئی اور اس نے وہ رنگ دکھایا کہ توبہ ہی بھلی۔ مجھے بورڈنگ میں رہتے ایک ہی سال گزرا تھا لہٰذا فقرہ اور پھبتیوں وغیرہ کے معاملے میں بھلا اُن کی کیا مدد کرتا۔ ہاں کی بات تو یہ ہے کہ مجھے خود اپنی فکر پڑی رہتی اور میں جہاں تک ہو سکتا ہر ایسے موقع کو بچاتا ہی رہتا۔ البتہ ہمارے سینیر صاحب ہمیشہ خواجہ کی دستگیری فرماتے۔ چارپائی الٹی جانے کا اندیشہ ہوا تو انہوں نے رکھوالی کی خاطر رات رات بھر آنکھوں میں گزاری اور مجھے بھی نہیں سونے دیا۔ ٹھنڈی فاختہ اُڑنے کا اندیشہ ہوا تو ساری ساری رات کرسی یا پلنگ پر بیٹھ کر حقہ پیا جس کے تیز خمیرہ کی خوشبو بھرحقہ نہ پینے والے کی نیند کافور کر دینے کے لئے کافی تھی۔ ہمیشہ خواجہ کو اپنے ساتھ رکھا اور اپنے رعب اور اثر سے جہاں تک ہو سکا فقرے اور پھبتیوں کا موقع نہ آنے دیا۔ اُن کا رعب اور اثر یہ تھا کہ تھے تو وہ تھرڈ ایر میں مگر دو سال ایف اے میں فیل ہوئے تھے اور سنہ ۱۹۱۱ء اور سنہ ۱۹۱۲ء کا "آئینے" والا پُر آشوب زمانہ دیکھے اور بھگتے ہوئے تھے بقول شخصے اتنی مشکلیں پڑی تھیں کہ آسان ہوگئی تھیں۔ ڈیل ڈول سے بہت درست تھے اور خواجہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ خوش قسمت واقع ہوئے تھے۔ اس لئے کہ آنکھ نہ صرف یہ کہ چھوٹی تھی بلکہ اس میں بادام اور نرگس والی سب باتیں موجود تھیں۔ پہلی بارک میں مدت سے رہتے تھے اور تھرڈ ایر میں آنے کے بعد سیکنڈ سینیر فوڈ مانیٹر اور راؤنڈنگ کپتان بنا دیئے گئے تھے۔ اب بتائیے کہ جب وہ اتنے امپارٹنٹ آدمی ہوں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ جو جانور اُن کی نگرانی میں ہو اس کو آنکھ اٹھا کر بھی کوئی دیکھ سکے۔ لیکن ہوا یہ کہ حفاظت اور بچاؤ کی تدبیروں میں جس قدر شدت اور زیادتی ہوتی گئی دوسری طرف الکھوٹی کرنے کا جذبہ اسی قدر ترقی کرتا چلا گیا۔ ہر کوشش جو ناکام ہوئی ایک نئی صورت میں نمودار ہوتی گئی مگر خواجہ کے کارکن سب کا کاٹ کرتے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بڑوسی تک دشمنوں سے جا ملے۔ پکی اور کچی بارک کے جتنے چوٹی کے بازی کار تھے اُن سب نے ایک مکمل اور منظم سازش کی اور کارکنان[۱] بخت، بشیر حیدر، صوفی احمد بخش، اشفاق علی، معین، رفیع قدوائی، جہانگیر قدر، لدھوڑے خاں، استاد وزیر، آغا مرزا نے سر سید یٹ کے رہنے والے ظہیر بیگ اتنی، صغیر عباسی، جعفر کاظمی، قیوم خاں نمازی، چھوٹے خاں اور فجی کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ اندر ہی اندر یہ مواد پکتا رہا اور کچھ اس ڈھب اور سلیقہ سے تیاریاں کی گئیں کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ خواجہ پر فقرے بازی کم ہو گئی۔ اُن کے کارکن کو بھی مغالطہ ہوا کہ اُن کا رعب گھر گیا اور لوگ ڈر گئے۔ لیکن وہ یہ نہ سمجھے کہ سکوت ہمیشہ طوفان کا پیش خیمہ ہوا کرتا ہے۔ کسی کا مصرع ہے۔ ؎ 'بارش کی علامت ہے جو ہوتی ہے ہوا بند'

کنج گل نئی دہلی

---

[۱] ۱۹۱۵ء میں صدیق حسن بدایونی وائس پریسیڈنٹ یونین سوسائٹی اور فاروق دیوانہ نے ایک اردو پرچہ نکالا تھا جس میں حسینوں اور حسن پرستوں کے کچے چٹھے چھپتے اور ان کو خطابات دیئے جاتے تھے۔ [۲] مغلیہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ فیل ہونے میں ماہر تھے کپڑے سے زیادہ جوتے کے شوقین تھے۔ بیالیس، تینتالیس جوڑے دیوار میں ٹنگے رہتے تھے۔ [۳] کالے بھجنگ، اکرڈ خاں تحصیلدار ہو گئے تھے۔ [۴] امرتسر کے رہنے والے۔ چارپائی الٹنے میں مشاق [۵] پٹیالی والے کرکٹ کپتان مولانا شوکت علی کے سکریٹری ہوئے، بھوپال چلے گئے تھے سنا ہے پاکستان میں ہیں [۶] ہمیشہ ہاکی کی سیکنڈ الیون میں رہے مگر اکثر راگ گاتے اور ڈھولک بجاتے تھے حیدرآباد کی فوج میں بریگیڈیر ہو کر ریٹائر ہوئے بریلی کے تھے مگر حیدرآباد میں بس گئے [۷] اُن کو کالج میں تو بہت ہی کم لوگ جانتے تھے۔ صرف الیکشن لڑاتے اور شطرنج کھیلتے تھے مگر عملی زندگی میں پہونچ کر ہندوستان کے مایۂ ناز مسلمان لیڈر اور فوڈ منسٹر ہوئے [۸] ان کا ذکر اوپر آچکا ہے [۹] اسحٰق خان نام تھا ہمیشہ ترکش کوٹ اور ڈھیلی شلوار پہنتے تھے خود بھی بھاری اور آواز بھی بھاری۔ لدھوڑی استری تے کی مناسبت سے لدھوڑے خاں نام رکھ دیا گیا تھا۔ [۱۰] سب کو ایک آنکھ سے دیکھتے تھے۔ کرکٹ فرسٹ الیون کے بہت اچھے بولر اور وائس کپتان، گھڑا بہت ہی عمدہ بجاتے تھے [۱۱] پہلے ذکر آچکا ہے۔ [۱۲] قد چھوٹا مونچھیں بڑی، اپنے کو بہت اہمیت دیتے تھے [۱۳] کرنجی آنکھیں۔ قدرے ہکلاتے تھے۔ نظہیرے رُوم فیلو تھے۔ نواب صاحب چھتاری کے یہاں تھے، ان کے ساتھ حیدرآباد بھی گئے۔ [۱۴] سیدھے سادے، فٹ بال پلیر [۱۵] لانبا قد، گورا رنگ بڑے بال، فٹ بال، فرسٹ الیون کے حیدرآبادی کھلاڑی۔ حیدرآباد میں اونچے عہدہ پر رہے۔ پاکستان چلے گئے [۱۶] شاہجہاں پور کے رہنے والے، بڑے خاں کے چھوٹے بھائی، فضل الرحمٰن خاں نام، ہاکی پلیر، بہت کامیاب وکیل، خان بہادر اور میونسپلٹی کے چیرمین ہوئے [۱۷] فضل الرحمٰن نام، فجی تخلص، لکھنؤ کے قرب و جوار کے رہنے والے چھوٹی سی داڑھی، اچھے شاعر تھے۔

ڈائننگ ہال میں انگلش ڈنر ہونے والا تھا۔ ہمارے سینیر صاحب چونکہ فوڈ مانیٹر تھے اس وجہ سے انہوں نے میرے اور خواجہ کے لئے دو ٹکٹ خرید لئے تھے انگلش ڈنر ہمیشہ ۹ بجے سے ہوا کرتا اور اُن لوگوں کو جو ڈنر میں شرکت نہیں کر رہے ہوتے پہلے کھانا کھلا دیا جاتا چنانچہ گھنٹی بجی اور ڈنر میں شریک نہ ہونے والے کھانے کی میزوں پر پہونچ گئے۔ خواجہ اور میں برآمدے کے سامنے کھلے میدان میں پلنگ پر لیٹے گپ لڑا رہے تھے۔ ڈائننگ ہال ختم ہونے کے بعد سب لوگ یا تو کمروں میں یا باہر چارپائیوں پر لیٹے اور بیٹھے تھے۔ ایک دم سلام علیکم کی آوازیں آنے لگیں اور لوگوں کی نظریں مسجد کی سمت اٹھ گئیں۔ میں نے بھی مڑ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اُس طرف سے ایک مجمع چلا آ رہا ہے۔ خواجہ بھی اس طرف دیکھنے لگے۔ لیکن ہم دونوں میں سے کوئی بھی نہ سمجھ سکا کہ معاملہ کیا ہے۔ کمروں کے سامنے برآمدے میں خداداد خاں[1]، سر تاج عالم[2]، عبدالرشید[3] اور رؤف پاشا[4] کھڑے تھے۔ رؤف پاشا کہنے لگے "ابن علی صاحب ہوشیار ہو جائیے" میں نے جواب دیا "میرے مقابلے میں آپ کا ہوشیار ہونا زیادہ ضروری ہے" فقرہ ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ آناً فاناً مجمع نے مجھے اور خواجہ کو گھیر لیا۔ ایک طرف اشفاق علی نظر آئے جن کے ساتھ ایک صاحب مشجر کی شیروانی پہنے عمامہ باندھے۔ پھولوں کا سہرا لٹکائے کھڑے تھے۔ پیر میں پچے کام کا دلی کا جوتا تھا اور ہاتھ میں سُرخ رنگ کا ریشمی رومال۔ اشفاق علی کے بازو میں بشیر حیدر بھی شیروانی پہنے، عمامہ باندھے، بانس کی چھڑی ہاتھ میں لئے موجود تھے۔ تماشائیوں کا ہجوم ایک سو سے کم نہ تھا۔ آتے ہی کسی نے کہا "نیک کام میں دیر کرنے کی ضرورت نہیں" اشفاق علی نے بشیر حیدر کو متوجہ کرتے ہوئے کہا "بندہ زادہ عبدالجلیل خاں حاضر ہے۔ اس کو اپنی فرزندی میں قبول فرمائیے" "بشیر کہنے لگے،" مجھے کوئی انکار نہیں، بسم اللہ کیجئے" اس پر ایک نسیم شمیم پونے چھ فٹ کے کوئی صاحب بڑا سا پگڑ باندھے لمبی سفید ڈاڑھی لٹکائے آگے بڑھے جن کو پہلے تو میں پہچان نہ سکا لیکن آواز سُن کر پتہ چلا کہ وہ توقیر مرزا[5] ہیں۔ جب انہوں نے آمنت باللہ شروع کی تو خواجہ صاحب جو اس وقت تک کافی گھبرا گئے تھے۔ بھیڑ کو چیرتے ہوئے برآمدے میں سے ہو کر کمرے کی طرف جانے لگے۔ خیرات علی بابا نے فرمایا "دلہن شرمیلی ہے۔ گوشہ پسند کرتی ہے، چلئے اندر چلیں" چنانچہ سب لوگ کمرے کی طرف ٹوٹ پڑے چونکہ پہلے سے سب انتظامات مکمل کرلے گئے تھے اس وجہ سے فرش فروش قالین، گاؤ تکیے، کرسیاں وغیرہ سب دم بھر میں سجا دی گئیں اور دلہن کے پڑوس والوں نے جو بمنزلہ میکے والوں کے تھے۔ باراتیوں کی خاطر تواضع میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ سوڈا، لیمنڈ، آرنج، راسپ بیری، جنجر، آئس کریم وغیرہ وغیرہ تقسیم ہونا شروع ہو گیا۔ ایوب احمد آثم، نجمی[6] اور دوسرے شعراء نے خوب خوب دادِ سخن دی۔ شاید اقبال سہیل کا کہا ہوا سہرا بھی کسی نے پڑھا۔ اُدھر صحن میں آتشبازی شروع ہو گئی۔ پھُل جھڑیاں پٹاخے، مہتابیاں، طریاں، بھُو انار

---

[1] فٹ بال فرسٹ الیون کے بہترین فل بیک، سوا چھ فٹ اونچے، فرنٹیر کے رہنے والے۔ [2] سر تاج حسیناں مشہور تھے۔ بڑی آنکھیں سانولا رنگ، حیدرآباد پولس میں سپرنٹنڈنٹ ہو گئے تھے، مٹاپے کے باوجود ریٹائر ہوتے وقت اداؤں کی دلکشی اور عادات میں کوئی فرق نہ تھا۔ لاہور ہی میں ہوں گے۔ [3] عبدالرشید، سعید الزماں اور عنایت خاں ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ سر تاج سانولے مگر یہ گورے تھے پشاور کے تھے، وہیں ہوں گے [4] مدراس کے رہنے والے، سب سے کم عمر تھے۔ چھوٹا

ساقد، سانولا سلونا رنگ، قیوم کے ساتھ رہتے تھے سنا تھا کہ بہت بڑے ایگزیکٹیو ہوئے اور داڑھی بھی رکھ لی تھی [5] اُن کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ [6] دہلی کے رہنے والے، کرکٹ پلیر، داڑھی رکھتے تھے حیدرآباد میں منصف ہو گئے تھے [7] حیدرآباد میں تھے۔ اسکول کی ابتدائی جماعت میں شریک ہو کر ظہور وارڈ میں رہے کالج پہونچے کوئی درجہ دوسری یا تیسری کوشش سے پہلے پاس نہیں کیا۔ بڑی مصیبت سے علی گڑھ چھوڑا، کرکٹ کھیلتے تھے سب سے پہلے فلالین کا پتلون اور کرکٹ بوٹ پہن کر ماذبجرے پہلے گراونڈ پر پہونچ جاتے تھے مگر ساری عمر نہ کسی ٹیم میں آسکے نہ کر لڑا۔ حیدرآباد واپس پہونچ کر محکمہ امور مذہبی میں ملازم ہو گئے تھے۔ [8] سہارنپور کے رہنے والے، شاعر تھے لہٰذا حسن پرست تھے چونکہ داڑھی تھی اس وجہ سے کالج میں اپنے کو بہت چھپائے رکھا۔ وکالت پاس کرکے سہارنپور لوٹے تو کھُلم کھُلا رند شاہد باز بن گئے بہت دلچسپ آدمی تھے [9] اُن کا ذکر بھی پہلے آچکا ہے۔ [10] پروفیسر رنیل ہسٹری کے پروفیسر تھے بہت قابل اور لائق مگر سخت مزاج تھے۔ ڈائننگ ہال کے پریسیڈنٹ تھے ایک مرتبہ کھانے کے وقت ڈائننگ ہال میں موجود تھے۔ اُن کے قریب کی میز پر کسی نے روٹی مانگنے کے لئے بہت زور زور سے اور دیر تک میل پر ہاتھ

ٹیبر یچے، چرخ، فرشتہ ہر قسم کی آتشبازی چھوٹنے لگی۔ ایک طرف سے تو کچھ گھنین، چکیاں اور ہوائیاں بھی اُڑائی گئیں۔

ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ ڈائننگ ہال کی طرف سے کچھ لوگ آتے ہوئے نظر آئے جن کے آگے آگے گارجین فوڈ مانیٹر اور پروفیسر رنیل تھے۔ رنیل کو دیکھ کر مجمع کائی کی طرح پھٹ گیا۔ انہوں نے ناراضی کے ساتھ کرخت لہجے میں کہا "سب لوگ کمرے سے باہر ہو جاؤ"۔ جو لڑکا رنیل کے قریب کھڑا تھا اُس سے انہوں نے دریافت کیا کہ یہ لوگ کیوں جمع ہیں۔ وہ تو جلدی میں کچھ نہ کہہ سکا۔ البتہ جلدی اور بدحواسی میں گارجین بول اُٹھے کہ میرے رُوم فیلو کی شادی ہو رہی ہے۔ رنیل اُن کی صورت دیکھنے لگا۔ حیران ہو کر اُس نے پوچھا "کیا مطلب کیسی شادی" ساری حذاقت ختم ہو گئی۔ جواب نہ دے پائے یہی کہہ کر جان چھڑائی کہ "یہ لوگ میرے رُوم فیلو کو ستا رہے ہیں"۔ دو چار منٹ بعد رنیل واپس ہو گیا لیکن ان بزرگ کی یہ حرکت کہ رنیل کو موقع پر لے آئے بہت ناپسند کی گئی اور کچھ عرصے بعد جب وہ یونین سوسائٹی کی سکریٹری شپ کے لیے کھڑے ہو گئے تو ناکامی کی صورت میں اُن کو سزا بھی مل گئی۔ البتہ ایک عرصہ بعد اُن کی خطا معاف ہوئی اور وہ سکریٹری بن سکے۔

رنیل غریب کو کسی نے نہ بتایا کہ کالج میں جب کوئی طالب علم ایسا آ جائے جسے کسی قسم کا مغالطہ ہو تو اولاً چھوٹے موٹے علاج کر کے اس کو درست کیا جاتا ہے لیکن اگر یہ نسخے کارگر نہ ہوں تو قطعی اور مجرب علاج یہ ہے کہ شادی کر دی جاتی ہے جس سے اس کا دماغ بالکل ٹھیک ہو جاتا ہے۔ چنانچہ خواجہ کی عقل بھی ٹھکانے آ گئی۔ اُن کے ڈنک گر گئے اور ساری اکڑ فوں خاک میں مل گئی۔ کیا آپ کو یقین آیا کہ اس عجیب بیماری کا علاج کس قدر عجیب تر تھا۔

مارے۔ رنیل نے اس کو ڈائننگ ہال سے نکال دیا۔ اُس زمانے کے لوگوں کو یاد ہوگا کہ یوسف قمر الدین بدایونی اور رفیع احمد قدوائی وغیرہ نے اسٹرائک کرا دی اور لڑکے اس وقت تک ڈائننگ ہال میں نہ گئے جب تک رنیل نے معافی نہ مانگ لی۔

آواز ناشنیدہ

میں ایک دریا تھا۔ بے حد تیز رو، بیباک آوارہ
کہیں میری سطح جیسے کوئی شفاف سا درپن
کہیں میری جبیں پر نکہت افشاں کتنے چندن بن
کہیں کھیتوں میں، میں پگھلے ہوئے سونے کا فوارہ

مری موجیں رہی ہیں مختلف جلوؤں کا گہوارہ
مری باہوں میں پلا ہے ہر اک تہذیب کا بچپن
گلے مل مل کے کھیلا ہے مری موجوں پہ بن بندھن
شوالوں کے کلس سے مسجدوں کا سبز مینارہ

مگر اس عہد نو نے مجھ کو دو اطراف میں موڑا
نہ جانے کیوں مری موجوں کے نازک جسم کو توڑا
اُدھر اک باندھ باندھا، اسطرف دیوار اٹھوائی

ملی اس کو بھی تنہائی، ملی مجھ کو بھی تنہائی
کلس میرے لیے چھوڑے، وہ میناروں کا شیدائی
اب ان حالات میں جو کچھ نہ ہو جائے وہی تھوڑا

اکیلا رہ کے وہ کیا بن سکا، کیا بن سکوں گا میں
کہ اس کے بعد بربادی کا ہر سامان آ گیا ہے
نہ جانے کس پہ کیا گزرے کہ اک طوفان آ گیا ہے
بہت ممکن ہے کھو جائے اکیلا وہ، اکیلا میں

بغیر اختلاطِ دل ادھورا وہ، ادھورا میں
کٹھن ہے راہ، لٹ جانے کا ہر امکان آ گیا ہے
سلگتی جا رہی ہے دھوپ، ریگستان آ گیا ہے
وہ اک بے رنگ سی تصویر، سُونا حاشیہ سا میں

کہو اس سے کہ اب وہ توڑ ڈالے اپنے سب پہرے
ادھر میں بھی کیے دیتا ہوں اس دیوار کے ٹکڑے
ہزاروں انقلاب آئے مگر یہ سچ نہیں بدلا
کہیں پانی الگ ہوتا ہے لاٹھی مار دینے سے
کہیں تنہا رہا ہے جسم سے اس جسم کا سایہ
کہیں تشنہ دہن صحرا، سمندر خشک کر پایا!

مجیب رامش

غزلیں

ضیا فتح آبادی

ضیا فتح آبادی

ضربِ تیشہ لگا رہی ہے دُھوپ
بوڑھی دیوار ڈھا رہی ہے دُھوپ

نرم و نازک دلہن کوئی جیسے
چاندنی سے لجا رہی ہے دُھوپ

آسماں سے اُتر کے دھرتی پر
سوئے فتنے جگا رہی ہے دُھوپ

گردشِ خوں کو تیز تر کر کے
گرمیِ دل بڑھا رہی ہے دھوپ

شب گزیدوں کو کیا خبر اس کی
آ رہی ہے کہ جا رہی ہے دھوپ

سائے سے بے نیاز و بے پروا
دشت میں گھر بنا رہی ہے دُھوپ

دلِ اندھیروں سے ڈرنے لگتا ہے
گھر کے اندر تک آ رہی ہے دھوپ

کیوں نہیں پھونک دیتی پاس آ کر
دُور سے کیا جلا رہی ہے دھوپ

آتشِ گُل ہے اجنبی ہم سے
مدّتوں آشنا رہی ہے دھوپ

نعشِ خورشید اُٹھائے کندھوں پر
جل رہی ہے، جلا رہی ہے دھوپ

سُنئے، کوئی ضیا کی تازہ غزل
زیرِ لب گنگنا رہی ہے دھوپ

آج کل نئی دہلی

ٹوٹتے دیکھے ہیں پندار کے شیشے کتنے
وقت کی دُھوپ نے کجلا دیئے چہرے کتنے

صرف اک چہرے کو مہتاب بنانے کیلئے
کس کو معلوم بجھائے گئے تارے کتنے

ہم ہی دیوانے تھے ہر حال میں چاہا اس کو
زندگی ہم سے ملی روپ بدل کے کتنے

ٹکڑے ٹکڑے نظر آتا ہے ہر اک چہرے کا عکس
راہ میں بکھرے ہیں ٹوٹے ہوئے شیشے کتنے

آج کے دَور میں بدلا ہے فضاؤں نے چلن
یوں صبا آئی کہ مرجھا گئے غنچے کتنے

امن کے ہر کی ہے وقت کی شیریں طالب
دیکھنا یہ ہے کہ اب اٹھتے ہیں تیشے کتنے

کون اب پوچھے ہے کیفیتِ زخمِ پنہاں
کس کو معلوم کہ ہیں درد کے مارے کتنے

اپنی بیدار نگاہی پہ بھروسہ ہے جنہیں
آج اس بزم میں ہیں ایسے بیچارے کتنے

کبھی اعزاز دلایا، کبھی رسوا بھی کیا
مہدی اس دل نے مرے نقش ابھارے کتنے

مہدی پرتاب گڈھی

دیدۂ طولِ داستاں، رنگِ بیاں سمجھا گیا
خون کی بوندوں کو زیبِ داستاں سمجھا گیا

حُسن کا دل سے جو رشتہ تھا کہاں سمجھا گیا
اک حقیقت تھی، جسے اک داستاں سمجھا گیا

میری خاموشی کو بھی میرا بیاں سمجھا گیا
میں وہاں تھا ہی کہاں مجھ کو جہاں سمجھا گیا

دل کو دل کی طرح کب دیکھا کہاں سمجھا گیا
مدتوں حدِ نظر کو آسماں سمجھا گیا

جانے کیا ہوتا، اگر ہوتا گریباں چاک چاک
کچھ نہ ہونے پر تو دامن دھجیاں سمجھا گیا

ایک نا سمجھی کو سجدے دربدر کرنا پڑے
ایک کمزوری کو زورِ آسماں سمجھا گیا

دیر و کعبہ کے دوراہے پر سنا واعظ کا وعظ
اس نے جو جانا کہا، میں نے جہاں سمجھا گیا

وہ پری بن کر اُتر آئی مرے شیشے میں آج
آسماں پر جس کو برقِ بے اماں سمجھا گیا

کی گئی زحمت بقدرِ فرصت و پندار و ظرف
مجھ کو اے فیاض کب دیکھا کہاں سمجھا گیا

فیاض گوالیاری

آج سے اکیس برس پہلے بھارت جمہوریہ بنا...
ہر طرف خوشی .... بھاری جوش و خروش...
ترقی و خوشحالی کی طرف ایک طویل سفر کا آغاز
.. یہ بات تو ہے پرانی ...
آج ... کئی مقاصد حاصل ہو گئے ہیں ...
ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے.. کل کا بھارت ہوگا
ہماری تمناؤں کا بھارت ... بھارتی لوگوں کیلئے
قابل فخر ....
آج اور کل

مراٹھی کہانی

منو

پی ایس ریگے

منّو ـــــ اس کا پورا نام ہے، منّو ایلا۔ اُسے میں نے پہلی بار کہاں دیکھا، کوشش کے باوجود بھی یاد نہیں آیا۔ جب بھی کوشش کرتا ہوں کئی مناظر ایک ساتھ دماغ میں اُبھر آتے ہیں ـــ لندن کی ایک کہر آلود شام اور نٹین ہیم کورٹ سڑک کی چہل پہل نظر میں گھوم جاتی ہے۔ شاید وہیں نومبر دسمبر کے دنوں میں، بس کے انتظار میں کھڑی منّو کو میں نے پہلی بار دیکھا ہوگا۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد آتا ہے کہ موسم بہار میں صبح سویرے ہیمسٹیڈ ہیتھ پر جھیل میں تیرتے ہنسوں کی طرف ڈبل روٹی کے ٹکڑے پھینکتے ہوئے کھڑی منّو کو میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ پھر ''سٹول'' سینما کے پاس، ایک ہاتھ میں کتابیں سنبھالے دوسرے میں سینڈوچ کا ایک ٹکڑا لیے، کھڑی کھڑی ہی کھاتی ہوئی منّو کی تصویر نظروں میں تیر جاتی ہے۔ اور محسوس ہوتا ہے کہ میں نے سب سے پہلے اسے وہیں دیکھا تھا ـــ اور تاریخ وار سچائی میری گرفت میں نہیں آتی۔

وہ کہاں اور کب نظر آجائے گی۔ یہ کہا نہیں جا سکتا تھا اسی لیے اس کا کہیں بھی نظر آجانا میرے لیے خلافِ توقع یا باعثِ استعجاب نہ ہوتا۔ اور جب بھی دیکھا اُس کی ادا نرالی ہی دیکھی۔ کبھی وہ اتنی بے تعلقی سے اپنے ماحول کا جائزہ لیتی نظر آتی کہ مانو اس کے اندر کائنات کے آغاز و انجام پر غور و فکر میں مستغرق کوئی مفکر موجود ہو اور کبھی اتنے ہی الھڑپن سے اسی ماحول میں گھل مل گئی ہوتی مگر ہر حالت میں اس کا انداز اتنا فطری اور معصوم ہوتا کہ شکایت یا صفائی کی گنجائش ہی نہ رہتی۔ مجھے محسوس ہوتا کہ ان متضاد کیفیتوں کے باوجود منّو میں کوئی خاص بات ہے۔ وہ کیا ہے یہ میں بتا نہیں سکتا مگر رہ رہ کر مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ بات صرف میں ہی جان سکا ہوں۔ جب بھی وہ نظر آتی، پل بھر میں سب کچھ بھلا دینے کو جی چاہتا۔ اور کبھی کبھی ایسا بھی محسوس ہوتا کہ وہ پھر کبھی نظر نہیں آئے گی۔ اس کے ساتھ ایک دائمی رشتہ قائم کر لینے اور نہ لینے کی آرزوئیں ایک ساتھ میرے من میں ہچکولے لینے لگتیں۔ یہ نہیں کہ میں اس کی وجہ جان پاؤں ـــ کسی چیز کو پانے کی شدید آرزو کے ساتھ ہی اس کے نہ ملنے کا ڈر بھی شامل ہو تو اس چیز کو پا لینے اور نہ پانے کی کشمکش کا پیدا ہو جانا بالکل غیر فطری نہیں۔ مگر منّو کے بارے ایسا کبھی سوچ نہیں سکا۔ شاید آج بھی ایسا نہیں کر سکوں گا۔

ابتدائی دنوں میں وہ جب بھی مجھے نظر آتی محسوس ہوتا کہ وہ مجھے بلا رہی ہے۔ جی چاہتا کہ اس کے پاس چلا جاؤں کسی بہانے اس سے بولوں۔ لیکن فوراً مجھے خیال آجاتا کہ میں نے ایسا کیا تو، پھر وہ کبھی دکھائی ہی نہیں دے گی۔ اور اسی خیال سے میں اتنا گھبرا جاتا کہ کچھ کرنے کی ہمت ہی نہ رہ جاتی۔ پھر بھی مجھے محسوس ہوتا کہ جو طوفان میرے دل میں بپا ہے اس کا منّو کو علم ہے اور میں اس کو دیکھنے، سننے، بلکہ اس کی ہر حرکت کا مطلب اپنی مرضی کے مطابق نکال لیتا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ میرے یہ مطالب بالکل غلط تو نہ تھے مگر وہ محض میری قیاس آرائی کا نتیجہ تھے۔

جب وہ آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی تو لگتا کہ اب وہ پھر کبھی نظر نہ آئے گی بن کرا کر کے اسے بھول جانے کی کوشش کرتا۔ بھول بھی جاتا۔ مگر وہ اچانک پھر کہیں نظر آجاتی اور وہی سلسلہ پھر سے جاری ہو جاتا۔ شروع کے اُن تین چار مہینوں میں میں نے اُسے صرف آٹھ دس بار ہی دیکھا ہوگا۔ لیکن معلوم ہوتا تھا کہ کئی بار دیکھا ہے۔

یونہی ایک دفعہ، شام کو چھ بجے کے قریب میں کالج لائبریری سے گھر لوٹ رہا تھا وہ بس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ اُسے دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ اُس نے مجھے پاس بلایا۔ دو کتابیں میرے ہاتھ میں تھمائیں اور ''میں ابھی آئی'' کہتے ہوئے بغل والی گلی میں غائب ہو گئی۔ اور مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ وہ پھر آئے گی، مجھ سے بولے گی، ہماری جان پہچان ہو گی۔ مجھے یوں صرف اس لیے محسوس نہیں ہوا تھا کہ اس کی کتابیں میرے ہاتھ میں تھیں۔

میں ماحول سے تو بے خبر ہو ہی چکا تھا، اس اُمید پر کہ اس کا نام پتہ معلوم ہوگا، میں نے اوپر کی کتاب کھولی ـــــ ''منّو ایلا ہارٹ من، دین ـــــ تو یہ آسٹرین ہے دیانا کی ـــــ منّو ایلا ـــــ منّو ایلا ـــــ اور میں نے اس نام کو فوراً ہندوستانی روپ میں ڈھال لیا۔ ـــــ منّو ـــــ منّو دیلا ـــــ اتنے میں وہ آگئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھیلی تھی۔ ''میں کچھ سینڈوچ لے آئی ہوں۔ چلو ہیتھ میں گھومنے چلیں۔'' اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چلنے لگی۔

منو ـــــ منو ـــــ منو ـــــ میرا من جاپ کرنے لگا بنتیہ جانے کے لئے بس کے مقابلے میں زمین دوز ریل گاڑی آرام دہ ہوتی ہے، اس کا علم تو مجھے بعد میں ہوا۔

اس کے بعد ہم اکثر ملنے لگے۔ کب اور کہاں ملنا ہے، یہ وہی طے کرتی۔ اور ایک بار طے کرتی تو ٹھیک وقت پر وہاں پہنچ جاتی۔ ان ملاقاتوں میں اکثر وہی بولا کرتی اور میں چپ چاپ بیٹھا سنا کرتا۔ اور اس کا لب و لہجہ اتنا انوکھا اور پر لطف تھا کہ جی چاہتا، انگریزی زبان کے سارے مستعمل لہجے (Accent) فراموش کر دیئے جائیں اور اسی کا اسلوب اختیار کر لیا جائے ـــــ وہ باتوں کے درمیان تالی بجا کر، پلکیں جھپکاتے ہوئے ای یا۔ ای یا (ہاں۔ ہاں) کہتی اور دونوں ہاتھ اپنی رانوں پر رکھ کر ہنسنے لگ جاتی ـــــ جب وہ اس طرح بولنے لگتی تو مجھے جنوبی کینرا کی عورتوں کا لب و لہجہ یاد آجاتا۔ وہ بھی ایسی ہی ہوتی ہیں، پیاری پیاری اور معمولی جملوں میں بھی مٹھاس گھول دیتی ہیں۔

منو کے پاس موضوعات کی کمی نہ تھی، اور ہر بات میں اس کی رائے منفرد ہوتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ آسمان ایک وسیع نیلا سمندر ہے۔ اسے میرا کالا رنگ بے حد پسند تھا۔ اس کی ایک تھیوری یہ بھی تھی کہ یورپ کے باشندوں کے آبا پہلے ہندوستان میں تھے۔ پھر وہ وہاں سے یورپ چلے آئے۔ اپنی تھیوری کو ثابت کرنے کے لئے وہ دلیل پیش کرتی ـــــ جہاں قدرت نے اتنی فیاضی سے اپنے خزانے لٹائے ہوں، وہاں سب سے پہلے انسان کا پیدا ہونا بالکل فطری ہے۔ بالآخر، میرے ہاتھ اپنے گلے سے لگا کر یہ ظاہر بتاتے ہوئے کہ اس طویل عرصہ میں وقت نے ہمارے رنگوں میں کتنی تبدیلی پیدا کر دی ہے اپنی بات ختم کر دیتی۔ جب وہ ایسی باتیں کرنے لگتی تو اس کے ساتھ بحث کرنا بے کار ہوتا، کیونکہ اگر میں ذرا بھی اختلاف کرتا یا ناپسندیدگی کا اظہار کرتا تو وہ ایک دم موضوع ہی بدل دیتی، اس سے تو یہی اچھا ہوتا کہ اس کے خیالات کی رو میں بہہ کر سب کچھ بھلا دیا جائے۔ لیسے ضبط اور صبر کا معقول پھل بھی ملتا، ہر دفعہ بالکل انوکھا اور غیر متوقع!

متعدد ملاقاتوں کے باوجود میں یہ نہ جان سکا کہ وہ کرتی کیا ہے۔ اس سے صاف صاف پوچھنا بھی مشکل تھا۔ ایک دفعہ اس نے خود بخود کہا تھا "میں مصوری جانتی ہوں۔ اسی کے مطالعہ کے لئے انگلینڈ آئی ہوں" اور میں سوچتا، جو شخص سچ مچ مصوری کی مشق کرنا چاہتا ہے وہ پیرس اور اٹلی کے مختلف شہروں میں جائے گا انگلینڈ کیوں آئے گا! میرا مطلب یہ نہیں کہ اس نے یوں ہی کچھ کہہ دیا ہو مگر وہ تصورات کو واقعات میں کچھ اس طرح ملا دیتی کہ اس کی باتوں کے لفظی مطالب پر اکتفا کرنا صرف مشکل تھا بلکہ کبھی کبھی تو ایسا کرنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔

ایک بار یوں ہی خیال آیا، ممکن ہے وہ موڈل کا کام کرتی ہو، اور میں پریشان ہو گیا۔ کیوں کہ میں نے ناولوں اور افسانوں میں فن کاروں کے موڈلس کے بارے میں کئی بری بھلی باتیں پڑھی تھیں۔ اور اس کام کے لئے منو تھی بھی بے حد موزوں۔ اس کے چہرے پر جس سادگی سے جذبات بدلتے تھے اسی سادگی سے وہ کسی بھی جذبے کو گھنٹوں اپنے چہرہ پر قائم رکھ سکتی تھی۔ دوران گفتگو کبھی کبھی، وہ اپنا نچلا ہونٹ ذرا داہنی طرف کر کے آنکھیں پھیلا کر کتنی ہی دیر ویسی ہی رہ جاتی۔ ایک بار تو وہ اتنی دیر تک سانس روک کر ساکن رہ گئی تھی کہ میں گھبرا گیا تھا ایسے بے مثال موڈ کو کون پسند نہیں کرے گا!

سات آٹھ دن بعد جب وہ ملی تو اس کے ہاتھ میں کاغذ کی ایک تھیلی تھی۔ اس نے تھیلی سے ایک تصویر نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دی ـــــ لائن اینڈ واش کی جاپانی مصوری کے ڈھنگ کی ایک سیدھی سادی تصویر۔ جس میں ایک سفید مور، پر پھیلائے، دایاں پاؤں اٹھائے محوِ رقص تھا۔ یہ تو بس اس تصویر کی بہت خشک تشریح ہوگی۔ دراصل وہ تصویر اتنی حسین تھی کہ محسوس ہوتا کہ وہ مور ابھی اپنا اوپر اٹھا پاؤں نیچے رکھ، دوسرا اٹھا کر سچ مچ ہی ناچنے لگ جائے گا۔ دیر تک میں تصویر کو دیکھتا رہا۔ پھر جو نہیں کرنا چاہیئے تھا ـــــ منو کے ساتھ کبھی نہیں کرنا چاہیئے تھا ـــــ وہی میں نے کیا۔ میں نے پوچھا۔

"یہ تصویر تم نے بنائی ہے؟"

اس نے ہولے سے تصویر میرے ہاتھ سے لی اور پھاڑ کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ اس وقت اس کا چہرہ جذبات سے بالکل عاری تھا۔ تب اگر وہ ناراض ہو جاتی، طیش میں آکر مجھے ذلیل کر دیتی تو مجھے اچھا لگتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔

اس کے بعد وہ مجھے پھر کبھی نہیں دکھائی دی۔

افسانہ ہی لکھنا مقصود ہوتا تو اسے یہاں ختم ہو جانا چاہیئے تھا۔ لیکن حقیقی زندگی کی باتیں اس طرح ختم نہیں ہو جاتیں۔ ایک سے دوسری بات پیدا ہوتی ہے۔ بالکل بانس کی طرح اور یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اصل کہانی کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں ختم ہوتی ہے۔ بنتیہ کی دوب پر لیٹے لیٹے منو نے ایک بار مجھ سے کہا تھا، "سبھی باتیں ایک ہی وقت ہوتی رہتی ہیں" میں حالاں کہ فلسفہ کا طالب علم تھا پھر بھی اس جملہ کا مطلب فوراً نہیں سمجھ سکا تھا۔ خود اس کے الفاظ میں اس کا مطلب یوں تھا، میں بولتی ہوں اور ہوا میں لہریں اٹھتی ہیں۔ وہ کہاں جاتی ہیں؟ ادھر ادھر۔

کچھ اٹک جاتی ہیں، کچھ بھٹک جاتی ہیں۔ لیکن کوئی ضائع نہیں ہوتی۔ کیونکہ فطرت کا اصول تحفظ ہے۔ مثلاً نہیں اور سبھی لہریں ہوا میں ایک ساتھ تیرتی رہتی ہیں، ہر وقت جو سننا چاہتا ہے، اسے سنائی دیتی ہیں۔ بولتے بولتے وہ اتنی سنجیدہ ہوگئی کہ مانو کائنات کی ان تمام لہروں کو سن رہی ہو۔

"تمہیں اس وقت کیا سنائی دے رہا ہے؟" میں نے بہت دھیرے سے پوچھا (اس کی بے خودی کا خیال رکھتے ہوئے۔)

اس نے فوراً جواب دیا۔ "چودہ سال کی عمر میں، ایک دفعہ، تم سمندر کے کنارے ریت میں بھٹک گئے تھے، راستہ بھول گئے تھے اور تمہاری توقع سے پہلے ہی رات ہوگئی تھی اور اندھیرا چھانے لگا تھا۔ تب گھبرا کر تم مجھے پکارنے لگے تھے۔ وہی پکار میں سن رہی ہوں۔"

میں ایک دم چونکا کیوں کہ اسی سے ملتا جلتا ایک واقعہ چھ سال پہلے پیش آیا تھا۔ گنداپور، میرے ننھیال میں، دیر سے لوٹنے کے سبب ڈانٹ بھی سننی پڑی تھی۔ تفصیل میں فرق صرف اتنا تھا کہ اس وقت میری عمر چودہ کی بجائے سولہ کی تھی اور میرے ساتھ میری ہمدرد نرملا تھی۔ میں نے پکارا تو کسی کو نہیں تھا مگر خوف زدہ من سے نرملا کے بارے میں — اس سے بھی زیادہ اس کے پتا کے بارے میں — سوچ رہا تھا۔ منوویلا اور نرملا۔ ان ناموں میں کتنی مناسبت ہے۔

اور مجھے یقین ہوگیا کہ ہستیاں اور واقعات چند ہی ہوتے ہیں۔ اور ان میں ہی جدت پیدا کرنا ہمارا کام ہے۔ انہی چند سروں سے نئی نئی راگنیاں بنانی پڑتی ہیں یہ بات منو کے لئے بالکل آسان تھی۔ کوئی بھی واقعہ اسے غیر متوقع نہیں لگتا تھا۔ ہر بات کو وہ بے ساختہ قبول کر لیتی ہے۔ انگریزی میں "آل ان اے ڈیز ورک (All in a day's work) کہتے ہیں۔ بالکل ویسے ہی۔ نتیجتہً اس کے دل میں کبھی تذبذب یا جھجکاہٹ پیدا ہی نہ ہوتی تھی۔ یہ تذبذب یا جھجکاہٹ جو ہے، پیش نظر حقیقت کے انکار کے مترادف ہے۔ یہ اسے ناپسند ہی نہیں بلکہ اس کے لئے ناممکن سی بات تھی۔

کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے، منو کے برتاؤ کا جو مطلب میں نکال رہا ہوں کیا وہ صحیح ہے؟ کیا خود منو اس سے آگاہ تھی؟ دراصل ان سوالوں کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ گیان ہمیشہ بعد میں آتا ہے۔ اس سے پہلے تمام پہلوؤں پر کافی غور کرنا پڑتا ہے۔ روزمرہ کی زندگی اس کے لئے کبھی رک نہیں سکتی۔ منو یہ جان گئی تھی۔

چوانگ ژو اور ہوئی ژو ایک دن گھومتے گھومتے ہاؤ ندی کے پل پر آ پہنچے۔ چوانگ ژو نے کہا: "دیکھو یہ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں کس طرح، ادھر ادھر تیر رہی ہیں۔ ان کو بڑا لطف آ رہا ہوگا اس میں۔"

ہوئی ژو نے کہا: "تم مچھلی تو نہیں ہو، پھر تم یہ کیسے جان سکتے ہو کہ مچھلیوں کو کس بات میں لطف آتا ہے؟"

چوانگ ژو نے کہا: "تم، میں نہیں ہو۔ پھر یہ کیسے جانتے ہو کہ مچھلیوں کو کس بات میں لطف آتا ہے یہ میں نہیں جان سکتا؟"

ہوئی ژو نے کہا: "میں، تم نہیں ہوں، اس لئے اگر میں یہ نہیں جان سکتا کہ تم جانتے ہو کہ نہیں، تو واضح ہے کہ تم بھی یہ نہ جان سکو گے کہ مچھلیوں کو کس بات میں لطف آتا ہے۔ آخر میری ہی بات سچ نکلتی ہے نا؟"

چوانگ ژو نے کہا: "ہم پھر پہلے سے شروع کریں گے۔ تم نے مجھ سے پوچھا کہ میں یہ کیسے جان سکا کہ مچھلیوں کو کس بات میں لطف آتا ہے۔ لیکن جب تم نے یہ سوال کیا تبھی تم اس کا جواب بھی جان گئے تھے۔ اتنا ہی نہیں، ہاؤ ندی کے پل پر اس طرح کھڑے ہوتے ہی تم وہ سب کچھ سمجھ چکے تھے۔"

عام زندگی کے فلسفہ کا بھی یہی حال ہے۔ وہ بحث کرنے سے حاصل نہیں ہوتا۔

شاید اسی لئے منو، خود کوئی سوال نہ کرتی تھی۔ اور اگر کبھی کر بھی دیتی تو سوال نہ صرف خود کلامی کے انداز میں ہوتا بلکہ ساتھ ہی جواب بھی اسی کی زبان سے نکل جاتا۔ سوال کے معنی ہیں وہم، وسوسہ، اسی لئے وہ سوالوں سے پرہیز کرتی تھی۔ صرف ایک بار، اس نے میرے بارے میں ایک سوال کیا تھا: "تم کیا بننے والے ہو؟"

میں نے سادگی سے جواب دیا: "میسور لوٹنے کے بعد میں مہاراجہ کالج میں پروفیسر بننے والا ہوں۔ اسی لئے ہماری سرکار نے مجھے اسکالرشپ دے کر یہاں بھیجا ہے اور میں فلسفہ سے متعلق بہت کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔"

دیر تک وہ کچھ نہ بولی۔ میں سمجھا کہ وہ اداس ہوگئی ہے۔ کیوں کہ میرے جواب میں ہماری جدائی کی طرف اشارہ تھا۔

"تم روپ بننا نہیں چاہتے؟" تھوڑی دیر بعد وہ صرف اتنا پوچھ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور چلنے کی تیاری کرنے لگی۔

اس سوال کا مطلب کئی دنوں بعد میری سمجھ میں آیا۔ بن جانے کا مطلب ہے، جو ہے اسے پھولنے پھلنے کا موقع دینا۔ اس کے لئے محنت کی ضرورت نہیں ہوتی، پر انتخاب ٹھیک ہونا چاہیئے۔ من پسند کام کرتے ہوئے تکان کا احساس نہیں ہوتا۔ سب کچھ جیسے خود بخود ہو جاتا ہے۔ ساری قوتیں مل کر کام کرتی ہیں۔ ریل گاڑی کا پانچ منٹ کا انتظار برداشت سے باہر ہوتا ہے۔ لیکن محبوب کا انتظار کتنی بھی دیر کیوں نہ کرنا پڑے، چاہے ہم کو تشویش ہو لیکن تکان محسوس نہیں ہوتی۔ ویسے ہی ایک دفعہ مجھے ہوبرٹا اسٹیشن پہنچنے میں آدھ گھنٹے کی دیر ہوگئی۔

میں من ہی من میں بہت ڈر گیا تھا۔ لیکن منو کے رویہ میں میرے پریشان من کو جیسے سہلا کر شانت کر دیا۔

"مجھے کتنی دیر ہو گئی؟" میں نے کہا۔

اس نے کہا: "نہیں تو۔ تم تو یہیں تھے۔ تھوڑی دیر تم دستون نے اس ستون سے آنکھ مچولی کھیلتے رہے تھے۔ کئی بار تو تم نے میرے پاس کی بی ٹکٹ مشین بن کر مجھے دھوکا دینے کی کوشش کی تھی۔ ابھی ابھی تو تم ایک ننھا سا بچہ بن کر میری ٹانگوں سے لپٹ گئے تھے۔"

اور وہ یہ سب اتنی سادگی اور خلوص سے کہہ گئی کہ ہم دونوں کھلکھلا پڑے۔ اس کا برتاؤ ہمیشہ ہی اس طرح بے ساختہ اور بے لوث ہوتا۔ اسی وجہ سے کبھی کبھی یہ سمجھ میں نہ آتا کہ اس سے کس طرح پیش آیا جائے۔ ہمارے تجربات میں جیسے جیسے اضافہ ہوتا ہے ویسے ویسے ہمارے عمل اور تعلقات میں الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ جیسے ساری جد و جہد معاشرے کے مسائل حل کرنے اور ان حلوں کو آزمانے کے لئے ہو۔ ہم اپنے آپ کو سمجھا لیتے ہیں کہ اس کے بغیر سماج کی گاڑی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ ہر بات پر ہر بار نئے سرے سے غور کر کے فیصلہ کرنا ہو تو کوئی بھی پاگل ہو جائے لیکن منو کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب بے کار ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اپنی مرضی پر چلنا ہو تو بہانے تراشنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی مگر اوروں کی مرضی پر چلنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ تب ہمیشہ یہی دیکھتے ہیں کہ کون سی بات کس رواج کی رو سے بالکل ٹھیک ہے۔ وہ بات ہمیں پسند ہے کہ نہیں، یہ خیال ہی نہیں آتا۔

ان دنوں ہم آئر لینڈ گئے ہوئے تھے۔ ایک دفعہ منو باتیں کرتے کرتے یوں ہی اٹھی اور بلا جھجک اپنے سادے کپڑے اتار لاک آئن ( ) کے پانی میں اتر گئی۔ تیرنا تو مجھے بھی آتا تھا لیکن اس کی اس حرکت سے اتنا حیران ہوا کہ کچھ دیر تک مجھ سے ہلا بھی نہ گیا۔ کوئی دیکھے گا تو کیا ہوگا؟ اس خیال سے میں اتنا گھبرا گیا کہ وہ پانی میں کتنی حسین لگ رہی تھی اور پانی سے باہر آنے کے بعد جب وہ بڑے اطمینان سے کچھ دیر تک آنگرے[1] کی لاسورس کی طرح جو کھڑی ہو گئی تو کس طرح حسین تر لگ رہی تھی۔ یہ سب مجھے صرف ایک خواب سا لگ رہا تھا۔ نتیجتاً جو حقیقت میرے سامنے تھی اسے قبول کر لینے کی ہمت نہ ہوئی۔ اگر وہ ویسے ہی دوڑ کر مجھ پر نہ آگرتی، تو یہ حقیقت کبھی میرے ہاتھ نہ آتی......

ایک متقی برہمن تھا۔ اتفاقاً ایک دن، بھگوان اس سے خوش ہو گئے بھگوان نے اس سے پوچھا: "بولو، تم کیا چاہتے ہو؟"

اس غیر متوقع کرم سے وہ برہمن اتنا گھبرا گیا کہ اس نے کہا: "ہے، بھگوان، مجھے تو کچھ بھی نہیں سوجھتا۔ میں سوچ کر کل بتاؤں گا۔ مجھے اپنی گھر والی سے پوچھنا ہوگا، بڑوں کی رائے لینی ہوگی۔"

بھگوان نے کہا: "ٹھیک ہے۔"

دوسرے دن وہ برہمن بھگوان کا انتظار کرتے کرتے تھک گیا مگر ایک بار خوش ہونے والے بھگوان دوبارہ نہیں آئے۔ منہ دکھائی کے موقع پر آئینہ کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے والا تاجرانہ ذہن بھی اسی قسم کا رہا ہوگا۔

منو ماضی یا مستقبل کا ذکر شاذ و نادر ہی کرتی۔ شاید اسے اس کا مکمل احساس تھا کہ ہر لمحہ دوسرے لمحے سے بالکل مختلف ہوتا ہے اور اسے ویسے ہی بھوگنا چاہیئے۔ اور اسی لئے وہ ہمیشہ خوش رہتی تھی۔ اس کی گفتگو میں بے ساختگی ہوتی اور اسی وجہ سے وہ مناسب بھی ہوتی۔ مور کی تصویر والے حادثے کے بعد وہ مجھ سے کیوں نہیں ملی؟ اس سے متعلق میں جب بھی سوچتا ہوں، مجھے یہی لگتا ہے کہ اس کی یہ حرکت اس کے عام رویہ کے خلاف تھی۔ میرے سوال نے اس کی انا پر چوٹ کی۔ مجھ پر سے اس کا اعتماد اٹھ گیا۔ اس نے جو خوابوں کی دنیا سجائی تھی وہ بکھر گئی۔ ایسے عمومی خیالات تو آتے ہیں لیکن گہرائی سے غور کرنے پر اس کا کچھ اور ہی مطلب نکلتا ہے۔ اس کی نظر میں اہمیت اس بات کی نہ تھی کہ تصویر کس نے بنائی تھی مگر اہمیت ان باتوں کی تھی کہ وہ کیسی تھی، کیا بتاتی تھی۔ اس کے بعد وہ مجھ سے نہیں ملی۔ اس کا اس حادثہ سے کوئی تعلق ہی نہیں رہا ہوگا۔ نہیں تھا، ایسا محسوس ہوتا ہے۔

منو کی اس غیر متوقع جدائی سے مجھے دنیا خالی خالی نظر آنے لگی۔ کیا کیا جائے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اس وقت، خوش قسمتی سے میرا امتحان قریب آپہنچا تھا۔ میں نے مطالعہ میں من لگا کر سب کچھ بھلا دینے کا مصمم ارادہ کیا۔ کسی حد تک میں اس پر عمل بھی کر سکا۔ لیکن چین کہاں، کبھی لگتا کہ اس کی تلاش کرنا میرا فرض ہے۔ اتنے گہرے مراسم کے باوجود، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، اس طرح حالات کے سامنے گھٹنے ٹیک دینا احسان فراموشی لگتا۔ یہ بھی خیال آتا کہ کہیں وہ اس دنیا کو ہی چھوڑ کر تو نہیں چلی گئی! اور میں مغموم ہو جاتا۔ اور کبھی کبھی لگتا کہ اب قسمت کے کھیل دیکھنے سے کیا فائدہ؟ میری انا بھی اس خیال کا ساتھ دیتی۔ میں نے ایسا کیا کیا تھا کہ وہ یکایک سارے رشتے ہی توڑ دینے پر تل گئی؟ اس کے جنون کی تال پر میں ہمیشہ کیوں ناچتا رہوں؟ پہلے خیال میں محبت کی وسعت کی گواہی تھی تو دوسرے میں اس کی کوتاہی جھانک رہی تھی۔ میں سمجھتا ہوں، جب تک سب ٹھیک طرح چلتا رہتا ہے خود غرضی کا

[1] آنگرے کی ایک مشہور پینٹنگ

ضرورت محسوس نہیں ہوتی یا خیالات آتے بھی نہیں۔ جب گاڑی رک جاتی ہے تو فلسفیانہ باتیں بجھائی دیتی ہیں۔ میں منو کا قائل اس وجہ سے ہوں کہ اسے ایسے فلسفوں کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ویسے دیکھا جائے تو اس کی زندگی "جیو دھرم" کی راہ پر گامزن تھی۔ جیو دھرم کا راز صدا کی بازگشت اور سوال کا جواب مہیا کرنے میں پنہاں ہے۔ اس میں یہ میرا ہے یہ پرایا، اس قسم کے خیالات کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ شکار اور شکاری کی، پیر و مرید کی، عاشق و معشوق کی، قاتل و مقتول کی یکتائی اس دھرم کا بنیادی اصول ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس کا سلوک کبھی بے جا نہ لگے ہمیشہ ہی معقول و مناسب ہو وہ شخص اس راز کو سمجھ سکتا ہے۔ ایسے شخص کے قول و فعل میں اکثر تضاد نہیں ہوتا۔ منو جب گھنٹوں گھاس پر لیٹی رہتی، یا بچوں کی بھیڑ میں مل کر خود ایک بچہ بن جاتی یا اپنی کچھ موٹی سی انگلیوں کی قینچی میں میرے بال پکڑ کر ایک ساتھ ہنستے اور روتے ہوئے نیچے جھک کر میری جان ہی لے لیتی تب میں اس راز کو کچھ کچھ سمجھ پاتا۔ وہ ہر لمحہ کو اپنا لیتی اور اس میں ایک انوکھا حسن بھر دیتی۔

ایک دفعہ اس نے کہا تھا: "مجھے بہت کچھ سیکھنا ہے۔"

میں نے پوچھا: "کیا سیکھنا ہے؟"

اس نے کہا: "سب۔ سبھی سے۔ سیکھنے کے لئے کسی خاص موضوع کی ضرورت ہے، ایسا تو نہیں۔ کل میں نے ایک لڑکے سے کاغذ کا ہوائی جہاز بنانا سیکھا۔ ٹھہرو، ابھی ایک تمہیں بنا کر دیتی ہوں۔ اور وہ میری میز پر سے کاغذ اٹھا کر سچ مچ جہاز بنانے لگی۔ اس وقت وہ بالکل ایک سات آٹھ سال کا بچہ لگ رہی تھی۔

"مجھ سے تم نے کیا سیکھا؟" میں نے پوچھا۔

"خود فراموشی۔" اس نے میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے زانو پر رکھ کر اپنی بڑی بڑی آنکھوں کی گہرائیوں میں مجھے ڈبو لیا اور کہا۔ "ایک زمانہ تھا، روپ، جب میں بہت مغرور تھی۔ لیکن تمہیں دیکھا اور بدل گئی، ہمیشہ کے لئے۔"

میں نے کہا: "تم سدا سے یوں ہی ہو۔ مجھے مفت میں بزرگی دے کر میرا افتخار بڑھا رہی ہو۔"

اس نے کہا: "تم ابھی میرے بارے میں نہیں جانتے۔ کبھی نہ کبھی جان جاؤ گے۔ جو سچ مچ دیتا ہے وہ اپنے احسان کو نہیں پہچانتا۔"

پھر میں نے کہا: "میں نے بھی تم سے سیکھا ہے۔"

اس نے کہا: "ہاں میں جانتی ہوں ــــ فضول گوئی۔"

"نہیں۔ پریوں کی کہانی والی سب سے چھوٹی شہزادی کی طرح معصوم رہنا۔"

میں نے کہا۔

سنکر وہ صرف مسکرائی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے اس کو کوٹ پہناتے ہوئے اس کے بائیں کندھے پر اپنی ٹھوڑی ٹکا دی۔ لمحہ بھر کو اس نے میرا بایاں ہاتھ لے کر اپنے دل پر زور سے دبا لیا اور اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے میرا بایاں گال سہلا دیا اور چلی گئی۔ ایسا سکھ میں نے کبھی نہیں پایا تھا۔......

خوشی اگر ایک دلی کیفیت ہے تو راحت زندگی کا لمحاتی عرفان ہے۔ کوشش سے خوشی کو پایا جا سکتا ہے مگر راحت، وہ کہاں اور کب نصیب ہوگی نہیں کہا جا سکتا۔

امتحان کے ختم ہونے پر میں منو کی تلاش میں ویانا جا رہا تھا۔ سفر کے دوران کے ایک واقعہ کی یاد آتی ہے۔ گاڑی میں کافی بھیڑ تھی۔ میرے ساتھ میں ایک سترہ اٹھارہ سال کی لڑکی بیٹھی تھی۔ اتنی دور کا سفر، وہ بھی تنہا، شاید وہ پہلی بار کر رہی تھی۔ اندھیرا چھانے لگا تو سبھی مسافر بیٹھے بیٹھے جھپکیاں لینے لگے۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ ویسے مجھے ریل گاڑی میں کبھی نیند نہیں آتی۔ پھر بھی لگتا ہے میں کچھ دیر سو گیا تھا۔ کیونکہ جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ وہ لڑکی میرے کندھے پر سر رکھ کر گہری نیند سو گئی ہے۔ یکایک مجھے لگا کہ اس کے ساتھ ایکدم غائب ہو جاؤں ــــ اپنائیت کی باڑھ میں بہہ جاؤں۔ میں ویسے ہی بیٹھا رہا۔ ہلا تک نہیں۔ تاکہ اس کی نیند نہ ٹوٹ جائے۔ مجھے یاد آیا کہ کرن[1] نے پرشورام کو سونے کے لئے اپنا زانو پیش کیا تھا۔ ساری رات میں نے ویسے ہی بتا دی۔ اس وقت میں نے جو کچھ محسوس کیا اور آج صرف اس کی یاد سے بھی جو کچھ محسوس کرتا ہوں اسے میں راحت کہوں گا۔ یہ واقعہ اگر منو کو سناتا تو وہ خوش ہوتی، مجھے سراہتی۔

میں ویانا میں چار پانچ دن رہا۔ وہاں کے محلات، میوزیم سبھی دیکھے، عام لوگ جو کچھ کرتے ہیں وہ سب کیا ــــ کچھ بھی باقی نہ رہا۔ اور ایک دن اچانک راحت کا ایک لمحہ اور آیا۔ شہر ویانا ڈینوب کے ساحل پر واقع ہے۔ جرمنی کے گھنے جنگلوں میں جنم لے کر خلیج اسود میں جا ملنے تک یہ دریا اتنے خطوں سے گزرتا اور انہیں سرسبز و شاداب کرتا ہے کہ اسے مادر یورپ وسطی کہنا چاہیئے۔ آریوں کے لئے تو وہ مادر اول ہے۔ کیونکہ، تاریخ شاہد ہے کہ اس کی وادیاں آریوں کا گہوارہ رہی ہیں۔

---

[1] پرشورام کرن (میں) کے گرو ہیں۔ ایک دن وہ کرن کے زانو پر سر رکھ کر سو گئے۔ جب وہ گہری نیند میں تھے تب کرن کی زانو میں ایک بھنورے نے کاٹ لیا اور خون بہنے لگا۔ لیکن کرن نہ ہلا تاکہ گرو کی نیند نہ ٹوٹ جائے۔

دریا میں تفریح کے لئے چھوٹی بڑی کشتیاں ملتی ہیں۔ اس دن علی الصبح میں ہوٹل کے سامنے ساحل پر کھڑا لہروں کا کھیل دیکھ رہا تھا اور ناؤ کا انتظار کر رہا تھا۔ اتنے میں پیچھے سے کسی نے کہا: "ہمارے ساتھ چلیں گے آپ؟ ہمیں بہت خوشی ہوگی!"

میں نے مڑ کر دیکھا۔ کشتی میں ایک جوان جوڑا تھا۔ لڑکی کے پیلے لباس پر نیلے اور قرمزی پھول تھے۔ بالوں پر ہلکے جامنی رنگ کا ایک ریشمی رومال بندھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہیپر (HAMPER) تھا۔ وہ دونوں بہت خوش تھے، ان کے چہروں پر اتنا پیار بھرا اصرار تھا کہ میں بلا پس و پیش کشتی میں سوار ہوگیا۔ کسی بھی طرح کی بھی پوچھ تاچھ کئے بغیر اتنے پیار اور سلیقے سے پیش آنے والے لوگ یورپ میں اکثر مل جاتے ہیں۔ یہ ان کی خوش اخلاقی کی عظمت ہے۔ کشتی پر ہم نے خوب باتیں کیں۔ بڑا فراخ دل تھا۔ وہ نوجوان۔ ہم لوگ جنگلے پر جھکے باتیں کر رہے تھے۔ اس نے دریا میں مجھ سے پوچھا۔ "دریا کا پانی آپ کو کس رنگ کا دکھائی دے رہا ہے؟"

"میں نے کہا: نیلا"

"تب تو واقعی آپ عاشق مزاج ہیں" وہ چہکا۔

"مجھے تو یہ پانی سبز نظر آتا ہے" لڑکی نے ایک نقلی آہ بھر کر کہا: "مجھ سے کوئی بھی پیار نہیں کرتا"

اس پر وہ دونوں کھلکھلا پڑے۔ تب تک میں ان سے کافی گھل مل گیا تھا۔ میں بھی ہنس پڑا۔ ڈینیوب کی یہ شاعری کتنی سادہ مگر کتنی موثر ہے، دل کو چھو لینے والی! دریا کا پانی تو ہر کسی کو نیلا ہی نظر آتا ہے۔ مگر روایت یہی ہے کہ وہ صرف عاشق مزاجوں کو ہی نیلا نظر آتا ہے۔ جس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ سبھی پریمی ہیں۔ کیا یہ آفاقی محبت حسین شاعری کی عظیم مثال نہیں! اس وقت سے میں محسوس کرنے لگا کہ منو میرے پاس ہی ہے یا میرے آس پاس چل پھر رہی ہے۔ ہر طرف اس کا روپ نظر آنے لگا۔ اور میرا من شانت ہوگیا۔ مجھ پر سب کچھ واضح ہوگیا۔ اور میں اپنے جوان دوستوں کی صحبت میں سب کچھ بھول گیا۔ کشتی جب کنارے پر پہنچی تو پھر ملنے کا وعدہ کر کے ہم ایک دوسرے سے علحدہ ہوئے۔ جاتے جاتے، اچانک، اس لڑکی نے جھک کر میرا بایاں گال چوم لیا۔ پیار کا ایسا غیر مصنوعی روپ میں نہیں جانتا تھا۔

منو اب صرف میری ہی نہ رہی تھی، سب کی ہوگئی تھی۔ اور اسی سبب میں اس سے قریب تر ہوگیا تھا۔ فوراً ہوٹل لوٹنے کی چاہ نہ رہی۔ میں محسوس کرنے لگا کہ میں کائنات کے ذرے ذرے میں موجود ہوں ــــــــ ہر ایک کا بھید جانتا ہوں۔ گاڑیوں کی ریل پیل، سڑک کی چہل پہل اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلتے ہوئے جوڑوں کے دل کی دھڑکنوں کو میں محسوس کر رہا تھا۔ دونوں ہاتھ نیکر کی جیبوں میں ڈال کر سیٹی بجاتے ہوئے اپنی ہی شان سے چلتا ہوا لڑکا، سڑک پر گن گن کر قدم رکھتے ہوئے درمیان میں رک رک کر پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوا، نحیف جوان، ساری دنیا کا بوجھ مانو اسی پر ہے، یوں سمجھ کر جلد جلد قدم اٹھاتے نوکری پر جاتی ہوئی ٹپ ٹاپ لڑکی ــــــــ ان سب کے احساسات کو میں محسوس کر رہا تھا۔ مجھے ان سب میں جذب ہو کر حظ حاصل کرنا تھا۔

منو کی زندگی کے راز کو میں نے اسی لمحے جانا۔ ساڑھے چار مہینے کے عرصے میں اس نے مجھے جنت اور دوزخ کے تمام راستے بتا دیئے تھے۔ دینے لینے کے عرصے میں کچھ بھی باقی نہیں رکھا تھا۔ طوفانی سمندر کا ہنگامہ اور سرما کی رات کا سکوت، مونالزا کی مسکراہٹ اور ٹیس کے آنسو۔ آسمان سے باتیں کرتے اونچے پیڑ اور صبح کی اوس میں بھیگی گھاس کے پھول ــــــــ ان سب کے راز اس نے مجھ پر فاش کر دیئے تھے۔ ایک طرف منو میرا کرشن تھی۔ کرشن، رادھا کی ہر ذہنی کیفیت میں اس کا ساتھ دیتے تھے۔ اس کے لئے چھوٹے بنتے تھے اور بڑے بھی۔ منو کے سلوک میں بھی وہی خصوصیت تھی۔ کرشن متھرا چلے گئے اور رادھا کی زندگی ختم ہوگئی ــ ختم ہوگئی، ایسا ہم سمجھتے ہیں۔ مگر حقیقتاً ایسا ہوا نہیں، تب رادھا خود کرشن بن گئی تھی۔ دراصل اس کی حقیقی زندگی کا آغاز وہیں سے ہوا تھا۔

میں ہوٹل میں داخل ہوکر، لفٹ کی جانب بڑھ رہا تھا۔ پورٹر نے ایک لفافہ اور ایک چھوٹا سا پارسل مجھے تھما دیا۔ میری بینک نے یہ دونوں چیزیں اس پتہ پر بھجوائی تھیں۔

کمرے میں بیٹھ کر اطمینان سے میں نے لفافہ کھولا۔ خط میں دن یا مقام کا ذکر نہیں تھا۔ پیلا سا، چکنا کاغذ اور اس پر پیارے پیارے حروف جن کا میں اتنا عادی ہوگیا تھا کہ وہ مجھے اپنے سے لگتے تھے۔ اتنا لمبا خط منو نے پہلے کبھی لکھا نہیں تھا۔ دوسرا جملہ بھی وہ شاذ و نادر ہی لکھا کرتی۔ تصویری کارڈ پر صرف پتہ اور نیچے بہت سادی حسین لکیروں کے درمیان نازک پھولوں کی طرح جھانکتے ہوئے اس کے نام کے حروف، بس! لیکن آج خط بالکل مختلف تھا، دونوں طرف لکھے آٹھ ورق، جن میں مانو اس کی زندگی کا نچوڑ تھا۔

"مجھے پورا یقین ہے کہ اس خط کو پڑھ کر تمہیں حیرت نہ ہوگی۔ اب تک تم متوازن ذہن سے دنیا سے سنگھرش کرنے کو تیار ہو چکے ہوگے اور شاید مجھے بھول بھی چکے ہوگے۔ لیکن جہاں میں ہوں، وہاں تم ہی تم ہو۔

"آج میں جو کچھ لکھنے والی ہوں، اسے تم شاید خط نہ مانوگے۔ کبھی میں نے اپنے دل سے جو وعدہ کیا تھا، اسے آج پورا کر رہی ہوں۔

"میری ماں مجھے جنم دیتے ہی اس دنیا کو چھوڑ کر چلی گئی۔ وہ پچھلی لڑائی کے

دن تھے۔ جب میں دو سال کی تھی تو پتا جی بھی چل بسے۔ اس لئے میری پرورش میری خالہ کے ہاں ہوئی، سالزبرگ میں۔ اور میں بھی اسی کنبہ کا ایک فرد بن گئی۔ میری زندگی کے وہ دن ایسے تھے کہ ہر کسی کو رشک آئے۔ میری ہر چاہ پوری کی جاتی تھی۔ خالہ کے اپنے بھی بچے تھے ـــــــــــ دو لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ لیکن کسی نے کبھی ہم میں امتیاز نہیں کیا۔ میں سب سے چھوٹی تھی اس لئے میرا لاڈ پیار زیادہ ہوتا تھا۔ خالو آرکیٹیکٹ تھے۔ جنگ ختم ہوئی تو انہیں اچھے کام ملنے لگے۔ سکھ کے دن آ گئے۔ کارل، میرا بھائی، ویانا میں پڑھ رہا تھا۔ میری بہنوں کی شادی جلد ہی ہو گئی اور وہ اپنے شوہروں کے ساتھ چلی گئیں۔ اس وقت طے پایا کہ مجھے سوئٹزرلینڈ کی ایک مشن سکول میں بھیجا جائے۔ اس وقت میرا پندرہواں سال ختم ہو چکا تھا اور میں سولہویں میں قدم رکھ چکی تھی۔

"یہ سکول انٹرلاکن کے پاس بستی سے تھوڑی دور ہے۔ اس سکول میں میں نے صرف دو ہی باتیں سیکھیں" ـــــــــــ چوری چھپے تیرنا اور فرنچ ٹیچر سے پیار کرنا۔ سسٹر ہیلینا اتنی خوبصورت تھیں کہ ہر بار، ان کی طرف دیکھتے ہی میرے دل کی دھڑکن بند ہو جاتی ـــــــــــ اور پھر دگنی تیزی سے شروع ہو جاتی۔ وینس دے میلو کو اگر راہبہ کا لبادہ گاؤن پہنا دیا جائے تو وہ جیسی لگتی، ویسی ہی تھیں وہ۔ ان کے بولنے کا انداز اتنا شاندار اور پُر وقار تھا کہ جب وہ بولنے لگتیں تو جی چاہتا کہ ان کے گاؤن کی بانہہ پر گال ملتے سنتے ہی رہ جائیں۔ اور ان کا سلوک، ہر ایک کے ساتھ، اتنا پیار بھرا ہوتا کہ سبھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے کہ وہ صرف اسی سے پیار کرتی ہیں۔ بس! اس بات کو لے کر، لڑکیوں میں، آئے دن جھگڑے بھی ہوا کرتے تھے۔

ایک رات جب سناٹا چھا گیا تو میں کھڑکی سے کود کر جھیل کے کنارے، اپنی مخصوص جگہ پر پہنچ گئی، تیرنے کے لئے۔ گرمی کے دن تھے۔ اس موسم میں من ہی من ارمانوں کی دنیا سجانے اور رات کو جھیل کے پانی میں دھینگا مشتی کر کے سب کچھ بھلا دینے سے بڑھ کر کون سا سکھ ہو سکتا ہے؛ ایسے وقت پانی کے ذرات جیسے جسم کے ہر مسام کو کھول کر زندگی میں ایک انوکھا پن بھر دیتے ہیں۔ میں سمجھتی تھی کہ وہ مقام بالکل خفیہ ہے، صرف میرا۔ لیکن اس دن وہاں کوئی اور آ گیا تھا۔ مجھ سے بھی پہلے۔ کیونکہ پانی میں چل رہے مشاق ہاتھوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں گھبرا تو گئی لیکن لوٹتے نہیں بن رہا تھا۔ اور اس تیراک شخص کو دیکھنے کی آرزو پیدا ہوئی۔ میں ایک درخت کی اوٹ سے، چھپ کر، دیکھنے لگی ـــــــــــ آواز رک گئی۔ پھر ساحل پر ایک سایہ نمودار ہوا۔ دور سے اسے پہچاننا ممکن نہ تھا۔ لیکن اتنا صاف ظاہر تھا کہ وہ بھی میری طرح آئی ہوئی تنہا عورت ہے۔ دھیرے دھیرے وہ میرے قریب آنے لگی، میں بھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ دفعتاً میرے دل کی دھڑکن رک گئی۔ پھر دگنی تیزی سے شروع ہو گئی۔ میرے پاؤں جیسے زمین میں گڑ گئے۔ جی چاہا کہ چلا اٹھوں، زور سے .... غیر ارادی طور پر دوڑ کر سسٹر ہیلینا کے پیروں سے لپٹ گئی تھی۔

وہ نہ چونکیں نہ گھبرائیں بلکہ بڑے اطمینان سے مجھے اوپر کھینچ لیا۔ اور "ذرا بیٹھو" کہہ کر کپڑے پہننے چلی گئیں۔ پہلے تو میں نے گھٹنوں میں سر چھپا لیا۔ پھر نہ جانے کیوں بلا جھجک سب دیکھنے لگی۔ رومال جیسے چھوٹے تولیے سے انہوں نے اپنا بدن دھیرے دھیرے پونچھا۔ پھر کپڑے پہننے لگیں۔ ایک کے بعد ایک، جلدی جلدی مگر باقاعدہ۔ مجھے پتہ نہ تھا کہ گرجا میں رہنے والی عورتوں کے لئے اتنے سارے کپڑوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر ان ڈھیر سارے کپڑوں کے باوجود سسٹر ہیلینا ایک تازہ پھول کی مانند شاداب نظر آتی تھیں۔ کپڑے پہننے کے بعد بوٹ اور موزے اٹھا کر وہ میرے قریب آ گئیں۔ جی چاہا کہ جھپٹ کر ان کے ہاتھوں سے موزے اور بوٹ لے لوں اور انہیں پہنانے کے بہانے ان کے لال لال تلوؤں پر اپنے گالوں کو ملوں اور انہیں ہلکے سے چوم لوں۔ انہوں نے جیسے میرے دل کی بات جان لی ہو۔ بوٹ میرے سامنے رکھ دیئے اور تولیہ میرے ہاتھوں میں تھما دیا۔ میں نے ان کے پیر پونچھے، اپنی آرزو پوری کی پھر جوتے پہنا دیئے۔

پھر انہوں نے کہا۔ "تم پانی میں اترنا چاہتی ہو، چاہو تو اترو۔ میں یہیں ٹھہروں گی۔" میں نے پہلے سر ہلا کر انکار کر دیا .... پھر ایکدم کہہ اٹھی، "پھر کسی دن ہم دونوں ساتھ نہائیں گے۔"

اس کے بعد دیر تک ہم دونوں ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے بیٹھے رہے (اس رات کے بعد میں پھر پانی میں اتری تو لاک الن میں، جب تم میرے ساتھ تھے۔)

دوسرے دن میں جیسے ہوا میں تیر رہی تھی۔ میری ہر حرکت ایسی تھی جیسے میں نے دنیا بھر کی تمام خوشیاں پا لی ہوں۔ جماعت میں جب ہماری نظریں ملتیں میں من ہی من ناچ اٹھتی .... میں ایک عالم بے خودی میں ڈوبی رہتی۔

اس دن شام کی عبادت کے بعد سسٹر ہیلینا اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھیں۔ سب کی نظریں بچا کر میں ان کی طرف دوڑتی چلی گئی۔ "رات کو کھانے سے فارغ ہونے کے بعد پچھلے میدان میں تھی کے پاس آ جانا۔" صرف اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھ گئیں۔ تب تک کیسے انتظار کروں! میں بے تاب ہو گئی۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں وہاں پہنچ گئی۔ ایک منٹ .... دو منٹ .... کیوں نہیں آئیں سسٹر ہیلینا ....؟

آزردہ آنکھیں۔ ایک البم نما کتاب میرے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے انہوں نے کہا — اسے اپنے پاس رکھو، تمہارے لئے ہے۔ اور اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی انہوں نے بڑے پیار سے میرے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور چلی گئیں۔ مجھے کچھ بھی نہیں سوجھ رہا تھا۔ میں نے وہ کتاب کس کر دل سے لگائی پھر گاؤن میں چھپالی۔ رات کو کتاب نکال کر دیکھ سکتی کیونکہ ڈارمٹری میں سبھی لڑکیوں کی موجودگی میں، ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ رات بھر کتاب میرے سینے سے لگی چبھتی رہی۔

اگلے دن دوپہر کے کھانے کے دوران، میری نظر بڑی میز پر گئی۔ وہاں سسٹر ہیلینا نہیں تھیں۔ میرے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔ کل جو البم یا کتاب ملی تھی وہ بھی تو نہیں دیکھ سکی تھی۔ کھانے کی رسم ادا کر کے نوکرانی ایلسا کے پاس دوڑی۔ اس نے بتایا کہ اسی دن صبح کو سسٹر ہیلینا کو سپین کے کسی گرجا میں بھیج دیا گیا ہے۔ سنکر میرے ہوش اڑ گئے۔ ایلسا کو اور کچھ معلوم نہ تھا۔ کسی اور سے پوچھنا بھی ممکن نہ تھا۔

اسی رات کو مجھے بخار آ گیا۔ جب وہ نہ اترا تو گھر تار بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد مجھے سالزبرگ سے لے جایا گیا ہوگا۔ ان سات آٹھ دنوں کی یاد بالکل دھندلی ہے۔ پوری طرح صحت یاب ہوتے ایک مہینہ لگ گیا۔ ان دنوں میں ایک ہی کام کرتی تھی۔ سسٹر ہیلینا کی البم۔ ڈائری (میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کیا نام دیا جائے) کا نظارا۔ میں نے تمہیں ایک مور کی تصویر دکھائی تھی۔ اسے میں نے اسی ڈائری کے ایک سکیچ سے بنایا تھا۔ اس ڈائری میں الفاظ سے بڑھ کر ایسی چھوٹی موٹی تصویریں ہی ہیں۔ یہ تو تم دیکھو گے ہی۔

اور ایک دن میں نے مصوری سیکھنے کا تہیہ کر لیا۔ میرے لئے وہ سسٹر ہیلینا کا پیغام ہی تو تھا۔ مجھے مشق کے لئے ساری چیزیں مہیا کر دی گئیں۔ آسٹریا کے سبھی میوزیم بتلائے گئے۔ پھر یہ طے ہوا کہ پہلے مجھے لندن بھیجا جائے اور بعد میں پیرس۔ جب ہم ملے تب میں سلیڈ سکول میں زیر تعلیم تھی۔

سسٹر ہیلینا نے اپنی ڈائری میں ایک جگہ لکھا ہے۔ پھول کے باطن میں داخل ہونے کی کوشش نہ کرو، وہاں خلا کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اور وہی اس کا سنہ جاگیہ ہے۔ پھول کی تمام تر رنگینیاں جس کے دل میں بھی ہوں، یہ بے نام خالی چن بھی اسی کے لئے ہے۔ پہلی بار تمہیں دیکھتے ہی مجھے یقین ہو گیا کہ میرے دل کا پھول تمہارے پاس ہمیشہ محفوظ رہ سکے گا۔

تم نے شاید یہ سمجھا ہو کہ میں نے تمہاری زندگی کے ساتھ مذاق کیا ہے لیکن سچ کہتی ہوں، روپ، میں نے ایسا نہیں کیا، سسٹر ہیلینا نے مجھے اپنا جانشین چنا اور اپنے دل کی دھڑکنیں میرے حوالے کر دیں۔ وہی اس خط کے ساتھ، میں تمہیں بھیج رہی ہوں۔ تم میرے جانشین ہو۔ تم میں غور و فکر کرنے کی صلاحیت ہے اور پھر نتیجہ کو آسان الفاظ میں پیش کرنے کی صلاحیت بھی ہے۔ یہ سب کو بتلانا، جو سمجھ جائیں گے وہ کل ہمارے جانشین بنیں گے۔

میں آج کہاں ہوں —— ؟ یہ تم پوچھوگے۔ میں ٹرول کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ہوں۔ خوب گھومتی ہوں۔ کھیت میں کام کرتی ہوں اور تصویریں بناتی ہوں۔ ایک دن تم مجھے بری طرح چاہنے لگوگے۔ میرے بغیر نہ رہ سکوگے، تب میں تمہارے پاس آؤں گی۔ تب تک کے لئے خدا حافظ …..؟

منو کے اس خط کو آئے سولہ سال بیت چکے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی یادیں اور گہری اور واضح ہوتی چلی جا رہی ہے۔ وہ اب تک تو نہیں آئی….. ۔ اس کی ٹیچر سسٹر ہیلینا کی ڈائری میں دل کی دنیا اتنی پیچیدہ ہے کہ اتنے برسوں بعد بھی وہاں پوری طرح قدم نہیں جم سکے ہیں۔ ایک دن مجھے یہ ڈائری شائع کرنی پڑے گی۔ مگر اس دن، جب اس کا ہر لفظ، ہر نقش میرا اپنا بن جائے گا۔

(مترجم :۔ محمد شرف الدین)

فضا کوثری

جو سنگ سار بدن چُور چُور اپنا ہے
کیا ہے پیار سراسر قصور اپنا ہے
میں ایک میں ہوں اور اپنے وجود کا احسا
نہ پاس ہے نہ کوئی دُور دُور اپنا ہے
لرز رہا ہوں اسے بھی نہ چھین لے کوئی
یہ آسرا بھی کہ ربِ غفور اپنا ہے
یہ اعتبارِ نظر بھی نہ ہو کہیں مغلوط
کرن کرن یہی کہتی ہے نور اپنا ہے
اکیلے پن کا یہ احساس مٹ گیا ہوتا
اگر فضا کو سمجھتے حضور اپنا ہے

جگدیش مہتہ درد

کسی کی یاد بڑھتے بڑھتے دردِ دل نہ بن جائے
خداوندا یہ آسانی کہیں مشکل نہ بن جائے
نگاہِ شوخ ہی تیرے لئے قاتل نہ بن جائے
کہیں بیٹھے بٹھائے جان پر اے دل نہ بن جائے
میرا ہر اشک وہ دامن سے اپنے پونچھ دیتے ہیں
کہیں یہ لختِ دل مٹی میں مل کر گل نہ بن جائے
وہ جب سے آئے ہیں دل میں نظر سے دُور رہتے ہیں
مجھے ڈر ہے کہ دل ہی پردۂ محمل نہ بن جائے
اثر پڑ کر رہے گا ایک دن رندوں کی صحبت کا
یہ ملا پارسا بھی جگدیش کامل نہ بن جائے

عشرت انور

دردِ عالم سے ہے گرچہ ساری دنیا آشنا
آج کل ہے کون دُنیا میں کسی کا آشنا
گویا شیرازہ چمن کا اب بکھر جانے کو ہے
"سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل نا آشنا"
آشنا سب ساتھ تھے اپنے فقط اک موڑ تک
موڑ پہ پہونچے تو سب تھے آشنا نا آشنا
دوستوں کی مہربانی دشمنی سے کم نہیں
کیسے ممکن ہے تمیزِ آشنا نا آشنا
دوستوں کی دشمنی انور بہت ہے دل شکن
دوست دشمن عمر بھر ہم سے رہے نا آشنا

عشر سہرامی

گلشن میں بلبلوں کا ہے میلہ لگا ہوا
شاید کوئی اسیر قفس سے رہا ہوا
پرہیز اُن سے ہو نہیں سکتا بہار میں
توبہ کا خون منہ کو ہے جن کے لگا ہوا
سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں ہے نگاہ میں
یہ آ گیا کہاں میں تمہیں ڈھونڈھتا ہوا
اس کو بھی تم نے بھانپ لیا میری شکل سے
جو رہ گیا تھا بات کا پہلو دبا ہوا
اُن کی نگاہ پھرتے ہی آیا یہ انقلاب
سارا زمانہ عشر ہے مجھ سے پھرا ہوا

ناظر الحسینی

تیری محفل سے کہاں جائیں گے دیوانے لوگ
خاک اُڑائیں گے تو بن جائیں گے افسانے لوگ
ہم نے خود پاؤں میں زنجیرِ وفا ڈالی ہے
ایسے عالم میں عبث آتے ہیں سمجھانے لوگ
میکدہ کم نہیں جنت سے جنابِ واعظ
آ ہی جاتے ہیں دلِ زار کو بہلانے لوگ
جب گلستاں میں اماں کی کوئی صورت ہی نہیں
کیوں نہ آباد کریں شوق سے ویرانے لوگ
کتنا بدلا ہوا دستورِ جہاں ہے ناظر
ہو کے کعبے سے چلے جاتے ہیں میخانے لوگ

بچوں کی پیدائش میں وقفہ کیلئے

فی زمانہ بچوں کی پیدائش اتفاق کی بات نہیں۔ یہ آپ کے اختیار میں ہے۔ نرودھ استعمال کرنے سے آپ کے بچے تبھی ہونگے جب آپ چاہیں گے، اتفاق سے نہیں۔

بچہ اور ماں کی صحت کیلئے

ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ بچے کو شروع کے تین برسوں میں زیادہ توجہ درکار ہوتی ہے۔ پھر بچے کی پیدائش کے بعد ماں کو اپنی صحت بحال کرنے میں بھی وقت لگتا ہے۔ نرودھ استعمال کرکے آپ اگلے بچے کی پیدائش ملتوی کرسکتے ہیں۔

نرودھ (کنڈوم)، اعلیٰ کوالٹی کے ربڑ سے بنتا ہے۔ دنیا بھر میں لوگ اسے استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ فیملی پلاننگ کا آسان و محفوظ طریقہ ہے۔ اس کے استعمال سے صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا۔

نرودھ ہر جگہ ملتا ہے۔
پنساری، اسٹور، کریانہ فروش، کیمسٹ، جنرل مرچنٹ، پان فروش وغیرہ کی دوکانوں پر بکتا ہے۔

صرف 5 پیسے خرچ کرکے آپ اپنے کنبے کو محدود رکھنے کی طاقت حاصل کرسکتے ہیں

نرودھ استعمال کیجئے

فیملی پلاننگ کیلئے
اعلیٰ کوالٹی کے ربڑ کنڈوم
15 پیسے کے 3
سرکاری امداد سے کم دام

سعد الحسن آفاق

کمسٹری اُس سائنس کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ قدرتی چیزوں کی بناوٹ اُن کی خصوصیت اور اُن کی بناوٹ میں قدرتی طور پر جو تبدیلیاں ہوتی ہیں اُن کی واقفیت حاصل کی جائے۔ اس علم کے جاننے والے کو ماہر علم کیمیا یا کیمیا داں کہتے ہیں۔

اس علم کی بنیاد یونان اور مصر میں پڑی۔ ہندوستان اور چین میں بھی یہ علم رائج تھا۔ سب سے پہلے یہ علم دھاتوں کو نکالنے اور برتن بنانے کے فن تک محدود تھا۔ شاید ۳۵۰۰ ق م میں مصری دھات نکالنے کے فن سے قطعی طور پر واقف تھے اور برتن بنانے کے فن میں بھی انہیں مہارت حاصل تھی۔ سب سے پہلی دھات جو انسانوں کے استعمال میں آئی شاید سونا تھی۔ اس کے بعد لوگ تانبے سے واقف ہوئے پھر وقت کے ساتھ ساتھ لوہا، چاندی، پارہ، قلعی اور دوسری دھاتوں سے متعارف ہو گئے۔ کچھ دنوں بعد یہ لوگ فن شیشہ گری سے واقف ہوئے۔ اس کے بارے میں دو خیال ہیں۔ کچھ مصنفوں کا خیال ہے کہ شیشہ گری کا فن یونانیوں کی ایجاد ہے مگر دوسروں کا خیال ہے کہ یہ فن یونانیوں اور رومیوں نے مصریوں سے سیکھا۔ کیونکہ یونان کے شہنشاہوں کے یہاں اور قیصر روم کے دربار میں مصری شیشے بطور تحفے اور اکثر خرید کر بھی جایا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں یہ لوگ رنگین شیشے بھی بنانے لگے اور بعد میں ان رنگین شیشوں سے مختلف قسم کے نقلی جواہرات بنانے میں کیمیاگروں نے بہت نام پیدا کیا۔ پہلے پہل تو یہ جواہرات بہت اچھے نہیں ہوتے تھے اور آسانی سے پہچان لیے جاتے تھے۔ مگر بعد میں اُن لوگوں نے دور دراز سے مختلف قسم کی معدنی اشیا جمع کیں اور ان کے ساتھ تجربے کرکے اس قدر عمدہ مصنوعی جواہرات بنانے لگے کہ اصل سے امتیاز کرنا مشکل ہو گیا۔ دوسری طرف نقلی سونا بنانے کا رواج بھی زور پکڑنے لگا۔

جب کیمیاگر نقلی سونا بنانے میں مصروف ہوتے تھے تو سونا تو بن نہیں پاتا تھا۔ البتہ اس عمل کے دوران دوسرے قسم کے سیال اور بہت سی ٹھوس قسم کی چیزیں مل جاتی تھیں۔ یہ لوگ ان چیزوں کو ویسے ہی نہیں چھوڑتے تھے بلکہ اُن کو دیکھتے اور پرکھتے تھے۔ اُن کے بنانے کے آسان طریقوں پر غور کرتے تھے۔ اس قسم کی کوششوں میں ایسی چیزیں مل گئیں جو دنیا کے لیے نئی ایجادات تھیں۔ کئی قسم کے مرکب، تیزاب اور الکحل جیسی چیزیں ان کے ہاتھ آئیں۔ لیکن کچھ لوگ اس عام ڈگر سے ہٹ کر کام کرتے تھے اور ان کے کام جدید کیمسٹری کے انداز پر ہوتے تھے۔

اس طرح ایک طرف کیمیا کی سائنسی ترقی ہو رہی تھی اور دوسری طرف نقلی سونا اور مصنوعی جواہرات بنانے کا فن ترقی کر رہا تھا۔ کیا ہم ان دونوں کا فرق کرنے کے لیے اوّل الذکر کو کیمیا اور ثانی الذکر کو الکیمی کہہ سکتے ہیں۔

کیمیا داں اس فن کے علاوہ عنصر اور فلسفۂ زندگی میں بھی بہت دخل رکھتے تھے۔ یونان کے ایک فلسفی تھیلیس نے ۶۲۴ ق م میں عنصر کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کی تھی۔ اس کے قول کے مطابق ہر چیز پانی سے بنتی ہے۔ بعد میں لوگوں نے ہوا، پانی اور آگ کو بھی عنصر بتایا۔ اور آخر میں ایمپی ڈاکلس نے کہا کہ ہر چیز کے اجزائے ترکیبی چار ہوتے ہیں: آگ، ہوا، پانی اور مٹی۔ عنصر کا لفظ جس کو لاطینی میں Stoiches کہتے ہیں، پلیٹو نے ۳۷۰ ق م اور ارسطو نے ۳۵۰ ق م میں استعمال کیا تھا۔

۳۰۰ ق م میں شہر اسکندریہ میں بھی اس علم نے بہت ترقی کی۔ یہاں پر مصر، یونان، روم اور شام کے مایۂ ناز کیمیا داں اکٹھے ہوئے اور اسی اسکول کے ذریعے اس علم نے اپنی ترقی کی رفتار تیز کر دی۔ یہیں پر دھاتوں کے اشارے بنانے کا خیال پیدا ہوا اور کچھ اشارات بنائے بھی گئے۔ جیسے سونے کے لئے ☉ اور چاندی کے لیے ☽ وغیرہ وغیرہ۔ یہ اشارے کیونکر بنائے گئے، اس کا خیال کیسے آیا۔ اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ اس وقت تک اس تعداد میں کیمیائی چیزیں معلوم ہو گئی تھیں اور ان کو لکھنے میں بہت وقت لگتا تھا اس لیے اشارے بنائے گئے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کیمیا داں چاہتے تھے کہ اُن کی لکھی ہوئی باتیں دوسرے نہ سمجھ سکیں اور انہیں تک محدود رہیں اور اسی لیے شاید الگ الگ کیمیا دانوں کے اشارے بھی الگ الگ ہوں۔ اس کی موافقت میں ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ کیمیا دانوں نے کبھی اپنے فن کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اور جو کچھ کتابوں میں لکھا اس میں رمز سے کام لیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جو پرانی کتابیں اس علم کے متعلق ملتی ہیں وہ ادھوری معلوم ہوتی ہیں اور ان کے کچھ تجربوں اور تکنیک سے ہم لوگ قطعی بے بہرہ ہیں۔

آئی آئی ٹی دہلی

جب عربوں نے اس خطۂ ارض پر قبضہ کیا تو وہ اس فن سے واقف ہوئے۔ عربوں نے علم کیمیا کی کتابوں کا ترجمہ کیا اور اس علم کو پڑھنے اور سمجھنے کے بعد اپنایا اور اس علم کو اس قدر مالا مال کیا کہ اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اشاروں کے سلسلے میں یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ کیمیا داں علم کیمیا کو علم نجوم سے جوڑنے لگے تھے۔ ستاروں اور دھاتوں کو ایک ہی چیز سمجھتے تھے۔ ان کے قول کے مطابق سیارے اور دھات ایک ہی چیز کے دو حصے ہیں ایک آسمان پر اور ایک زمین پر۔ مثال کے طور پر ان کیمیا گروں نے سات اشارے بنائے اور ان اشاروں کو مشترکہ طور پر دھات اور سیاروں کے نشان کے طور پر تسلیم کرتے تھے۔ یہ اشارے اس طرح ہیں۔

☽	☿	☉	♂	♃	♄
چاند	زہرہ	سورج	مریخ	مشتری	زحل
چاندی	تانبا	سونا	لوہا	قلعی	سیسا

اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اسلام کے عروج تک علم کیمیا نے بہت ترقی کی تھی اور اسلام کے بعد اس علم کا دوسرا باب کھلتا ہے جو اس علم کی تاریخ میں سنہرے حرفوں سے لکھا جاتا ہے۔

جب عربوں میں یہ فن کتابوں کے ترجمے سے منتقل ہوا تو انہوں نے اس فن کو بے انتہا ترقی دی اور اس میں اضافہ کرتے چلے گئے۔ کتابوں کے ترجمے کا کام زیادہ تر عباسی خلفاؤں کے زمانے میں ہوا اور خلفاؤں نے اس کام کے لئے مالی اور دوسرے قسم کی سہولتیں دیں۔

دوسرے ممالک کے کیمیا دانوں کی طرح عربوں میں بھی تین قسم کے کیمیا داں ملتے ہیں۔ کچھ کسی عنصر کے اندرونی تبدیلی پر یقین رکھتے ہیں۔ کچھ نئی چیزوں کی کھوج اور تجربوں میں لگے ہوئے تھے اور بعض دھاتوں کی جلس تبدیل کرنے کے چکر میں تھے۔ ان کیمیا دانوں میں الرازی پہلی قسم کے مصنفوں میں، العراقی دوسری قسم کے اور جابر تیسری قسم میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان تینوں کے علاوہ اور بہت سے دوسرے کیمیاں داں بھی ہوئے ہیں جیسے الحسن الرہاما، السمرقندی، ایوب الرہاوی وغیرہ وغیرہ۔

جابر ابن حیان کا زمانہ آٹھویں صدی کے بعد کا ہے۔ ان کے آبا و اجداد دکھنی عرب سے ہجرت کر کے آئے تھے اور اسلامی عروج کے زمانہ میں کوفہ میں رہنے لگے تھے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ شاید یہ کتابیں کسی ایک آدمی کی نہیں ہیں بلکہ جابر کے خیالات کے ماننے والے دوسرے مصنفوں نے جابر کے نام سے کتابیں لکھیں ہیں۔ جابر کی مشہور کتاب The Book Of Balance ہے۔

الرازی جن کا پورا نام محمد ابن ذکریا الرازی تھا Arab Galen کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ یہ طب میں بھی استاد مانے جاتے تھے اور ان کا نام طب میں ابو سینا کے بعد لیا جاسکتا ہے۔ الرازی کی مشہور کتاب جو طب کے موضوع پر ہے Despestilentia or Dr.Peste ہے۔ دوسری کتاب Secret of Secrets ہے جو الکیمی پر ہے۔

تیسرے مشہور کیمیا داں ابو القاسم العراقی ہیں جو تیرہویں صدی کے ہیں۔ یہ اندلس کے رہنے والے تھے۔ ان کی نو کتابیں عام ہیں۔

ان لوگوں کے علاوہ کچھ شاعر بھی تھے جو کیمیا کے فارمولوں کو شاعری میں ڈھالتے تھے۔ ان میں الطغرائی کافی مشہور ہیں۔ دوسرے کیمیا داں انہیں لوگوں کے خیالات پر کام کرتے تھے اور اکثر انہیں لوگوں کی باتوں کو دہراتے تھے۔

علم کیمیا کی تاریخ ویسے تو بہت پرانی ہے مگر اس کی صحیح تاریخ کسی کو معلوم نہ تھی۔ عربوں نے سب سے پہلے اور سب سے اہم جو کام کیا ہے وہ اس علم کی تاریخ سے متعلق ہے۔ جابر نے سب سے پہلے علم کیمیا کی تاریخ لکھی ہے۔ وہ اس کی تاریخ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں۔ کہ جس طرح فلسفے کے بانی فیثا غورث ہیں اسی طرح اس علم کے جنم داتا ارسطو ہیں۔

توازن کا خیال اور اس کا اصول بھی سب سے پہلے جابر نے پیش کیا۔

توازن سے مراد یہ ہے کہ کسی دھات کی جو خصوصیات باہر سے دکھائی دیتی ہیں۔ اس کے برابر کی متوازن خصوصیت اس میں اندرونی طور پر موجود رہتی ہے۔ ان کے قول سے ہر دھات کی دو اندرونی خصوصیات ہیں اور اسی کے برابر کی دو باہری خصوصیات ہیں جیسے کہ سونا اندرونی طور پر سرد اور خشک ہے اور باہری طور پر گرم اور تر (سرد گرم کا مقابل اور خشک تر کا) چاندی اس کے برعکس ہے۔ باہر سے سرد خشک اور اندر سے گرم تر۔ اس طریقے سے اندرونی اور باہری خصوصیات کا توازن قائم رہتا ہے۔

معدنی شے کی بناوٹ کے بارے میں سب سے پہلے جابر نے گندھک اور پارے کا نظریہ پیش کیا۔ یہ نظریہ آج کل کی ایٹم اور مبیں کے نظریہ سے موافقت رکھتا ہے۔ گندھک اور پارے کے نظریے میں ان لوگوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہر دھات پارے اور گندھک سے بنتی ہے۔ پارہ جب گندھک کی مدد سے جم جاتا ہے تو کوئی نہ کوئی دھات بن جاتا ہے۔ لیکن یہ سوال اٹھتا ہے کہ دھات تو کئی قسم کی ہوتی ہیں۔ اس کا جواب دیتے ہوئے جابر نے لکھا ہے کہ دھاتوں میں فرق مادہ ثانی سے یا گندھک میں فرق کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اور گندھک میں فرق اس جگہ کی زمین جہاں سے گندھک نکالا گیا ہے اور موسم کی گرمی کی وجہ سے ہے۔

اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ان لوگوں کے خیال سے ہر دھات ایک ہی جنس سے تعلق رکھتی ہے اور ان میں فرق اتفاقی یا گندھک میں فرق کی وجہ سے ہوتا ہے۔ شاید اسی خیال کی بنا پر العراقی نے Prima - Matter کا نظریہ پیش کیا ہے۔ ان کے خیال میں ایک چیز Prima - Matter ہے جس سے ہر دھات بنتی ہے۔ اس کو انہوں نے اس طریقے سے بیان کیا ہے کہ Prima - Matter ایک پیڑ ہے۔ جس کی کئی شاخیں ہیں اور ہر شاخ میں الگ الگ رنگ کے پھول کھلتے ہیں جو لال رنگ، کالے رنگ، سفید رنگ، لال اور کالے کے بیچ کا رنگ۔ سفید اور پیلے رنگ کے بیچ کا رنگ ہوتا ہے (لال رنگ سے مراد شاید سونا ہے کالے رنگ سے مراد شاید لوہا ہے۔ سفید رنگ سے مراد چاندی اور لال اور کالے رنگ کے بیچ کے رنگ سے مراد شاید قلعی ہے) اس طرح یہ خیال ان لوگوں کے ذہن میں آتا ہے کہ جب ہر دھات ایک ہی قسم کی چیز سے پیدا ہوتی ہے تو اس کی جنس بھی بدلی جا سکتی ہے۔

مسلمان کیمیا دانوں میں جابر پہلا شخص تھا جس نے تجربہ گاہ بنائی اس کام میں ذوالنون نے اس کی مدد کی۔ پہلے تو کیمیا داں مہوسی کے چکر میں پڑے رہتے تھے اور نتیجہ صفر ہوتا تھا لیکن بعد میں جب ابو سینا نے (۹۸۰ء سے ۱۰۳۶ء) یہ کہا کہ یا انسانوں کے بس کا روگ نہیں ہے کہ وہ دھات کی جنس تبدیل کر دیں۔ اسی وقت سے اس علم نے دوسری کروٹ لی اور الکیمی سے ہٹ کر کیمیا پر آ گیا۔

جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ دور اسلامی کی پہلی تین صدیاں مذہبی فلسفے میں گزریں۔ اس کے بعد کی دس صدیاں سائنس کی صدیاں تھیں جس کا زیادہ تر حصہ مہوسی کی نظر ہو گیا، اور بارہویں صدی سے یہ علم یورپ کی طرف منتقل ہونا شروع ہو گیا۔ یہاں پر بھی پہلے اسی انداز پر کام ہوا مگر بعد میں جدید کیمسٹری کی بنیاد پڑی۔ یورپ میں اس علم کے متعلق عربی اور لاطینی زبان میں لکھی گئی کتابوں کے ترجمے انگریزی اور فرانسیسی میں ہوئے۔ سب سے پہلی کتاب Turb - Philospomin کا ترجمہ لاطینی زبان سے کیا گیا۔ اس کے بعد جابر کی لکھی ہوئی کتابوں کا ترجمہ شروع ہوا۔ اس سلسلے میں اگر ہم نکلسن فلیمنگ کا ذکر نہ کریں تو زیادتی ہوگی۔ یہ ۱۳۳۰ء میں پیدا ہوا۔ فرانس کا رہنے والا ایک معمولی کتاب فروش تھا ایک بار اس نے ایک خواب دیکھا (جس کا ذکر اس نے خود کیا ہے) کہ ایک فرشتہ اس کو ایک کتاب دکھا رہا ہے جس کا نام Abraham of jend ہے۔ اس خواب کے دوسرے دن اسی کتاب کو ایک آدمی نے اس کے ہاتھ فروخت کیا۔ جب یہ کتاب اس کے ہاتھ آئی تو اس کو وہ خواب یاد پڑا۔ اس نے اس کتاب کو پڑھا مگر کچھ سمجھ نہ سکا۔ اس کو سمجھنے کے لئے اس نے اسپین کا سفر کیا۔ جب وہ وہاں سے ناکام واپس آ رہا تھا تو راستے میں اس کو ایک آدمی ملا۔ اس نے فلیمنگ کو کتاب کے بارے میں بتایا۔ اس آدمی کی کچھ دنوں کی محنت سے فلیمنگ اس قابل ہو گیا کہ کیمیا کے متعلق ہر کتاب کو سمجھ سکتا تھا۔ اس نے کچھ تجربے بھی اپنی اہلیہ کی مدد سے ۱۳۸۲ء میں کیے۔ ۱۳۹۷ء میں اس کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے اپنا پورا وقت علم کیمیا کے متعلق لاطینی اور عربی کتابوں کا ترجمہ کرنے میں صرف کر دیا۔ ۱۴۱۸ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس طریقے سے علم کیمیا عربوں سے یورپ کی طرف منتقل ہوا اور جدید کیمسٹری کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔

اس زمانے میں چند قابل ذکر چیزیں ایجاد ہوئیں جن میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں۔

قرع انبیق مسلمانوں کی ایک قابل قدر ایجاد ہے۔ مغرب کے لوگ اس کو پالی کین پرندے کے نام سے جانتے ہیں۔ اس میں پالی کین پرندے کی طرح ایک چوڑا جسم، ایک چپٹا سر اور ایک لمبی چونچ ہوتی ہے۔ یہ ایک مالی چکنی مٹی کا بنایا جاتا ہے اور خاص طریقے سے پکایا جاتا تھا۔ اس کے دو حصے تھے جن کو حسب ضرورت ملایا جا سکتا تھا۔ ایک حصہ گول پیندے کے مرتبان کی شکل کا ہوتا تھا جس کی چوڑی گردن لمبائی میں بہت چھوٹی ہوتی تھی۔ اس کا دوسرا ایک بھبکے کی شکل کا ہوتا تھا جس کی چوڑی گردن لمبائی میں بہت چھوٹی ہوتی تھی۔ یہ دوسرا حصہ پہلے حصے کے اوپر صحیح طور پر آ جاتا تھا۔

مرتبان میں جس کا جوہر یا عرق نکالنا ہوتا تھا بھر دیا جاتا تھا۔ اور اس کی گردن میں بھبکے کو الٹا لٹکا دیا جاتا تھا۔ اس حالت میں مرتبان کو آگ پر رکھ کر گرم کیا جاتا تھا۔ حرارت سے اس شے سے بخارات اٹھتے تھے اور نالی سے ہوتا ہوا بھبکے میں آتا تھا۔ بھبکے میں ایک صراحی لگا دی جاتی تھی جس سے آبخارات ٹھنڈے ہو جاتے تھے اور مائع بن جاتا تھا۔ یہی مائع اس چیز کا عرق ہوتا ہے۔ یہ لوگ قرع انبیق سے گلاب، چنبیلی، موتیا وغیرہ کا عرق نکالتے تھے اور خوشبو کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اس سے ست پودینا نکالتے تھے اور پیٹ کے مرض میں دیتے تھے سری بوٹی کا تیل بھی نکالتے تھے اور مرہم وغیرہ میں استعمال کرتے تھے۔ سری بوٹی کا عرق Salicylic Acid ہے اور اسپرین Aspirin اسی تیزاب کا ایک مرکب ہے جو آج کل بہت عام ہو رہا ہے۔

قرع انبیق کے ذریعے شراب سے الکحل بھی انہیں لوگوں نے بنایا۔ بلاشبہ اوپر ذکر کئے گئے قرع انبیق سے الکحل نہیں بن سکتا کاریگروں نے بہت کوشش کی مگر ہمیشہ ناکام رہے۔ یہ کام انہوں نے شراب کے Distillation سے شروع کیا۔ مگر شراب بھبکے میں آتی ہی نہیں تھی۔ کچھ عرصے بعد ایک کاریگر نے اس کی نلی کو لمبا کر کے اس کو ایک صراحی سے جوڑا۔ اس طرح صراحی میں رکھے ہوئے

بھبکے میں ایک مائع آگیا اور اس کو الکحل کا نام دیا۔
تیزاب ایک اتفاقی ایجاد ہے۔ ایک بار ایک بوڑھے کیمیا داں نے قرع انبیق میں پھٹکری، ہراکسیس اور قلمی شورہ ڈالا، اس کو کوئلے کی آگ پر رکھ دیا۔ اس نے ان مرکب کو کیوں ملایا اور اس سے کیا ہوگا؟ یہ وہ بھی نہیں جانتا تھا مگر اس کا یہ تجربہ نہایت ہی کامیاب رہا۔ بھبکے میں پہلے بھورے رنگ کی ایک گیس نکلی۔ اور بعد میں ایک بے رنگ کا مائع بیرونی برتن میں اکٹھا ہوگیا۔ اس مائع نے قرع انبیق کے بیرونی برتن جو تانبے کا تھا سوراخ کر دیا۔ اس کو چاندی کے کٹوری میں اکٹھا کرنے کی کوشش کی تو اس میں سوراخ ہوگیا۔ چمڑے کی تھیلی کو بھی نقصان پہنچا۔ اس نے اس مائع کو چھوا تو اس کا ہاتھ جل گیا۔ اس کا نام اس نے تیزاب۔ Aquaf ortes رکھا۔ اس تیزاب کا اثر صرف سونے اور شیشے پر نہیں ہوتا تھا۔ اس اثر کو دیکھتے ہوئے لوگوں نے شیشے کا قرع انبیق بنایا۔ جو سب سے پہلے اٹلی میں بنا اور وینس کے شیشہ گروں نے اس کام کو سرانجام دیا۔ ان کاریگروں نے ان کے دونوں برتنوں کو جوڑ دیا اس سے یہ فائدہ ہوا کہ مائع کے رس رس کر نکلنے کے امکان بھی ختم ہو گئے۔ اس کا نام ریٹارٹ رکھا۔ بعد میں اس سے ایک تیزاب بنایا۔ جو پھٹکری، ہراکسیس، نوسادر اور قلمی شورے کو ملا کر گرم کرنے سے بنا تھا۔ یہ تیزاب سونے کو بھی گھول لیتا تھا۔ اس کو شاہی تیزاب یا Aquaregia کا نام دیا۔ اس سے ایک اور تیزاب بنایا جو پھٹکری اور ہراکسیس کی مدد سے بنا۔ اس کو ہراکسیس کا تیل کہتے تھے۔ آج کل پہلے تیزاب کو شورے کا تیزاب Nitric Acid دوسرے کو Aquaregia (شورے اور نمک کے تیزاب کا آمیزہ) اور تیسرے کو گندھک کا تیزاب Sulphuric Acid کہا گیا ہے۔

بارہویں صدی کے آخری حصے میں بارود کی ایجاد ہوئی۔ بارود کی ایجاد شورے کے ساتھ پوٹاش اور گندھک کے تجربے سے ہوئی۔ اس کی ایجاد کے بارے میں لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ شاید تیرہویں صدی میں ہوئی۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ بارود چینیوں کی ایجاد ہے مگر اس کی تصدیق نہیں ہوتی ہے۔ ویسے جہاں تک خیال ہے کہ یہ شام میں بنایا گیا تھا۔ اور اس کی جلنے والی خصوصیت کی وجہ سے اس کا استعمال جنگ میں بھی کیا جانے لگا۔

اس کے علاوہ ان لوگوں نے کچھ ایسے سائنسی سامان بنائے جو کیمیائی تجربوں میں اب تک استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے Smelting furnace, Pistol motor, Beaker Flask, Naptha Lamp,

اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ علم کیمیا مصر اور یونان میں پیدا ہوا۔ اسکندریہ میں پنپا، مسلمانوں نے اس کو پروان چڑھا کر بغداد، اسپین، سمرقند اور افریقہ تک پھیلایا۔ اور بعد میں یورپ والوں نے اس کو اپنا کر جدید کمسٹری کی شکل دی۔ اس علم کا زیادہ تر کام بارہویں صدی میں ہوا، بارود، رنگ اور الکحل وغیرہ اسی زمانے کی ایجاد ہیں۔ علم کیمیا کی جو شکل پہلے تھی اب قطعی بدل چکی ہے۔ الکیمی یا مہوسی ایک دوسری چیز بن کر رہ گئی ہے۔ جواب بہت کم ملتی ہے۔ علم کیمیا جواب جدید کمسٹری کی شکل میں ہے اس میں سائنس نے بہت ترقی کی ہے۔ ان چیزوں کے خاکے بنائے ہیں جن کو نہ ہم دیکھ سکتے ہیں اور نہ چھو سکتے ہیں۔ اور انسانوں کی سوجھ بوجھ، حکمت عملی اور لگن کی وجہ سے قدرت کے راز لگاتار منکشف ہو رہے ہیں۔

کلیم عاجز

کروگے عشق تو ڈوبوگے پیارے
یہ دریا ہے کنارے ہی کنارے
یہ دن آیا ہے کس مشکل سے پیارے
پھرو ہو تم جو زلفوں کو سنوارے
تمہیں سب بے وفا کہتے ہیں پیارے
مرے جاتے ہیں ہم غیرت کے مارے
مرے احوال پر روتے ہیں سارے
ہنسو ہو تم بڑے ظالم ہو پیارے
جو سب سے دور ہیں سب سے کنارے
وہی ہیں چاہنے والے تمہارے
ہمیں یہ اس لئے پیاری ہے پیارے
یہ محفل ہے تمہاری تم ہمارے
نہ رکھو تہمت ترکِ محبت!
چھری رکھ دو گلا حاضر ہے پیارے
دل اب قابو سے باہر جا رہا ہے
کوئی اس جانے والے کو پکارے
تڑپ ہر شعر میں رہتی ہے عاجز
یہ کیسا درد ہے دل میں ہمارے
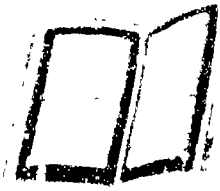
نئی کتابیں

جدید اُردو نظم اور یورپی اثرات

ڈاکٹر حامدی کاشمیری

ناشر:۔ مجلس اشاعت ادب، ۱۰۹۱۴ باڑہ ہندو راؤ دہلی
صفحات:۔ ۴۰۰ ، قیمت:۔ ۲۰ (بیس) روپے
ملنے کا پتہ:۔ مجلس اشاعتِ ادب دہلی اور ادارہ ادب ۲۹۹ جواہر نگر سرینگر کشمیر

زیرِ نظر مقالے پر ڈاکٹر حامدی کاشمیری کو کشمیر یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا ہوئی ہے مقالہ نگار اس لحاظ سے قابلِ تحسین ہیں کہ انہوں نے ایک ایسے موضوع پر قلم اٹھایا جس پر اُردو میں کم لکھا گیا ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے بڑی چھان بین کر کے اس مقالے میں خاصا کار آمد مواد بھی اکٹھا کیا ہے۔ لیکن مواد اکٹھا کرنا محض آدھا کارنامہ ہے۔ ناقد کی خوبی یا خامی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ وہ اس مواد کو کس طور پر ترتیب دیتا ہے اور اس سے کیا نتائج اخذ کرتا ہے۔ مقالہ نگار کے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لئے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

جہاں تک دوسری اصنافِ سخن مثلاً غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، رباعی وغیرہ کا تعلق ہے انہیں زیرِ مطالعے سے خارج کیا گیا ہے کیونکہ یہ موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے مروجہ روایتی فرسودہ اور کہنہ ہیں۔ (صفحہ ۸)

"مرتبِ مقالہ نے اُردو نظم کے اس مطالعے میں جو تنقیدی اسلوب اختیار کیا ہے وہ مغرب اور مشرق کے ادب اور شاعری کے درمیان کوئی فرق یا تمیز روا نہیں رکھتا۔ (صفحہ ۹)

"مرثیہ کی صنف میں نظم نگاری کے بہت سے امکانات پوشیدہ تھے لیکن ان امکانات کا شعور کسی شاعر نے نہیں دکھایا ہے سوائے اس کے کہ صرف ایک مرکزی موضوع شہادت امام حسین کو استعمال کیا گیا ہے اور وہ بھی روایتی انداز سے مرثیہ کی صنف بذاتِ خود بری نہیں۔ یہ نظم کے تخلیقی عناصر کی حامل ہے۔ انگریزی میں گرے کی ایلجی، یا ٹینی سن کی ان میموریم، مرثیہ کے ذیل ہی میں آتی ہیں اور دونوں بلند پایہ نظمیں قرار دی گئی ہیں۔ لیکن اُردو میں اس پائے کی ایک بھی نظم نہیں ملتی۔" (صفحہ ۴۴)

یہ بات مسلّم ہے کہ فیض نے جدید نظم کی فنی تراش خراش، تنظیم اور تعمیر میں اپنی بہترین خلاقانہ صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے۔ اور چند ایسی اعلیٰ پایہ کی نظمیں تخلیق کی ہیں جو مغربی نظموں کا طرزِ تفکر اور اندازِ نگارش کی حامل معلوم ہوتی ہیں اور فکر و فن کی نئی سمتوں کا تعین کرتی ہیں۔ جہاں تک اُن کے دائرۂ فکر کا تعلق ہے وہ بدقسمتی سے بہت ہی محدود رہا ہے۔ اُن کے افکار میں تنوع ہے اور نہ وسعت اُن کے اسلوب اور ہیئت میں بھی ایک طرح کی یکرنگی اور یکسانیت پائی جاتی ہے۔

(صفحہ ۴۲)

"اُردو شاعری اپنی پیدائش کے زمانے ہی سے مسلسل طور پر یا تو بیرونی روایات کے تلے دبی رہی ہے یا مختلف ادوار میں مروجہ تصورات اور احساسات کی غلام بنی رہی۔ سچ تو یہ ہے کہ ایرانی زبان و خیال کے حاوی اثر سے ہماری شاعری ابھی تک آزاد نہیں ہوئی ہے۔" (صفحہ ۴۰۶)

"نئے نظم نگار فنی اصولوں کی اہمیت سے واقفیت رکھتے ہیں۔ وہ مغربی شعر و ادب کے حالیہ رجحانات کا دلچسپی سے مطالعہ کر رہے ہیں۔ آزاد نظم اب ایک علیحدہ اور مکمل صنف کی حیثیت اختیار کر چکی ہے اور نثری نظم کی مقبولیت بڑھتی جا رہی ہے۔"

"مختصر یہ کہ نئی اُردو نظم موجودہ دور میں جس سرعت کے ساتھ عالمی تحریکوں، ادبی نظریوں اور نئے اسالیب سے ہم آہنگ ہوتی جاتی ہے وہ اس

[illegible]

سے مستقبل کے امکانات کے لئے فال نیک نہیں ہے۔" (صفحہ ۲۱۰)

مندرجہ بالا اقتباسات اور متعدد دیگر بیانات میرے ہر ایک محل نظر ہیں اور اگر کسی ذمہ دارانہ ناقدانہ بیانات دلائل اور امثال کے ساتھ پیش کئے ہوتے تو ان پر مفصل بحث بھی ہو سکتی تھی لیکن مقالہ نویس نے چونکہ یہ اور ایسے دیگر بیانات بغیر دلیل و شواہد کے پیش کئے ہیں لہٰذا وہ محض ان کی ذاتی رائے کے مظہر ہیں اور زیادہ سے زیادہ انگریزی ادب سے ان کی ذہنی مرعوبیت کی غمازی کرتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ذاتی رائے پر کوئی بحث نہیں ہو سکتی۔

سنجیدہ قاری کو ایک علمی مقالے میں "اشارئے" کی کمی گراں گزرتی ہے اور یہ سوال بھی شش و پنج میں ڈال دیتا ہے کہ "جدید اردو نظم" کا عہد صرف ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کیوں محدود رکھا گیا ہے۔ کیا گزشتہ بیس سال کی شاعری جس کا محض ضمنی طور پر آخری باب میں ذکر ہے "غیر جدید" ہے؟

ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس مقالے کے باوجود "جدید اردو نظم اور یورپی اثرات" کا موضوع ابھی تک تشنہ ہے۔

(مہر عباس حسینی)

عہد جہانگیر و شاہجہاں میں ہندوستان کا فارسی ادب (انگریزی)

مصنف: پروفیسر لطف الرحمٰن

فارسی سیکڑوں برس تک ہندوستان کی زبان رہی ہے اور اس طویل عرصہ میں یہاں تقریباً ہر علم و فن میں فارسی میں کتابیں لکھی جاتی اور ترجمہ ہوتی رہی ہیں لیکن ہندوستان سے باہر لکھنے والے جب فارسی ادب کی تاریخ لکھتے ہیں تو ہندوستان کے اس ذخیرہ کو تقریباً نظرانداز کر دیتے ہیں۔ خود ہمارے ملک میں اب تک اس پر دل کھول کر کام نہیں ہوا ہے پھر بھی انگریزی میں اس سے متعلق کچھ کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ڈاکٹر اقبال حسین صاحب نے امیر خسرو کے پہلے کے ہندوستانی فارسی شعراء پر ایک کتاب لکھی تھی۔ پٹنہ یونی ورسٹی کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر عبدالغنی نے مغلوں سے پہلے کے عہد اور بابر، ہمایوں اور اکبر کے زمانے کے فارسی ادب پر تین جلدوں میں ایک کتاب شائع کی تھی مگر اس کے بعد کے فارسی ادب پر کوئی کتاب موجود نہ تھی جس کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔

۱۹۶۵ء میں بڑودہ یونی ورسٹی نے پروفیسر لطف الرحمٰن کی ایک کتاب شائع کی ہے جس میں جہانگیر اور شاہجہاں کے زمانہ کے فارسی ادب کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں متوسط سائز کے تقریباً دو سو صفحات ہیں۔ اس میدان میں ایک بڑی کمی تھی جس کو اس تالیف نے دور کر دیا ہے۔

اس امر کی نشان دہی ضروری ہے کہ کتاب کی ضخامت کو دیکھتے ہوئے مولف نے تناسب کا خیال نہیں رکھا ہے۔ یعنی بعض کے ذکر میں ضرورت سے زیادہ طول دیا گیا اور بعض کو ضرورت سے زیادہ مختصر رکھا گیا ہے۔ جہانگیر پر اکتیس صفحوں پر شامل دو باب ہیں۔ جبکہ صرف ایک باب اور اس سے کم صفحوں میں کام چل سکتا تھا۔ عرفی کا ذکر عمداً جہانگیر کے عہد میں کیا گیا ہے جبکہ وہ اس کی تخت نشینی سے پہلے مر چکا تھا۔ صرف اس وجہ سے کہ اس کی شاہ زادگی کے زمانہ میں عرفی نے اس کی مدح میں قصیدے لکھے، اسے جہانگیر کے عہد کے شعراء میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح ابوطالب کلیم اور شیدا جیسے شاعروں کو جہانگیر کے عہد کے شعراء میں شمار کرنے کے بجائے شاہجہاں کے عہد میں شامل کرنا چاہیے تھا، اس لئے کہ کلیم شاہجہاں کے دربار کا ملک الشعراء تھا۔ نیز شیدا کا اسی زمانہ کے شعراء میں شمار ہوتا ہے۔ کچھ گمنام قسم کے شعراء کا ذکر ہے جن کو صرف ایک سرسری فہرست میں شامل کیا جا سکتا تھا۔ علاوہ بریں بعض شاعروں کا ذکر کرتے ہوئے ان کے کلام کا کوئی نمونہ پیش نہیں کیا گیا ہے۔

اقتباسات طولانی ہیں۔ خاص کر جب کہ فارسی کے ساتھ اُن کے انگریزی ترجمے بھی دئے گئے ہیں۔ حواشی غیر ضروری طریقہ سے طولانی ہو گئے ہیں۔ چند کتابوں کا پورا پورا نام بار بار دہرایا گیا ہے جبکہ ان کے مخففات سے کام نکالا جا سکتا تھا۔ چھپائی کی غلطیاں بھی کافی ہیں۔

ہندوستان میں فارسی ادب کے مطالعہ میں ملکی عناصر کا خیال رکھنا ضروری ہے، بلکہ ان پر اصرار ہونا چاہیئے۔ دارا شکوہ اور جہاں آرا دونوں کو اس کتاب میں برابر سے ایک ایک صفحہ دیا گیا ہے جبکہ دارا شکوہ نے فارسی ادب میں اپنی تخلیق، تحریر اور سرپرستی سے ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ اس عہد میں بہت سی ہندوستانی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ ہوا اور مقامی داستانوں کو فارسی کا لباس پہنایا گیا ہے جنہیں پورے طریقے سے اب تک منظرِ عام پر نہیں لایا گیا ہے۔

(امیر حسن عابدی)

گزشتہ دنوں جمہوریہ گویانا کے وزیر اعظم عزت مآب لینڈن
فاربس سیمپن برنہم اور شریمتی وائلا برنہم ہندوستان کے
سرکاری دورے پر تشریف لائے تھے آپ نے ہندوستانی
رہنماؤں سے مشترکہ دلچسپی کے مسائل پر بات چیت کی۔
(تصویر میں) ۲۸ جنوری کو آپ دونوں نے مہاتما گاندھی
کی سمادھی پر پھول چڑھائے۔

حکومت ہند ہر سال ہندوستانی زبانوں
شائع ہونے والی کتابوں کو بہترین طباعت،
کاری اور گٹ اپ کے مختلف زمروں کے
انعامات دیتی ہے۔ [illegible] کے دوران میں
اور شائع ہونے والی ہندوستانی زبانوں کے
قومی مقابلے میں نسخہ عرشی زادہ دیوان غالب
غالب کو دو انعامات کا مستحق قرار دیا۔
(تصویر میں) ۳ فروری [illegible] کو شری گوپال
پالشک نائب صدر جمہوریہ ہند نے وگیان بھون
دلی میں منعقدہ ایک تقریب میں شری محمود م
امروہوی کو پروڈکشن کا انعام دیا۔ دوسرا
شری اکبر علی خاں کو دیا گیا جو ڈیزائننگ

Vol. 29 No. 8 AJKAL (Monthly) March 1971

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi.
Printed by Skylark Printers, 11355 Idgah Road, New Delhi-55

آجکل

نئی دہلی

ایڈیٹر
شہباز حسین
*
سب ایڈیٹر
نند کشور وکرم

جلد ۲۹ شمارہ ۱۰
مئی ۱۹۷۱ء
بیساکھ جیٹھ سنہ ۱۸۹۳

ترتیب

مضامین اور ترسیل زر کا پتہ
شہباز حسین ایڈیٹر آجکل (اردو) پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

پانچویں لوک سبھا اور راجیہ سبھا کے مشترک اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے صدر جمہوریہ ہند نے کہا کہ عام انتخابات نے ایک بار پھر ثابت کر دیا ہے کہ جمہوریت میں پائیدار سیاسی اقتدار کا صرف ایک ہی منبع ہے اور وہ ہیں عوام۔ انتخابات سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ لوگوں کو اپنے پر اور جمہوریت کے عمل پر کتنا اعتماد ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے دیش واسیوں نے اپنے فیصلے کا اظہار کر دیا ہے۔ رائے دہندگی کے حق کے استعمال کے ذریعے انہوں نے اپنی خودمختاری کا بھرپور طریقے سے اظہار کیا ہے۔ انہوں نے تبدیلی کے لیے مثبت موثر فیصلہ دیا ہے ایسی پرامن تبدیلی کے لیے جس کے ذریعے تیزی کے ساتھ ملک میں پائی جانے والی غربت کا خاتمہ کیا جا سکے۔

شری گری نے کہا کہ جلد ہی سرکار رائے دہندگان کے فیصلے پر مبنی پالیسیاں اور پروگرام بنائے گی۔ چوتھے منصوبے کا وسط مدتی جائزہ لیا جائے گا۔ اس جائزے سے اس کا اندازہ ممکن ہو سکے گا کہ منصوبے کو کیا شکل دی جائے جس سے کہ اقتصادی ترقی کے لیے سرمایہ کاری کی رفتار بڑھ سکے اور اس کا موثر استعمال کیا جا سکے ساتھ ہی ساتھ سرکار یہ بھی فیصلہ کر سکے گی کہ ترقیاتی پروگراموں کو کس طرح مضبوط بنایا جائے تاکہ بے روزگاری کے مسئلے کے حل میں مدد مل سکے - - - - - - - - - -

ایک وسیع پروگرام پر آئندہ مالی سال سے کام شروع ہوگا جو کھیتی کی پیداوار بڑھانے کی اسکیموں سے متعلق ہوگا اور اس کے مطابق سینچائی کے چھوٹے وسیلوں کی تعمیر اور مرمت اور پینے کا پانی مہیا کرنے اور سڑکوں کی تعمیر ایسی بنیادی سہولتوں کو بھی فروغ دیا جائے گا۔ تعلیم یافتہ بیروزگاروں کو روزگار دلانے کے لیے مخصوص کوششیں کی جائیں گی۔ راشٹرپتی نے کہا کہ سرکار دیہی علاقوں میں بجلی فراہم کرنے کے کام کو اور بالخصوص سینچائی کے لیے بجلی کے استعمال کو خصوصی اہمیت دیتی ہے۔ گاؤں میں بجلی پہنچانے کے پروگراموں میں تیزی لائی گئی ہے۔ اس پنج سالہ منصوبے کے پہلے برس میں ۲ لاکھ ۶۶ ہزار پمپنگ سیٹوں کے لیے بجلی مہیا کی گئی تھی۔ رواں سال میں یہ کام اور بھی تیزی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ گاؤں کو بجلی پہنچانے کی کارپوریشن نے لگ بھگ ستر کروڑ روپے کی اسکیمیں منظور کر کے اپنے کام کو شروع کر دیا ہے۔ اس پروگرام کو اور بھی تیزی کے ساتھ آگے بڑھایا جائے گا۔

شری گری نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ سرکار کو اچھی طرح معلوم ہے کہ شہروں میں غریب لوگ کس قدر ناقابل برداشت حالات میں رہ رہے ہیں۔ مالی اور سماجی اصلاحات کے پروگراموں کی فہرست میں گندی بستیوں کی صفائی اور ان کے سدھار کو خصوصی اہمیت دی جائے گی۔ اور ان کے لئے سرکار زیادہ سے زیادہ وسائل فراہم کرنے کی کوشش کرے گی۔ حال ہی میں تعمیر مکانات اور شہری ترقی کی مالیاتی کارپوریشن قائم کی گئی ہے اور اس کے ذریعے بڑے شہروں اور شہری علاقوں میں مکانات کی سہولتوں میں اضافہ ہو سکے گا۔

راشٹرپتی نے کہا کہ ملک کے کچھ حصوں میں فرقہ وارانہ کشیدگی کا جاری رہنا اور وقتاً فوقتاً تشدد کا بھڑک اٹھنا ہمارے سیکولرازم اور جمہوریت نیز ہماری مہذب زندگی کی بنیادی اقدار کے لئے ایک خطرہ ہے حکومت نے اس خطرے پر قابو پانے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ قومی وجود کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس مسئلے کو قومی اہمیت کا کام تصور کیا جائے۔

راشٹرپتی نے کہا کہ والیان ریاست کے وظائف اور مراعات موزوں آئینی اقدامات کے ذریعے ختم کرنے کے حکومت کے عزم میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔

شری گری نے کہا کہ ہمارے اردگرد وسیع تر دنیا میں امید و یاس دونوں موجود ہیں۔ مغربی اور مشرقی یوروپ کے درمیان کشیدگی میں کمی ہوئی ہے۔ ہم وفاقی جمہوریہ جرمنی اور روس و پولینڈ کی حکومتوں کے درمیان طے پائے معاہدے کا خیرمقدم کرتے ہیں۔

راشٹرپتی نے کہا کہ انڈوچائنا کی صورت حال اور زیادہ بگڑ گئی ہے۔ لاؤس اور کمبوڈیا میں جنگ مسلسل جاری ہے اس مسئلے کا حل جنیوا معاہدے کے دائرے کے اندر پرامن اور گفت و شنید کے ذریعے تصفیہ میں پنہاں ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ بہترین حل یہ ہوگا کہ تمام بڑی بڑی طاقتیں اور اس خطے میں دلچسپی رکھنے والے دیگر ملک ایک بین الاقوامی معاہدے یا سمجھوتے پر دستخط کریں۔

مغربی ایشیا میں جنگ بندی کے باوجود بے چینی پائی جاتی ہے میری حکومت امید رکھتی ہے کہ سکیورٹی کونسل کی ۲۲ نومبر ۱۹۶۷ء کی قرارداد کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اپنی دلی خواہش کے اظہار کے طور پر متحدہ عرب جمہوریہ نے حال ہی میں جو نئے اقدامات کئے ہیں ان کا مثبت جواب ملے گا۔

راشٹرپتی نے کہا کہ میری حکومت بدستور غیر جانبداری کی پالیسی پر عمل جاری رکھے گی جب بھی پرامن اور خودمختار حکومتوں کی آزادی کو خطرہ لاحق ہوگا میری حکومت آواز اٹھائے گی اور نوآبادیاتی نظام کی مخالفت کرے گی۔

اردو کے ممتاز ناقد اور محقق پروفیسر عبدالقادر سروری کا ۱۱ مارچ کی شب کو سرینگر میں انتقال ہو گیا آپ پر قلبی دورہ پڑا جس سے جانبر نہ ہو سکے۔ آپ کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر تھے۔ آپ نے دینیات، لسانیات اور اردو تحقیق میں قابل قدر کام انجام دیا۔ آپ بہت دنوں تک آج کل کی مجلس ادارت سے وابستہ رہے ہیں ان کی موت اردو کے لیے واقعی ایک سانحہ ہے۔

ملاحظات

سکندر علی وجد

آج کی طرف دیکھو

اصل زندگی ہے یہ ؛ دور مختصر اس کا
تابناک و بے پایاں ؛ وقت کے اندھیرے میں
گم ہوا، گزشتہ کل ؛ اک سراب اگلا کل
آج کی طرف دیکھو

اس طلسم حیرت میں ؛ عہد آفریں ماضی
جاندار مستقبل ؛ ارتقا کا ہر منظر
قافلے بہاروں کے ؛ نغمہ خواں جواں دنیا
آج کی طرف دیکھو

آج کی مسرت سے ؛ یادگار پچھلا کل
خوش گوار اگلا کل ؛ ہر نظر میں اک جلوہ
ہر قدم پہ اک منزل ؛ خواب دیکھنے والو
آج کی طرف دیکھو

کاشانۂ دل میں جب سے تو ہے
ہر وقت خموش گفتگو ہے
جلوؤں میں اسیر ہیں نگاہیں !
فردوس خیال روبرو ہے
کل تک جسے تیری جستجو تھی
آج اس کو خود اپنی جستجو ہے
اے موج صبا، ادب سے چلیو
گلزار حریم رنگ و بو ہے
کانٹوں میں جو ہنس رہا ہے پیہم
وہ پھول، چمن کی آبرو ہے
وہ نقش حسیں، غزل سراپا
ہر خط میں رواں جواں لہو ہے
آئینہ رخوں کی بے نیازی
اے وجد، حجاب آرزو ہے

(۱۵)

عرش ملسیانی

رات دن بیک نرواہی سے منید نہیں رہتی اس ندی کا پانی گہرا نہیں تھا۔ اس لئے لوگ اس کے آر پار دن رات آتے جاتے رہتے۔ ملسیاں کے پاس ہی ایک قدرتی منظر تھا جس پر ملسیاں کے لوگ ناز کرتے۔ رات بھر یہ دھیمی دھیمی گنگناتی بعلی الصبح لوگ اس میں اشنان کے لئے آتے۔ اشنان کر کے کنارے پر ہی سنت تیجا سنگھ کی کٹیا میں داخل ہوتے جہاں سنت جی اپنی سُریلی آواز میں گورو گرنتھ صاحب کا پاٹھ کرتے۔ صبح کی بانی آسا دی وار سنتے اور مگن ہو جاتے۔ ایک آتا اور ایک جاتا۔ اس وقت کے لوگوں میں عقیدت تھی سچائی تھی۔ دلوں میں میل نہیں تھا۔ واپسی پر راستے میں آریئیں اور مسلمان راجپوت کسان ہل اور بیلوں کے ساتھ آتے ہوئے ملتے، صاحب سلام سے ہر ایک کو بلاتے۔ مذہبی تفریق سے بری یہ دنیا آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے ایک ایسی معصوم اور بھولی بھالی دنیا تھی کہ آج اُسے یاد کرتا ہوں تو دل میں ہوک سی اٹھتی ہے۔

میں ۱۹۰۸ء میں ملسیاں میں پیدا ہوا۔ والد سے پہلے خاندان میں کیا سارے قصبے میں نہ کوئی صاحب علم تھا اور نہ قابل ذکر صاحب جاہ و حشم۔ انیس بیس کا فرق تھا۔ کوئی کھاتا پیتا تھا، کوئی محنت کش اور کوئی دوسروں کا دستِ نگر۔ چھوٹا سا بازار مشمولات میں بنی ہوئی بستی جن تعلق سے مشہور ڈاکٹر پور کے باشندے تھے۔ خرم پور جولی سالم نگر، قصبہ دیگر مشمولات تھے مسلم راجپوت چودھریوں کا زور تھا۔ ذیلدار بھی انھیں میں سے ہوتا اور قصبے کی سربراہی سرکاری حلقوں میں بھی وہی کرتے۔

دلچسپ کردار کے لوگ تھے۔ ملیا خور، چانن چوڑی گر، دادا کنجیاں والا، بھائی مُولا اور چوبدار، ہر ایک میں کوئی نہ کوئی خصوصیت تھی۔ ۱۹۱۲ء میں جب میں چار سال کا تھا میں نے چوبدار کو دیکھا۔ چاق چوبند، گندمی رنگت، سفید داڑھی، میرے ہمجولی اس کے گرد ہو گئے، پالو سب سے بڑا تھا اس نے کہا کہ چوبدار کی عمر سو سال سے زیادہ ہے۔ مہتہ جی میرے تایا بولے کہ ایک سو پانچ سال۔ میں حیرت میں تھا آج حساب لگاتا ہوں تو سمجھ میں آتا ہے کہ بابا سر کھیم سنگھ بیدی اور ان کے خاندان کا یہ چوبدار ۱۸۰۷ء میں پیدا ہوا ہوگا اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے وقت اس کی عمر پچاس سال کی ہوگی۔ غالب کی موت اور مہاتما گاندھی کی پیدائش کے وقت باسٹھ سال کا ہوگا۔

مہتہ جی کی بیٹھک ہر وقت ان کے سائلوں سے بھری رہتی۔ وہ وثیقہ نویس تھے۔ دوسرے درجے تک پڑھے تھے لیکن ہر قسم کا وثیقہ لکھنے میں طاق تھے تمسک، بین نامہ، بیع نامہ، وصیت نامہ، طلاق نامہ وغیرہ۔ سعدی کا ایک شعر یاد تھا جب اجرت وثیقہ پر جھگڑا ہوتا تو سائل پر رعب طاری کرنے کے لئے وہ پڑھ دیتے ؎

دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست
در پریشاں حالی و درماندگی

شعر پڑھتے ہی منہ مانگی اجرت مل جاتی۔ اس لئے نہیں کہ سننے والا شعر سمجھتا تھا بلکہ اس لئے کہ اس پر مہتہ جی کی علمیت کا سکہ بیٹھ جاتا تھا۔ ہندو مسلمان سکھ سبھی اس بیٹھک میں جمع رہتے۔ بیٹھک کے باہر ان کی سواریاں گھوڑی یا اونٹ بندھے رہتے۔ مہتہ جی بڑے فیاض تھے۔ جانوروں کو چارہ دیتے اور ان کے مالکوں کو کھانا، حقہ تمباکو کا بھی دور رہتا۔ اجرت میں سب کچھ وصول کر لیتے۔ دُور دُور کے گاؤں والے ان پر اعتماد رکھتے تھے۔ ان کی مہارت، بر خود غلط قانون دانی اور جعل سازی سب ان کے بروئے کار آتی۔

پہلی جماعت میں مقامی مدرسے میں داخل ہوا۔ خلیفہ حیدر علی ہمیں پڑھاتے تھے

عمر دیکھنے میں سامنے کے قریب لگتی تھی۔ کھجور کی ایک چھوٹی سی چھڑی دستی ہاتھوں نے ملاس میں ہروقت گھومتے رہتے سوائے نماز کے وقت کے حفت سے پڑھاتے۔ پیٹتے کبھی نہیں تھے۔ گالی بھی نہیں دیتے تھے۔ گھر پر تعویذ بھی دیتے اور دم بھی کرتے تھے۔ وظیفہ پڑھتے اور تسبیح ہاتھ میں رکھتے۔ خدمی شلوار اور دوپلی ٹوپی پہنتے۔ ہر شخص اُن کی عزت کرتا سال میں ایک دوبار بیٹش کے پار اپنی زمین دیکھنے جاتے۔ بازار سے گزرنا پڑتا ہر شخص دکان سے اُٹھ کر انہیں سلام کرتا۔ خلیفہ جی سلام، خلیفہ جی سلام کی آوازیں آتیں۔ خلیفہ جی سر جھکائے آنکھیں نیچی کیے بڑی لجاجت سے سب کا سلام قبول کرتے تیزی سے نکل جاتے۔ اتنا پاک نفس، نیک نہاد عجز اور حلم کا پتلا انسان آج کے زمانے میں ڈھونڈو بھی تو نہ ملے۔

قاضیوں کی مسجد کے پاس سے ایک تنگ گلی گزرتی ہے اس کے آخری موڑ پر ہندوں کے تین مکان تھے ایک ہمارا، ایک مہتہ جی کا اور ایک کانشی رام حجام کا۔ ارد گرد سینکڑوں مکان مسلمانوں کے تھے سب مل جل کر آپس میں رہتے، شادی کہار، جنگی خوجہ، عمرا اُونت مولانا بیگم رنگریزن، بلّا سناریہ تھے ہمارے ہمسائے بے خوفی سے دن گزرتے۔ نہ ڈر نہ خطرہ

رہتے تھے بتیس دانتوں میں زبانوں کی طرح

دیوی دوارہ، لچھمن مندر ہم سے دور تھے۔ اذان کی آواز کان میں آتی رہتی اور ایسے لگتی کہ واقعی اللہ اور اس کے اکبر ہونے کا ہمیں یقین دلا رہی ہو ــــــ الفاظ میں کیا رکھا ہے۔

ایشور اللہ تیرے نام

سیاست کسی کو چھو نہیں گئی تھی۔ چھوت چھات جہالت کی وجہ سے زوروں پر تھی لیکن نفرت کا موجب نہیں تھی یونہی طرز زندگی سی بن گئی تھی۔ سُود خوروں کی وجہ سے کاشتکار طبقہ دبا رہتا تھا۔ اس سے بھی بغض و عداوت کے شعلے نہیں بھڑکتے تھے۔

قصبے کی معاشی اور اقتصادی حالت اچھی نہیں تھی۔ ایک زمانے میں یہ بیدیوں کی جاگیر تھی۔ اُن کی بارہ دری، بُرج، طویلہ اور مکانوں کے کھنڈر میں نے دیکھے ہیں۔ اب اس سارے جاہ و جلال کی نشانی وہی سکھ چودھرائن صاحبہ کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

چودھری اللہ بخش، ڈاکٹر جھنڈے خاں، سید شاہ سوار حسین، بسنتا (بسنت سنگھ) سنید ویشن گوپی چند اگروال پرانے پڑھے لکھے لوگ تھے جن میں سے کوئی مڈل سے آگے نہیں گیا تھا۔

میرے دادا پنڈت موتی رام پشاور کے قصہ خوانی بازار میں حلوائی کی دکان رکھتے تھے۔ شراب پیتے تھے۔ کچھ کما کے لاتے تو نائو نوش میں خرچ کرکے واپس چلے جاتے قطعی اَن پڑھ تھے۔ والد اس خاندان میں پہلے شخص تھے جنہوں نے باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ فارسی میں بہت اچھی دسترس حاصل کی۔ معلمی پیشہ اختیار کیا۔ شعر و سخن کی طرف توجہ ہوئی تو معلوم ہوا کہ ایک خداداد قوت ظہور میں آرہی ہے۔ عروض، علم بیان

اور زبان کا مطالعہ کرتے کرتے منشی بن گئے۔ ۱۹۰۳ء میں داغ کے شاگرد ہوئے اور آج ستاسی سال کی عمر میں بھی شعر کہتے ہیں۔ داغ کے دو ہزار کے قریب شاگردوں میں تنہا رہ گئے ہیں۔ انہیں کا ایک شعر ہے۔

جینے کا کیا لطف یہاں اب یار گئے غمخوار گئے

جو دو چار رہے تھے وہ بھی تیر جگر پر مار گئے

تقسیم بنگال کی تحریک اور پنجاب میں نہری مالیانے کی تحریک سے انہیں ہمدردی تھی اور وہ سیاسی نظمیں کہنے لگے۔ اسی شبہ میں ۱۹۰۸ء میں ان کی تلاشی ہوئی۔ پولیس کو کچھ ملا تو نہیں لیکن سزا کے طور پر انہیں ایک ایسے مدرسے میں تبدیل کر دیا جو قریب قریب ویران جگہ پر اور آبادی سے دُور تھا۔ وہ دل برداشتہ ہو کر مستعفی ہو گئے اور ریاست جیند میں سفیدوں کے مقام پر ایک اسکول میں چلے گئے۔ چند سال بعد نکودر اینگلو سنسکرت ہائی اسکول میں آگئے۔ یہ قصبہ ملسیاں سے آٹھ میل کے فاصلے پر ہے میں پانچ سال کا تھا کہ ہم یہیں منتقل ہو گئے اور آج تک یہی ہمارا وطن ہے۔ ملسیاں کو والد خراب آباد کہا کرتے تھے۔ تین چار سال ہوئے ہیں ملسیاں دو تین گھنٹے کے لئے گیا۔ بازار وغیرہ تو ترقی پذیر ہے لیکن تقسیم کے بعد آبادی بہت کم ہو گئی ہے۔ قاضیوں کی مسجد کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ سب مکان صاف ہو چکے ہیں اور میں یہ بھی نہ پہچان سکا کہ ہمارا گھر کس مقام پر تھا۔ ہمارے لئے زمانے میں وہی گھر ایک ایوان تھا اس کی بربادی اور ناپیدی کو دیکھ کر ایک فارسی شاعر کا یہ شعر بغداد کی بربادی پر یاد آگیا۔

ہاں اے دل عبرت بیں از دیدہ نظر کن ہاں

ایوان مدائن را آئینۂ عبرت داں

مسلمان اب وہاں کوئی نہیں۔ ہندو سکھ بظاہر میل ملاپ سے رہتے ہیں لیکن خلوص نہ ہندو ہندو میں ہے اور نہ سکھ میں۔ نکودر میں مڈل تک تعلیم حاصل کی۔ پڑھنے لکھنے میں بہت اچھا تھا کئی مضامین میں سو فیصد نمبر حاصل کئے لیکن ذہانت کا فائدہ نہ ملا میٹرک کے لئے جالندھر گیا اور ایف کے لئے کپورتھلہ۔ ۱۹۲۱ء میں تحریک عدم تعاون جاری ہوئی تو دل جذبۂ آزادی سے کھولنے لگا۔ ہر جلسے اور جلوس میں شامل ہوتا۔ اخباری نظمیں جلسوں میں پڑھتا۔ واہ واہ ملنے لگی۔ غلط سلط شعر بھی کہنے لگا۔ لالہ لاجپت رائے نکودر میں تلک سوراج فنڈ جمع کرنے آئے۔ امتحان ہو رہا تھا تین گھنٹے کا پرچہ آدھ گھنٹے میں حل کرکے اسکول کے پیچھے سے بھاگا۔ لالہ جی کی جائے قیام پر پہنچ گیا۔ اُن کو دیکھا قدم چومے اور اس سعادت پر آج تک نازاں ہوں۔

کالج میں گیا تو شعر و شاعری کے چرچے بہت تھے۔ ہم جماعت سمجھتے تھے کہ میں بہت بڑا شاعر ہوں۔ ایک نظم ڈرتے ڈرتے والد کی خدمت میں اصلاح کے لئے

بھی اصلاح تو کجا ایک سرزنش آمیز خط ملا کہ اس طوق کو اتار ڈالو یہ تمہارے گلے میں تنگ ہے۔ اُن کے ایک دوست نے مجھے بتایا کہ جوش صاحب خوش تو بہت تھے لیکن کہتے تھے کہ شعر کہنے لگا تو تعلیم سے غافل ہو جائے گا۔ اس لئے اس کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے تو اچھا ہوگا۔ اس کے بعد ایک دوست نے میرے سامنے والد کو میرا یہ شعر غالب کی مشہور زمین میں سنایا۔

مرکر بھی گرفتارِ سفر ہے مری ہستی
دُنیا مرے پیچھے ہے تو عقبیٰ مرے آگے

بہت خوش ہوئے اور شعر کی برجستگی کی بڑی تعریف کی۔ میری تسکین ہوگئی اور میں آزادانہ شعر کہنے لگا کسی لفظ یا ترکیب پر شبہ ہوتا تو اسے والد سے پوچھ لیتا۔ اصلاح نہ لیتا۔ اس سے مجھے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی توفیق حاصل ہوئی۔ نوبرایا رام درد (درلیش کمار شاد کے والد) والد کے شاگرد تھے۔ انہوں نے میرا حوصلہ بڑھایا کہ بس کہتے جاؤ۔ نہ رکنے کا مقام ہے نہ ڈرنے کا۔

ابھی میں پڑھ ہی رہا تھا کہ بلائے ناگہانی مجھ پر نازل ہوئی۔ میں والد کے مجبور کرنے پر گورنمنٹ انجینیرنگ کالج رسول کے داخلے کے امتحان میں بیٹھ گیا اور امتیاز سے کامیاب ہوا۔ ناچار علم و ادب کی فضا کو چھوڑ کر انجینیرنگ کی تعلیم حاصل کرنے لگا۔ دو سال رو رو کر گزارے۔ مگر بُرا ہو اس ذہانت کا کہ وہاں بھی امتیاز سے کامیاب ہوا۔ ملازمت نہر کے محکمے میں لی۔ دیکھا کہ چاروں طرف بھیڑیئے منہ کھولے بیٹھے ہیں۔ رشوت کا بازار گرم ہے۔ جہالت ہی جہالت چھائی ہوئی ہے۔ ایک سال کی مدت میں تین بار مستعفی ہوا۔ ملازمت چھوڑ کر گھر پر آتا تو وہاں سرزنش ملتی۔ ملازمت پر جاتا تو ضمیر ملامت کرتا۔ آخری بار جب مستعفی ہوا تو یہ کہہ کر مستعفی ہوا کہ خواہ بھوکا مروں اس پُر آشوب ملازمت کا نام نہ لوں گا جہاں اتنی جہالت ہے کہ مزدور اوورسیر کو بلاتا ہے تو کہتا ہے 'او ئے باؤجی او ئے' یعنی دونوں طرف تعظیماً اوئے،

کہتا ہے تعلیم نامکمل، جو پیشہ اختیار کیا اس سے نفرت، گھر کی مالی حالت خستہ، چار بہنوں کی شادیاں یکے بعد دیگرے، رات کو نیند نہیں آتی تھی۔ اسی زمانے میں لاہور میں کانگرس کا تاریخی اجلاس منعقد ہوا جواہر لال نہرو کے جلوس سے لے کر سالانہ اجلاس اور متعلقہ تقریبات دیکھتا رہا۔ اور ورما صاحب کے پاس پندرہ بیس دن ٹھہرا۔ وہاں گاندھی، سردار پٹیل، موتی لال نہرو، سروجنی نائیڈو، سبھاش چندر بوس اور بہت سے اکابر کو دیکھا۔ یہ بات ۱۹۲۹ء کے آخر کی ہے۔ جنوری ۱۹۳۰ء کے پہلے تین چار دنوں میں بہت سی تقریریں سنیں۔ وہیں پہلی بار عطاء اللہ شاہ بخاری کو سنا۔ کیا تقریر تھی۔ گاندھی سے جوش عقیدت، انگریز کے خلاف شعلہ افشانی، طلاقت، فصاحت، بلاغت، برموقع لحن سے شعرخوانی، لطائف و ظرائف۔ اللہ کی پناہ ایسا مقرر میں نے عمر بھر نہیں دیکھا۔ بہادر یار جنگ کے باب میں بھی ایسی ہی باتیں سنی ہیں لیکن ان کو میں نے نہیں دیکھا۔

پنجاب کی بساطِ سیاست پر اس زمانے میں ڈاکٹر ستیہ پال، ظفر علی خاں، ڈاکٹر محمد عالم، چودھری افضل حق، ڈاکٹر کچلو، ماسٹر تارا سنگھ اور بہت سے قائدین چھائے ہوئے تھے۔ سرکار کے کاسہ لیسوں کا کوئی عزت سے نام نہیں لیتا تھا۔ اُردو صحافت اپنی مستقل نک جھونک میں مصروف تھی۔ نظموں کے جواب میں نظمیں، اداریوں کے جواب میں اداریے لکھے جاتے۔ پھلجھڑیاں چھوٹتیں۔ زندہ دلانِ پنجاب جو کبھی کرتے کم تھا۔ لالہ کرم چند کا ہفتہ وار اخبار "پارس" اپنی وضع کا نرالا اخبار تھا۔ ادبی حصہ بڑا پرلطف ہوتا۔ نگران پنڈت ہری چند اختر تھے۔ حفیظ، تاثیر فرضی ناموں سے مولانا محمد علی اور خواجہ حسن نظامی کی طرف داری میں نظمیں لکھتے۔ رچپال سنگھ شیدا کا کلّ، مظفر حسین خاں کا شاعری کالج، تاجور نجیب آبادی کی انجمن ارباب علم پنجاب سیتلا مندر کے مہنت کی بداعمالیاں، سب پر پھبتیاں کسی جاتیں۔ "بانگِ درا" میں زبان و فن کے اغلاط پر مسلسل مضمون "اقبال کی خامیاں" اسی "پارس" میں چھپتا رہا

ان ہنگاموں سے کہاں پیٹ بھرتا۔ گھوم پھر کر گورنمنٹ انڈسٹریل اسکول میں ڈرائنگ ماسٹر کی ملازمت حاصل کی۔ دوست احباب طعنہ زن تھے کہ اوورسیری چھوڑ کر یہ کیا کرنے چلا ہے لیکن ستر روپے کی قلیل تنخواہ پر میں نے لدھیانے میں بارہ سال گزار دیئے۔ وہیں ایف اے اور بی اے کے امتحان پرائیوٹ طور پر پاس کئے۔ جی بھر کے پڑھا، جی بھر کے شعر کہے، مشاعروں میں شمولیت کی۔ پاٹ دار آواز، لحن سے پڑھنا۔ دور و نزدیک شہرت پھیلی۔ بالکل ایک مشاعرے باز شاعر کی حیثیت سے۔ بزمِ اردو شملہ کے مشاعروں میں جاکر دادِ سخن لی۔ حسرت موہانی، جگر، جوش بیخود، سائل، پنڈت امرناتھ ساحر، اور پنڈت کرشن کانت مالویہ سے دادِ سخن پائی مشاعروں کو لوٹا اور سمجھنے لگا کہ اب میں ہی شاعرِ اعظم ہوں۔ مشاعرے کی داد شاعر کو بر خود غلط بنا دیتی ہے۔ یہی حال میرا بھی تھا۔ ہارڈنگ لائبریری دلی نے تین بڑے مشاعرے کئے۔ ایک مشاعرے میں چار نشستوں کے صدر تیج بہادر سپرو، نواب رامپور سر رضا علی اور رائے بہادر رام کشور تھے۔ ڈپٹی کمشنر انگریز تھے مسٹر ایونز نام تھا۔ شعراء کا خیر مقدم انہوں نے فارسی میں پڑھا۔ لہجہ بھی ایرانی تھا۔

شملے کے مشاعروں میں یوں تو بہت سے اکابر سے ملا۔ لیکن ایک تعلق خاطر مسٹر غلام محمد سے ہوگیا۔ انہوں نے ۱۹۴۱ء میں دلی میں مشاعرہ کیا۔ اسی میں میری غزل بہت سرسبز ہوئی۔ غلام محمد تو ناچنے لگے۔ مشاعرے کے بعد مجھ سے کہا دلی آؤ لدھیانے میں پڑے کیوں سڑ رہے ہو۔ قصہ کوتاہ مجھے وہ ماہ فروری ۱۹۴۲ء میں دلی لے آئے اور میں سپلائی کے محکمے میں پہلے سے زیادہ تنخواہ پانے لگا۔

لدھیانے میں جب تھا تو بہت سے شعراء تھے لیکن اکثر غلط گو اور بزعم خود علامہ تھے ۔ ان کے امام نور لدھیانوی خود کو مصور جذبات سمجھتے تھے ۔ ان کا ایک مصرعہ آج تک یاد ہے
" ڈرڈنچی و خوف لاٹ نہ کر " میری گلی میں نظیر لدھیانوی رہتے تھے انھیں کے پاس اٹھنا بیٹھنا تھا ۔ اتنے میں گوپال متل آ گئے اور وہ بھی اسی گلی میں مقیم ہو گئے ۔ ویکفیلڈ گنج لدھیانہ میں یہ ارباب ثلاثہ جمع ہو گئے ۔ گوپال متل بڑے ذہین تھے ۔ طبیعت میں براقی تھی ، ہر بحث میں الجھ پڑتے اور ایسا معلوم ہوتا کہ زیر بحث موضوع خود انھیں کا مضمون ہے ۔ ان کے ساتھ جو وقت گزرا اس سے لدھیانہ میں رہتے رہتے ، بجھی ہوئی اور گند طبیعت میں ایک طوفان سا آ گیا اور نظیر لدھیانوی کے مکان کے باہر فی البدیہہ اشعار ہوتے ۔ ادھر ادھر کی ادبی باتیں ہوتیں ، بے ادبی پر بھی اتر آتے ۔ گوپال متل ایک رسالہ صبح امید کے نام سے نکالتے تھے ۔ دو تین شمارے نکلے اور وہ بند ہو گیا ۔ متل صاحب لاہور چلے گئے یہ غالباً ۱۹۳۵ - ۳۶ کی بات ہوگی ۔

شملے کے ایک مشاعرے میں سر سکندر حیات خاں صدر تھے ۔ اقبال کا مصرعہ مصرعۂ طرح تھا ۔ میرا ایک شعر تھا

دو روزہ عظمت و شوکت پہ بھولنے والے
اجل سے پوچھ کہ شانِ سکندری کیا ہے

لوگ داد دینے کے موڈ میں آ گئے ۔ وزیر اعلیٰ پر شعری چوٹ ۔ اس کے بعد جلد ہی ان کا انتقال ہو ۔ مجھے اس بات کا علم بعد میں ہوا کہ عظمت حیات اور شوکت حیات ان کے بیٹوں کے نام ہیں ۔

دلی آیا تو لدھیانے کی صحبتیں یاد آنے لگیں ۔ وہاں کی ادبی چودھراہٹ دلی میں کہاں میسر تھی ۔ ایک نظم کہی جس کے دو شعر یہ ہیں

دُنیا کی نگاہوں میں بھلا ہوں کہ بُرا میں
اربابِ محبت کا ہوں پابندِ وفا میں
لدھیانے سے نکلا صفتِ بلبلِ ناشاد
دلی کی فضاؤں میں ہوا نغمہ سرا میں

میرا دفتر روڈ نئی دہلی کے قریب ہی پریس پلیس میں رہتے تھے ۔ دفتر شاہجہاں روڈ پر تھا ۔ مٹیا محل میں خواجہ محمد شفیع کے دولت کدے پر ہر اتوار کو اردو مجلس منعقد ہوتی ۔ وہیں کبھی کبھی پرانے احباب اسد ملتانی اور عبد المجید حیرت کے ساتھ میں بھی جاتا ۔ منور صاحب بھی کبھی کبھی آجاتے ۔ اس زمانے کا تاثر ان قطعات میں ہے ۔

یہ بھی ہے اسے گردشِ حسنِ اتفاق ÷ ملسیاں اور دلی میں قیام
اس ستارے کو چمکنے کی ہوس ÷ جس کے گرد اک شمسی نظام

خوبیٔ قسمت وہاں لائی مجھے ÷ ہے جہاں دل کے لئے اکسیر درد
اور اس پر میرے مسکن کے قریب ÷ چین سے سوتے ہیں خواجہ میر درد

از سرِ نو دل ہوا ہنگامہ زار ÷ پھر خیال و فکر کے لشکر چلے
پھر ہے ایماے مئے شعر و سخن ÷ جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

لال قلعے کی وہی دلی جہاں ÷ سجدہ کرتا ہے ہر اک ذی احتشام
وہ نظام الدین کی درگاہِ پاک ÷ جس جگہ جھکتا ہے ہر عالی مقام

خوبیٔ قسمت وہاں لائی مجھے ÷ ہیں جہاں کے ذرے رشکِ آفتاب
اور اس پر میرے دفتر کے قریب ÷ غالب و خسرو ہیں دونوں محوِ خواب

خسروِ ملکِ سخن کا فیض ہے ÷ غالبِ نام آورم ، سنتا ہوں روز
سر بسر گم ہو کے فکرِ شعر میں ÷ خوبیٔ قسمت پہ سر دُھنتا ہوں روز

ان قطعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں میرے ذہن کی ساخت کس طرح ہوئی ۔ میں روایت کا باغی نہیں تھا ۔ قدامت کا پرستار تھا لیکن کچھ ایسا بھی تھا کہ قدامت کا طوق گلے میں تنگ نظر آتا تھا ۔ میں نے بہت سی نظمیں مختلف موضوعات پہ کہیں ۔ کرشن اور رام پر نظمیں لکھیں ۔ رسول کریم کی تعظیم میں نعتیں کہیں ۔ گورو نانک اور گورو گوبند سنگھ کی بھی مدح کی ۔ دل اپنے بچپن کے زمانے کو یاد کرتا اور رواداری کے مسلک پر چلتا ۔ ملک میں فسادات ہوئے تو ملتان ، ڈیرہ اسمٰعیل خاں اور کانپور کے فسادات پر دل دوز نظمیں کہیں ۔ فرقہ پرست لیڈر کو مخاطب کر کے اُسے خوب سنائیں ۔

میرے ضمیر میں یہ بات نہیں تھی کہ مذہبی عصبیت کا شکار رہوں ۔ دلی آئے ابھی پانچ سال ہی نہیں ہوئے تھے کہ تقسیم ملک کا حادثہ ہوا ۔ اس نے ہر درد مند دل پر چوٹ لگائی ۔ آدمی وحشی ہو گیا ۔ اس حادثے نے میرے دل کو بہت مجروح کیا ۔ اس زمانے کے کلام میں آدمی کی وحشت اور بربریت پر نوحہ خوانی جگہ جگہ نظر آتی ہے ۔ ایک طویل سلسلہ میرے مجموعے جنگ و آہنگ میں اسی کی یادگار ہے ۔ رام پور کے مشاعرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے سامنے جب میں نے اپنی غزل پڑھی تو لوگوں میں یقین اور اعتماد کی لہر سی دوڑ گئی ۔ اس کا پہلا مصرعہ ہی اس آدم کش زمانے پر بھرپور وار تھا ۔

یہ دورِ خرد ہے دورِ جنوں اس دور میں جینا مشکل ہے

پوری غزل اسی خیال کی ترجمان ہے ۔ صرف تین شعر درج کرتا ہوں ۔

جب ناخنِ وحشت چلتے تھے روکے سے کسی کے رک نہ سکے

اب چاک دلِ انسانیت سیتے ہیں تو سینا مشکل ہے
جو دُھرم، پہ بیتی دیکھ چکے 'ایماں' پہ جو گزری دیکھ چکے
اِس رام و رحیم کی دنیا میں انسان کا جینا مشکل ہے
وہ مرد نہیں جو ڈر جائے ماحول کے خونیں منظر سے
اُس حال میں جینا لازم ہے جس حال میں جینا مشکل ہے

آخری شعر پر تو سامعین تڑپ اُٹھے۔ درد انگیز شور تحسین بلند ہوا۔ مایوس دلوں کے لئے یہ حوصلمندی کا پیغام تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ شعر پڑھتا ہی چلا جاؤں۔

یہ جذبہ ہندوستان اور پاکستان کی خونریزی تک ہی محدود نہ رہا۔ نظر ذرا اور آگے بڑھی۔ دُنیا میں جنگ جوئی کے ارادے دیکھے تو نسلِ آدم کی بدعنوانیوں پر قلم زنی کی۔ جنگ کوریا پر نظم لکھی۔ ایشیا کی مظلومیت پر ایک ترکیب بند "ایشیا کو چھوڑ دو" کے عنوان سے لکھا۔ چند شعر اس جذبے کی یادگار ہیں:

عجیب درد ہے یہ دورِ ارتقائے جدید ؛ کہ سب کی قدر بڑھی قدر آدمی نہ رہی
بجھے ملا ہے یہ حکمت فروشِ دُنیا سے ؛ کہ عقل تو بہت ہیں قلندری نہ رہی

ہم صفیروں کی نواؤں کا اثر ہے شاید ؛ ہر گرفتارِ قفس کوششِ پرواز میں ہے

عقل کی صبح کہاں جہل کی ہے رات ابھی ؛ ذہنِ انساں میں ہیں فرسودہ خیالات ابھی
آستاں امن کا اب تک نہیں مسجودِ بشر ؛ آستاں جنگ کا ہے قبلۂ حالات ابھی
عرشؔ کیوں خواب سے بیدار ہوا جاتا ہے ؛ بند کر آنکھ کہ باقی ہے یہاں رات ابھی

۱۹۴۸ء میں آج کل کی ادارت ملی۔ مدیرِ اعلیٰ جوشؔ ملیح آبادی تھے جوشؔ کا ساتھ سات سال تک رہا اور اس کے بعد اُن کی کرسی عرشؔ کو ملی۔ جوشؔ رنگا رنگ مزاج کے آدمی ہیں۔ اُن سے مسلسل تعلق نے ذہن کو جلا دی۔ شعر میں میرے نقطۂ نظر میں تبدیلی آئی اُن سے بحثیں ہوتیں۔ وہ شگوفے چھوڑتے ہماری زبان و بیان کی غلطیاں ہمیں سمجھاتے۔ کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ وہ خالص بورژوا ہیں، کبھی وہ پرولتاری نظر آتے۔ اصل میں وہ کچھ اور ہی ہیں۔ اُن کی قدرتِ کلام نے ہمیں مرعوب کیا اس لئے جائز و ناجائز وہ اپنی بات منوا لیتے۔ اکثر معاملات میں وہ میری رائے کی قدر کرتے۔ فنی امور میں بھی کبھی شکست مان لیتے۔ اُن کے ہوتے کتنے شعراء اور ادیبوں کا جمگھٹ اُن کے گرد دیکھا۔ ایک سے ایک دلچسپ، ایک سے ایک اپنے اپنے رنگ کا مالک، مجازؔ، فراقؔ، جگرؔ، مخمورؔ، مخدومؔ، پرویز شاہدی ایسے بادہ آشاموں کے ساتھ ساتھ جعفر علی خاں اثرؔ، گوپی ناتھ امنؔ، منورؔ، مالیؔ جالسی، پروفیسر اجمل خاں، یونس سلیم

وہاں یو مصرا، حیرت بدایونی، امجد حیدر آبادی، صفی لکھنوی کے علاوہ بہت سے صوفیائے صافی طینت سے بھی ان کو بہت ربط ضبط تھا۔ سات سال میں اس ادبی اور شعری ماحول کا بہ نظر غائر مطالعہ کرتا رہا اور اس ماحول سے کسبِ فیض بھی کرتا رہا۔ جوش صاحب کی شراب کی محفلوں میں تنہا اُن سے اور اُن کے احباب کے تیر ہائے مطاعن کا شکار ہوتا رہا۔ عالمِ ہوش میں وہ حیرت کا اظہار کرتے تھے کہ تم کس مٹی کے بنے ہو کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔

اُن کو فراق سے محبت تھی لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ ظاہری زیادہ تھی اور باطنی کم۔ وہ کسی ہم عصر کو اپنے سے بہتر نہیں سمجھتے تھے۔ جگر اور غالب میں کسی کے بابت اُن کی رائے اچھی نہ تھی۔ فراق کی ذہانت کے بہت مداح تھے۔ اقبال کی وساطت سے یہ حیدر آباد میں ملازم ہوئے تھے۔ لیکن اس کی شاعری پر چوٹیں بھی کرتے تھے۔ اس کے مداحوں کو شاہیں بچے کہتے تھے۔ اب یہ بات چل پڑی ہے تو قدرے اس پر کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کروں تو بے جا نہ ہوگا۔

شاعر کو خام بدم پختہ شدم سوختم، نہیں ہونا چاہئے۔ یہ بات اقبال میں تھی۔ کہ خام تھے اور پختہ ہو گئے۔ داغؔ کے شاگرد ہوئے، بڑی فرسودہ غزلیں کہتے تھے۔ پھر نیا شوالہ اور ہندوستان ہمارا کہنے پر مائل ہو گئے۔ اور تصویرِ درد کھینچی۔ اس کے بعد رُخ بدلا تو اسرار و رموز پر آئے۔ لوگ اسرار و رموز کو بہت بڑا کارنامہ سمجھتے ہیں لیکن سنائی، عطار، اور رُومی اس میدان میں ان کے رہنما ہیں۔ ہندوؤں کا فلسفہ و ویدانت بہت آگے ہے۔ اس کے بعد نئے شوالے کا پجاری مسجدِ قرطبہ پر نوحہ زن ہوا تو پنجاب کے مسلمان اُسے ترجمانِ حقیقت کہنے لگے۔ شکوہ اور جوابِ شکوہ پہلے ہی انہیں دائرۂ اسلام میں محدود کر چکا تھا۔ پھر تو اپنی نظموں میں اسلامی تلمیحات اور ترکیبات بھرنے لگے! عورت، کے متعلق ان کے خیالات ان کی ذہنی بلندی کا ثبوت نہیں دیتے۔ گورونانک، سوامی رام تیرتھ، رام، بھرتری ہری، گوتم بدھ یہ سب کچھ ان میں ہے لیکن ان کے پورے کلام کو دیکھیں تو عشر عشیر بھی نہیں۔ انہوں نے الٰہ آباد میں مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کی اور پاکستان کے تصور کو ہوا دی جناح کے نام ان کے خطوط پڑھئے تو بجز اس کے کچھ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کو ہندوؤں سے الگ کرنا چاہتے تھے۔ یہ کہاں کی بین الاقوامیت ہے؟

ان کی شاعری کمال کی حدوں کو چھوتی تھی۔ ان کا اسلوبِ بیاں ان کا اپنا ہے۔ وہ فکر انگیز شاعر ہیں لیکن پنجاب والوں نے اُن کو بانس پر ذرا زیادہ ہی چڑھایا۔ جذباتی ستائش تھی جو اعتدال کی حدوں سے نکل گئی۔

فراق اور جوش الگ الگ ڈھرّوں کے شاعر ہیں۔ مارکس کے دونوں قائل۔ جوش میں کلاسکیت زیادہ ہے اور وہ اس معیار پر ہے ہوئے ہیں۔ حکیم آزاد انصاری تو ان

کی نظموں پر تغزل کا اثر دیکھتے تھے اور جب جوش غزل کی مخالفت کرتے تھے تو وہ کہہ اٹھتے تھے ہو کر چھپتی نہیں شانِ غزل ؛ ممکن ہو تو ڈھا دیجئے ایوانِ غزل
سرکارِ غزل میں پلے ہیں غزل سے یہ بیر ؛ افسوس ہے اے نمک حرامانِ غزل

فراق کلاسیکی دنیا سے نکلے تو ہندوستانی تہذیب اور کلچر کی نمائندگی کرنے لگے چنانچہ اُن کی شاعری میں ویدک رچاؤں گیتا کے اشلوکوں، سنت کبیر اور سورداس کی بانیوں کا امتزاج ملتا ہے۔ یہاں سرور، ہنس، بھیرویں وغیرہ قسم کے ناموں سے تشبیہات مرتب کرتے ہیں غزل میں بالکل انفرادی رنگ ہے۔

"ہم زندہ ہیں ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے" کی قسم کی نظمیں بھی کہتے ہیں، مزدور اور دہقان کی عظمت کا راگ جوش کی طرح ہی گاتے ہیں۔

شاید اقبال کے لئے ان دونوں کی رائے اتنی اچھی اور عقیدت مندانہ نہ ہو جتنی "شاہین" جوش کی ہے جذباتی عقیدت مندی وقت کے ساتھ ساتھ مٹ جایا کرتی ہے۔ اقبال کا مقام بحیثیت فلسفی اور پیغامبر ابھی نہیں مقرر کیا جا سکتا اس کے لئے وقت چاہئے۔

جوش و فراق کا اس میں قصور نہیں، نظیر اکبرآبادی کو اس دور کے ثقہ لوگوں اور تذکرہ نویسوں نے مبتذل اور سادہ گو قرار دیا تھا آج یہ حالت ہے کہ خود جوش کو میں نے یہ کہتے سنا ہے کہ نظیر ہندوستان کا اصل عوامی اور فلسفی شاعر ہے اور بڑا شاعر ہے۔

غبارِ کارواں میں کارواں کے امیروں کا ذکر آ گیا۔ غالباً یہ ناموزوں نہیں جوش پاکستان چلے گئے، اور قرعۂ فال جب مجھ دیوانے کے نام پر پڑا تو زیادہ سنجیدگی آ گئی۔ شروع سے اب تک مشاعرہ بازی نے سوچ سمجھ کر شعر کہنے کا ایک انداز خیال پیدا ہونے دیا دوستوں اور بزرگوں نے واہ واہ تو کی لیکن شاعری میں وہ مجھے آگے بڑھنے سے روکتے رہے۔ اس نے واہ واہ کا نشہ جب اترتا تو پھر چڑھ جاتا عالمِ ہوش میں آنے کا موقع نہ ملا۔

مجموعے تو کئی چھپ گئے۔ نثری کتابیں بھی چھپیں۔ فارسی سے برابر اُنس رہا سرمد کی رباعیوں کا اُردو رباعیوں میں ترجمہ کیا۔ قاضی عبدالودود نے میری رہنمائی کی۔ موصوف مجھ سے عمر میں بڑے اور علم میں بہت بڑے ہیں۔ تحقیق کے میدان میں اُن کا کوئی مدِمقابل نہیں۔ بہت بڑے انسان بھی ہیں اس زندگی میں قاضی صاحب، مالک رام اور مکیش اکبرآبادی سے بہتر انسان مجھے شاید ہی ملے ہوں۔ ذوق تو کسی ہمدم دیرینہ کی ملاقات کو مسیحا و خضر کی ملاقات سے بہتر جانتے تھے میں بزرگ، ہمدرد، ہم خیال اور نیک دوستوں سے ملاقات کو نعمت غیر مترقبہ سمجھتا ہوں۔ یہ لوگ پریشان حالی اور درماندگی کے ہی دوست نہیں ہر حال، ہر رنگ اور ہر ساعت کے دوست ہیں۔ ان لوگوں کی محبت بڑی ہموار ہے، یہ حبِ علی یا بغضِ معاویہ کے اصول پر نہیں چلتے۔

ان تین ناموں کے ساتھ پنڈت ہری چند اختر کے نام کا اضافہ ضروری ہے۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن ان کی انسان دوستی اور نیکیوں کا اختر تابندہ پوری طرح روشن ہے۔ وہ صاحبِ دل تھے، صاحبِ علم و فضل تھے، نہ جانے کتنی خوبیاں کے مالک تھے۔ ان کا مجموعہ ان کی زندگی کے بعد 'کفر و ایماں' کے نام سے چھپا تھا افسوس ہے کہ اس صاحبِ کفر و ایماں کو ہندو و مسلمان بھول گئے۔ مالک رام دلی میں میرے انسائیکلوپیڈیا تو ہیں ہی۔ یوں بھی دل کو دل سے راہ ہے۔ ان کی محبت میری زندگی کا عزیز ترین سرمایہ ہے۔ جس دردِ انسانی کی جھلک بچپن میں دیکھی تھی وہ میری ذات میں زندگی بھر نمایاں ہوتا گیا۔ مالک رام اور دوسرے احباب نے اپنے طرزِ تعلقات سے اسے اور استوار کیا۔ زندگی کا یہ جوہر جسے میں نے اوّل اوّل والد محترم کی زندگی سے پایا، احباب کی مخلصانہ نوازشات سے پالا اور اپنی افتادِ طبع سے قائم رکھا، ایک ایسی واحد نعمت ہے جس پر میں فخر کر سکتا ہوں۔ شاعر سینکڑوں مجھ سے بہتر ہیں۔ نثر لکھنے والے سینکڑوں مجھ پر فائق ہیں۔

میری زندگی اور ذوقِ ادب کی تشکیل کس طرح ہوئی اس کا ایک مختصر سا خاکہ میں نے پیش کر دیا۔ کچھ لوگ اس کی تفصیل پیش کرتے ہیں تو نام و نسب سے شروع کرتے ہیں۔ میں تو صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ میرا اصل شجرۂ نسب تو صرف والد محترم سے شروع ہوتا ہے۔ اُن کا ذوقِ ادب، ان کی شرافت، اُن کی پاکیزہ نفسی نے میری رہنمائی کی۔ اُن کے باب میں جوش ملیح آبادی کہا کرتے تھے کہ ایک گاؤں اور وہ بھی پنجاب کے گاؤں میں رہ کر انہوں نے دلی اور لکھنو کی زبان کہاں سے سیکھی۔ بے علموں میں بیٹھ کر فن کیسے حاصل کیا۔ بہرحال یہ سب خدا کی دین ہے۔ انہوں نے عمر بھر ریاض کیا۔ اُردو کی خدمت کی۔ نہ کوئی مخلصہ عمل اُن کے پاس ہے جس کی وہ تشہیر کرتے۔ نہ کسی مجذوب فرنگی کو انہوں نے پڑھا جسے 'مقام کبریا' تک پہنچا دینے کا دعویٰ کرتے۔

میں نے بھی اتنا مطالعہ نہیں کیا جتنا آج کل کے ادیب کے لئے ضروری ہے۔ سعدی، حافظ، عطار، سنائی، رُوم، ادھر اُدھر سے دیکھے۔ نظیری اور صائب پر آیا، شبلی دگرامی پڑھے یہ دونوں ہندوستان کے آخری کلاسیکل شاعر ہیں جنہوں نے فارسی میں دادِ سخن دی۔ اقبال، جوش، فراق کو جی بھر کے پڑھا۔ انگریزی میں معرکتہ الآرا ناول پڑھے سیاسی اور غیر سیاسی موضوعات پر کتابیں پڑھیں۔ جستہ جستہ معتبر شعرائے انگریزی کا مطالعہ کیا۔ کبیر، تلسی، بہاری، جائسی کو پڑھا۔ اُردو نظم و نثر کی کتابوں کی فہرست لکھوں تو دفتر ہو جائے۔

غالبیات سے مجھے خاص اُنس رہا اور مالک رام سے ربط و ضبط بڑھا تو یہ شوق خبط ہو گیا۔ ہندی میں ایک کتاب غالب بہ حیثیت شاعر اور انسان لکھی متعدد

غالب کا انتخاب ہندی میں کیا۔ آج کل کے ماہ فروری کے شمارے میں ہر سال غالب سے متعلق نادر مضامین شائع کئے۔ اب بھی فرصت ہوتی ہے تو کلیات غالب فارسی لے کے بیٹھتا ہوں اور اس قسم کے شعروں پر سر دھنتا ہوں

بامن میاویز اے پدر فرزند آذر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

تو اے کہ معتقد شاعران پیشینی
مباش منکر غالب کہ در زمانہ تست

یہ شعر اس زمانے کے شعر نظر آتے ہیں۔ اور غالب کی ترقی پسند ذہنیت کے آئینہ دار ہیں علم و فضل میں مولانا آزاد سا نابغہ اس دور میں نہیں دیکھا۔ ڈاکٹر سید عابد حسین اور سید مسعود حسن رضوی ادب کے ستون ہیں۔ خواجہ غلام السیدین جدید و قدیم علوم کا مجموعہ ہیں اور کس کس کا نام گناؤں۔ میں نے ان سب کی تحریروں سے فیض پایا ہے۔

تقسیم سے پہلے لاہور اُردو کا مرکز تھا۔ کتنے ادیب جمع تھے۔ تاجور نجیب آبادی کی کوششوں سے اُردو مرکز قائم ہوا تو جگر، یگانہ، اصغر، فہیم گوالیاری سیفی سیوہاروی اور نہ جانے کون کون وہاں پہنچ گیا۔ حفیظ، تاثیر، تبسم اور ہری چند اختر کی چاریاری، سالک و مہر کی صحافتی ہم رکابی، چراغ حسن حسرت اور بطرس کی بذلہ سنجی اور مزاح نگاری، ظفر علی خاں کی نظم و نثر کا طنطنہ، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی اور میاں بشیر احمد کی دوستی، سر عبدالقادر اور دیوان بہادر راجہ نریندر ناتھ کی علم دوستی اور ادب پروری، پنڈت راج نرائن ارمان کی مہ وانی، شیو برت لال ورمن اور محمد اسلم کی ناول نگاری، امتیاز علی تاج کی ڈرامے سے محبت، خواجہ دل محمد کی ہمہ رنگی، کس کس کا ذکر کیا جائے، اقبال تو ان سب کے سرخیل تھے ہی۔ یہ تو بڑ کا درخت تھے۔ اُن کے سایے میں کوئی شاعر اونچا نہ اُٹھ سکا سوائے حفیظ کے جس نے الگ راہ اختیار کی اور شعر و نغمہ کا امتزاج کیا۔ اب میاں بشیر احمد، حفیظ، تبسم اور ایم اسلم کے سوا سب عالم بقا کو سدھار چکے ہیں۔ ان سب نے اُردو کا پرچم بلند کیا فیض احمد فیض نے بھی نئی شاعری کی شاہراہ پر گامزنی کی اور نئی راہ نکالی۔ ایک محفل میں راجہ نریندر ناتھ سر عبدالقادر اور جوگی کے عنوان سے مشہور نظم کے خالق منشی محمد ناظر ایسے بزرگوں کو دیکھا وہ آپس میں چہلیں کرتے اور سامعین خوش ہوتے۔

اولاد حسین شاداں بلگرامی محمود شیرانی، پرنسپل محمد شفیع اور انیٹل کالج کی جان تھے۔ ان اکابر کو میں نے دیکھا، ان کی تصنیفات، ان کی گفتگو، ان کی علم دوستی سے رہنمائی حاصل کی۔ لیکن زمانے میں پائداری کسے نصیب ہے۔ تقسیم کے بعد اُردو کا انحطاط شروع ہو گیا۔ سیماب، آرزو لکھنوی، اختر حیدرآبادی اور بعد میں نیاز فتحپوری[*] پاکستان گئے اور جاتے ہی عالم فانی کو چھوڑ گئے۔ اب مہاجرین میں صرف جوش ہیں جو قریب قریب گوشۂ تنہائی میں ہیں۔

اِدھر بھی پنجاب میں اُردو نے دم توڑ دیا۔ اب اس کا حال اس شعر کے مصداق ہے ؎

نہ پوچھ حال میرا چوب خشک صحرا ہوں
لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا

اتنا بڑا انقلاب آنکھوں سے دیکھا۔ سخت جانی بروئے کار آئی۔ اُردو کا دامن اب بھی تھامے ہوئے ہوں ہندی میں لکھتا ہوں تو اُردو ہی سے متعلق لکھتا ہوں۔ یہ خوبصورت و طرحدار زبان کیوں سیاست کی نذر ہو گئی۔ اس المیے کی تشریح کون کرے۔ اب تو پاکستان میں بھی حفیظ اور فیض یہ کہہ رہے ہیں کہ پنجاب کی زبان پنجابی ہے۔ انھیں مبارک ہو پنجابی میں صوفی شعراء گزرے ہیں۔ بلھے شاہ وارث شاہ اور غلام رسول کی دین سے کسے انکار ہے۔ لیکن اُردو نے بھی تو بہت کچھ بخشا ہے۔ یہ بھی سلامت رہے تو کیا بُرا ہے۔

اِدھر ہندوستان میں دیوناگری رسم الخط اختیار کئے جانے کی آوازیں بھی اُٹھ رہی ہیں۔ اس بحث میں کون پڑے۔ مجھے امید ہے کہ اُردو کی خدمت کرنے والے خدمت کرتے رہیں گے۔ ہم لوگ تو قریب قریب اپنا کام کر چکے۔ وہ اچھا تھا یا بُرا اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔

اب نئی تعلیم کے زیور سے آراستہ نوجوان نئی آن بان سے نکلے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ ن۔ م۔ راشد اور میرا جی پرانوں کی فرسودگی کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہوئے وہ زمانہ بھی گزر گیا۔ ترقی پسند تحریک چلی وہ وقت بھی اب نہیں رہا۔ اب جدید ادب کا زمانہ آیا ہے۔ شاعری نئی، افسانہ نگاری نئی، تنقید نئی حتےٰ کہ تحقیق بھی نئی۔ پڑھے لکھے نوجوان بوسوجھ بوجھ سے جدیدیت کا نعرہ لگاتے ہیں ان کا نعرہ قبول۔ ان کی تخلیقات میں بھی جان ہے۔ ان کی باتیں بھی فکر انگیز ہیں لیکن ایک بھیڑ بے راہ رو نوجوانوں کی بھی ہے جو کاتا اور لے دوڑی کے اصول پر چلنا چاہتے ہیں۔ جن کی تخلیقات میں نہ فکر کی گہرائی ہے اور نہ بیان کی عمدگی۔ ان کو کون سمجھائے گا۔ ہر نئی چیز پرانی ہو جاتی ہے۔ اس نئے ادب کے بعد جو ادب آئے گا۔ وہ کیا ہوگا۔ اس سے بھی بدتر ہوگا یا بہتری کی تصویر ہوگا۔ ہم تو بساط بھر جو کرنا تھا کر چکے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ سیلاب سب کو خس و خاشاک میں بہائے جائے گا یا کہیں تھم جائے گا۔

نئے علوم، نئے فنون، نئی طرز معاشرت سب ادب پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اُردو ادب اس سے مبرا نہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ آہستہ روی اور اعتدال پسندی

[*] حال میں اُن کا انتقال ہو گیا ہے (ادارہ)

سے آگے بڑھا جائے۔ تیز روی میں ٹھوکر کھانے کا خطرہ بھی ہے۔

میں نے دیکھا ہے کہ غزل ایسی مردود صنفِ سخن میں بھی جدید نگار قابلِ تعریف اور لائقِ صاد باتیں نئے انداز سے کہہ جاتے ہیں۔ یہ فالِ نیک ہے لیکن ہر نئے دور میں روایت بشرطیکہ وہ خوش آئندہ ہو قائم رہی ہے۔ روایت کو محض روایت کہہ کر گردن زدنی قرار دینا بصیرت کی بات نہیں۔

میں نے اپنے گرد و پیش کی بہت سی نئی اور پُرانی باتیں کہہ دیں۔ میرے نزدیک یہ باتیں حق ہیں ناحق نہیں ؎

بُت پرستی کیجئے یا حق پرستی کیجئے
یاس کس دن کے لئے ناحق پرستی کیجئے

شعر و ادب کی کوئی منزل آخری منزل نہیں۔ اس دولت میں جس نے جو بھی تھوڑا بہت اضافہ کیا ہے یا کر رہا ہے قابلِ صد مبارکباد ہے۔

میں زندگی بھر یہ سوچتا رہا کہ ملازمت سے سبک دوش ہو کر سیاسی ہواؤں میں بھی اُڑ کر دیکھوں گا اور اس طریقے سے تحریر و تقریر دونوں کے ذریعے ادب کی خدمت کروں گا لیکن ایسے وقت میں کنجِ قفس سے نکلا کہ بال و پر کمزور ہو چکے تھے اب سمجھ میں آیا کہ ادیب کے لئے سیاسی فضا کی ہوا بادِ سموم سے کم نہیں اس لئے منقار زیرِ پر ہونا ہی بہتر سمجھا۔

کارواں آگے نکلتا جا رہا ہے۔ میں ابھی راہ ہی میں ہوں، اور اس شعر کا مصداق بن گیا ہوں ؎

خدا جانے کہاں ہے میری منزل ؛ غبارِ کارواں ہے اور میں ہوں

محمور سعیدی

بھیڑ میں ہے مگر اکیلا ہے
اس کا قد دوسروں سے اونچا ہے
دل میں جو چٹکیاں سی لیتا ہے
یہ سیہ، سرد ہاتھ کس کا ہے
اپنے اپنے دکھوں کی دنیا میں
میں بھی تنہا ہوں وہ بھی تنہا ہے
منزلیں غم کی طے نہیں ہوتیں
راستہ ساتھ ساتھ چلتا ہے
ساتھ لے لو سپر محبت کی
اس کی نفرت کا وار سہنا ہے
تجھ سے ٹوٹا جو اک تعلق تھا
اب تو سارے جہاں سے رشتہ ہے
خود سے مل کر بہت اُداس تھا آج
وہ جو ہنس ہنس کے سب سے ملتا ہے
اب مراسم میں وہ تپاک نہیں
ملنا جلنا یہ چند دن کا ہے
اور تو یاد ہے اسے سب کچھ
وہ مگر خود کو بھول بیٹھا ہے
غم دل کو عزیز رکھتا ہوں
یادگارِ نشاطِ رفتہ ہے
سب چلے ہم بھی اٹھ چلو محمور
میکدہ بند ہونے والا ہے

پروفیسر عبدالقادر سروری

خواجہ احمد فاروقی

آہ یہ دُنیا یہ ماتم خانۂ برناؤ پیر
آدمی ہے کس طلسم دوش وفردا میں اسیر

۳ مارچ کی رات کو شنکر وشاد کی یاد میں مشاعرہ تھا اُس روز صبح کو کشمیر گرلز کالج کی لیکچرار بلقیس فاطمہ مظہر اللہ کا ٹیلیفون آیا کہ پروفیسر عبدالقادر سروری کا ناگہانی سرینگر میں انتقال ہوگیا اور قضا وقدر نے اتنی مہلت بھی نہ دی کہ علاج ہو سکتا۔ چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کند

سروری صاحب ہندوستان کی تین مشہور و معروف یونی ورسٹیوں میں اُردو کے پروفیسر اور صدر شعبہ رہ چکے تھے اور یہ معمولی اعزاز نہیں ہے حیدرآباد اور میسور کی ملازمت ختم کرنے کے بعد وہ کشمیر یونی ورسٹی کی کرسی پر فائز ہوئے۔ سرینگر نسبتاً دور ہے لیکن اُردو کا کوئی کام اور کوئی تحریک ایسی نہیں تھی جس سے قریبی طور پر وابستہ نہ رہے ہوں۔ انجمن ترقی اُردو ہند، ترقی اُردو بورڈ، ساہتیہ اکادمی اور جشن غالب کمیٹی کے ممبر رہ چکے تھے۔ ۲۹ اور ۳۰ جنوری سنہ ۱۹۷۱ء کو ہمارے شعبہ میں اُردو رسم الخط پر سمینار تھا اس کی ان کو بے انتہا خوشی تھی اور انہوں نے شرکت کا وعدہ فرمالیا تھا لیکن بعض مجبوریوں کی وجہ سے شرکت نہ ہو سکی جیسے ۵ فروری سنہ ۱۹۷۱ء کے خط میں لکھتے ہیں۔ (یہ انکی آخری تحریر ہے جو میرے پاس محفوظ ہے)

حیدرآباد ۵ فروری سنہ ۱۹۷۱ء

محب مکرم

آپ کا خط رسم خط کے سلسلہ میں سرینگر ہوتا ہوا یہاں ایسے وقت ملا کہ آپکے لئے مضمون لکھنا ممکن نہ تھا۔ اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ فوراً جواب بھی نہ دے سکا۔ یہ سوچ رہا تھا کہ عزیزی رفعت کی شادی کے دعوت نامے کے ساتھ خط بھی لکھ دوں گا۔ یہ ذرا ملتوی ہوگئی۔ ۱۵ فروری ۱۹۷۱ء مقرر ہوئی ہے مجھے توقع ہے آپ اور احتشام صاحب شادی میں شریک ہو سکیں گے۔

ہم ۲۰ مارچ کو انشاء اللہ آپ کے شعبے میں ملیں گے۔ پروفیسر احتشام حسین نے آپکو خط لکھ دیا ہے۔

۲۲ دسمبر کو میں نے گھر پر فون کیا تھا۔ صاحب زادی سے بات ہوئی تھی پتہ نہیں آپ کو اطلاع ہوئی یا نہیں خط حیدرآباد ملتا تو مضمون لکھ دیتا۔

آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ جموں اور کشمیر میں اُردو کی ادبی تاریخ میں نے مکمل کر لی ہے۔ تین جلدوں میں لکھی ہے۔ ریاست کی کلچرل اکادمی اُسے چھاپنا چاہتی ہے۔ دیکھئے کب تک چھپ جاتی ہے۔

سب کی خیر و عافیت کا متمنی مخلص

عبدالقادر سروری

اس خط کے سلسلے میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ ۲۰ فروری کو ہمارے شعبہ اُردو میں ترویجی یونی ورسٹی کا زبانی امتحان تھا۔ اس میں پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر احتشام حسین اور پروفیسر گیان چند آئے تھے۔ میں اس روز دہلی میں موجود نہیں تھا۔ اس لئے ان دوستوں سے نیاز حاصل نہ کر سکا۔ لیکن حسن اتفاق سے سروری صاحب

سے ۲۲ فروری کو حیدرآباد میں ملاقات ہوگئی۔ پروفیسر رفیعہ سلطانہ کے مکان "پھول بن" پر دوپہر کے کھانے کی دعوت تھی۔ اس میں وہ بھی مدعو تھے۔ میں نے کبھی ان کو اتنا خوش و خرم اتنا صحت مند اور اتنا مطمئن نہیں دیکھا۔ اطمینان کا سبب غالباً یہ تھا کہ رفعت کی شادی کے فرض سے سبک دوش ہو گئے تھے اور کشمیر کی ادبی تاریخ تین جلدوں میں مکمل کر چکے تھے کہنے لگے: "فاروقی صاحب میں نے آپکے حکم کی تعمیل کر دی ہے۔ کشمیر میں اُردو کی ادبی تاریخ تین جلدوں میں مرتب ہوگئی۔ اب اس کے چھپوانے کی ذمہ داری آپ کی ہے۔" یہ میری اُن سے آخری ملاقات تھی۔

۱۸ مارچ کو حیدرآباد سے سرینگر جاتے ہوئے وہ ذرا دیر کو دہلی میں رُکے اور مجھے اسٹیشن سے ٹیلی فون کیا۔ میری بدقسمتی کہ اس روز ایسا گھرا ہوا تھا کہ ان کی خدمت میں اسٹیشن نہیں پہنچ سکا لیکن جو گفتگو ٹیلی فون پر ہوئی۔ وہ بھی کچھ کم اہم نہیں تھی۔ میں نے عرض کیا کہ سروری صاحب اب آپ میرے پاس دہلی آجائیے۔ ایک صورت نکلی ہے۔ خواہ مخواہ کے بہانے مت کیجئے گا۔ میں آپ کی جگہ ہوتا تو جنت سے بھی بھاگ کھڑا ہوتا۔

"فردوس ہم دل نیا سایدم

کتنے بڑے بڑے سفر کرتے ہیں آپ اس عمر میں، اور جی نہیں گھبراتا آپکا۔" کہنے لگے زندگی تو ذوقِ سفر ہی ہے لیکن حضرت یہاں بھی تو آپ ہی نے بھیجا تھا۔

چہ می کردم اے بندہ پرور خداشے"

مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ اس سے بڑے سفر پر جانے والے ہیں اور ان کا ذوقِ عمل موت کو بھی ماندگی کا ایک وقفہ سمجھے گا۔

سروری صاحب زندگی بھر علمی کاموں میں مصروف رہے۔ مقالات کو چھوڑ کر جن کی تعداد تین سو کے قریب ہے ان کی مشہور تصانیف یہ ہیں۔

۱۔ جدید اُردو شاعری
۲۔ پھولبن
۳۔ کلیات سراج ⎫
۴۔ قصہ بے نظیر ⎬ کی ترتیب اور تصحیح
۵۔ سراج سخن ⎭
۶۔ زبان اور علم زبان ۷۔ اُردو مثنوی کا ارتقاء ۸۔ دُنیائے افسانہ
۹۔ اُردو کی ادبی تاریخ
۱۰۔ سراج سخن ⎫
۱۱۔ انتخاب ظفر ⎭ شاہ سراج اور بہادر شاہ ظفر کے کلام کا انتخاب
۱۲۔ کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ
۱۳۔ کشمیر میں اُردو کی ادبی تاریخ۔ تین جلدوں میں

لیکن اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ وہ ہر علمی کام کرنے والے کی فیاضی سے مدد کرتے تھے اور اس معاملہ میں بخل نہیں کرتے تھے۔ وہ مجھے تین جون ۱۹۵۹ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

حیدرآباد دکن
مورخہ ۳-۶-۵۹ء

"محب مکرم"

کرم نامہ مورخہ ۲۳ مئی عنایت ہوا۔ شبہ اور اہل محبت سے ہا پرستاروں کی لغت میں کفر کے مترادف ہے۔ آپ کی دی ہوئی بشارت ایک ضخیم مقالہ کی شکل میں مجسم ہوئی۔ اب اس کو پڑھنا ہے۔

مولہ "چار درویشوں" کے بارے میں آپ کو کس طرح کا مواد درکار ہے۔ جامعہ عثمانیہ میں ان کے بارے میں شاید کچھ زیادہ مواد نہ مل سکے لیکن کتب خانہ آصفیہ اور کتب خانہ سالار جنگ میں مل جائے گا۔ کتب خانہ آصفیہ میں دیوان اثر کا ایک قلمی نسخہ ہے ان "چار درویشوں" کے بارے میں وہاں جو مواد چاہئے۔ انشاءاللہ اس کی سبیل نکل آئے گی۔"

سروری صاحب انجمن اساتذہ اُردو جامعات ہند کے بانیوں میں سے تھے۔ اور اس کے سب سے پہلے صدر۔ ان کی صدارت میں انجمن کے تین سالانہ جلسے ہوئے۔ سب سے پہلا اجلاس دہلی میں ہوا۔ دوسرا سرینگر میں اور تیسرا علی گڑھ میں — ان کو اس کا سخت رنج تھا کہ چوتھا اجلاس اب تک نہیں ہوا۔ وہ برابر اس کی کوشش اور پیروی میں لگے رہتے کہ ہم کہیں سر جوڑ کر بیٹھیں۔ مجھے ان کے ساتھ بحیثیت جنرل سکریٹری انجمن اساتذہ کام کرنے کا شرف حاصل ہوا اور میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ بے مثل تنظیمی صلاحیت کے مالک تھے اور اُن کو اُردو سے گہری اور سچی محبت تھی جس میں جذبات کم اور علم و عمل کا دخل زیادہ تھا۔

سن ۱۹۶۱ء میں میں یورپ اور امریکہ گیا اور اٹھارہ مہینے کے بعد واپس آیا۔ میری واپسی پر سروری صاحب نے لکھا: "رام چندر جی کی غیر حاضری میں ان کے بھائی بھرت تخت و تاج کو سنبھالے رہے۔ اب آپ آگئے ہیں حضرت۔ انجمن اساتذۂ اُردو کو سنبھالئے اس کے ضروری کاغذات آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔"

سروری صاحب بڑے اصرار و کوشش سے سرینگر بلاتے تھے اور جو بھی اُردو کے حلقہ کا دوست یا عزیز وہاں پہنچ جاتا تھا اس کے ساتھ بیشتر وقت صرف کرتے تھے۔ میرے حال پر غیر معمولی کرم تھا۔ ۱۰ جون ۱۹۶۳ء کے گرامی نامے میں سرینگر سے لکھتے ہیں۔

"محب مکرم

آپ کا تار تین چار دن پہلے عنایت ہوا تھا۔ جواب کی جلدی نہیں تھی۔

اس لئے میں نے کچھ تاخیر سے کام لیا۔ آپ کے نہ آسکنے کا بہت افسوس ہے میں نے خط لکھنے کے بعد آپ کے گھر پر ٹرنک کال کی۔ بیگم صاحبہ سے معلوم ہوا کہ آپ دلّی میں نہیں ہیں۔ کئی دن انتظار کے بعد چونکہ رجسٹرار کو جلدی تھی۔ اس لئے۔۔۔ صاحب کو بلوایا۔ یہ بہت اچھا موقع تھا۔ آپ اور بیگم صاحبہ سب یہاں آسکتے تھے اب ایک اور صورت نکالنے کی کوشش کی ہے غالباً اس کا تذکرہ میں نے آپ سے کیا تھا۔ میں نے ایک سے می نار غالب پر مقرر کرنے کی تحریک یونی ورسٹی کو بھیجی ہے۔ اس میں آپ کا سرور صاحب، احتشام صاحب اور نورالحسن ہاشمی کا نام بھی تجویز کیا ہے۔"

لیکن میں پانچ برس کے بعد ۱۹۷۹ء کی گرمیوں میں کشمیر پہنچ سکا اور نگین جھیل کی ایک ہاؤس بوٹ "پی کاک" میں ٹھہرا اس موقع پر انہوں نے مجھے ایک توسیعی لیکچر دینے کے لیے مدعو فرمایا وہ مجھ سے ملنے کے لیے شکارے میں بیٹھ کر آیا کرتے تھے۔ اور خال مرزا بیت پوری جھیل کو تیر کر پہنچتے تھے۔ وہ اس موقع پر ایک قدیم اردو شاعر کا شعر پڑھا کرتے تھے جو مجھے یاد نہیں رہا لیکن جس کا مفہوم یہ تھا کہ تم تک رسائی ہو سکے تو یہ بحر و بر کچھ بھی نہیں۔

ایسی محبت اور شفقت کے بول اب کہاں؟ اُن کے یہاں نہ ڈاکٹر زور کی سی شان و شوکت تھی اور نہ عبدالحق صاحب کی سی وسعت اور بے پایاں ایک اُستاد کی سادگی اور بے ریائی تھی جو دلوں کو موہ لیتی ہے۔

ایک نقطہ ہے سادگی بس یہ بلانے جان ہے تو
عشوہ کرشمہ کچھ نہیں۔ آن نہیں ادا نہیں

اُردو والوں پر یہ الزام تھا کہ وہ زندگی میں کسی کی قدر نہیں کرتے مرنے کے بعد پرستش کرتے ہیں۔ ہم نے ڈاکٹر عبدالحق، سید سلیمان ندوی، ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی اور جگر مرادآبادی کے لیے کیا کیا جو اب کچھ کریں گے۔؟ میرے خیال میں اس الزام سے اب اس قبیلۂ عشق کو بری کر دینا چاہیے۔

غزل

مظفر حنفی

حالانکہ وہ حسین نہ تھا کچھ اداؤں سا
پھر بھی ہمارے ساتھ رہا دھوپ چھاؤں سا

جس شہر میں گیا ہوں لگا مجھ کو اجنبی
جو گاؤں بھی ملا وہ لگا اپنے گاؤں سا

مرمر کے رات دن جو تراشا ہے ایک بت
وہ بھی ہے پُر جلال پرانے خداؤں سا

تم سے بھی مل کے جی کو تسلی نہیں ہوئی
تم نے بھی سبز باغ دکھایا وفاؤں سا

ہم دیوتا سمجھ کے جسے پوجتے رہے
دیکھا تو اس کا پاؤں تھا مٹی کے پاؤں سا

فردوس گمشدہ سے بھی شاید نہ بھر سکے
وہ سلسلہ جو ہے مرے اندر خلاؤں سا

میں معذرت طلب تو نہیں ہوں مگر یہ دیکھ
اعمال نامہ ہے کوئی میری خطاؤں سا

فکر معاش، فن کی طلب جستجوئے حق
ایک غول میرے پیچھے لگا ہے بلاؤں سا

اختر اورینوی

ایک کوارٹر کے پہلو میں ایک بہت ہی اونچا، مضبوط، گھنیرا اور خوبصورت درخت تھا۔ شہر کے مشہور باغ کو بڑی بدسلیقگی سے کاٹ کاٹ کر بے ربط اور بدوضع کوارٹر کھڑے کر دیئے گئے تھے بے ہنگم، نہ ناک دست نہ نقشہ۔ صرف ایک کوارٹر اسی چھتنار اور بلند و بالا درخت کی وجہ سے بہت بھلا لگتا تھا، ہرا بھرا، سایہ دار۔ ماحول کے بے کیف سپاٹ پن اور بدآہنگی کو دُور کرنے والا۔ گہری جڑیں، سڈول، بھاری بھرکم، اونچا تنا، پھیلی ہوئی صحت مند شاخیں، سرسبز کونپلیں، سندر ہرے ہرے بولتے ہوئے پتے۔ اس پیڑ کی سربلندی کو دیکھ کر جی خوش ہو جاتا تھا اور آسمان کی طرف نظریں اُٹھ جاتی تھیں۔ دل میں بڑا اعتماد اور حوصلہ پیدا ہوتا تھا جیسے مٹی سے ایسا وشال درخت اُگے وہ مقدس محسوس ہوتی تھی۔ اس پُرانے باغ کے نہ جانے کتنے خوبصورت اور پھل دار درخت کاٹ کر پھینک دیئے گئے ہوں گے۔ آم، لیچی، جامن، امرود اور شریفے کے پیڑ۔ اُفتادہ زمینوں اور بنجر قطعوں کی کمی نہ تھی لیکن نہ جانے کس جبلت کی تسکین کے لئے یہی حسین باغ قتل گاہ بنایا گیا۔

اس برباد باغ کی ایک تاریخ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شاہی وقت کا باغ تھا۔ ایک فراخ دل نواب نے اپنے جگری دوست ایک مہاراجہ کو تحفتاً یہ باغ پیش کیا تھا۔ انہیں دنوں ایک کامل فقیر باغ کے ایک گوشے میں دھونی رما بیٹھا۔ مہاراجہ نے کوئی مزاحمت نہ کی بلکہ اُسے نیک شگون سمجھا اور پہلو میں ایک قطعہ اراضی بھی شاہ صاحب کو دیدی۔

آج بھی اُس احاطے میں قبریں موجود ہیں۔ خدا رسیدہ فقیر کا سالانہ عرس ہندو مسلمان سب دھوم دھام سے مناتے ہیں۔ جس عظیم الشان درخت کا ذکر ہے شاہ صاحب کی قبر پر سایہ کئے ہوئے تھا جیسے چتر لگانے کی سعادت حاصل کر رہا ہو۔ لوگوں میں یہ مشہور تھا کہ یہ درخت بھی متبرک ہے اور اس خطے کی خاک پاک ہے۔ جب انگریزوں کا راج ہوا تو لیفٹننٹ گورنر بہادر نے سخت دباؤ ڈال کر یہ باغ مہاراجہ سے اونے پونے خرید لیا۔ یہیں سرکار بہادر کی کوٹھی بنی مگر باغ کا بڑا حصہ قائم رہا۔ اور وقت پر پھل دیتا رہا۔ قبریں رفتہ رفتہ منہدم ہو گئیں اور اُن کے نشانات بھی مٹتے گئے لیکن پیر صاحب کی قبر جیسی تھی ویسی ہی رہی۔

۱۸۵۷ء کے ناکامیاب ہندوستانی انقلاب کے بعد اسی باغ میں کئی مجاہد سولی پر لٹکا کر شہید کر دیئے گئے۔ انگریزی راج محل خون اور گوشت کے گارے سے تعمیر ہوا۔ اس وشال پیڑ نے یہ خونیں ڈرامہ دیکھا تھا۔

خلقت کہتی ہے کہ اس عجیب درخت کی خون شہداء سے آبیاری ہوتی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر درخت کے پتے یا شاخیں کوئی توڑتا تو اُن سے سُرخ خون ٹپکنے لگتا تھا۔ اسی وجہ سے جب نئے کوارٹر باغ کے درختوں کو کاٹ کاٹ کر بنائے جانے لگے تو کسی بڑھئی کی یہ جرأت نہ ہو سکی کہ اس متبرک زندہ جاوید درخت پر آرا چلائے۔

یہ درخت عجوبۂ روزگار تھا۔ اس کا نام کوئی صحیح طور پر نہیں جانتا تھا۔ کوئی کچھ کہتا تھا اور کوئی کچھ۔ نہ پھول نہ پھل مگر ہریالی و شادابی ضرب المثل اور سکون دل و جان۔ یہ بھی مشہور تھا کہ انقلاب ۱۸۵۷ء سے پہلے پھول کھلتے تھے، پھل لگتے تھے۔ اس بات کی شہرت بھی تھی کہ فرنگیوں کی حکومت کے بعد تین چار بڑے خوشبودار پھول کھلے اور لال لال پھل آئے اور فرنگیوں کو بڑا تعجب ہوا۔ ادھر سالوں سے کسی نے پھل دیکھے نہ پھل کھائے۔ شہر بھر میں ایسا کوئی پیڑ نہ تھا۔ ریاست اور ملک بھر میں لاثانی اور فرد ہو تو عجب نہیں۔ مجھے اس درخت کے وقار سے بڑی تسکین ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ آندھیوں اور طوفانوں کو آڑے گا۔ وہ ہمارا سپر تھا، سہارا تھا، مربی تھا، ہمسایہ تھا، ساتھی تھا، دوست اور غمگسار تھا۔ وہ قطب نما تھا۔ ایک عظیم و رفیع علامت تھا۔ پورے احاطے کی انفرادیت اسی سے قائم تھی۔ میں پہروں اُسے دیکھتا رہتا تھا۔ ہر موسم میں اس کی الگ بہار تھی۔ صبح دوپہر شام جب دیکھئے وہ دلکش تھا۔ چاندنی راتوں میں اس

ساعشق ملی تھا۔ اندھیری راتوں میں وہ ایک بلند بالا اور قوی جاگتا ہوا سنتری دکھائی دیتا تھا اور اس کی حفاظت میں ہم سب لوگ سکھ کی نیند سوتے تھے۔ اس کی خاموش ہم کلامی میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ کبھی تو میں یہ محسوس کرتا کہ اس درخت کا بیج میرے دل میں ہے۔ کبھی نہ کبھی وہ انکھوائے گا اور ایک عظیم و سرفراز شجر بن جائے گا۔

اس شاداب درخت کو کاٹ کر گرانے کی برسوں سے کوششیں ہو رہی تھیں لیکن اس کی تقدیس جاننے والے بڑھئی اور مزدور آرے کاٹنے سے ڈرتے تھے۔ درخت کی رگوں میں لال لہو تیرتا ہے اور اس کا سایہ پیر صاحب کی خدمت گزاری کرتا ہے وہ قبر کے کنارے جیتے جاگتے پاسبان کی طرح چوکس کھڑا تھا۔ کبھی کوئی ٹھیکہ دار دُور کے شہروں سے مزدور لا کر اس پاک پیڑ کو کاٹ کے اس کی لکڑیاں بیچ کر نفع کمانا چاہتا تھا لیکن یہ دیکھا گیا کہ درخت کے کسی تنے یا شاخ پر تبر چلاتے ہی سرخ عرق ٹپکنے لگتا اور کارندوں پر دہشت طاری ہو جاتی اور کام رُک جاتا۔ ایک بار کوئی کلہاڑا چلانے والا درخت کی کسی اونچی شاخ سے گر کر مر گیا۔ کبھی کوئی مزدور خطرناک طور پر بیمار پڑ جاتا۔

غرض یہ کہ حیات اور رحمت کا علمبردار درخت فضا کی رفعتوں پر لہلہاتا رہا اور اس کا ماحول امن کا گہوارہ بنا رہا۔ اُسے دیکھ کر تشفی اور شانتی کا احساس ہوتا تھا۔

پچھلی گرمیوں میں نہ جانے کہاں سے ایک سخت دل اور بے باک ٹھیکہ دار کو انجان اور ڈھیٹ کارندے مل گئے اور ایک نئی ترکیب سے اس شاندار پیڑ کا قتل شروع ہوا۔ بڑے بڑے لانبے اور موٹے رسّوں سے اُسی درخت پر پھانسیاں بنائی گئیں۔ بالائی پتلی پتلی شاخوں کو کاٹ کاٹ کر پھانسی چڑھایا جانے لگا۔ پھر بڑے تنوں کی باری آئی اور انہیں آرے سے کاٹ کاٹ کر پھانسی پر لٹکایا گیا۔ کئی مزدور کٹے ہوئے تنوں کو آہستہ آہستہ جھلاتے ہوئے زمین پر لے آتے۔ یہ اہتمام اس لئے تھا کہ کوارٹروں کو نقصان نہ پہونچے۔ یہ پیڑ جڑ کے پاس سے گرایا نہیں جا سکتا تھا۔ اس کا وقار و جلال لرزہ پیدا کرتا تھا اس میں زمین کا جاں بخش رس تھا، بلند آسمان کے کرنوں کی روشنی اور دھڑکتی ہوئی زندگی کی شادابی تھی۔

پندرہ دنوں تک اس درخت کو پھانسی دی جاتی رہی۔ عضو بہ عضو لال لال عرق بہتا رہا پھر وہ تھوڑی دیر کے بعد خون کے چکتوں کی طرح جم جاتا۔ اس کے عرق کا رنگ ببول کے گوند کی طرح پیلا نہ تھا۔ کوارٹروں کی نالیوں میں لال لوتھڑے کیچڑ کے ساتھ مل کر بہہ رہے تھے۔

اچانک کئی مزدور بیمار پڑ گئے اور کئی موٹے موٹے رسّے پارہ پارہ ہو گئے۔ پندرہ دنوں کے لئے کام رُک گیا۔ لانبے لانبے بالوں اور چڑھی ہوئی آنکھوں والے ٹھیکہ دار کو بڑی تشویش ہوئی محلّے کے لوگوں میں چہ می گوئیاں شروع ہو گئیں اور پیر صاحب کی کرامات کے چرچے ہونے لگے۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو چاہتے تھے کہ یہ اونچا جسمات درخت کٹے تو وہ اپنے کوارٹروں کے چھوٹے چھوٹے احاطوں میں مولی، گوبھی، آلو اور چقندر اگا کر کچھ پیسے حاصل کر لیں۔ اس عظیم درخت کی قلمرو میں مولی اور چقندر کہاں اُگ سکتے تھے۔ ہاں امن، سکون، طمانیت، راحت اور حسن کی نشوونما ہوتی رہتی تھی اور چین کی برکھا برستی تھی۔

کام پھر شروع ہو گیا۔ درخت کے بڑے بڑے موٹے تنے کٹنے لگے۔ کئی تنوں سے جہازی رسّے کئی سمتوں میں باندھے جاتے تھے اور اُن کے سرے درجنوں مزدور زمین پر کھڑے تن کر پکڑے رہتے تھے۔ درخت کے تنوں پر کلہاڑے اور آرے سے تیز دست مزدور اس کے جوڑ بند کاٹتے جاتے تھے اور مضبوط رسّوں سے باندھ کر انہیں آہستہ آہستہ جھلا جھلا زمین پر کوارٹروں سے بچا بچا کر گرایا جاتا تھا۔ دُور سے ایسا لگتا تھا کہ جیسے گٹھیلے بدن کے پہلوانوں کو پھانسی دی جا رہی ہے۔ اور ان کی جسیم لاشیں زمین پر پڑی ہیں۔ روزانہ دو ہی تین تنے کاٹے جا سکتے تھے اور انہیں نیچے لانا بڑا مشکل مرحلہ تھا۔ رسّے کئی پہلوؤں سے باندھے جاتے اور کئی سمتوں سے کھینچے جاتے تھے اور مرکزی رسّے کو دھیرے دھیرے ڈھیل دے کر اس حساب سے دیو قامت تنوں کے ٹکڑوں کو کوارٹروں کی چھتوں اور دیواروں سے بچا بچا کر زمین پر گرایا جاتا تھا کہ ان پر ضرب نہ پڑے۔ پھر بھی زور کا دھماکہ ہوتا تھا اور در و دیوار لرز جاتے تھے۔

چند دنوں میں جیتے جاگتے، شاداب و مسرّت بار درخت کا عضو عضو کاٹ ڈالا گیا جیسے پہلے لوگوں کو صلیب پر چڑھانے کے بعد اُن کی ہڈیاں توڑ دیتے تھے۔ میرا ذہن مہینے بھر تک سولی پہ چڑھتا رہا اور میرے دل کو صلیب دی جاتی رہی۔

اب ایک مہیب رعب دار جڑیلا تنا اور اسی سے نکلے ہوئے دو شاخوں کے ٹکڑے بے برگ و بار بے دم ہو کر رہ گئے۔ اوپر کے دونوں تنوں سے بندھے رسّے جھول رہے تھے۔ ایک صبح میں اپنے احاطہ میں ٹہل رہا تھا۔ میری نظر اس ٹھنٹھ درخت پر پڑی۔ زمین پر تنوں کی لاشیں بے سدھ بکھری پڑی تھیں۔ بہت سے تنے اور شاخیں ٹھیکہ دار بیل گاڑیوں میں لے جا چکا تھا۔ اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا کہ سامنے ایک دیو قامت غلیل ہے۔ اس کا عظیم دوشاخہ آسمان تک بلند ہونا چاہتا تھا اور مہیب دستہ دھرتی کے ہاتھوں میں ہے۔ اور اب شکتی شالی دھرتی کٹے ہوئے تنے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو چوٹی پر جا کر شست باندھے گی اور قاتلوں پر بھرپور نشانہ لگائے گی —

ایک روز دوشاخہ بھی کاٹ دیا گیا۔ مگر گرتے گرتے دوشاخہ کے ایک بازو نے ایک کوارٹر کی دیوار سے ٹکرا کر اُسے شق کر دیا اور دوسرے بازو نے دوسرے کوارٹر کی گیراج کی چھت کو پارہ پارہ کر ڈالا۔

نہ جانے کیوں مہینوں قتل وغارت کا کام پھر ٹھیکیدار نے روک دیا اور وسطی جڑیلا تنا دیوار سے اٹکی ہوئی لاش کی طرح کھڑا رہا۔

مہینوں یہ صدنک تنا مقتول امن وشادابی کی علامت بن کر میرے دل میں تیر نیم کش کی طرح پیوست رہا۔ اور دو شانے کے دونوں بازو کسی عظیم ٹوٹی ہوئی بیساکھی کے بالائی حصّوں کی مانند اس سروتن بُریدہ درخت کی لاش کے سامنے زمین پر پڑے رہے۔

بیساکھ اور جیٹھ کے مہینے ختم ہو گئے اور اساڑھ آگیا۔ وقفے وقفے سے بادل کے ٹکڑے آئے اور کچھ چھڑکاؤ ہوتا رہا۔ ایک صبح رُوح پرور معجزہ رُونما ہوا اُسے دیکھ کر ہم سب خوشی سے لہلہا اُٹھے۔ چند ہی دنوں بعد ٹھیکیدار پھر نمودار ہوا اور درخت کے وسطی تنے پر مزدوروں کو آرا چلانے کے لئے آمادہ کیا۔ پہلے کلہاڑیاں چلنے کی آوازیں آئیں ہم چوکنا ہو گئے! اور بھاگتے ہوئے مقتول درخت کی طرف دوڑ پڑے دیکھا کہ درخت کو جڑ سے کاٹا جا رہا ہے۔

ہم لوگوں نے ٹھیکیدار اور عملوں سے پرزور احتجاج کیا اور اُنہیں صاف صاف کہدیا کہ جڑوالا تنا ہرگز نہیں کٹے گا۔ جو زمین پر تنوں کے گرے ہوئے ٹکڑے ہیں اُنہیں چاہو تو اٹھا کر لے جاؤ۔ جڑ میں اب ہرگز ہاتھ لگانے نہیں دیا جائے گا۔ تند و تیز مجادلے کے بعد ٹھیکیدار اور اس کی ذرّیت دفع ہوئی اور دُوسرے دن وہ لوگ تنوں کے افتادہ ٹکڑے لاد کر لے گئے۔

مجروح جڑیلا تنا صبر، استقلال، اطمینان اور امید کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے بالائی پہلو میں سرسبز نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں اور کوارٹروں کی چھتوں سے اُونچی چند نئی ہری بھری شاخیں ہوا میں لہرا رہی تھیں۔

وہ رحمت فشاں درخت مرکر پھر جی اٹھا تھا۔

مغیث الدین فریدی

بے شوق طلب، بے ذوق نظر، بے رنگ تھی اُن کی گل بدنی
یہ کوہکن مجنوں کی نظر شیریں بھی بنی لیلیٰ بھی بنی

دیکھے ہوئے اُن کو دیر ہوئی ہر نقش ابھی تک تازہ ہے
بے گانہ وشی، مستانہ روی، بیدار نظری، شیریں سخنی

اپنا بھی گریباں دیکھ ذرا، پھر میرے جنوں پر ہنس لینا
عادت میں تری پیماں شکنی فطرت میں مری زنداں شکنی

ہم اپنے ہی گھر میں رہتے تھے جب تیری نظر میں رہتے تھے
اب روز ہمیں تڑپاتی ہے اے دوست وطن میں بے وطنی

پھولوں میں جھلکتے ہیں چہرے شاخوں پہ گماں آغوش کا ہے
کچھ ایسی بسی ہے نظروں میں گل پیرہنی، نازک بدنی

شعلوں میں بکھرتے ہیں جو سر قسمت پہ فریدی طنز نہ کر
غم ایسی ہی نعمت ہے جس کو پاتے ہیں یہاں قسمت کے دھنی

تبصرہ نگاری کا فن

شمس الرحمٰن فاروقی

تبصرے کے بارے میں چھان بین کے کئی پہلو ہو سکتے ہیں۔ اخلاقی، ہیئتی، علمی، اخلاقی پہلو سے بات کی جائے تو اس طرح کے سوال اٹھائے جائیں گے۔ تبصرے میں غیر جانب داری کا کیا مقام ہے؟ مبصر کے لئے کتاب سے کس حد تک واقف ہونا ضروری ہے؟ تبصرہ نگار کو کتاب کے نقائص کی نشان دہی اور اس کے محاسن کی تعریف میں کیا تناسب رکھنا چاہئے وغیرہ ہیئتی چھان بین میں کچھ اس طرح کے سوالوں سے بات شروع ہوگی۔ تبصرہ فن ہے یا مشق یعنی Art ہے یا Skill دوسرے الفاظ میں، کیا تبصرہ نگار بھی شاعر کی طرح تلمیذ الرحمٰن ہوتا ہے یا مشق و مزاولت کے بل بوتے پر ہر شخص تبصرہ نگار بن سکتا ہے؟ تبصرہ کتنا طویل ہونا چاہئے؟ تبصرہ نگاری اور تاثرات نگاری میں کیا فرق ہے؟ کیا مبصر کے لئے ضروری ہے کہ وہ بھی اس فن کو برتتا ہو جس کا اظہار کتاب میں کیا گیا ہے جیسے کیا شعری مجموعے کے مبصر کا شاعر ہونا ضروری ہے؟ علمی نقطۂ نظر سے گفتگو میں صرف ایک ہی سوال ہوگا یعنی یہ کہ تبصرہ اور تنقیدی مضمون میں کیا فرق ہے۔

میں اس مختصر سے مضمون میں تبصرہ نگاری کی تاریخ اور اردو کے اچھے یا مشہور تبصرہ نگاروں کے بارے میں کچھ نہ کہوں گا۔ حالی سے لے کر آل احمد سرور محمد حسن عسکری سے لے کر محمود ایاز تک اردو میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں رہی ہے جنہوں نے بہت اچھے تبصرے لکھے ہیں۔ ان مسائل پر معلومات حاصل کرنے کے اور بھی ذرائع ہیں۔ میں تبصرہ نگاری کے صرف اخلاقی اور علمی مسائل پر کچھ ضروری اشارے کروں گا۔

اخلاقی مسائل کو میں نے اس لئے اہمیت دی ہے کہ یہی مسائل تبصرے کے قاری، کتاب اور مبصر سے براہ راست متعلق ہیں۔ اور یہ رشتہ نہ صرف براہ راست ہے بلکہ بہت گہرا اور اصلی بھی ہے۔ بحیثیت ایک قاری میری دلچسپی صرف یہ ہے کہ میں کتابوں کے بارے میں معلومات حاصل کروں مجھے اس بات سے چنداں سروکار نہیں ہے کہ تبصرہ نگار کسی فن کا مظاہرہ کر رہا ہے یا کسی مشق یعنی Skill. کا؟ مجھے اس سے بھی کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے کہ جو تبصرہ میں پڑھ رہا ہوں اس میں اور کسی تنقیدی مضمون میں کیا فرق ہونا چاہئے۔ ہیئتی سوالات تو محض طالب علموں کی دلچسپی کے ہیں، علمی سوالات کی اہمیت صرف تبصرہ نگار کے لئے ہے لیکن اخلاقی سوال میں تینوں شرکاء (قاری، کتاب اور مبصر) پوری طرح الجھے ہوئے ہیں اس لئے اس سوال کو حل کر لیا جائے تو تبصرہ نگاری کے بارے میں بہت سی بنیادی باتیں صاف ہو جائیں گی۔

کچھ دن ہوئے ایک معروف شاعر نے اپنے دیوان کے دیباچے میں لکھا کہ تبصرے کی نوعیت محض ایک اشتہار کی ہوتی ہے اس افسوسناک نظریے پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم

ہوگا لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ برقرار رہتی ہے کہ ادبی برادری کا ایک بڑا اور سنجیدہ طبقہ تبصرے کے اخلاقی مسائل سے اس درجہ بے خبر ہے کہ وہ اسے محض ایک جانب دارانہ تقریظ سمجھتا ہے۔ بلکہ تقریظ تو پھر بھی کتاب کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلومات حاصل کر کے ہی لکھی جاتی تھی۔ لیکن اشتہاری عبارت بنانے والے کو تو اکثر یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ وہ کس چیز کی تعریف کر رہا ہے۔ عبارت بنانے والے سے کہہ دیا جاتا ہے کہ بھائی ایک نیا صابن بازار میں آنے والا ہے، اس کے لئے عبارت بنا دو، وہ اپنی جودتِ طبع کو کام میں لاکر کوئی دلچسپ یا توجہ انگیز عبارت گھڑ دیتا ہے۔ اگر تبصرہ اتنے ہی پست درجے کی چیز ہے تو پھر ادیب اور قاری (ادیب خاص طور پر، قاری عموماً) اپنی پسند کا تبصرہ نہ پاکر اتنے برہم کیوں ہوتے ہیں۔؟

ہماری جدید ادبی صورت حال کا ایک عبرتناک پہلو یہ ہے کہ ہم ایک طرف تو اپنے اوپر اچھے سے اچھا تبصرہ دیکھنے کے مشتاق رہتے ہیں اور اس کے لئے سعی بھی کرتے ہیں، اور دوسری طرف تبصرے کو اشتہار بازی کی سی گھٹیا چیز بھی کہنے پر مصر رہتے ہیں۔ یہ رویہ خود اعتمادی اور فنی ایمان داری کے فقدان کی دلیل ہے۔ اردو میں آزاد اور بے خوف تبصرہ نگاری کی روایت کے عدم استحکام کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ادیبوں نے اکثر تبصروں سے اشتہار کا سا کام لیا ہے یا لینا چاہا ہے۔ چنانچہ اب بھی اگر کسی کتاب پر تعریفی یا تنقیصی تبصرہ ذرا بھی معمول سے ہٹا ہوا نظر آئے تو فوراً یہ افواہ اڑ جاتی ہے کہ مبصر یا رسالے کا مدیر مصنف کا دشمن یا دوست ہے۔ دراصل ہمارے یہاں تقریظ، دیباچہ اور تبصرہ ایک ہی قبیل کی چیز سمجھ لئے گئے ہیں، بس اس فرق کے ساتھ کہ تقریظ میں تعریف زیادہ مبالغہ آمیز ہونا چاہیئے۔ دیباچے میں تعریف تو ہو لیکن مبالغہ کی آرائش ذرا کم ہو، تبصرے میں تعریف تو دیباچہ نما ہو لیکن ساتھ ہی کتاب کی قیمت، پبلشر کا نام، اور دیگر تفصیلات بھی درج ہوں۔ اگر تبصرہ نگار یا مدیر مصنف سے ناراض ہے تو مستقل عنوانات (قیمت، پبلشر کا نام وغیرہ) تو ویسے ہی رہیں۔ بس مبالغہ آمیز تعریف، مضحکہ آمیز تنقیص میں بدل جائے۔ یہ نکتہ غور طلب ہے کہ تبصرہ اگر تعریف پر مبنی نہ لکھا جاتا ہو تو تقریظ کی روایت کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ غالب نے جب آئینِ اکبری پر تقریظ لکھی تو سرسید کی مبالغہ آمیز عیب جوئی نہیں کی تھی بلکہ عیب جوئی سرے سے کی ہی نہیں تھی، اور صرف یہ لکھا تھا کہ زمانہ بدل رہا ہے، لیکن تم ابھی تک پرانی باتیں لئے پھر رہے ہو۔ انگریزوں کو دیکھو، وہ کس طرح پانی پر دھوئیں کے جہاز چلاتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ گویا غالب نے اصولی اختلاف کیا تھا، جوتیاں لے کر پل نہیں پڑے تھے۔ لیکن میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھو کے مصداق جب ہمارے اردو ادب کے شیروں نے تقریظ کی روایت کو پرانے ادب کے جنگل سے اکھاڑ کر نئے ادب کی کھیتی میں تبصرے کے نام سے آباد کیا تو آسانی سے یہ بات نظر انداز کر دی کہ تقریظ میں نکتہ چینی بھی ہو تو اصولی اور علمی ہوتی ہے۔ چنانچہ تعریف کے تیور تو وہی رہے صرف ظاہری رکھ رکھاؤ بدل گیا۔ لیکن اظہار ناراضی کے لئے اصولی اور علمی متانت کو بالائے طاق رکھ کر وہ کڑوے تیور اختیار کئے گئے کہ کتاب کا پتہ پانی ہونے لگا۔ لہٰذا جہاں اس طرح کے جملے ہمارے تبصروں میں بہت عام ہیں کہ کتاب اردو ادب میں اضافہ ہے، لازوال ہے، غیر معمولی کارنامہ ہے، شاعر/ افسانہ نگار/ تنقید نگار نے اردو ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے فنی نزاکتیں اور فکری باریکیاں موصوف پر ختم ہیں وغیرہ۔ وہاں ایسے ہی شرمناک اور سنگین فیصلے بھی دکھائی دیتے ہیں؛ مصنف جاہل ہے، شاعری/ تنقید/ افسانہ نگاری کے فن سے قطعاً بے گانہ ہے، تعجب ہے کہ موصوف اس قدر کم علم ہیں کہ ..... وغیرہ۔

یہاں پر یہ سوال اٹھ سکتا ہے کہ اگر ہمارے تبصروں کی بیشتر تعداد ایسی ہی سطحی، کم کوشش، تقریباً جھوٹی (اور اگر جھوٹی نہیں تو حد سے زیادہ تعمیم زدہ) تحریروں پر مشتمل ہو تو قاری ایسی چیزوں کو برداشت کیوں اور کیسے کرتے ہیں؟ احتجاج کیوں نہیں کرتے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بہت کم زور، نیم جان سا احتجاج کبھی کبھی ضرور ہوتا ہے، لیکن عموماً قاری یا تو بے خبری کی وجہ سے تبصرے کو صحیح سمجھتا ہے اور اس سے اتفاق کرتا ہے، یا پھر جان بوجھ کر ایسی تحریر کو قبول کرتا ہے، کیوں کہ وہ بھی مصنف کے لئے اسی قسم کا معاندانہ رویہ رکھتا ہے جیسا کہ مبصر یا مدیر کا تھا۔ لاعلم قاری بے چارہ تو دونوں طرف سے مارا جاتا ہے کیوں کہ اگر وہ مصنف اور مدیر/ مبصر کے تعلقات سے بے خبر ہے تو تبصرے کو بالکل صحیح سمجھ کر قبول کرتا ہے، اور اگر وہ مصنف سے بالکل بے خبر ہے، یا اس کے بارے میں محض ایک دھندلا سا تصور رکھتا ہے تو اس کی تمام تر رائے اس تبصرے کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے جو اس نے پڑھا ہے۔ لیکن با علم قاری کا ہے، جو اپنی رائیوں، اپنے تعصبات، اپنے جہل کا انعکاس تبصرے میں دیکھنا پسند کرتا ہے اور اس طرح انتہا پسندانہ تبصرہ نگاری کی ہمت افزائی کرتا ہے۔ جس طرح جمہوریت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جمہوریت میں ہمیں ویسی ہی حکومت ملتی ہے جس کے کہ ہم مستحق ہوتے ہیں، اسی طرح تبصروں کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ قاری کو تبصرے بھی ویسے ہی ملتے ہیں جن کا کہ وہ مستحق ہوتا ہے۔ آج کا قاری پچاس برس پہلے کے لوگوں کی طرح ادبی مسائل

درصورت حال سے کلیتہً بے خبر نہیں ہوتا۔ اس کے اپنے تعصبات ہوتے ہیں۔ بیشتر معروف لکھنے والوں کے بارے میں اس کی ایک ذاتی رائے بھی ہے جو ہمیشہ ادبی بنیادوں پر نہیں قائم کی جاتی۔ چنانچہ اگر مجھے شاعر الف سے کسی وجہ سے کد ہے تو میں اس کی کتاب پر سخت تبصرہ پڑھنا پسند کروں گا۔ اور ایسا تبصرہ پڑھ کر خوش ہوں گا، یہ نہ سوچوں گا کہ مبصر نے کتاب کو غور سے پڑھا بھی ہے کہ نہیں۔ چنانچہ اگر مبصر نے لکھ دیا ہے کہ شاعر زیر بحث کا اسلوب دوسرے شعرا سے مستعار ہے تو میں اس رائے کو فوراً قبول کر لوں گا اور اس بات پر اعتراض نہ کروں گا کہ مبصر نے مثالیں نہیں دی ہیں۔ لیکن اگر مجھے شاعر سے کسی وجہ سے ہم دردی ہے تو میں فوراً اعتراض کروں گا کہ دوسرے شعرا سے کھلے استفادے کی مثالیں کیوں نہیں دی گئیں۔

لیکن تبصرے میں جانب داری کا مسئلہ اتنا آسان اور سادہ نہیں ہے جتنا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں۔ اوپر کی بحث سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ تبصرے میں غیر جانب داری بہت بڑی چیز ہے، اور تبصرہ دیباچے یا تقریظ سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ لیکن یہ نتیجہ پوری طرح درست نہ ہوگا۔ کیوں کہ واقعہ یہ ہے کہ تبصرے میں مکمل جانب داری نہ ممکن ہے نہ مستحسن۔ یہ نکتہ غور طلب ہے کہ کسی رسالے میں جو مضامین چھپتے ہیں وہ لازماً ادارے کی پالیسی کے آئینہ دار نہیں ہوتے، لیکن جو تبصرے چھپتے ہیں وہ یقیناً اس کی پالیسی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یعنی یہ تو ممکن ہے کہ کسی ترقی پسند پرچے میں جدیدیت پر مضمون چھپ جائے، جو یک گونہ تعریفی ہو، لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ اس میں کسی جدید شاعر کے کلام پر تبصرہ بھی چھپ جائے تو توصیفی اور تحسین آمیز ہو۔ مضمون نگار کو تو آزادی ہوتی ہے کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کرے، چاہے وہ خیالات ادارے کے نظریات سے مکمل طور پر ہم آہنگ نہ ہوں۔ لیکن تبصرہ نگار ادارے کے ذہن کا نمائندہ ہوتا ہے، تبصرہ ہی پڑھ کر یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس پرچے کے ارباب حل و عقد کس قسم کا ادب پسند کرتے ہیں۔ کسی پرچے میں شاعر الف کی نظم یا افسانہ نگار ب کا افسانہ چھپ جانا لازماً یہ معنی نہیں رکھتا کہ یہ رسالہ شاعر الف یا افسانہ نگار ب کے ادبی نظریات و اسالیب اظہار کو نظر استحسان سے دیکھتا ہے۔ لیکن اگر اس میں شاعر الف یا افسانہ نگار ب پر تحسینی تبصرہ چھپے تو یقیناً ایسا نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا تبصرہ نگاری میں کلی طور پر جانب داری کا دعویٰ صرف وہی کر سکتا ہے جو یا تو دیوتا ہو یا بہت بڑا احمق۔ اگر کوئی مبصر ہر طرح کی کتاب پر ایک ہی طرح کا تبصرہ کرتا ہے تو یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ یا تو اس کی اپنی کوئی رائے نہیں ہے یا پھر اس نے وہ کتابیں پڑھی نہیں ہیں بلکہ محض فارمولے کا استعمال کر کے شعبدہ کاری کی داد دے رہا ہے۔

بنیادی بات یہ ہے کہ ہر رسالے کا اپنا مزاج ہوتا ہے (یا ہونا چاہیئے) اور کتابوں پر تبصرے رسالے کے مزاج اور کردار کے زیر اثر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر معارف میں افتخار جالب کے مجموعۂ کلام پر تحسینی تبصرہ نہیں ہو سکتا، اور نہ ہونا چاہیئے۔ برہان میں عشقیہ گیتوں کے مجموعے پر تبصرہ اگر ہو گا تو محض مختصراً تذکرۃً ہو گا یا نکتہ چینی سے مملو ہو گا۔ شاعر میں کسی ایسی کتاب پر توصیفی تبصرہ نہیں ہو سکتا جو اردو زبان یا سیماب اکبرآبادی کی مخالفت کرتی ہو، وغیرہ۔ ان تبصروں میں اس بات کا لحاظ نہ رکھا جائے گا۔ (اور نہ رکھا جانا چاہیئے) کہ یہ کتابیں اصلاً کتنی اچھی، کتنی مدلل، خوب صورت یا پرزور ہیں۔ لہٰذا اس حد تک تو تبصرہ جانب داری کا اعلان ہوتا ہی ہے۔

دوسری طرف ہر مبصر کا بھی نقطۂ نظر ہوتا ہے۔ فرض کیجئے اردو مخالف کتاب جو شاعر میں تبصرے کے لئے آئی اسے ایک ایسے شخص کے پاس بھیجا گیا جو اردو مخالفوں کے بارے میں جذباتی رد یہ نہیں رکھتا، بلکہ عقلی اور استدلالی سطح پر ان سے اختلاف رائے رکھتا ہے۔ ایسے شخص کا تبصرہ اس شخص کے تبصرے سے مختلف ہو گا جو اردو کے مخالفوں کے بارے میں جذباتی رد یہ رکھتا ہے۔ اول الذکر مبصر کتاب کی علمی اور استدلالی خامیوں کا تذکرہ کرے گا۔ موخر الذکر مبصر، ممکن ہے، مصنف کتاب کو ملک دشمن، فاشسٹ، مجرم اور بے ایمان کہہ دے۔ دونوں تبصروں میں اصول تو ایک ہے لیکن رد یہ اور نقطۂ نظر کے اختلاف نے تبصروں میں زمین آسمان کا فرق کر دیا۔ ممکن ہے اردو مخالف مصنف نے اپنی رائے کا اظہار علمی اور سائنسی ایمانداری کے ساتھ کیا ہو اور اس میں تنگ نظری، بے ایمانی اور شر انگیزی کا شائبہ تک نہ ہو۔ لیکن جذباتی نقطۂ نظر والے مبصر نے جو نتیجہ اخذ کیا وہ عقلی نقطۂ نظر والے مبصر سے مختلف تھا۔ اور اس نے مصنف کی نیت کو بھی معرض بحث میں لے کر اسے بدنیتی سے متہم کیا۔

یہ صورت حال تخلیقی ادب کی کتابوں پر تبصروں میں اور زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ افتخار جالب کی ہی مثال پھر لیجئے۔ افتخار جالب ایک جدید لیکن انتہا پسند شاعر اور نقاد ہیں۔ بہت سے پرچے ایسے ہیں جو جدیدیت کے مخالف نہیں ہیں لیکن انتہا پسندی کے اس اظہار سے خوف کھاتے ہیں جو افتخار جالب کے یہاں نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں افتخار جالب پر تبصرہ کسی اور نہج سے ہو گا۔ وہ ان کے نکالے ہوئے نتائج سے اتفاق تو کریں گے لیکن احتیاط کے ساتھ۔ وہ انہیں جدید تو مانیں گے لیکن گمراہ، یا کم سے کم گمراہی کی طرف مائل۔ قدامت پسند رسالے میں مبصر افتخار جالب کو مہمل گو بتائے گا، لیکن وہ افتخار جالب کے

حوالے سے ساری جدید شاعری کو مطعون و مسترد کرے گا۔ ترقی پسند رسالہ افکار جالب کے وجود سے ہی شاید انکار کر دے۔ لیکن کسی بھی مبصر پر آپ بے جا جانبداری یا تعصب کا الزام نہیں رکھ سکتے۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی روشنی میں کتاب کو پرکھا ہے اور اپنے اپنے نظریات کے حوالے سے صحیح رائے دی ہے۔ جو لوگ ان مبصروں کو ایمان داری سے عاری کہیں گے وہ خود ایمانداری سے عاری ٹھہریں گے کیوں کہ وہ اپنی ایمانداری دوسروں پر مسلط کرنا چاہتے ہیں، یہ رویہ بے ایمانی کی پہلی منزل ہے۔

تو پھر تبصرے میں جانب داری اور تعصب کیا شے ہے؟ جب ہر سنجیدہ رسالے کی ایک پالیسی ہوتی ہے اور ہر سنجیدہ مبصر کا ایک نقطۂ نظر اور دونوں کے رنگوں کا انعکاس تبصرے میں لازم، مستحسن اور متوقع ہے، تو پھر غیر جانب داری سے کیا مراد ہے؟

اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لئے ہمیں اپنے پہلے تجزیے کی طرف واپس جانا ہوگا۔ جہاں میں نے اس ذہنیت کی طرف اشارہ کیا تھا کہ بعض سنجیدہ لوگ بھی تبصرے کو اشتہار سے زیادہ نہیں سمجھتے۔ علمی غیر جانب داری تو مبصر کے لئے سمِ قاتل اور تبصرے کے لئے موت ہے۔ کیوں کہ پھر تو تبصرہ یا تو بالکل بے رنگ ہوگا یا بالکل یک طرفہ بیان سے زیادہ نہ ہوگا۔ لیکن انفرادی غیر جانب داری مبصر کے لئے یقیناً از حد ضروری اور اس کے فن کا پہلا تقاضا ہے۔ انفرادی غیر جانب داری سے میری مراد یہ ہے کہ تبصرہ لکھتے یا لکھواتے وقت مبصر اور مدیر اس کو نظر انداز کر دیں کہ مصنف سے ان کے تعلقات کیسے ہیں؟ مصنف کی ادبی شہرت اور حیثیت کیا ہے؟ ورنہ وہ غیر جانب داری تو کچھ نہ ہوئی جو چھوٹے موٹے ادیبوں یا اجنبی مصنفوں کی کتابوں کے ساتھ تو پورا پورا تجزیہ و تحسین و تنقیص روا رکھتی ہے لیکن بڑے ادیب کی کتاب یا اپنے کسی دوست شناسا کی تحریر دیکھ کر اس کے منہ میں آبلے پڑ جاتے ہیں اور وہ بولنے سے قاصر ہو جاتی ہے۔ تبصرہ نگاری آبگینوں کو ٹھیس سے محفوظ رکھنے کا نام نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ صاحب ایسی باتیں نہ لکھیئے جن سے مصنف یا پبلشر کو تکلیف پہنچے۔ مصنف اور پبلشر سے میری درخواست یہ ہے کہ جب اوکھلی میں سر دیا ہے تو موسل سے ڈرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ اگر آپ کی کتاب میں مبصر کو عیوب یا نقائص یا خامیاں نظر آئیں تو وہ لامحالہ ان کا تذکرہ کرے گا، اس پر بلبلانے کی کیا بات ہے؟ لیکن آج کل مصنف اور پبلشر بھی اسکول کے بچوں کی طرح ہو گئے ہیں جو تبصرہ خراب ہونے پر ممتحن اور اسکول کے دوسرے ارباب حل و عقد کو گالیاں سناتے ہیں بلکہ پیٹنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ظاہر ہے کہ یہ رویہ غیر ادبی، غیر فن کارانہ اور عمومی ایمان داری کے خلاف ہے۔ اس خصوصی اور مشکل ایمان داری کا تو ذکر ہی کیا جسے ہم فن کارانہ ایمان داری کہتے ہیں۔

لیکن تصویر کا دوسرا رخ بھی ہے۔ کسی ادیب پر تبصرہ صرف اس وجہ سے سخت لکھنا کہ ہمارے اس کے تعلقات اچھے نہیں ہیں، یا اس نے ہماری کتاب پر سخت تبصرہ لکھا تھا، یہ بھی مبصر کی انفرادی ایمان داری کے منافی ہے۔ اور یہ رویہ بھی اتنا ہی غیر ادبی ہے جتنا وہ رویہ جو خیال خاطر احباب پر آزادیٔ رائے کو قربان کر دیتا ہے۔ مبصر اگر تبصرہ موافقانہ لکھتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ مصنف کا دوست ہے، اور اگر مخالفانہ لکھتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ مصنف اس کا دشمن ہے۔ یہ تصور اگر ہمارے درمیان میں عام ہو جائے تو غیر ذمہ دارانہ تبصرے جن میں فن کارانہ ایمان داری کا فقدان ہے۔ خود بخود کم ہو جائیں گے۔ اس وقت تو قاری کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ تبصرہ اگر اچھا ہے تو دوست نے لکھا ہے اور اگر خراب ہے تو دشمن نے۔ جب مبصر کو یہ بات معلوم ہے تو پھر وہ بھی اس رسم کی پابندی کرتا ہے۔ مجھ سے اکثر یہ پوچھا گیا ہے کہ آپ نے فلاں بڑے ادیب پر سخت تبصرہ کیا تھا، کیا آپ میں اور ان میں کوئی اختلاف رائے ہے؟ اس کا الٹا بھی ہوا ہے کہ اگر کسی کتاب کی تعریف میں نے کی ہے تو لوگوں نے فرض کر لیا ہے کہ مصنف خود ان حضرت کا دوست ہوگا۔ کئی سال کی مسلسل محنت کے بعد یہ فضا ایک حد تک بدلی ہے لیکن وہ بھی صرف چند مبصروں کے حق میں۔ عام طور پر مصنف خود تبصرہ لکھ کر کسی دوسرے کے نام سے چھپوا دیتا ہے، لہٰذا تبصرہ نگاری میں جانب داری کی مسموم جڑ پوری طرح اکھڑی نہیں ہے۔ اس کو اکھاڑنے میں قاری اور پھر مصنف سب سے زیادہ کام کر سکتے ہیں، کیونکہ جس دن یہ محسوس ہونے لگا کہ نہ قاری اور نہ مصنف جھوٹے تبصروں کو قبول کرنے پر راضی ہے، اسی دن سے ان مبصروں کی ضرورت ختم ہو جائے گی جو مصنف یا مدیر یا پبلشر کی رضا کو مقدم جانتے ہوئے قاری کو جہل اور اندھی تعریف کا کالا صابن تبصرے کے گلاس میں پیش کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔

میں نے تبصرہ نگاری کے اخلاقی پہلو کو اس وقت خاص اہمیت دی ہے کیوں کہ حالات حاضرہ کا تقاضا یہی ہے ورنہ بہتر فضا اور صورت حال میں سب سے اہم سوال یہ ہوتا کہ تبصرے اور تنقیدی مضمون میں کیا فرق ہے؟

اس سوال کا جواب طوالت اور اختصار، محدود یا غیر محدود دائرہ کار وغیرہ کے حوالے سے نہیں دیا جا سکتا۔ کیوں کہ ممکن ہے کہ تبصرہ بیس صفحے کا ہو کر بھی تبصرہ ہی رہے اور تنقیدی مضمون دو ہی صفحے کا ہو لیکن تنقید کہلائے۔

یہاں میں میکالے اور اس کی قبیل کے دوسرے تبصرہ نگاروں کا ذکر نہیں کر رہا ہوں جو کتاب کا نام، مصنف کا نام اور دیگر تفصیلات اوپر لکھ کر اپنے طور سے ایک پورا مضمون لکھ ڈالتے تھے، دراصل تبصرے اور تنقیدی مضمون کی روح میں فرق ہے۔ اس بات سے قطع نظر کر تبصرے کی ایک مخصوص ہیئت ہوتی ہے، یعنی یہ کہ تبصرہ جس کتاب پر کیا جاتا ہے اس کا نام، مصنف کا نام، پبلشر، سائز، قیمت صفحات، گیٹ اپ وغیرہ تمام تفصیلات اس میں درج ہوتی ہیں، بنیادی بات یہ ہے کہ تبصرہ نگار کا رویہ نقاد کے رویے سے مختلف ہوتا ہے۔ سب سے پہلا فرق تو یہ ہے کہ تبصرہ نگار کا مخاطب بہت فوری اور سامنے کا قاری ہوتا ہے۔ تبصرہ اس لئے نہیں لکھا جاتا کہ اسے دس سال بعد کا قاری پڑھے گا، تبصرہ اس لئے لکھا جاتا ہے کہ جو قاری اس وقت موجود ہے اسے کتاب سے متعارف کیا جائے۔ تنقیدی مضمون کا مخاطب آج کا بھی قاری ہوتا ہے اور کل کا بھی۔ لہٰذا اس میں ایسے فیصلے اور رائیں دینے سے احتراز کیا جاتا ہے جن کی درستگی Validity آئندہ زمانے میں مشکوک ہو سکے یا ہو جائے۔ مثلاً ضربِ کلیم پر تنقید لکھنے والا یہ تو کہہ سکتا ہے کہ یہ کتاب ناکام ہے، لیکن یہ نہیں کہہ سکتا کہ اقبال کی شاعری ناکام ہو گئی ہے یا ختم ہو چکی ہے۔ اس کے برخلاف مبصر ضربِ کلیم کو ناکام کتاب کہہ کر یہ کہہ سکتا ہے کہ اقبال کی شاعری میں دم نہیں رہا[1]۔ تبصرہ ایک لمحاتی اور فوری چیز ہوتی ہے۔ تنقید ایک مستقل اور پائدار تحریر ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تبصرہ دس سال بعد نہیں پڑھا جا سکتا۔ یقیناً پڑھا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کا اولین مقصد یہ ہوتا ہے کہ اسے فوراً پڑھا جائے۔ اس کے پڑھنے والے وہ لوگ ہوں جو مصنف کے اپنے عہد میں رہتے ہیں، جو مصنف کو عصری ماحول کے تناظر میں دیکھ سکتے ہوں۔ اچھے تبصرے بہت دیر تک زندہ رہتے ہیں اور رہے ہیں، لیکن یہ اتفاقی امر ہے۔

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ تبصرہ نگار اپنے موضوع کے ساتھ ایک انتہائی ذاتی اور تاثراتی رشتہ رکھتا ہے۔ کتاب پڑھتے وقت اسے اس بات سے زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی کہ مصنف کے ذاتی حالات کیا ہیں، وہ کیا محرکات ہیں جنھوں نے اس کتاب کو جنم دیا ہے۔ اس کا تعلق کتاب کے Gestatt سے زیادہ ہوتا ہے، پس منظری تفصیلات سے کم۔ مثلاً کسی نظم کو پڑھ کر وہ اس کے ذریعے پیدا ہونے والے فوری تاثر کو تبصرہ میں بیان کرتا ہے، لیکن نقاد صرف اسی پر بس نہیں کرتا۔ وہ نظم یا مجموعۂ کلام کو پڑھ کر اس کا رشتہ مصنف کی دوسری کتابوں اس کے ہم عصروں، اس کے ماضی و حال سے بھی قائم کر سکتا ہے۔ تنقید محرکات و عوامل، اصل الاصول اور تخلیق کی گہرائیوں سے بھی بحث کر سکتی اور کرتی ہے۔ تبصرہ خود صرف تخلیق زیرِ بحث کے زیرِ اثر پیدا ہونے والے ذاتی ردِعمل تک محدود رکھتا ہے۔ تنقید نگار کی بہت سی شخصیات بیک وقت کارفرما ہو سکتی ہیں، مورخ، لغت دان، عروضی، فلسفیانہ تجزیہ کار، وغیرہ۔ یا اگر یہ سب نہ بھی ہو تو اس کا کم سے کم ایک مخصوص نقطۂ نظر ہوتا ہے جسے ایک فکری نظام و استدلال کی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف تبصرہ استدلال اور Argument کے ذریعہ کوئی نظریہ نہیں خلق کرتا بلکہ کسی بنے بنائے نظریہ یا نقطۂ نظر کی روشنی میں کسی مخصوص کتاب کا جائزہ لیتا ہے۔

[1] ان جملوں کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں ضربِ کلیم کو ناکام کتاب سمجھتا ہوں یہ نام محض مثالاً اٹھایا گیا ہے۔ عہدِ حاضر کا کوئی نام لیا جاتا تو اس میں غلط فہمی کے امکانات زیادہ تھے۔

انا کا پرندہ

سمٹتے ہوئے سایوں کے فرش پر
دیر سے یونہی بیٹھا ہوا ہوں
کہ گزرے کوئی قافلہ جادۂ روز و شب سے
تو پوچھوں کہ درماندگی کی سزا کیا ہے؟ مجھ کو بتاؤ!
مگر ڈر رہا ہوں کہ کوئی مسافر
مری بات پر مسکرایا تو میں کس طرح جی سکوں گا؟
مری زندگی ایک سرکش انا ہے
پرندے کی صورت عناصر کے زرکار پنجرے کی زینت
مری رُوح بھی (جادوگر کی طرح)
اسی انا، اس پرندے کے قالب میں خلوت نشیں ہے

کسی کو (وہ دشمن ہو یا دوست)
میں پنجرے کی تیلیوں تک پہونچنے دوں
یہ کس طرح ہو سکے گا؟
کسے یہ خبر ہے کہ میں خود کو بھی
اپنا دشمن سمجھنے لگا ہوں

حرمت الاکرام

ایک روشؔ

علی جواد زیدی

عروج و زوال کی بات کرتے ہوئے شاعر نے کہا تھا کہ ع
کسی کی ایک طرح پر بسر ہوئی نہ انیسؔ

لیکن روشؔ صدیقی کی زندگی ایک ہی طرح پر بسر ہو گئی۔ شروع سے آخر تک ان کی ایک ہی روش رہی۔ متبسم نگاہیں، مسکراتے ہوئے ہونٹ، بوٹا سا قد، چھریرا جسم، بیچ کی مانگ سے دو حصوں میں بٹے ہوئے بال، پُر اطمینان چہرہ، لیکن جسمانی اور ذہنی اعتبار سے ہر وقت متحرک، ایک نیم اضطرابی اور سیمابی کیفیت کا مرقع! میں نے انہیں ہمیشہ اسی حال میں دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان پر سرد و گرم زمانہ کا اثر ہی نہیں ہوتا۔ ظاہری طور سے ان کے عروج و زوال کا پتہ لگانا ناممکن تھا۔ وہی شیروانی علی گڑھ کاٹ کا پاجامہ اور کشتی نما ٹوپی، اس لباس میں کبھی تبدیلی نہیں آئی۔ آزادی کے پہلے دوسرے سے ہیر رنگ کھدر پہنتے تھے، آزادی کے کچھ دنوں بعد خود کو اس قید سے آزاد کر لیا۔ ہاتھ میں چمڑے کا ایک بیگ بھی ہمیشہ رہا۔ ان علامات ظاہری

میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ صرف ٹوپی پہننے کے معاملے میں زیادہ شدت پسند نہیں تھے۔ اکثر شعر سناتے وقت ٹوپی اتار دیا کرتے تھے اور کبھی کبھی ایک خاص قلندرانہ ادا سے ہاتھ میں ٹوپی لئے ہوئے شعر سناتے تھے۔ اس سر برہنگی کے عالم میں پتہ چلتا کہ چالیس پینتالیس کے سن تک بالکل کالے رہنے والے بال ساٹھ کی عمر تک آتے آتے کچھ کچھ رنگ بدلنے لگے ہیں۔ یہ بھی بڑی احتیاط سے، بڑی آہستگی سے ہو رہا تھا۔ عمر بہت دبے پاؤں آگے بڑھ رہی تھی۔ شعر پڑھنے کا انداز بڑا پر جوش اور والہانہ تھا۔ مجھے یاد ہے کہ انقلابی نظمیں سناتے وقت وہ مٹھی باندھ کے داہنا ہاتھ باغیانہ انداز سے بار بار بلند کرتے تھے۔ آخری عمر میں بغاوت پر قلندری غالب آنے لگی لیکن ہاتھ اب بھی فضا میں بار بار بلند ہوتا تھا۔ طرز خواندگی میں قدیم طرز کا ہلکا ترنم بھی ملا ہوتا تھا۔ آواز کے اتار چڑھاؤ سے وہ رومان سے انقلاب تک کے تمام مراحل طے کر لیا کرتے تھے۔ خلوص، تپاک، حفظ مراتب، آداب مجلس کا خیال یہ سب ان کی طرحداری اور وضعداری کے سنگ میل تھے۔ ایسے لوگ شاذ ہوتے جاتے ہیں۔

بہت کم لوگوں کو روشؔ کے پورے نام یا ان کی صحیح عمر کا علم ہوگا۔ انہیں سب ان کے تخلص ہی سے جانتے پہچانتے تھے۔ نام جاننے کی شاید ہی کسی نے کوشش کی ہو۔ کچھ کم باسٹھ برس کی عمر پائی لیکن کاٹھی ایسی مضبوط تھی کہ دیکھنے والا چالیس پینتالیس برس کا اندازہ کرتا۔ "نگار" لکھنؤ نے جنوری، فروری ۱۹۴۱ء کا شمارہ غزل نگاروں کے تذکرے اور انتخاب اشعار کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ اس کے لئے چند شاعروں نے اپنے حالات خود لکھے تھے۔ روشؔ کے خود نوشت حالات صفحہ ۱۲۸ پر درج ہیں۔ اس کے اعتبار سے تاریخ ولادت ۸ جولائی ۱۹۱۱ء ہے۔ لیکن خود روشؔ نے مالک رام سے بیان کیا تھا کہ ان کی عمر سے دو برس کاتب نے چرا لئے تھے۔ انہوں نے ۱۹۰۹ء لکھ کر بھیجا، کاتب نے نہ جانے کس طرح ۱۹۱۱ء کر دیا اور اب یہی غلط تاریخ سند ہو گئی۔ لیکن صحیح تاریخ ۸ جولائی ۱۹۰۹ء ہے۔

ان کا نام شاہد عزیز تھا۔ ان کے والد مولوی طفیل احمد شاہد کو غنیمت کنجاہی کی مثنوی "نیرنگ عشق" بے حد پسند تھی۔ اس کے پہلے شعر سے انہوں نے خود اپنا تخلص اور اپنے بیٹے کا نام اخذ کیا۔ شعر یہ ہے:

بنام شاہد نازک خیالاں
عزیز خاطر آشفتہ حالاں

روشؔ تخلص کے بارے میں بھی ایک روایت سنی۔ روشؔ کا وطن جوالاپور (ضلع سہارنپور، یو۔پی) اپنے ساز قدرت اور مشہور روشؔ کا گھر ...

کے لیے معروف ہے۔ ابتدائی زندگی ہی میں روش کو اس دانش گاہ سے قریبی ربط رہا ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے ہندی میں بڑی مہارت پیدا کرلی تھی اور سنسکرت سے بھی لگاؤ تھا۔ گوروکل کی علمی فضا پر گھر کے ادبی ماحول نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور روش سات برس کے سن سے شاعری کرنے لگے۔ والد فارسی کے عالم اور اچھے شاعر تھے۔ روش نے شروع میں انہیں سے مشورۂ سخن کیا۔ لیکن تخلص گوروکل کی دین ہے۔ ابھی روش تخلص و اصلاح سے بے نیاز طفلانہ شاعری ہی میں مصروف تھے کہ گوروکل والوں کو ان کے ذوق شعری کا پتہ لگ گیا اور انہوں نے ان کے لئے ایک تخلص "رویش" جو سنسکرت میں روی (سورج) اور ایش (خدا) کا مرکب ہے تجویز کیا۔ "رویش" اردو میں چل نہیں سکتا تھا اس لئے غالباً والد کی ہدایت پر یہ روش ہوگیا۔

اگرچہ ابتدا میں روش نے اپنے والد سے اصلاح لی لیکن سچ یہ ہے کہ وہ تلمیذ رحمان تھے کیونکہ انہوں نے شاعری میں اپنی ڈگر خود بنائی۔ وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے اور ان کا ذہنی سلسلۂ تلمذ چکبست و سرور و اقبال کی قومی شاعری سے جا ملتا ہے۔ بلکہ انہوں نے اس میں جوش و احسان کی طرح انقلاب کی گرمی بھی حل کردی۔ جب انہوں نے ۱۹۱۷ء میں غزل کی شاعری شروع کی تو وہ کچھ اس طرح کے شعر کہتے تھے،

یہ میرے ضبط محبت کی تھی عجب تاثیر
کہ ان کو ضبط محبت کا حوصلہ نہ رہا
ہے روز میرے گریباں سے گفتگوے رفو
بہار کے لئے کیا کوئی مشغلہ نہ رہا

۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۴ء تک روش برابر غزلیں کہتے رہے۔ ۱۹۲۴ء سے وہ نظموں کی جانب متوجہ ہوئے اور ان کی سب سے پہلی نظم 'انتظار' رسالہ 'ہمایوں' لاہور میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد ان کی نظمیں ملک کے مقتدر رسالوں میں چھپتی رہیں اور اتنی مقبول ہوئیں کہ ۱۹۳۴ء، ۱۹۳۵ء تک آتے آتے مشاعروں میں ان سے نظمیں ہی پڑھنے کی فرمائش ہونے لگی۔ وہ خود بھی بیشتر نظمیں سناتے۔ غزلیں عموماً طرحی مشاعروں، آغاز خواندگی یا مختصر نشستوں کے لئے مخصوص تھیں۔ ۱۹۳۵ء کے بعد کا زمانہ نظموں کے عروج کا زمانہ ہے۔ ۱۹۴۰ء تک نوبت یہ پہنچ گئی تھی کہ لکھنؤ جیسے شہر کے غزل گو، تقدم و تاخر کا خیال ترک کرکے، مشاعروں میں غزل کا دور پہلے کرا لینے کی فرمائش کرنے لگے تھے۔ حصول آزادی کے بعد حالات نے ایک اور پلٹا کھایا اور غزل پھر بزم مشاعرہ میں صدر نشین ہوگئی۔ روش اس دور میں بیشتر غزلیں لکھنے اور پڑھنے لگے۔ یہ ان کی غزل نگاری کا کامیاب ترین دور تھا۔ اس زمانے میں انہوں نے کئی غزلیں آہنگ و طرح غالب میں لکھیں اور یہ تجربہ کامیاب ثابت ہوا۔

میں یہ بات بار بار دہراتا رہا ہوں کہ ہمعصر رائیں اکثر جلد بازی کی رائیں ہوتی ہیں۔ ۱۹۴۲ء کے آغاز میں کلیم الدین احمد اور آل احمد سرور کے رتبے کے ناقدوں نے روش کو خالصتہً نظم کا شاعر قرار دیا تھا اور ان کی غزل گوئی کو نسبتاً کم مایہ ٹھہرایا تھا۔ آج ان کی نظموں کا کوئی مجموعہ ہمارے سامنے موجود نہیں ہے اور لوگ انہیں صرف "محراب غزل" کی وساطت سے جانتے ہیں!

اکثر شاعر کچھ ایسے جہاں گرد ہوتے ہیں کہ انہیں کسی ایک شہر سے وابستہ کرنا مشکل ہے۔ روش بھی مختلف شہروں سے متعلق رہے ہیں لیکن جوالاپور میں زیادہ قیام رہا اور وہی ان کا وطن ہے۔ یہاں شروع شروع میں روش بانسوں کا کاروبار کرتے تھے۔ آزادی کے پہلے انہوں نے ایک دار الاشاعت بھی قائم کیا تھا۔ اور کوئی رسالہ بھی نکالا تھا۔ لیکن یہ دونوں زیادہ دنوں نہ چل سکے۔ کچھ دنوں لاہور میں علامہ تاجور کے بھی شریک کار رہے لیکن ان سے نہ نبھی اور وہاں سے بھی چلے آئے۔ آزادی کے فوراً بعد جو اندوہناک ہنگامے ہوئے، ان کی زد میں بانسوں کا کاروبار بھی آگیا اور اس میں شک نہیں کہ کئی برس انہوں نے خاصی تکلیف لیکن بڑے صبر و استغنا سے گزارے۔

روش کی شادی کافی کم عمری میں ہوگئی تھی لیکن بہت جلد شریک حیات نے داغ مفارقت دیا۔ روش ان سے بے حد مانوس تھے۔ اس ناوقت موت کا اتنا شدید صدمہ ہوا کہ پھر مدتوں تاہل زندگی سے کنارہ کش رہے۔ جب سن چالیس سے متجاوز ہوگیا تو زندگی کا یہ خلا ناقابل برداشت نظر آنے لگا۔ احباب و اقارب نے بھی اصرار کیا تو انہوں نے اسی شرط پر رضامندی ظاہر کی کسی بیوہ سے عقد کریں گے۔ اس سلسلے میں مجاز کا ایک لطیفہ مشہور ہے۔ ایک مجلس میں لوگوں نے روش سے شادی کا ذکر چھیڑا تو کہنے لگے کہ کسی بیوہ سے عقد کرنا چاہتا ہوں۔ مجاز نے کہا کہ آپ اس کی فکر نہ کریں۔ آپ سے شادی کرنے کے بعد بیوی تو بیوہ ہو ہی جائے گی۔ بہرحال روش کی یہ شرط پوری نہ ہو سکی اور بالآخر سینتالیس اڑتالیس برس کے سن میں انہوں نے مراد آباد کے مولوی مظہر جلیل کی صاحبزادی سعیدہ سے شادی کر لی۔ اس سے دو لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔ بڑا لڑکا بہت ذہین ہے۔ اس کو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سال کے بہترین طالب علم ہونے کا انعام ملا۔ اب علی گڑھ میں ایم ایس سی کا طالب [illegible] شادی کے بعد روش کا قیام کچھ دنوں مراد آباد میں بھی رہا لیکن آبائی کاروبار سے محروم ہو کر انہیں اب فکر معاش ہوئی۔ مولانا آزاد جیسے گوشہ نشین کو [illegible]

خبر ہوئی تو انہوں نے وزیر اطلاعات ڈاکٹر کیسکر سے تحریک کی ۱۹۵۹ء ان کا تقرر آل انڈیا ریڈیو میں ڈپٹی چیف پروڈیوسر اردو سیکشن دہلی کی حیثیت سے ہو گیا۔

مولانا آزاد، روشؔ کی ناقابلِ تسخیر قوم پروری سے بہت متاثر تھے۔ مسلم لیگ کے ہنگامہ پرور دور میں اور بعد آزادی کے ہنگاموں میں کبھی بھی روشؔ کے پائے استقلال کو لغزش نہ ہوئی۔ پاکستان سے کئی بار ان کو ملازمت وغیرہ کی پیشکش ہوئی لیکن جو کچھ دنیا کے برعکس، روشؔ نے اپنے وطن کی خدمت کو فرضِ اولین جانا اور یہیں کی خاکِ پاک سے پیوند ہونے کو باعثِ سعادت سمجھا۔ ان کی قومیت "وفاداری بشرطِ استواری" کے معیار پر پوری اترتی تھی اور درحقیقت اصلِ ایمان تھی۔

۱۹۵۹ء میں جب دلی آئے تو شروع شروع میں کاکا کالیلکر کے یہاں مقیم ہوئے۔ یہاں ریحانہ بہن سے ملاقات ہوئی اور وہ ان پر بے حد شفقت کرنے لگیں۔ ریحانہ بہن خود عالم اور علم دوست ہونے کے علاوہ روحانیت سے خاص لگاؤ رکھتی ہیں اور دلی میں بہت سے معززین ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہیں۔ انہوں نے روشؔ کو اپنا بیٹا بنا لیا اور کہنے لگیں کہ میں اگلے جنم میں ان کی ماں تھیں۔ جب روشؔ کو سرکاری مکان مل گیا تو یہ پنڈارہ روڈ منتقل ہو گئے اور ملازمت سرکاری کے خاتمے کے بعد تک وہیں مقیم رہے۔ آخر میں وہ میرٹھ جا بسے۔

میرٹھ میں مستقل قیام رہا، اس کے علاوہ لکھنؤ میں بھوپال ہاؤس میں اور الٰہ آباد مسلم بورڈنگ ہاؤس میں بھی روشؔ ہفتوں قیام کیا کرتے تھے۔ ان دونوں شہروں کی ادبی فضا نے ان کو اور انہوں نے وہاں کی محفلوں کو بہت کچھ دیا۔ سلسلۂ فرنگی محل سے بھی ارادت رکھتے تھے۔ ان کے والد سلسلۂ قادریہ رزّاقیہ میں شمس العلما مولانا عبدالحمید مرحوم فرنگی محلی کے مرید تھے اور یہ خود بھی اسی سلسلے سے منسلک رہے۔ غرض

مصرع: چمن میں ہر طرف بکھری پڑی ہے داستاں میری

روشؔ کی رسمی تعلیم زیادہ نہ تھی لیکن گھر کے علمی ماحول اور ذاتی مطالعے سے روشؔ نے یہ کمی بڑی حد تک پوری کر لی۔ بالخصوص ادب و تصوف پر ان کی نظر گہری تھی۔ اور وہ تصوف کے رموز و غوامض سے خاص طور پر واقف تھے۔ معلومات ہی کی حد تک ہی نہیں بلکہ کیفیت کے اعتبار سے بھی وہ صوفی مشرب تھے۔ ان کے قریبی دوست پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی کا بیان قابلِ نقل ہے کہ "ان کی زندگی اور معمولات پر تصوف اور اس کی جاندار و اعلیٰ قدروں کا بہت گہرا اثر تھا۔ ان کی کتابوں کے بیش قیمت ذخیرے میں تصوف اور صوفیائے کرام سے متعلق بڑی نادر کتابیں ہیں۔ ان میں سے بعض کتابوں کو تو انہوں نے بار بار پڑھا تھا اور ان کا جب ذکر کرتے تو بڑے گہرے احساس سے کرتے تھے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کی روحانی کیفیت کچھ اور ہی ہے۔"

روشؔ نے گھر پر اردو اور فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی، پھر گورو کل سے ہندی اور ابتدائی سنسکرت کا علم حاصل کیا۔ کام چلانے بھر کو انگریزی سے بھی واقفیت حاصل کر لی لیکن سچے ادیب اور شاعر کی طرح وہ زندگی بھر طالب علم رہے۔ فارسی کا بڑا ستھرا ذوق رکھتے تھے اور شعرِ فارسی کی نوک پلک سے واقف تھے۔ فارسی کا ذوقِ شعری اور غزلِ فارسی کا احساسِ جمال ان کے کلام میں پوری آب و تاب و متانت و فن کاری سے جھلکتا ہے۔

روشؔ سے میری پہلی ملاقات ۱۹۳۵ء میں ہوئی جب وہ ایک مشاعرے کے سلسلے میں لکھنؤ آئے ہوئے تھے۔ اس کے بعد لکھنؤ اور لکھنؤ کے باہر مشاعروں میں اکثر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ جب سے میں نے مشاعروں میں شریک ہونا تقریباً ترک کر دیا یہ ملاقاتیں کم ہو گئیں۔ لیکن جب آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہوئے تو میرا دفتر بھی قریب ہی تھا۔ اس لئے ان سے برابر بر سرِ راہے گاہے ملاقات ہو جایا کرتی تھی کبھی کبھی مخصوص نشستوں میں بھی ساتھ رہا۔ یہ سلسلہ اس وقت بھی جاری رہا جب وہ ریڈیو کی ملازمت ترک کر کے میرٹھ جا بسے تھے۔ مشاعروں کے سلسلے میں یا کسی اور کام سے برابر دلی آتے رہتے تھے اور یا تو خود مجھے ملاقات کا شرف بخشتے یا کہیں نہ کہیں ملنے کا بہانہ مل جاتا۔ عمر بڑھتی جا رہی تھی، لیکن ان کی آن بان، طبعی شگفتگی، متصوفانہ سکونِ طبع، اور ظاہری صحت میں کوئی فرق نمایاں نہیں تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کاروانِ عمر ان سے کترا کترا کے نکل جاتا ہے۔ لیکن موت غریب الوطنی کا ماحول ڈھونڈ رہی تھی۔ ایک مشاعرے میں شرکت کی غرض سے شاہجہاں پور گئے ہوئے تھے۔ وہیں یکایک دل کا سخت دورہ پڑا اور پلک جھپکانے میں یہ شاہد بھی اور یہ یارِ عزیز ہم سے چھن گیا۔ ۲۳ جنوری ۱۹۷۱ء کی صبح کو پہلے ریڈیو سے اور پھر مشترک دوست زنجانی صاحب سے معلوم ہوا کہ گزشتہ شب میں روشؔ دائمی مفارقت کا داغ دے گئے۔ ایک دور، ایک عہد، جو لوٹ پلٹ کے آنے والا نہیں ہے، دم توڑ گیا۔ دشتِ جنوں سے سر پر خار کو تیز رکھنے کی فرمائش کیا کی جائے اب شاید ہی کوئی آبلہ پا ادھر سے گزرے۔ روشؔ کی طرح کے لوگ ایک عہد، ایک تحریک اور ایک روایت کی دین تھے اور اس قبیل کے دیکھے اور پرکھے جائیں گے۔

روشؔ میں بڑی خوبیاں تھیں۔ وہ خلوص کا مجسمہ اور وفائے بے ریا کا سراپا تھے۔ یہ کہنا شاید غلط ہو کہ وہ سب سے ایک انداز سے ملتے تھے لیکن پہلی بار جس خلوص و محبت سے ملتے تھے اسے آخر تک نباہتے تھے۔ اس خلوص میں گرمی بھی تھی اور خودداری بھی، وضعداری بھی تھی اور دینداری بھی، لیکن دنیاداری نہیں تھی۔ دل کے صاف تھے۔ جو بات ناگوار ہوتی اسے بے تکلف

اور سب کا حل کہہ دیتے تھے۔ اس سلسلے میں زنجانی صاحب نے ایک واقعہ ان کی
جوانی کا سنایا۔ ایک محفل میں اقبال کے کلام پر گفتگو ہو رہی تھی۔ یکایک روش
نے اقبال کو نازیبا الفاظ سے یاد کرتے ہوئے کہا کہ میں اس کی یہ دریدہ دہنی شان
الہی میں برداشت نہیں کر سکتا۔

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

زنجانی صاحب اقبال کے غالی مداحوں میں تھے۔ نبرد آزمائی پر آمادہ
ہو گئے۔ اگر روش کے قد کو مد نظر رکھا جائے تو نتیجہ بھی ظاہر تھا۔ اس کے بعد
دونوں میں گفتگو بھی بند ہو گئی، لیکن وضعداری یہ تھی کہ روش الہ آباد میں بدستور
زنجانی صاحب کے مہمان ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ یہ کدورت رفع ہو گئی اور
خود روش کا یہ حال ہوا کہ وہ اقبال کے پرستاروں میں شامل ہو گئے!

اسی طرح قوم پروری کے معاملے میں وہ بے حد متشدد تھے۔ انہوں نے
جنگ آزادی میں عملی حصہ تو نہیں لیا لیکن کانگریس کے جلسوں میں وہ ضرور جاتے
اور اپنی قومی نظمیں سناتے تھے۔ عالمی جنگ کے زمانے میں جب کئی شاعر
مصلحت کے بہانے بنا کر جنگی ترانے گانے اور نظمیں لکھنے لگے تھے، اس وقت بھی
وہ کنارہ کش رہے اور مسلم لیگی فرقہ واریت سے بھی وہ برسر پیکار رہے۔ یہ پیکار
فکری اور ذہنی تھی، مگر تھی غیر متزلزل۔ ان کے پائے ثبات میں اس وقت بھی لغزش
نہ ہوئی جب فرقہ واریت کی لپٹوں نے جوالا پور تک کو گھیر لیا تھا۔ ان کی قوم پروری
دکھاوے سے بہت دور تھی۔ جب آزادی ملی تو بہت سے شاعر اور ادیب وزراء
کے دروں کے چکر کاٹنے لگے لیکن روش کی خودداری، فقیری اور مستی میں فرق
نہیں آیا، جب آخر میں ریڈیو کی ملازمت پائی تو بھی مولانا آزاد خود متوجہ ہوئے۔ انہیں
دست سوال دراز کرنا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض نمائشی قوم پرستوں سے روش کی
طبیعت اکثر کرتی تھی، حکومت پرستوں کو تو وہ علی الاعلان ٹوک دیا کرتے تھے
جب حفیظ جالندھری کو زمانۂ جنگ میں برطانوی سامراج کی حمایت کے صلے میں
غالباً "خان صاحب" کا خطاب ملا تو روش نے اقبال کے شعر سے استفادہ کرتے
ہوئے لکھا،

رقاص حکومت کی معراج یہ کہتی ہے
طاؤس و رباب اوّل، اعزاز و خطاب آخر

ان کے ہم عصروں میں جوش، نرنگ، تمر، ساغر و احسان ہم عصر تھے اور یہ
تینوں اپنی قومی اور سیاسی شاعری کے لئے شہرت رکھتے تھے۔ جوش شاعر انقلاب
مشہور تھے لیکن انقلاب کا نعرہ ان تینوں نے بھی اپنایا۔ ساغر کا تصور انقلاب،
ایک محبوب کے تصور سے ہم آہنگ تھا، احسان خود کو مزدور شاعر کہتے تھے اور وہ
انقلاب کے تخریبی عناصر کو نمایاں کرتے تھے لیکن روش کے یہاں کوری جذباتیت اور
طمطراق الفاظ کم ہے۔ وہ انقلاب کی بھی بات کرتے ہیں اور بغاوت کی بھی لیکن
وہ الفاظ کے استعمال کے معاملے میں محتاط ہیں اور بے جا جوش و خروش سے
حتی المقدور بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بیداری ہند کے ساتھ وہ بیداری ایشیا
کے بھی نقیب ہیں لیکن یہ بیداری قومی اور علاقائی بیداری ہے۔ اقبال کی بیداری
مشرق کی طرح تہذیبی، فکری یا ملی بیداری نہیں ہے۔ وہ ایشیا کی بات کرتے
ہوں یا ہند کی۔ ان کا تصور انقلاب احسان دانش کے تصور انقلاب کی طرح بنیادی
طور پر صرف خون و تباہی نہیں ہے۔ تصور انقلاب کے لئے اس دور میں کچھ تخریب
اور جبری تبدیلی تو لازمی ہے اور روش بھی ایسی تعمیری تخریب کی طرف اشارے
کرتے ہیں۔ لیکن اساسی طور پر وہ ایک بہتر مستقبل کی تعمیر کے پیامی ہیں۔ وہ خواب
خرگوش سے نیزے چبھو کر یا ٹھوکریں مار کر بیدار نہیں کرتے بلکہ پیار سے جگاتے ہیں
اور کبھی کبھی چلا بھی لیتے ہیں۔

ہم نے اپنی نوجوانی سے روش کی نظمیں سنی ہیں اور ان کی نظموں پر ہم جھومے
ہیں۔ وہ اس دور کے نوجوانی کے لہجے میں ضرور بولتے تھے لیکن ان کا آہنگ
بزرگوں کو بھی گوارا تھا۔ بعض اوقات تو وہ دونوں ہی کے جذبات کے ترجمان
نظر آتے تھے۔ یہ غالباً فارسی ادب میں رچے بسے ہونے کی وجہ سے ممکن ہو سکا۔ انہوں
نے قومی نظموں کے علاوہ کچھ رومانی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ رومانی نظموں سے مراد وہ
نظمیں ہیں جو حسن و عشق کے محور پر رقص کرتی تھیں ورنہ ان کی قومی نظمیں بھی رومانی
تصورات سے آزاد نہیں تھیں۔ ان رومانی نظموں پر ٹیگور کا اثر (مثلاً "نہ جا")
صاف جھلکتا ہے۔ یہ نظمیں اپنے زمانے میں خاصی مشہور بھی ہوئیں لیکن ان کی رومانی
نظموں کو وہ رتبہ نہ مل پایا جو اختر شیرانی کے حصے میں آیا۔ قومی نظمیں یقیناً ہمارے
قوم پرورانہ ادب کا حسین ورثہ ہیں۔ ان میں عصری مسائل و کوائف کا ذکر آیا ہے۔
روش نے ان میں آفاقی عناصر ڈھونڈھنے کے لئے شاعرانہ انتخاب اور خوش
مذاقی سے کام لیا ہے، اس لئے یہ کافی مدت تک تازہ رہیں گی اور دوسری جذباتی
تخلیقات کی طرح کسی خاص عہد کی فضا میں چمک کر بجھ نہ جائیں گی۔ یہاں ان کی
نظموں پر تفصیل سے بحث کرنا مقصود نہیں ہے۔ بدقسمتی سے ان کی نظمیں یکجا
ملتی بھی نہیں ہیں۔ ذہن میں فوری طور سے "بار و علی"، "بیداری مشرق" اور "مہاتما
گاندھی" وغیرہ نظمیں آتی ہیں۔

روشن نظموں میں شبلی، ظفر علی خاں، چکبست و سرور جہان آبادی کے بعد کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ جوش و شیرانی سے بھی کم عمر ہیں۔ غزلوں میں بھی اُن کا شمار حسرت، اصغر، فانی و جگر و فراق کے بعد کے گروہ سے ہوتا ہے۔ اگرچہ وہ کسی خاص اُستاد کے شاگرد یا کسی طرزِ خاص سے وابستہ نہیں رہے لیکن وہ بیشتر پھولوں پر لہراتے ہیں اور بعض سے کسبِ شہد بھی کیا ہے۔ پھر بھی نظم و غزل دونوں ہی میدانوں میں اُن کی آواز جانی پہچانی جاتی ہے۔ جو خصوصیت انہیں اُن کے ہم عصروں سے ممتاز کرتی ہے وہ اُن کا رچا ہوا ذوقِ فارسی ہے ویسے تو ان کی نسل میں دو ایک مستثنیات کے علاوہ سبھی فارسی سے بخوبی واقف تھے لیکن روشن تراکیبِ فارسی کے استعمال اور تراش و تخلیق میں زیادہ کوشاں رہتے تھے۔ اُن کے یہاں زبان و بیان کا یہ فارسی انداز ارادی اور اسی لئے زیادہ نمایاں ہے۔ کہیں تو وہ "بربطِ بے نغمہ" اور "ساغرِ بے بادہ" جیسی ترکیبیں تراش لیتے ہیں اور کہیں "سرمۂ بینائش" اور "بصد ہزار انواع" جیسی ترکیبوں کو بھی غزل کے لئے روا رکھتے ہیں۔ ایسے مقامات شاذ ہی محو ہیں۔ روشن کا فن ہمہ جہاتی نہیں ہے اور فکری عنصر بھی ان کے یہاں دبا دبا سا ہے۔ لیکن گہرے متصوفانہ انداز نظر (تصوف نہیں) اور تغزل کی متوازن روش کی بدولت اُن کی غزلوں تک میں ایک فکری ماحول ضرور ملتا ہے جو جگر و ساغر سے زیادہ نمایاں ہے۔

اُن کے یہاں خمریات کے بھی تمام لوازم ملتے ہیں۔ میکدہ، مینا، جام، سبو، خمار، تشنگی اور (بفیضِ غالب) زہرا اور بزم کا ماحول بھی شمع، ہمنشیں، پروانہ وغیرہ سے تعبیر ہوتا ہے وہ تلاطم و باد و ساحل سے بھی باتیں کرتے ہیں اور منزل و سفر و جادہ کی بھی۔ بہار و چمن بھی ہے منصور و طور و موسیٰ بھی ہے لیلیٰ و سلمیٰ بھی سینکڑوں برس سے ان مضامین کے گرد رقاصۂ غزل ناچتی رہی ہے لیکن روشن اِن فرسودہ مضامین میں بھی اپنی فن کاری سے ایک تازگی پیدا کر لیتے ہیں۔ وہ بزم و انجمن سے زیادہ خلوت و تنہائی کے شاعر ہیں۔ اُن کا عشق ایک "ربطِ پنہاں" ہے۔ اُن کا "شوقِ فراواں" ہر لمحہ فزوں "بھی ہوتا ہے، اس میں "گلہ و شکایت"، "حرف و حکایت" بھی ہے اور عشرت و کیف و طرب کے ساتھ اشک و غم و درد بھی ہے لیکن اُن کی شخصیت "منزلِ احساس فراموشی" میں زیادہ ابھرتی ہے انہیں حسرتِ آغوش بھی ہے لیکن وہ بیگانہ نگاہی پر بھی جان چھڑک سکتے ہیں۔ وہ "آئینِ حجاب" کے پرستار ہیں . . . . . "آوارگی غربت" میں بھی لذت محسوس کرتے ہیں۔ اکثر "بیتاب نمودِ رقص" (ترکیب کی غرابت پہ نہ جایئے) رہتے ہیں اور تماشائے بتابیٔ دل کے مزے لیتے ہیں جب سطحِ عشق اور بلند ہوتی ہے تو زندگی "حجابِ رُخِ امکاں" بن جاتی ہے اور وہ "رسمِ اظہار" سے بیگانہ ہو کر "نالۂ خاموش" سے کام لینے لگتے ہیں۔ وہ "نظارہ" کی مسرتوں سے بھی آشنا ہیں، لیکن یہ نظارہ انھیں حیرت و حیرانی کی منزلوں کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ رازِ تصوف کے جادوں سے آگاہ ہیں لیکن اُن کا اندازِ قیام و سفر ذہنی ہے۔

(آج کل نئی دہلی)

وہ اکثر تضادات سے بھی کام لیتے ہیں۔ جیسے صبح و شام، طرب و غم، دیر و حرم، شوق و تغافل، سکوت و گفتگو، سوال و جواب، وفا و جفا، اور کبھی تسلسلِ کلام سے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن تازگی اور شگفتگی کو کہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اُن کے اشعار میں سیاسی اور سماجی رمزیت بھی پائی جاتی ہے۔ ابتدا میں روشن پر شبلی و اقبال کا اثر نظر آتا تھا لیکن بعد میں وہ ارادی طور پر "بطرزِ غالب" لکھنے لگے تھے۔ کئی غزلیں غالب کی طرحوں میں کہی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ بڑی حد تک ہم آہنگی پیدا کی ہے۔ روشن موجودہ دور کے ممتاز غزل گو تھے اور صادق لہجہ نظم گو۔ اُن کے کلام کا بہت سا حصہ غیر مطبوعہ پڑا ہے۔ ضرورت ہے کہ اُسے یکجا کر لیا جائے۔ غزلیں تو "سرابِ غزل" کی بدولت پھر بھی مل جاتی ہیں لیکن نظمیں صرف حافظوں یا اخبارات و رسائل کے صفحات میں محفوظ رہ گئی ہیں ضرورت ہے کہ انہیں فوراً یکجا کر لیا جائے۔ یہاں کوئی انتخاب منظور نہیں ہے لیکن چند اشعارِ غزل پیش ہیں۔

فریبِ آرزو کی انتہا ہے ؏ کسی افسردہ دل کا مسکرانا
گمانِ بادۂ عشرت میرے سبو پہ نہ کر ؏ ہے اس میں زہر بھی شامل مرے لہو کے سوا
حریفِ عیش نہیں ہوں مگر خوشی یہ ہے ؏ تری نگاہ سے پنہاں رہا ملال مرا
ہاں زندگی ایک پیغامِ لغزش ؏ جینا پڑے گا کب تک سنبھل کر
خدا شناس ہے زاہد، مگر نہیں معلوم ؏ کہ آدمی کو جگاتی ہے آدمی کی پکار
ہائے اب اُن بستیوں کا ذکر ہی کیا ہم نشیں ؏ جو ابھی بسنے نہ پائی تھیں کہ ویراں ہو گئیں
سکونِ دل جو ملا بھی تو آہ کیا ہو گا ؏ سکونِ دل تو مرے درد کا مآل نہیں

روشن کے یہاں زبان و بیان کی غلطیاں نہیں ملتیں لیکن مولیٰ غزل میں غزل کے بارے میں جو نظم یا غزل ہے اُن میں کچھ تسامحات نظر آتے ہیں۔ مثلاً یہ اشعار

دیکھتا کون رُخِ شاہدِ معنی کی بہار ؏ گر یہ پیراہنِ خوش زیب نہ پہنائے غزل
جو سخن ہوتا کہے اس دور میں حق گوئی کا ؏ اگر افسانۂ منصور نہ دہرائے غزل
لب کشا کیا کوئی ہوتا اگر اُس محفل میں ؏ ترجمانِ دلِ خاموش نہ بن جائے غزل
آتشِ وعظ و خطابت کا بھرم کیا کھلتا ؏ تختۂ دار پہ گر پھول نہ برسائے غزل

پہلے مصرعوں میں خط کشیدہ الفاظ کا قوافی سے ربط نہیں۔ اگر علی الترتیب یوں ہوتا تو عیب جاتا رہتا (۱) دیکھتے پھر کون (۲) پھر کسے ہوش ہو (۳) لب کشا کیسے کوئی ہو (۴) کیسے کھلتے۔ اِن معمولی لغزشوں سے جو صرف کہیں کہیں شاذ ہی ہیں روشن کی عظمتِ شاعری میں فرق نہیں آتا۔ وہ اپنے دور کے صفِ اوّل کے ممتاز شاعروں اور ہمارے ادب میں اُن کے لئے مستقل جگہ محفوظ ہے۔

زندگی کا رقص

م م راجندر

وہ اُٹھ گیا اور ندی کے اس پار ڈوبتے ہوئے سورج کو دیکھنے لگا جس بہر کی سہ بے جان دھوپ ڈھل چکی تھی اور اُفق میں کانپتے ہوئے زرد سونے کے سوا تمام فضا میں ایک دھندلکا چھا گیا تھا تیزی سے سمٹتی ہوئی روشنی ایک اندھیرے کی گود میں گم ہو رہی تھی اور اُسے ایسا محسوس ہوا کہ ایک زندگی موت سے ہم کنار ہو رہی ہے۔

اور موت کا خیال آتے ہی اس کے بوڑھے جسم میں کپکپی دوڑ گئی، اور وہ سوچنے لگا۔ کسی بھی لمحے وہ بھی اسی طرح ایک اندھیرے کی گود میں کھو جائے گا۔ وہ خوف زدہ سا ہو گیا اور جلد جلد اپنے گھر کی طرف چلنے لگا جو یہاں سے پاس ہی تھا۔

گھر پہونچ کر وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اُسے دیکھتے ہی نوکر دوڑ کر آیا اور اس نے اس کے کمرے کی بتی جلائی، اس کے ہاتھ سے اس کی چھڑی لی اور اُس کا لمبا کوٹ اُتارنے لگا۔ وہ پلنگ پر بیٹھ گیا اور اُس نے نوکر کو چائے لے آنے کے لئے کہا بستر پر لیٹ کر اور لحاف اپنے پاؤں پر ڈال کر پھر سوچنے لگا یہاں اس کمرے میں کتنا سکون تھا باہر پھیلی ہوئی لامحدود وسعت کتنی بھیانک تھی جیسے موت ہی پھیل کر یہ وسعت بن گئی ہو جب تک سورج سروں پر چمکتا ہے، چاروں طرف ایک گہما گہمی رہتی ہے اور سرگرمی اور دوڑ دھوپ کا چکر چلتا رہتا ہے۔ اس وقت ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ چکر کبھی نہیں رُکے گا لیکن شام ہوتے ہی زندگی کی چکی کا یہ شور کتنا کم ہو جاتا ہے۔ اور جب درختوں کے سائے ڈھلتے ہیں اور دھرتی پر ایک کاٹنے والی اُداسی اور ٹھنڈک کا غلاف پڑ جاتا ہے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اب زندگی ٹھہر جائے گی۔ یہ چکر پھر نہیں چلے گا۔

وہ سوچنے لگا کہ وہ ستر برس کا ہو گیا ہے اور کسی بھی دن اور کسی بھی لمحے ایکا ایکی اِس پرشور دنیا سے چلا جائے گا۔ اس کے اعضا تقریباً جواب دے چکے تھے اور دن بھر اپنے مکان کے برآمدے یا لان میں آرام کرسی پر بیٹھنے اور سہ پہر کو اپنی چھڑی کے سہارے ندی تک چلے آنے اور ایک پتھر پر بیٹھنے کے سوا وہ کوئی اور کام کرنے کے قابل نہیں رہا تھا لیکن اس لاچاری کے باوجود اُسے موت سے ڈر لگتا تھا وہ موت کو ایک ایسی اتھاہ گہرائی سمجھتا تھا جس میں گر کر وہ ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہو جائے گا۔

نوکر چائے لے آیا اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چائے کی گھونٹوں میں گرمی اور زندگی تھی، اور وہ اس گرمی اور زندگی کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ یکایک اُسے ٹھنڈک کا احساس ہوا اور اُس نے مڑ کر دیکھا تو کھڑکی کو کھلا ہوا پایا۔ کھڑکی کے پار موت کی سی خاموشی اور اندھیرا تھا۔ اُس نے نوکر کو کھڑکی بند کرنے اور پردہ ڈالنے کے لئے کہا اور جب کھڑکی بند ہو گئی۔ اور نوکر دروازہ بند کرتا ہوا چلا گیا تو وہ اطمینان سے چائے پینے لگا اور چائے پی کر لیٹ گیا۔ اب اس کے کمرے میں کوئی نہیں آئے گا کیونکہ وہ شام کو کچھ نہیں کھاتا تھا اُس نے لحاف سینے تک اوڑھ لیا۔ اس کے کمرے میں بتی ساری رات جلتی تھی کیونکہ وہ گھپ اندھیرے کو ہی موت کی آمد سمجھتا تھا کچھ دنوں سے تو جب وہ سونے لگتا تو اُسے یہ خیال آتا کہ وہ شاید صبح نہیں جاگے گا اور نیند میں ہی اس کے دل کی حرکت بند ہو جائے گی۔ وہ صبح جاگ کر پہلے اپنے آپ کو ہی محسوس کرتا تھا۔

اگلے روز اٹھ کر اور چائے وغیرہ پی کر وہ معمول کے مطابق اپنی چھڑی لے کر باہر برآمدے میں آ گیا اُس کا بیٹا دفتر جاتا ہوا ہمیشہ کی طرح اُس سے ملنے آیا اور اس کی طبیعت کے بارے میں پوچھتا ہوا چلا گیا۔ بیٹے کے جاتے ہی اُس کے محل میں اپنے

مکان میں پیچھے کی طرف لگے ہوئے امرودوں کے درختوں کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ دراصل درختوں سے زیادہ اُن خرگوشوں کو دیکھنا چاہتا تھا جو اس کے پوتوں منّو اور چنّو نے پال رکھے تھے۔ وہ اندر گیا اور اس نے اپنی الماری میں سے بسکٹ نکال کر اپنی جیبوں میں بھر لیے۔ وہ جب کبھی مکان کے پیچھے کی طرف جاتا تھا وہ اپنی جیبیں اسی طرح بسکٹوں سے بھر لیتا تھا کیونکہ اُدھر کھیلتے ہوئے چنّو اور منّو اپنے بابا کو دیکھتے ہی اس کی ٹانگوں سے چمٹ جاتے اور بسکٹ مانگتے۔ وہ اپنی چھڑی کے سہارے آہستہ آہستہ نیچے اُترا اور پیچھے کی طرف پہنچ کر چنّو منّو اور اُن کے دوستوں کو بسکٹ دیتا ہوا امرودوں کے درختوں کے پاس آکر رک گیا۔

یہ درخت اُسے بہت پسند تھے۔ ایک بڑا درخت تھا جو کچے امرودوں سے لدا پڑا تھا۔ ایک اس سے چھوٹا تھا جس پر ذرا بڑے کئی امرود لگ گئے تھے اور دو تین تو تقریباً پودے ہی تھے جو پچھلے ہی سال لگائے گئے تھے اور ہرے بھرے پتوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اس نے بڑے درخت کے نیچے کھڑے ہو کر اپنے بائیں ہاتھ کو آنکھوں پر رکھتے ہوئے اُوپر کی طرف جھانکا اور اس کے جھانکتے ہی ٹہنیوں پر بیٹھی ہوئی دو تین چڑیاں اُڑ گئیں۔ پھر وہ خرگوشوں کی طرف بڑھ گیا۔ یہ خرگوشوں کا جوڑا پچھلے سال مالی نے اُس کے پوتے کو لا کر دیا تھا اور کوئی ایک ماہ کے بعد ہی اُن میں دو ننھے ننھے روئی سے بھی زیادہ سفید اور نرم بچوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ اور اب تو وہ بھی پورے خرگوش تھے۔ اور اُن کے لئے ایک علیحدہ گھر بن گیا تھا۔ وہ خرگوش کے گھر کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا اور اندر جھانکنے لگا۔ اس کے بیٹھتے ہی خرگوش دبک کر ایک کونے میں بیٹھ گئے۔ اس نے جالی کے سوراخوں میں سے دو بسکٹ توڑ کر اندر پھینک دیئے، اور پھر زمین پر سے ہری گھاس کے چند تنکے توڑ کر اندر ڈال دیئے۔

وہ اُٹھ گیا اور مکان کی دیوار کے ساتھ دھوپ میں چلنے لگا۔ یہ مکان اس نے پچیس برس ہوئے چالیس ہزار روپے کی لاگت سے بنوایا تھا اور دس بارہ کمروں کا ایک شاندار بڑا مکان تھا جس کے چاروں طرف ایک اچھا خاصا باغ تھا۔ اب اس لمبے چوڑے مکان میں جو کبھی اس کے خوابوں کی تعبیر تھا وہ تنہا ایک چھوٹے سے کمرے میں اپنی زندگی کی شام گزار رہا تھا۔ اس کی بیوی پندرہ سال ہوئے چل بسی تھی اور وہ اس سفر کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ وہ اس دنیا کی بے ثباتی کے بارے میں سوچنے لگا۔ کیا ایک بھری پری بارونق زندگی کا یہی المناک انجام ہے۔ اس کی تمام زندگی چند بیتے ہوئے لمحے بن کر اس کے سامنے سے گزر گئی۔ کتنا خوبصورت لڑکپن، کتنی بھرپور جوانی، کتنی طاقت، کتنا آرام، اور رشک اس کی زندگی میں رہا تھا اور افسوس کہ وہ سب کچھ اس طرح مٹنے والا اور مٹ کر کبھی نہ بننے والا تھا۔ زندگی کا یہ انجام اور زندگی میں یہ موت کیوں تھی۔

سہ پہر کو تین بجے کھانا کھانے اور کچھ دیر لیٹنے کے بعد وہ اپنا کوٹ پہن کر اور چھڑی لے کر ندی کی طرف چل پڑا۔ آج اُسے کچھ زیادہ تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ شاید اس لئے کہ وہ صبح اُٹھ کر مکان کے پیچھے کی طرف چلا گیا تھا اور کچھ دیر وہاں رہا تھا۔ کمزوری کی اب یہ حالت تھی کہ اگر وہ ذرا سا بھی فالتو چل لیتا تو فوراً تھک جاتا تھا لیکن یہ تھوڑا بہت چلنا ہی تو اس کی زندگی تھی اور وہ اُسے چھوڑنے کے لئے آمادہ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ وہ دن کے وقت کمرے کے باہر ندی کے کنارے کھلے آسمان کے نیچے اور سورج کی کرنوں میں زندگی محسوس کرتا تھا اور شام کو اپنے کمرے کے اندر رہتا اُسے یہ وسیع دنیا اندھیرے میں ڈوبی ہوئی بڑی خوفناک لگتی تھی۔ وہ ندی پر پہنچ کر دھوپ میں بیٹھ گیا اور سورج کی کرنیں اس کے ناتواں جسم میں گرمی بھرنے لگیں۔ ہوا صاف شفاف پانی ایک خوشگوار خنکی کا احساس دے رہا تھا۔ حرارت اور خنکی یہ امتزاج زندگی کا کتنا پُرمسرت پہلو تھا اور وہ چند لمحوں کے لئے اپنے آپ کو بھول سا گیا۔

مگر جاڑے کی دھوپ بھی زندگی کی مانند کتنی مختصر ہوتی ہے۔ گھنٹے دو گھنٹے میں ہی سہانی دھوپ کی یہ چادر سمٹ گئی اور ہوا میں خنکی سرسرانے لگی۔ وہ اُٹھ گیا کیونکہ درختوں کے سائے سمٹنے لگے تھے اور ایک زندگی ایک موت سے ہمکنار ہونے والی تھی۔ ایک دہکتا ہوا آگ کا گولا ایک ٹھنڈی نارنجی گیند بن کر ڈوبنے والا تھا اور دھرتی پر ایک ڈسنے والی تاریکی کا غلاف پڑنے والا تھا۔ وہ گھبرا کر گھر کی طرف بڑھنے لگا۔ نہیں، وہ ڈوبتے ہوئے سورج کو نہیں دیکھے گا۔ نیچے پھیلاتے ہوئے سایوں پر نظر نہیں ڈالے گا۔ وہ بغیر موت کو دیکھے ہوئے اس زندگی کی طرف لوٹ جائے گا جو اب اس کے کمرے کی چار دیواری میں بجلی کی ایک روشنی میں سمٹ جائے گی۔ وہ کانپتے ہوئے قدموں کے ساتھ ہانپتا ہوا گھر پہنچا۔

اس روز اُسے پتہ نہیں لگا کہ کب نیند آگئی یا آئی بھی یا نہیں۔ یہ زندگی کیا تھی اور موت کیوں تھی۔ اس پر وہ بہت دیر تک سوچتا رہا تھا۔ اور جتنا وہ سوچتا رہا تھا اس کا دل ڈوبتا سا گیا تھا۔ اس نے اپنے دل کو کئی بار کڑا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کی اداسی دور نہ ہوئی تھی۔ وہ ایک ایسی بے مقصد لمبی چوڑی زندگی کو جس کا انجام موت تھا ماننے کے لئے تیار نہیں تھا۔ یہ ایک بڑا غیر یقینی اور بھیانک انجام تھا۔

اگلی صبح وہ چائے وغیرہ پی کر باہر برآمدے میں نہیں آیا بلکہ اپنے پلنگ پر لیٹا رہا۔ اس نے آج اپنے اندر اُٹھنے اور باہر جانے کے لئے کوئی بھی جوشش محسوس نہیں کیا۔ دراصل وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس کے لئے کوئی بھی سرگرمی جینے کے لئے ضروری نہیں ہے۔ بے معنی سی تھی۔ اس کا بیٹا حسب معمول دفتر جاتے ہوئے اس سے ملنے کے لئے آیا اور اسے برآمدے میں نہ پا کر تیزی سے اندر آیا۔ باپ کو پلنگ پر لیٹے ہوئے دیکھ کر وہ بالکل اس کے قریب سرہانے کی طرف بیٹھ گیا اور اس کی طبیعت کے بارے میں پوچھنے

لگا۔ اُس نے بتایا کہ وہ بالکل ٹھیک تھا۔ اس کا بیٹا دو تین منٹ تک بیٹھا رہا اور کچھ کہہ کر اور مسکرا کر چلا گیا

اس کا بیٹا چلا گیا مگر وہ کچھ ٹھٹک کر رہ گیا وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ اس کا بیٹا ہو بہو اس کی تصویر تھا اور جب وہ بھی چالیس سال کا تھا تو بالکل ایسا ہی تھا اور اب جو اس کا بیٹا مسکرایا تھا تو بالکل اُسی کی طرح۔ تو کیا اُس کے بیٹے میں وہ خود موجود تھا۔ اور اس کا بیٹا جو ابھی دفتر گیا تھا تو کیا اُس کی شکل میں وہ خود گیا تھا؟

اس کے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا جیسے کوئی نئی روشنی پھوٹنے والی ہو۔ وہ لپک کر اُٹھ بیٹھا۔ اُس نے اپنا کوٹ پہنا۔ چھڑی اٹھائی اور باہر برآمدے میں آگیا پھر وہ نیچے اتر کر پھاٹک کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اور باہر کی طرف دیکھ کر مسکرا اُٹھا کیوں کہ چند لمحے ہوئے وہ خود چالیس سال کا جوان بن کر اس پھاٹک میں سے نکل دفتر گیا تھا!

وہ اپنے کمرے میں آگیا اور اس نے اپنی جیبوں میں بسکٹیں ٹھونس لیں اور پھر باہر نکل کر منّو اور رمنو کو بسکٹیں دیتا ہوا امرودوں کے درختوں کی طرف ہو لیا اور ان کے تلے چند لمحے کھڑا ہو کر خرگوشوں کے خاموش مگر خوش و خرم کُنبے کی طرف بڑھ گیا۔

وہ اس روز کافی خوش تھا اور اُسے تھکاوٹ کا احساس تک نہیں ہوا وہ وٹ کے اپنے کمرے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اور ادھر سے چنو گزرا تو اُس نے اُسے بلا کر پوچھا کہ کیا وہ بابا کے ساتھ ندی پہ چلے گا چنو نے جواب میں بابا سے پوچھا کہ کیا اس کی جیبوں میں بسکٹ ہیں اور جب اُس نے بسکٹ دکھائے اور ایک پہلے ہی دیدیا تو چنو خوشی سے بابا کے ساتھ ہو لیا۔

بیچ ندی پر بڑی رسیلی اور خوش گوار دھوپ تھی اور ندی کا پانی چاندی کی طرح سفید اور اجلا تھا درختوں کے جلے سائے چمکتی دھرتی پر اپنے جسموں کی شکل بنے لہلہا رہے تھے ندی کے اوپر آسمان کی نیلگوں پہنائی میں پرندوں کی کتنی ہی ڈاریں اڑان میں مصروف تھیں چاروں طرف ایک نہ مٹنے والی زندگی تھی۔ وہ دھوپ میں نیچے بیٹھ گیا تھا اور اُس نے چنو کو دو بسکٹ دے کر اپنے پاس ہی کھیلتے رہنے کو کہہ دیا تھا۔

تھوڑی دیر میں چنو اپنے ہاتھ میں گول گول بجریاں اکٹھی کر کے لے آیا اور جب اس نے اُنہیں نیچے رکھ کر بابا سے آئس کریم کے پیسے مانگے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ چنو کی شکل بھی اس سے بہت ملتی تھی اور اُس کے کان اور آنکھیں تو بالکل ہی اُس پر تھیں۔ اس کے ذہن میں اُس کا بچپن جھلملانے لگا اور وہ چنو کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔ تو کیا وہ اپنے بعد اپنے بیٹے کی صورت میں اور پھر اس کے بعد اپنے پوتے کی صورت میں زندہ رہے گا اور کیا زندگی ایک ایسا دھاگہ ہے جو کبھی نہیں ٹوٹے گا۔؟

اس نے چنو کو پیسے دیئے اور چنو آئس کریم لینے دوڑ گیا وہ بے اختیار ہنس پڑا اور نیچے بیٹھ کر چنو کی بجریوں سے کھیلنے لگا پھر چنو بابا کی چھڑی سے گھوڑا کی طرح چلا اور اس کی

خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ دونوں دیر تک ندی پر بیٹھے اور جب درختوں کے سائے سمٹ گئے اور گرمی اور روشنی کو خنکی اور اندھیارے نے ڈس لیا تو بھی وہ نہیں گھبرایا وہ لہریں سے سورج کو اُن میں کانپتے اور ڈوبتے دیکھتا رہا اور اُسے محسوس ہوا کہ ایک نئی دوسری زندگی میں ڈھل رہی تھی موت کا کہیں نام و نشان نہیں تھا اور لاتعداد لہریں ایک دوسرے میں جذب ہو کر مسلسل گھوم رہے تھے

رباعیات

امیر چند بہار

(۱)

انسان کی دُو روزہ زندگی کیا ہے
کیا چیز بڑھاپا ہے، جوان کیا ہے
جاتی ہے کہاں رُوح بشر بعد فنا
آنے جانے کی یہ کہانی کیا ہے

(۲)

کرتی ہے ہمیں عقل اشارہ کچھ اور
لیکن ہے طبیعت کا تقاضا کچھ اور
مجبور ہے کس درجہ زمانے میں بشر
کرتا ہے وہ کچھ، اور ارادہ کچھ اور

(۳)

نالاں ہے غم دہر سے انسان بہت
اُٹھتے ہیں یم زیست میں طوفان بہت
اے دوست نظر اُلجھ کے رہ جائے نہ کیوں
افسانۂ ہستی کے ہیں عنوان بہت

(۴)

مانا کہ میں ہوں دیر و حرم سے بیزار
اخلاص و محبت ہے مگر میرا شعار
ناراض نہ ہوں شیخ و برہمن مجھ سے
میں اپنی ضمیر کا ہوں فرماں بردار

(۵)

تسکیں نہ ملے جس سے وہ ایماں کیا ہے
بخشے نہ گناہ جو وہ یزداں کیا ہے
جو درد سے معمور نہ دل کیسا؟
اوروں کے نہ کام آئے جو انساں کیا ہے

قابلِ مُطالعہ

کتابیں

کتاب	قیمت
ہمارا جھنڈا	ایک روپیہ
بھارت آج اور کل	۷۵ پیسے
دو شہروں کی کہانی (چارلس ڈکنس)	۵ روپے
جوالا مکھی (ناول، اننت گوپال شیوڑے)	۲ روپے ۵۰ پیسے
ہندوستان کا دستور	۲ روپے
آئینۂ غالب	۵ روپے
آج کل کی کہانیاں	۳ روپے ۵۰ پیسے
وطن کے نغمے	ایک روپیہ ۷۵ پیسے
امرجوت	۲ روپے
سائنس کے چند پہلو	ایک روپیہ ۲۵ پیسے
ہمارے نہرو	۳ روپے ۵۰ پیسے
گنجینۂ غالب	۴ روپے ۵۰ پیسے
ہندوستان کی مسجدیں	۲ روپے ۵۰ پیسے
مہاتما گاندھی کی کہانی (رنگین تصویروں میں)	۲ روپے ۵۰ پیسے

کتاب	قیمت
اچھا شہری (بچوں کے لئے)	ایک روپیہ
نہرو رادھا کرشنن کی نظر میں	ایک روپیہ
ابو الکلام آزاد	دو روپے
ہندوستان کی تاریخ (بچوں کے لئے)	۳ روپے ۷۵ پیسے
ہندوستان کی نامور ہستیاں (حصہ اوّل)	۲ روپے ۲۵ پیسے
ہندوستان کی نامور ہستیاں (حصہ دوم)	۲ روپے ۵۰ پیسے
ہندوستان کی نامور ہستیاں (حصہ سوئم)	۲ روپے ۵۰ پیسے
سوامی وویکانند (بچوں کے لئے)	ایک روپیہ ۵۰ پیسے
جواہر لال نہرو (خراجِ عقیدت)	۲ روپے ۵۰ پیسے
ہندوستان میں تعلیم کی از سرِ نو تنظیم (ڈاکٹر ذاکر حسین)	ایک روپیہ ۲۵ پیسے
ہندوستانی ڈرامہ (صفدر آہ)	۳ روپے ۷۵ پیسے
پنڈت نہرو سے بات چیت (ٹیبر منڈی)	۲ روپے
ندیا کنارے (علی عباس حسینی)	ایک روپیہ
کلکی یا تہذیب کا مستقبل (ڈاکٹر رادھا کرشنن)	۷۵ پیسے

آج کل کے خریداروں کو [illegible] رعایت ہو گی
محصول ڈاک ہمارے [illegible] ہو گا

اُردو کے علاوہ انگریزی، ہندی اور تمام علاقائی زبانوں میں کتابیں شائع ہوتی ہیں

فہرستِ کتب مُفت طلب کیجئے

بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

احمد جمال پاشا

محلے میں ہمارا گھر ہے

جس محلے میں ہے ہمارا گھر وہیں بقول مرزا شوق دہلوی رہتا ہے ایک سوداگر ہمیں اس بات کا پکا یقین ہے کہ شوق مرحوم کے زمانے میں ضرور اس علاقہ میں کوئی سوداگر رہتا ہوگا مگر اب تو سمجھئے واقعی لوگ کم رہتے ہیں اور سوداگر زیادہ۔ گھروں کے آگے پہلے دالان صحن کہیں ڈرائنگ روم، دیوان خانے اور مہمان خانے ہوا کرتے تھے۔ ان کے بجائے اب دکانیں اور صرف دکانیں ہوا کرتی ہیں۔ اور دکانیں بھی ایسی کہ گھر کے سامنے دکانیں، گھر کے پیچھے دکانیں، گھر کے دائیں دکانیں، گھر کے بائیں دکانیں، یہاں تک کہ گھر کے اوپر اور نیچے دکانیں۔ چنانچہ ہمارا گھر اچھا خاصا بساط خانہ اور محلہ بازار معلوم ہوتا ہے۔ غرض جب ہم اپنے گھر کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اپنے بچپن میں پڑھی ہوئی ایک نظم 'The Charge of the Light Brigade' بے اختیار یاد آجاتی ہے۔ جس کا یہ ٹیپ کا بند تھا۔!

"Canon to the left of them,
Canon to the right of them,
Canon in the front of them,
Canon behind of them".

بس فرق یہ ہے کہ اس فوجی بریگیڈ کے چاروں طرف توپیں ہی توپیں اور اس کشتۂ بازار کے ہر طرف دکانیں اور بس دکانیں ہیں۔

ان دکانوں میں دکانداری سے زیادہ شور و غل کی آوازیں وقت قوت لا یموت تک ہمارا جینا اور سونا دو بھر کئے رہتی ہیں۔ یہ آوازیں مول تول سے لے کر مار پیٹ اور ریکارڈنگ تک کی ہوتی ہیں۔ اور اس بازار کا ہر سودا با آواز بلند طے پاتا ہے۔

آپ مانیں یا نہ مانیں مگر اب ہم اس دھماکوں، ہنگاموں اور آوازوں کی دنیا کے شور شرابے کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ اگر ٹھیک سے شور نہ ہو رہا ہو تو آرام سے سو نہیں پاتے، اور اگر بازار وغیرہ بند ہونے کی وجہ سے کچھ سناٹا ہو، تو عجب الجھن اور بے چینی سی رہتی ہے۔

مگر اس شور و غل کے فائدے بھی ہیں۔ مثلاً حال ہی میں ہمارے ایک عزیز مع اپنے خاندان لکھنؤ کی سیر کے لئے ہم پر اس طرح نازل ہو گئے جیسے گنہگاروں پر عذاب اور کمزوروں پر موسمی بخار۔ ہم اس مہمانی میں مہمانداری کے بوجھ سے دبنے ہی والے تھے اور ہمارا بجٹ فیل ہونے میں کوئی خاص کسر باقی نہیں رہ گئی تھی ہمارے معزز مہمان دو دن اور دو رات مسلسل شور و غل کی وجہ سے سو نہ سکنے کے بعد اپنا بوریا بستر باندھا اور شہر کے باہر کہیں جا بسے۔ ہیں قیام کے لئے ہمارے ظاہری روکنے کے باوجود چل دیئے۔ اور ہمارا بجٹ فیل ہونے سے اور ہم محض اس دن رات کے شور کی وجہ سے بال بال بچ گئے۔

اس شور و غل سے ایک اور فائدہ یہ ہے کہ ہمیں صبح صبح بلا اخبار پڑھے دنیا جہان کی خبریں معلوم ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ہر اہم خبر کے بارے میں مختلف قسم کی رائیں اور بے لاگ تبصرے مل جاتے ہیں۔ کیونکہ زیادہ تر کاروباری حضرات اخبار بھی اس طرح پڑھتے ہیں گویا اخبار پڑھ نہیں، چلا چلا کر بیچ رہے ہیں۔ اس کے ساتھ پاس پڑوس کے لاتعداد ریڈیو اور ٹرانسسٹر پل پل کی خبریں ہمارے کانوں میں پہنچاتے رہتے ہیں۔ فری خبروں کے بعد ہمیں صبح سے رات گئے تک عام طور پر، اور خاص طور پر تہوار تقریب کے موقع پر دن بھر کے علاوہ رات بھر بھی بالکل مفت تازہ ترین فلمی گانے اور فرمائشی پروگرام سنائی دیتا ہے۔ کرکٹ میچ کی کمنٹری ۱۵ر اگست اور ۲۶ر جنوری کے موقع پر جشن جمہوریہ کے پروگرام، اہم اعلانات اور بازار کے بھاؤ کے لئے ہمیں کبھی سننے کا کوئی اہتمام نہیں کرنا پڑا ہم اپنے معمولات میں مصروف رہے مگر ہر پروگرام کی تفصیلات سے خود بخود آگاہ بھی ہوتے رہے۔

اسی کے ساتھ ایک زبردست فائدہ گھر میں بازار لگنے کا یہ بھی ہے کہ ہمیں ہمیشہ معلوم رہتا ہے کہ کون سی چیز بازار سے غائب ہے؟ کس چیز کے دام چڑھے یا گرے۔ کون چیز کہاں اچھی ملتی ہے اور کون کہاں خراب؟

چونکہ ہمارا گھر بیچ شہر میں واقع ہوا ہے۔ اس لئے ہمارا ہر عزیز، شناسا اور جگری دوست خواہ کہیں بھی رہتا ہے مگر شہر کے اس بارونق بازار کا ضرور رُخ کرتا ہے اور جو لوگ یہاں تک آ جاتے ہیں وہ گھڑی دو گھڑی کے لئے غریب خانے کو بھی رونق بخش جاتے ہیں۔ اس زمانے میں جبکہ جناب کرایے اتنے مہنگے ہیں اور رکشا والے ٹیکسی والے کا کرایے میں مقابلہ کرتے ہیں، ہم کرایے اور آنے جانے کی زحمت اور خرچ سے بالکل صاف بچے رہتے ہیں کیونکہ جائیں تو جائیں کہاں۔ سب تو خود یہیں آ جاتے ہیں۔

آنے والوں میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ وہ لوگ بھی جو محض وقت گزارنے یا ادھار مانگنے آتے ہیں اور وہ لوگ بھی جو کھڑے کھڑے آتے ہیں اور الٹا ہم ہی سے پوچھ لیتے ہیں۔ "ہمارے لائق کوئی خدمت؟" تو ہم اس آخرالذکر قسم کی مخلوق سے ملنا زیادہ پسند کرتے ہیں جو خیر سے مخلص کے علاوہ خدمت گزار بھی واقع ہوئی ہے۔ لہٰذا جن لوگوں سے ہم نہیں ملنا چاہتے فوراً پردے کی آڑ میں سے زنانی آواز بنا کر خود ہی کہہ دیتے ہیں۔

"میاں! بھیا نہیں ہیں۔!"

اور اگر کسی نے کہا۔

"کون ہو؟ باہر تو آؤ۔!"

تو نہایت عاجزی کے ساتھ کہتے ہیں۔

"میاں! کیسے آ جائیں؟ پردے دار جو ٹھہرے۔"

اس کے بعد وہ غریب لاجواب ہو کر رفوچکر ہو جاتا ہے۔ اور جب کبھی راستے گلی ان سے صاحب سلامت ہوتی ہے اور وہ بتاتے ہیں کہ "جناب والا کے دولت خانے پر حاضر ہوا تھا۔" تو ہم بڑی لاعلمی کے ساتھ دریافت کرتے ہیں۔

"کب؟"

اور جب وہ گا چکتا ہے تو اسے کل پھر بلاتے ہیں۔

ہمارے بہت سے دوستوں کو حیرت ہے بلکہ تعجب ہے آخر ہم سینما کیوں نہیں دیکھتے۔ لیکن شاید انہیں اس بات کا علم نہیں ہے کہ اتنے فلمی ماحول میں دن رات رہنے کے بعد فلم دیکھنے کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کیونکہ ہمیں اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، چلتے پھرتے، صبح شام اور دن رات اپنے محلے اور پڑوس نما بازار کے مکالمے، گانے اور مفت کی موسیقی سننے کے ساتھ ساتھ ان کی گھریلو اور بازارو مار دھاڑ والی زندگیوں کی پوری پوری ٹاکی فلمیں اور آنے والی فلموں کے ٹریلر تک سننے کو مل جاتے ہیں۔ جس کے بعد الگ سے سینما دیکھنا آخر بدمذاقی نہیں تو پھر کیا ہے؟

پھر بھی آخر میں ہم یہی عرض کریں گے کہ غرض زمانے کو دیکھتے ہوئے، جہاں بھی ہمارا گھر ہے۔ بہت غنیمت ہے۔ جس کے لئے ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ خدا اسے آباد اور ہمیں شاد رکھے۔

غزلیں

ظفر ادیب

لاکھوں ہی آرزوئیں ہیں ہر آدمی کے ساتھ!
لیکن یہ قافلہ ہے فقط زندگی کے ساتھ

رنگینیاں بھی تو ہیں غمِ عاشقی کے ساتھ
کیا کیا خوشی نہیں ہے اس آزردگی کے ساتھ

پیمانہ دور میں ہے تو ہے زندگی کا دور
ہر ایک بات میں ہے کشش مے کشی کے ساتھ

بھولا نہیں ہوں میں تو نہیں وہ بھی بھولیں گے
دل کی لگی بھی ہوتی ہے کچھ دل لگی کے ساتھ

اُن کی جفا کا ردِّ عمل ہے میری وفا
شاید ہمیشہ وہ نہ رہیں برہمی کے ساتھ

یہ ہم ہی تھے کہ سہتے رہے تیری بے رُخی
کیا کیا زخم اُٹھائے ہیں ہم نے خوشی کے ساتھ

بس اِک نگاہِ لُطف کی ہے تجھ سے آرزو
آخر طلب ظفرؔ کو ہو کتنی کمی کے ساتھ

عبدالحمید حمید عظیم آبادی

دل میں سوزش ہے مرے آگ لگی ہو جیسے
اور دھواں بھی ہے کوئی چیز جلی ہو جیسے

دل کو پژمردہ زمانے نے کیا ہے ایسا
شاخِ گل میں کوئی مرجھائی کلی ہو جیسے

مُسکراتا تری محفل سے رقیب اٹھا ہے
اس کے مطلب کی کوئی بات بنی ہو جیسی

پی کے آنکھوں سے تری مست ہیں مے کش ساقی
ساری مستی تری آنکھوں میں بھری ہو جیسے

تیری تصویر سے ہو جاتی ہے دل کو تسکیں
ہے تو تصویر مگر بول رہی ہو جیسے

جس گلی سے میں گزرتا ہوں جنوں میں جب بھی
وہ گلی لگتی ہے تیری ہی گلی ہو جیسے

آنکھیں پتھرائیں مگر جانبِ در ہیں پھر بھی
اُن سے ملنے کی ابھی آس لگی ہو جیسے

ضبطِ غم پر کوئی کیونکر نہ کرے رشک حمیدؔ
ہنستے رہتے ہو تم ایسے کہ خوشی ہو جیسے

دلؔ ایوبی ٹونکی

منظرِ دیدۂ نمناک ہے جل تھل کی طرح
دل سے گزری ہے تری یاد ابھی بادل کی طرح

دوستو صبح کے آثار مبارک لیکن
آج بھی شام نہ ہو جائے کہیں کل کی طرح

سرفروشوں کو دعا دے کہ انہیں کے دم سے
سرخرو ہے ترا کوچہ کسی مقتل کی طرح

شام ہوتے ہی اندھیرے مری تنہائی میں
پھیل جاتے ہیں تیری آنکھ کے کاجل کی طرح

لب سے وا ہیں میری آنکھوں کے دریچے ظالم
کب سے ویران ہے دل بیتِ مقفّل کی طرح

ڈھانے والے درو دیوارِ تمنا یہ نہ بھول
دل مقدس ہے "مراقبلۂ اول کی طرح"

اُن کے دم سے جو کبھی رشکِ ارم تھا اے دلؔ
وہی گھر ہے کسی سنسان سے جنگل کی طرح

ہماری زبان کے نثری حصے میں جو صنف ادب کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے وہ افسانے کے بعد مقالہ ہے — اگر پچھلے پونے دو سو سال کی ادبی کاوشات کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں اپنے ادبی سرمایہ کی بے بضاعتی شدید طور پر محسوس ہوگی۔ یہ کہنا بڑی حد تک صحیح ہوگا کہ پچھلا سرمایہ نظم، داستان اور مضمون جیسی مقبول اہم نگارشات پر مشتمل تھا — ہر قسم کے جذباتی و فکری کوائف کی شعری قلم بندی کی صورت "نظم" تھی، وہ نظم جو نثر کی ضد سمجھی جاتی اور جس میں مختلف شعری سانچے داخل تھے — اخلاقی، مذہبی و نیم مذہبی واقعات و حکایات کی نثری قلم بندی کی صورت "داستان" تھی، وہ داستان جو فرضی اور غیر فطری، قیاسی اور غیر حقیقی واقعات کا مجموعہ تھی۔ مختلف قسم کے علمی و ادبی سنجیدہ اور اہم موضوع و مسائل کے بیان و اظہار کا اسلوب "مضمون" تھا — بساطِ ادب پر، صنفی لحاظ سے نگارشات کی یہی تین شعری و نثری قسمیں بحیثیت مجموعی، ہمارے اہلِ قلم کا سرمایۂ ذہن و زبان تھیں۔

مقالہ "مضمون" کی ایک قسم ہے، مگر منفرد اور مستقل بالشان قسم ہے عام زبان میں ہر بات یا خیال جو نثر میں پیش کیا جائے، "مضمون" سے موسوم کر دیا جاتا ہے۔ پر، ہر نثری تحریر کو ہم مقالہ نہیں کہہ سکتے — مقالہ تحریر کی ایک منظم و مستحکم صورت ہے، جو انشائیہ، سوانح، خاکہ اور رپورتاژ جیسے دیگر نثری اصناف کی طرح ادب میں اپنا خاص مرتبہ و منصب رکھتا ہے۔ مقالہ نگار ایک بھرپور علمی و ادبی شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔ یہ صاحبِ علم ہوتا ہے اور صاحبِ فکر و نظر بھی۔ مقالہ نگاری میں صنفی ضوابط اور فنی شرائط کا التزام ضروری ہے۔ یہ کسی عالم و فاضل کی قلم کاری ہے جو پارۂ ادب کہے جانے کی مستحق ہے۔

— مقالہ ایوانِ ادب میں روزن کی مثال ہے، روشن، کھلا اور ہوادار: اچھے اور معیاری مقالوں سے ہمیں ذہنی تابانی حاصل ہوتی ہے۔ یہ ہمارے ذہن کی تاریکی کو دور کرتے اور دماغ کے بند دریچے کھول دینے کی قوت رکھتے ہیں۔ ایک کامیاب مقالہ کلید گنجینۂ علم ہوتا ہے۔ یہ وہ صاف و شفاف شیشہ ہے جو نہایت اعتماد کے ساتھ دوربینی اور خوردبینی میں کام آتا ہے۔

(الف) علمیت مقالہ کی بنیادی خصوصیت ہے۔ علمیت اس تحریر کا وہ اساسی وصف ہے جو اس صنف کو دوسری نثری تحریروں سے معناً و فنیاً مختلف کر دیتا ہے۔ — اچھے اور اونچے مقالوں کے مطالعہ سے ہمیں علم و دانش کی دولت حاصل ہوتی ہے۔ یہ مفید اور اہم معلومات کی زریں دولت ہے۔ یہ علمیت کا بیش بہا خزانہ ہے اور غیر فانی خزانہ بھی۔ مقالہ کا نفس کسی مخصوص بات یا خیال سے معمور رہتا ہے۔ ایسی بات یا خیال مثلاً نکتہ یا پہلو جو ہماری ذات یا زندگی سے علاقہ رکھتا ہے، کبھی بالواسطہ اور کبھی بلاواسطہ وہ خاص بات جس کی جان پہچان اس علمی پھرتی اور منتی بجھاتی دنیا میں ہمارے لئے بہت ضروری ہے۔ وہ اہم بات جسے جانے پہچانے بغیر کبھی زندگی گزارنا بھی دو بھر ہو جاتا ہے۔

علمیت مقالہ کا جوہر ہے۔ کامیاب مقالہ قلم کار کی ذی علم شخصیت اور اس کے تبحرِ علمی کا پرتو ہوتا ہے۔ اس تحریر میں اس کے شعور و نظر کی بلندیاں ابھرتی ہیں۔ وہ عالم ہوتا ہے اور طلبِ علم کا جذبۂ صادق رکھتا ہے۔ مطالعہ اور کثرتِ مطالعہ اس کا

محبوب مشغلہ ہوتا ہے کہ کتابیں، اچھی کتابیں اس کی مونس و ہمدم رہتی ہیں۔ مقالہ نگار کے مطالعہ میں جس قدر وسعت و گہرائی ہوگی، موضوعِ تحریر پر جس قدر اس کی ذاتی نظر ہوگی، مقالہ میں اسی قدر علمیت کا زور، وزن اور روشنی ہوگی۔

مقالہ کا ماخذ قول ہے جس سے مراد بیان، کلام، گفتگو یا بات چیت ہے — یہی گفتگو یا کلام مقالہ نگار کا مقصد و مدعا ہے۔ وہ ہمیں کچھ کہتا یا سُناتا ہے — یہ "کچھ" واقعہ نہیں۔ یہ شاعری نہیں — یہ گپ شپ بھی نہیں — یہ کچھ کوئی مفید علمی بات ہوتی ہے۔ لیکن بخش اور فکر انگیز — یہ ایسی اہم اور سودمند بات ہوتی ہے جسے ہم نہیں جانتے یا کم جانتے ہیں جس کے نہ جاننے سے ہماری خواندگی یا خردمندی پر حرف آتا ہے اور ہم ذہنی مفلسی کا شکار ہو جاتے ہیں —

علمیت مقالہ کی بنیادی خصوصیت ہے۔ مقالہ نگار کسی موضوع پر عالمانہ اور فاضلانہ اظہارِ خیال کرتا ہے۔ لیکن اندازِ گفتگو یعنی موضوعِ تحریر کے بیان کے طریقۂ کار سے علمیت کی ماہیت بدل جاتی ہے، اور علمیت کی تاثیر و عمل میں بھی فرق پیدا ہو جاتا ہے — دوسرے الفاظ میں اس بات کو یوں سمجھئے کہ علمیت مقالہ میں ایک رقیق مادہ کی مثال ہے جس سے قاری کی تشنگی دور ہوتی ہے۔ یہ رقیق مادہ کہیں صرف ٹھنڈا پانی ہے، کہیں کیف افزا شربت اور کہیں حیات بخش عرق — علمیت کی اس نوعیت اور خاصیت کے بموجب مقالوں کو تین مختلف طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جو مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ معلوماتی مقالے

۲۔ تاثراتی مقالے

۳۔ فکری مقالے

معلوماتی مقالے علوم یا سائنس سے متعلق ہوتے ہیں۔ یہ تاریخ، فلسفہ، منطق، سیاست، عمرانیات، نفسیات، اخلاقیات جیسے سنجیدہ علوم سے علاقہ رکھتے ہیں۔ نیز یہ کیمیات، طبعیات، فلکیات، ریاضیات، نباتیات و دیگر سائنسی موضوعات پر بھی مبنی ہوتے ہیں۔ بہ نفسہٖ ہر معلوماتی مقالہ میں کسی علمی یا سائنسی بات پر اظہارِ خیال کیا جاتا ہے جس طرح کسی شعبہ کی نمائش گاہ کی سیر و مشاہدہ سے ہم اس شعبہ کے وجود، اہمیت اور اہلِ شعبہ کی کارکردگیوں سے اچھی طرح روشناس ہو جاتے ہیں اسی طرح معلوماتی مقالوں کے ذریعے ہمیں علوم اور سائنس کی سیر و سیاحت کے مواقع نصیب ہوتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے ہم مختلف علمی یا سائنسی مسائل و امور سے باخبر اور آگاہ ہو جاتے ہیں۔

معلوماتی مقالے قاری کے لئے ابتدائی اسباق کی مثال ہیں۔ معلوماتی مقالوں میں عموماً قلم کار کا اپنا زاویۂ نظر یا نقطۂ نگاہ نہیں ہوتا۔ ان تحریروں میں اس کی ادبی شخصیت کا عکس و نقش نہیں ملتا۔ وہ ایک ذی علم لائق اور مشفق مدرس کی طرح سنجیدگی کے ساتھ مصروفِ تعلیم و تدریس رہتا ہے۔ مقالہ کی سب سے عام قسم معلوماتی ہے۔ معلوماتی مقالے، بالخصوص ابتدائی منزل و مناہج کے معلوماتی مقالے، کثرت سے لکھے اور پڑھے جاتے ہیں۔

(۲) مقالوں کی دوسری قسم تاثراتی ہوتی ہے۔ ان مقالوں کے مطالعے سے بھی ہمیں علمیت حاصل ہوتی ہے۔ مگر ان میں علمیت کی خاصیت و تاثیر مختلف ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر کسی بات کا جاننا اور کسی بات کا پہچاننا ایک نہیں ہوتا، یا کسی چیز کو دیکھنا اور اس کو سمجھنا علم و آگہی کی دو منزلیں ہیں، جیسے گھڑی پر ایک نظر ڈالنا اور گھڑی کی دو سوئیوں کے عددی قیام کو دیکھنا : ———— مقالہ معلوماتی ہو یا تاثراتی، بلاشبہ اس کے مطالعہ سے ہمیں کچھ حاصل ہوتا ہے۔ مگر معلوماتی مقالے کی علمیت ظاہری شناسائی ہے، محض چلتی پھرتی۔ تاثراتی مقالے کی علمیت گہری ہوتی ہے اور دیرپا۔ کہہ سکتے ہیں معلوماتی مقالوں میں علمیت کی تاثیر کسی شخص سے چند ساعتوں کی ملاقات کی مثال ہے اور تاثراتی مقالوں میں یہ تاثیر اس شخص سے رفاقت کی مثال ہے۔

علمیت کی یہ تاثیر یا گہرائی تاثراتی مقالہ میں قلم کار کے تخلیقی طریقۂ کار سے پیدا ہوتی ہے۔ ان تحریروں میں وہ اپنی شخصیت کو علیحدہ رکھ کر قلم نہیں اٹھاتا، بلکہ قلم بندی میں اس کی عالمانہ شخصیت کے ساتھ ادبی مزاج بھی حرکت میں آ جاتا ہے۔ اظہارِ خیال میں وہ خارجیت اور داخلیت دونوں سے مصرف لیتا ہے۔ اس طریقۂ کار سے باتوں کی خشکی روکھے پن اور بے کیفی میں کمی ہو جاتی ہے۔ ان میں جذباتی کو الف کی لو آ جاتی ہے۔ اور تحریر میں نت نئے رنگ پھوٹ پڑتے ہیں۔ معلوماتی مقالے میں خارجیت کی تیزی ہوتی ہے اور موضوع کے ساتھ قلم کار کا ایسا شعوری ضبط و احتیاط جس سے باتیں زیادہ سنجیدہ اور ارتکازی ہو جاتی ہیں۔

معلوماتی مقالہ ہمارے علم میں اضافہ کا سبب فی الفور ہوتا ہے۔ یہ ہمیں بیدار و ہوشمند بناتا ہے۔ تاثراتی مقالہ ہماری پسند و خاطر میں استواری و پائیداری لاتا ہے۔ تاثراتی مقالوں سے بینائی کو مشاہدہ کی قوت اور بصارت کو بصیرت کا زور حاصل ہوتا ہے۔ معلوماتی مقالے ہمیں راہ بتاتے ہیں۔ تاثراتی مقالے اس راہ پر چلنے کی توانائی اور توفیق بخشتے ہیں۔

(۳) مقالوں کی تیسری قسم فکری ہے۔ فکری سے یہ مراد نہیں کہ اس نوع کے مقالوں کا موضوع فلسفہ و حکمت ہوتا ہے بلکہ یہاں قلم کاری کا انداز فلسفیانہ ہوتا ہے یعنی موضوعِ تحریر پر مقالہ نگار عالمانہ اور مفکرانہ انداز سے قلم اٹھاتا ہے اس کی علمی شخصیت اوسط نہیں، غیر معمولی ہوتی ہے اس کی ذہنی قوتیں قدرت کی فیاضی کا نمونہ ہوتی ہیں۔ اسے بصیرت ہوتی ہے اور ژرف نگاہی بھی۔ علاوہ بریں، اس کا اپنا مطمحِ نظر ہوتا ہے، واضح اور روشن۔ یہ مطمحِ نظر کثرتِ مطالعہ، غور و خوض اور تفکر سے پیدا ہوتا ہے۔

داخلیت فکری مقالوں میں بھی ہوتی ہے۔ یہ داخلیت تاثراتی مقالوں

جیسا صریح تاثیر نہیں ہوتی۔ یہ معتدل اور مناسب ہوتی ہے۔ صنفِ مقالہ ہمیں نہ بھولنا چاہئے، ادب کی نہایت سنجیدہ، صالح اور رفیع تحریر ہے جس میں قلم کار کے لئے ضبط، صبر اور متانت اولین شرط ہے۔ جذبات کو شدت کے اظہار میں اس لئے مقالہ نگار کو انتہائی احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ جذبات کی تیزی، جوش و خروش یا شدت سے مقالے کی تاثیر میں فرق آجاتا ہے۔ جس طرح انتشارِ خیال سے نظم کی بندش گھٹ جاتی ہے یا کثرتِ واقعات سے افسانہ کا حلیہ بدل جاتا ہے، جذبات کے افراط و فراوانی سے یہ صاف ستھری تحریر بھی بدصورت اور بدانجام ہو جاتی ہے۔

فکری مقالوں میں داخلیت کی وجہ سے کبھی ہجو و طنز اور درد و رقت کی کیفیتیں بھی نمودار ہو جاتی ہیں۔ یہ مناسب نہیں۔ پر اُن میں اعتدال ضروری ہے بلند پایہ فکری مقالوں میں اُن کا استعمال نہایت ماہرانہ ہوتا ہے۔ اِن میں بالخصوص ہجو اور طنز کے براق و برّاں نمونے ملتے ہیں جیسے شگفتہ لبوں پر خفیف سا تبسم اور چشمِ گوں میں آنسوؤں کی نمی۔

فکری مقالے، مقالوں کی سب سے بزرگ و اعلیٰ قسم ہیں۔ معلوماتی یا تاثراتی مقالوں کی طرح یہاں قلم کار کا مقصد علمیت کی تدریس و تعلیم ہے۔ علمیت کی نوعیت ان تحریروں میں نہایت ارفع و ادق ہوتی ہے۔ یہ ایسی معنویت ہوتی ہے جسے تحریر میں تحلیل کرنا ہر مقالہ نگار کے بس کی بات نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فکری مقالوں کے قاری عوام نہیں خواص ہوتے ہیں۔ یہ وہ غذائیں نہیں جو ہر دل و دماغ کو راس آجائیں ——— اُن کا لکھنے والا ایک بیدار دماغ انسان ہوتا ہے، بڑا مفکر اور زمانہ شناس عالم جس کی پیری میں جھلکتا ہے سحرِ مثلِ شباب! ——— یہ حکمت کو ادب اور ادب کو حکمت میں تبدیل کرنے کا سحر جانتا ہے۔ معیاری فکری مقالے زبان و ادب کی وہ قیمتی دستاویزیں ہیں جو ادب و تہذیب کو لازوال بناتے ہیں۔

(ج) سنجیدگی اور متانت مقالے کی تیسری اہم خصوصیت ہے۔ یہ تحریر بنفسہ نہایت سنجیدہ ہوتی ہے۔ یہ تفریحی یا نشاطی نہیں ہوتی۔ نثری ادب کے تمام اصناف کے مقابلے میں اس لحاظ سے مقالہ کا وجود منفرد ہے۔ مقالہ نگار کسی علمی موضوع جو ادبی یا سائنسی ہو، پر سیر حاصل گفتگو کرتا ہے اور عالمانہ اور فاضلانہ انداز سے کرتا ہے۔ سنجیدگی اور سنجیدہ بیانی اس کی خلقی صفت ہے۔

مقالہ کی سنجیدگی در اصل مقالہ نگار کے مزاج و طبع کا پرتو ہوتی ہے۔ یہ سنجیدگی اس کی شخصیت کے وہ رُخ سامنے لے آتی ہے جس میں بزرگی ہوتی ہے اور بلندی بھی، ایثار ہوتا ہے اور عاجزی بھی۔ اخلاص و دیانت اور راستی فی الحقیقت اس کی سیرتی اوصاف میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ ہمیں کچھ بخشتا ہے بے مانگے دیتا ہے اور ہمارے ظرف کے بموجب دیتا ہے۔ جتنا وہ جانتا ہے، بتاتا ہے اور ہمیں جتنا جاننا چاہئے اس کے بتانے میں دریغ نہیں کرتا، قاری کو اپنی برتری سے مرعوب کر کے اس کے ذہن کو غیر متعلق باتوں میں اُلجھانا، اس کی ذہانت اور فراست کو تھکانا، اس کا شعار و شرافت نہیں۔ وہ الجھنوں کو سلجھاتا ہے، گرہوں کو کھولتا ہے، لاعلموں کو بیدار، کم علموں کو باخبر اور ذی علموں کو ہوشیار و کاردار بناتا ہے۔ یہی مقالہ نگار کی دیانت، راستی اور اخلاص ہے۔

مقالہ نثری ادب کی واحد تحریر ہے جو قلم کار کی عالمانہ و مفکرانہ شخصیت کی ضامن ہوتی ہے۔ یہ تحریر قلم کار کے تبحرِ علمی، وسعتِ نظری، نکتہ رسی، دقیقہ رسی، حافظہ اور خیال آفرینی کی صحت و ثبات کا آئینہ ہوتی ہے۔ اس تحریر میں قلم کار کا صاف ستھرا ذہن، واضح مطمعِ نظر اور تجزیہ حق بیں ریڈیو میڈائل کے نقش کی مثال ہیں ——— مقالہ معلوماتی ہو، یا تاثراتی ہو یا فکری، اگر مقالہ نگار طبعاً و خلقاً سنجیدگی و متانت کے اوصاف سے مبرّا ہے تو وہ مقالہ نگار کے فرائض انجام دینے کا اہل نہیں۔ ایسے مقالہ نگار بجھے چراغ ہوتے ہیں، جن کی جگہ اس معمورہ علم میں ممکن نہیں۔

وہ مقالے جو تحقیقی یا تنقیدی ہوتے ہیں اور جن میں اس نوع کے موضوعات پر اظہار خیال کیا جاتا ہے۔ ان میں خصوصاً اس خصوصیت کی تب و تاب پر پہلی نگاہ جاتی ہے۔ تحقیقی و تنقیدی مقالوں میں قلم کار کے اخلاص و دیانت کی وہی حیثیت ہے جو نمازی کے لئے تازہ وضو کی یا زنِ پاکدامن کے لئے حیا و حجاب! اِن مقالوں میں عدمِ اخلاص و دیانت سے مقالہ نگار سطحی جذبات کا اسیر ہو جاتا ہے۔ وہ عصبیت، ریا، پاسداری اور تنگ نظری کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس میں سہل انگاری، عجلت روی، اور کج بینی آجاتی ہے وہ محنت و مشقت اور عدل و انصاف کی راہ سے دور اور رعایت و مروّت کا بندہ ہو جاتا ہے ——— ادبی تنقید میں مقالہ نگار عادل و منصف کی طرح قلم اٹھاتا ہے وہ دو ٹوک اور بے لاگ باتیں کہتا ہے اور نہایت تیقن کے ساتھ کہتا ہے۔

مقالہ کسی سنجیدہ موضوع پر سنجیدہ تحریر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تحریر دیگر اصناف سے صورتاً و مزاجاً مختلف نظر آتی ہے کہ ان جیسی دلکشی یا جذب و جمال اس میں نہیں ہوتا لیکن اس غیر شاعرانہ یا غیر فسوں کارانہ سرشت کے باوجود یہ تحریر ادبی رنگ و آہنگ سے معرّا نہیں ہوتی۔ تعلیم علم اس کا فریضہ ہے اور اس سے عہدہ برآ ہونا واقعی آسان نہیں ——— اس کا کام محض بلند و بالا اور انجانی و غیر معمولی باتوں کی تفہیم و تشریح نہیں بلکہ ان باکار و سود مند باتوں کو قاری تک حسن و خوبی پہنچانا ہے۔ یعنی ایسی ترسیل کہ یہ باتیں قابلِ قبول ہو جائیں۔ یہی مقالہ نگار کی کامرانی اور سلیقۂ قلم کاری ہے ——— دشوار کام مقالہ نگار انشا کے ذریعہ انجام دیتا ہے۔ انشا کے چٹخاروں سے وہ سوکھی اور بے سواد باتوں کو رس دار بنا دیتا ہے۔ ان کی خشکی اور بے مزگی کو زائل کرتا ہے۔ انہیں عسیر الفہم ہونے سے بچاتا اور اُن کی پذیرائی کو بڑھاتا ہے۔

صنفِ مقالہ میں اس طرح قلم کار کی دُہری شخصیت ہوتی ہے اور عموماً یہ ہم کار نظر آتی ہے اولاً وہ ایک عالم و دانشور ہوتا ہے۔ دوئم ایک ہوش مند انشا پرداز۔ اس کی ناموری اور برآری کے دو اسباب ہیں، دولتِ علم اور قوتِ قلم ۔ انشا پردازی ہر مقالہ نگار کے لیے عمل ناگزیر ہے۔

انشاء شاعر و ناثر کی ایک اعلیٰ لیاقت ہے۔ یہ قدرتی ہنر ہے اور قابل قدر سلیقہ بھی جس کے عمل سے قلم کاری آرٹ کا منصب حاصل کرتی ہے مگر انشا تحریر کے لیے عیب بھی بن جاتی ہے جب یہ تحریر کے مقدور اور اس کے منطقی ضابطے کی پابند نہیں ہوتی ——— مقالہ میں انشا کا غیر مستحسن عمل عموماً دو مواقع پر نظر آتا ہے۔ اولاً جب مقالہ نگار کا ذخیرۂ علم عامیانہ ہوتا ہے، مختصر اور اوسط۔ اُسے زبان و بیان کی قدرت تو حاصل ہوتی ہے، مگر ذہنی طور پر وہ نادار ہوتا ہے کسی سنجیدہ موضوع پر وہ سنجیدگی کے ساتھ اظہار خیال شروع کرتا ہے۔ بات سامنے آتی۔ یہ آگے نہیں بڑھتی، محض گھومتی رہتی ہے اور دُور از کار امور کے جلو میں گھومتی ہے۔ نفسِ تحریر میں کوئی حرکت نہیں ہوتی۔ عبارتیں خوش نما و دل افروز عبارتیں، لکہ ہائے ابر کی طرح صفحۂ قرطاس پر گزرتی رہتی ہیں ——— یہ انداز قلم کاری مقالہ نگاری نہیں، عبارت آرائی ہے۔ یہ خیالات کی تحریری زیب و زینت ہے، محض سج دھج، اور یہی انشا کا ناقص عمل ہے جو اس صنف کے لیے قطعاً مناسب نہیں۔

دوئم جب مقالہ نگار جذباتی ہو جاتا ہے اور انشا جب اس کی قلم کاری پر مسلط ہو جاتی ہے۔ مقالہ نگار کی رہبری پھر دماغ کے عوض دل کے سپرد ہو جاتی ہے۔ وہ خیالات کی بجائے جذبات کی طرف راغب اور بات سے زیادہ بیان کا بندہ ہو جاتا ہے۔ یہ صورت بھی انشا کی بے اعتدالی کا نتیجہ ہے جو اس صنف کے لیے عیب ہے تاثراتی مقالوں میں انشا کے دخیل ہوئے کا بڑا خطرہ رہتا ہے۔

انشا گری مقالہ نگار کی قلم کا ایک رُخ ہے۔ یہ رُخ ہمیں نہ بھولنا چاہئے ضمنی ہے اساسی و اصلی نہیں۔ اس صنف میں انشا کا دخل و عمل ملبوسات میں نفاست کی مثال ہے۔ انشا کے استعمال میں اگر پاسِ احتیاط نہ ہو تو پھر انشا تحریر کے لیے کاجل نہیں کالکھ بن جاتی ہے ——!

(د) مقالہ سنجیدہ اور بلند و برتر خیالات و افکار کا نہایت مرتب و مستحکم تحریری اسلوب ہے اس صنف کی امتیازی خصوصیت جو اس کے اسلوب کو دوسری تمام نثری تحریروں سے منفرد کر دیتی ہے، سالمیت و جامعیت ——— یہ خیالات کی یکجہتی ہے جو ترتیب ذہنی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ مقالہ کی کامیابی کا راز باتوں کی تنظیمی خوش سلیقگی اور تحریری بستگی ہے۔ ہر اچھا مقالہ، خصوصاً فکری مقالہ، ایک پختہ کار اور تربیت یافتہ دماغ کا عمل ہوتا ہے۔

مقالہ نگار چند مخصوص ذہنی قوتوں کا مالک ہوتا ہے۔ یہ قوتیں حافظہ، استدراک، تسویہ اور ذہانت ہیں۔ اس کی قوتِ نقد درجہ اوسط سے بالا ہوتی ہے اور اس میں صبر و ضبط کا مادہ بدرجہ اتم ہوتا ہے۔ دوسرے قلم کاروں کی طرح مقالہ نگار کسی عنوان پر بے ساختہ قلم نہیں اٹھاتا۔ قلم برداشتہ اظہارِ خیال اس کا شعار نہیں۔ وہ احتیاط، اطمینان اور اعتماد کے ساتھ اپنی باتیں سپردِ قلم کرتا ہے۔ ذاتی مطالعہ کی روشنی میں وہ اس عنوان پر اچھی طرح غور و خوض کرتا ہے۔ دماغ میں باتیں آتی ہیں۔ یہ جوش و خروش کے ساتھ نمودار ہوتی ہیں اور کبھی ہجوم و انبوہ کے ساتھ بھی آتی ہیں، لیکن مقالہ نگار ان کے نمود اور ورود سے غافل نہیں ہوتا۔ ان کی یورش اور شورش کو روکتا ہے۔ انہیں رطب و یابس سے پاک کرتا ہے۔ باتوں کو قلم بند کرنے سے پہلے ان کی یکجائی و یکسانی اور ہم آہنگی و پذیرائی پر وہ اچھی طرح توجہ دیتا ہے ——— حافظہ تسویہ و تمیز جیسے عوامل سے لائق و سودمند مواد کی فراہمی اور انتخاب کے کام سر انجام پاتے ہیں۔ دلائل اور بامحل مثالوں کے ذریعہ باتوں کو تنومند اور قابل قبول بنایا جاتا ہے ——— یوں بااہتمام والتزام کے ساتھ ساری مبسوط باتیں عالم خیال سے عالم وجود میں لائی جاتی ہیں۔ بالترتیب و بتدریج یہی خیالات و افکار کی وہ شیرازہ بندی اور تنظیمی خوش سلیقگی ہے جو اس صنف میں سالمیت و جامعیت پیدا کر دیتی ہے اور اس نثری تحریر کو نہایت صاف ستھرے، سجل اور ہموار اسلوب کا حامل بنا دیتی ہے جیسے فرش پر بچھی ہوئی نئی اور بے داغ سپید چادر!

مقالہ کے اس پختہ و مستحکم اسلوب کا اصل سبب وحدتِ خیال ہے ——— اس صنف میں باتوں کا اتحاد ہوتا ہے۔ انتشار نہیں ہوتا، انشائیہ کی طرح۔ مقالہ میں باتیں وحشی و پرافشاں یا آزاد و مختار نہیں ہوتیں۔ یہ وابستہ و پیوستہ ہوتی ہیں اور پھول کی پنکھڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے الگ ہو کر بھی ایک واحد مرکز سے ملحق رہتی ہیں۔ باتیں جو بظاہر مختلف پیراگرافوں میں منقسم نظر آتی ہیں، ان میں نظامِ جسم جیسا گہرا عضویاتی تعلق ہوتا ہے۔ یہ تعلق جسے مقالے کا بنیادی خیال کہئے، جوہرِ مقالہ ہوتا ہے اور اسی جوہر میں مقالہ نگار کا مطمحِ نظر حلول رہتا ہے۔

مرکزی خیال اس تحریر اور تحریر کے رگ و ریشے میں پیوست رہتا ہے۔ یہ مقالہ کے مختلف حصوں کو قابو میں رکھتا ہے اور انہیں مطلق العنان نہیں ہونے دیتا۔ آپ غور کریں جب ہم مقالہ شروع کرتے ہیں۔ اور ہماری نگاہیں تحریر کے مختلف پیراگرافوں سے گزرتی ہیں اور خیالات کے تانے بانے ابھرنے شروع ہونے لگتے ہیں۔ باتیں کھلتی ہیں، بنیادیں کھلتی ہیں اور اختتام پر نفسِ تحریر کے سارے نقوش نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ہماری وہ نگاہ جو ابتدا میں محض عنوانِ مقالہ سے آشنا ہوئی تھی، بعد مطالعہ یہ اس نکتۂ نہاں کو

بھی دیکھ لیتی ہے جو حاصلِ مقالہ یا جوہرِ مقالہ ہے ـــ اس طرح طمانیت و آسودگی میں آپ اتفاق کریں گے، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ نے کچھ پایا، نئی بات، راحت خیز اور فکر بخش زرّیں بات ـــ!!

اچھے اور کامیاب مقالوں میں خیالات کی مختلف منزلیں ہوتی ہیں۔ یہ منزلیں بالترتیب و بتدریج سامنے آتی ہیں اور قاری انہیں زینہ بہ زینہ طے کرتا ہے۔ مقالہ کا چھوٹے چھوٹے متعدد پیراگرافوں میں منقسم ہونا نہ صرف قلم بند خیالات کی نفیس ذہنی تنظیم کی دلیل ہے بلکہ یہ مقالے کے فورم یا اسلوب کی مضبوطی اور استحکام کی علامت بھی ہے۔ مقالے کے اس مستحکم اسلوب کی وضاحت نظم اور غزل کے اسلوب کے موازنہ سے کی جا سکتی ہے۔ غزل کے فورم میں جیسی لچک اور ملائمیت ہے وہ نظم میں نہیں ہوتی۔ اشعارِ غزل کی ترتیب میں تبدیلیاں اور من موجی تبدیلیاں ہمیشہ ممکن ہیں مگر نظم کے اشعار کے مصرعوں میں بھی ردّ و بدل دشوار ہے۔ خیالات کا جیسا ارتقا اور ترسیلِ جذبات کی جیسی متوازن روانی صنفِ نظم میں ہوتی ہے تقریباً اسی پایہ کی ساخت مقالے کے اسلوب میں بھی شرط ہے۔

کامیاب اور معیاری مقالہ میں اچھی نثر کے تمام محاسن موجود ہوتے ہیں چھوٹے نرم رو جملے، ہلکا آہنگ، سادہ و سہل عبارت، متوازن انشا، اور تحقیق پذیر انداز اسی تحریر کے شمائل و خصائل ہیں۔

مقالہ میں کوئی بات مبسوط بات، قلم بند کی جاتی ہے مگر اس صنف کا اسلوب طول طویل باتوں کا متحمل نہیں ہوتا۔ اس تحریر کا سانچہ مختصر ہوتا ہے جیسے قطعہ یا رباعی کی ارضی۔ یہاں باتوں کثرتِ صفحات کی حاجت نہیں۔ طول بیانی اور تفصیلات سے مقالہ نگار کو احتراز لازمی ہے۔ طویل مقالے مقالے نہیں ہوتے یہ بذاتِ خود سالم تصنیفات کی حیثیت رکھتے ہیں جنہیں پڑھنے سمجھنے اور ذہن نشین کرنے سے زیادہ وقت اور زیادہ محنت کی ضرورت پڑتی ہے۔ مقالہ اس کے برعکس، ادب کی وہ مختصر و لبستہ جامع تحریر ہے جو قارئین سے کم از کم وقت کی طالب ہوتی ہے اور اس کے دماغ کو عمدہ و اعلیٰ باتوں سے روشن کر دیتی ہے۔

(۷) نثری ادب میں جو صنف آج سب سے زیادہ معروف و مقبول ہے، وہ افسانہ کے بعد مقالہ ہے۔ اس مقبولیت کا سبب اس صنف کی ذہن پذیری اور جذب و اثر ہے۔ یہ وہ خمخانۂ ادب ہے جس کا دروازہ ہر بادہ نوش کے لئے ہمیشہ کھلا رہتا ہے اور جہاں بادۂ قدح خوار دیکھ کر بڑھایا جاتا ہے ـــ فی زمانہ مسائلِ حیات کے ہجوم اور نت نئی باتوں کی کثرت نے مقالہ کو نہایت کشادہ اور وسیع کر دیا۔ مقالہ نگاری وقت کا ایک اہم مطالبہ ہو گئی ہے جیسے یہ ہماری خواندگی کا ایک تقاضہ ہو گئی ہو۔ وقت کی برق روی سے آج صدیاں دہائیوں میں سمٹی جا رہی ہیں گوناگوں بدلتے ہوئے حالات نے ہمیں مجبور کر دیا ہے کہ ہم زمانہ کی روش و رفتار سے باخبر رہیں گرد و پیش کے معاملات و مرحلات کو جانیں اور سوچیں۔ ان اہم تبدیلیوں سے جو با برکات ہیں استفادہ حاصل کریں، انہیں اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کی ترقی کے لئے تجویز کریں ـــ اس عظیم مقصد کے لئے مقالے اور صرف مقالے ہی ہمارے کام آ سکتے ہیں۔ کائنات کے موجود و مشہود کا نقشہ ہو یا سیرت و سرشت کی تعمیر و تشکیل کا مسئلہ ہو ہر نقشہ اور ہر مسئلہ مقالہ کے براق شیشے سے صاف صاف دیکھا جا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ صنف ہر ہوشمند کے معمولات کا ایک جزو لاینفک بن گئی ہے۔ ہر طبقہ اور طبیعت کا انسان مقالہ کا مطالعہ ضرور کرتا ہے، خواہ یہ مقالہ سیرِ دنیا کی دعوت دے یا سفرِ آخرت کا پیغام سنائے ـــ!

موضوع کے بموجب مقالہ نگار کے لئے کوئی پابندی نہیں۔ وہ مکمل آزاد ہوتا ہے۔ ادبی تخلیقات و تحقیقات علمی مضامین، سائنسی ضابطے و مسائل، فنون اور ان کی صورتیں غرض ہماری متمدن زندگی کا ہر باب کبیر و صغیر مقالہ نگار کے لئے ہموار رہتا ہے۔ وہ اگر ان باتوں کو سمجھتا ہے۔ اپنی سمجھی بوجھی بات کو دوسرے تک پہنچاتا ہے، اسے باتوں کی پہچان اور پرکھ کی تمیز ہے، تو وہ مقالہ نگار کے فرائض بحسن و خوبی انجام دے سکتا ہے۔

موضوعات کے اس تنوع اور نگارنگی کی وجہ سے مقالے آج کئی مختلف ٹولیوں میں بٹ گئے ہیں۔ صفحاتِ گزشتہ میں مقالہ کی جن قسموں (یعنی معلوماتی، تاثراتی اور فکری) کا ذکر کیا گیا تھا۔ یہ تقسیم قلم بند باتوں کی مخصوص نوعیت کے تحت کی گئی تھی۔ اس تقسیم سے دراصل طبیعت کی اس خاصیت کا بیان مقصود تھا جو مزاجاً اور کچھ حد تک سیرۃً ان سنجیدہ تحریروں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیتی ہے ـــ بادی النظر میں ہر مقالہ اپنے موضوع اور عنوان کے تحت کسی ذیلی گروپ میں داخل رہتا ہے۔ مثلاً مذہبی مقالہ، سیاسی مقالہ، تاریخی مقالہ، تنقیدی مقالہ، تحقیقی مقالہ، سیرتی مقالہ، وغیرہ اور علیٰ ہذا القیاس مختلف سائنسی مضامین سے متعلق مقالے۔

مقالوں کی مقبولیت اور مقالہ نگاروں کے فروغ کے کئی اسباب ہیں۔ اولاً طباعت کی جدید سہولتیں ہیں۔ یعنی، ہر طرح کی نئی و غیر معمولی باتیں نہ صرف واضح اور مکمل طور پر ضبطِ تحریر میں آ جاتی ہیں۔ بلکہ مطبوعہ نقش و تصویر اور جدول و خاکہ کی مدد سے ان انجانی و اوق باتوں کو مقبولِ عام اور موثر بھی بنا دیا جاتا ہے۔ دوئم، نشر و اشاعت کی آسانیاں ہیں جن سے باتوں کو ترسیل و رسائی کی نئی قوت حاصل ہو گئی ہے۔ اب ہمیں عمدہ اور اعلیٰ مقالات نہ صرف پڑھنے کو بہ آسانی مل جاتے ہیں، بلکہ ان بلند و بہتر باتوں کو بالمشافہ سننے کے مواقع بھی نصیب ہیں ـــ اس ضمن میں ٹیپ ریکارڈ کا ذکر ضروری ہے جس سے اس صنفِ ادب کو مستقبل قریب میں خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ اس جدید ایجاد کے ذریعہ متکلم کی باتوں اور خیالات کو محفوظ کر لینا مطلق دشوار نہیں اس لفظ جتنا

باتوں کو تحریر میں منتقل کرکے مقالہ کی صورت دیدینا بھی سہل ہے، اور یوں ہر تقریر یا خطبہ یا فی البدیہہ گفتگو مقالہ کا اسلوب حاصل کر سکتی ہے ــــ مگر، یہ طریقہ کار اس صنف ادب کے زوال کا سبب بن جائے گا۔ ہمیں نہ بھولنا چاہیے کہ مقالہ نگار مقرر یا خطیب یا صحافی نہیں ہوتا۔ یہ صحیح ہے کہ مقرر، خطیب یا صحافی کی طرح مقالہ نگار بھی کسی مخصوص موضوع پر اظہار خیال کرتا ہے اور عالمانہ انداز سے اس موضوع پر روشنی ڈالتا ہے، مگر ان دونوں کی شخصیتیں اور منصب علیحدہ ہیں اور ان کے اغراض و اسالیب بھی مختلف ہیں۔ مقالہ نگار کسی وقتی مطالبہ یا مسلک کے تحت اظہار خیال نہیں کرتا اور نہ وہ فی البدیہہ گہر افشانی کرتا ہے اس کا اسلوب تحریری ہوتا ہے تکلمی نہیں ہوتا۔

نئے علوم و مضامین کی دریافت سے بھی مقالہ کے عروج و مقبولیت میں بڑی مدد ملی ہے۔ ہماری زندگی اس قدر پھیل گئی ہے اور مادی ترقی نے زندگی کو اس قدر میکانکی بنا دیا ہے کہ انسان کا دماغ کل کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔ مجبوراً اب ہم جزو کی جانب زیادہ مائل ہو گئے ہیں۔ ہماری خرد مندی، یہ ایک تلخ حقیقت ہے، اب خود بیں ہو گئی ہے اور لازماً ہم تخصیص کار کی طرف ضرورت سے زیادہ متوجہ ہوتے جا رہے ہیں۔ ادب میں بھی یہ روش جڑ پکڑ چکی ہے۔ صنفِ مقالہ میں تخصیصیت عام ہو گئی ہے۔ جنسیات، معاشیات، اور سائنس جیسے مخصوص رسائل کے اجرا سے مقالہ کو زیادہ توانائی نصیب ہو سکتی ہے۔ جو اس صنف ادب کے لئے بڑی اچھی علامت ہوگی۔

ان ساز گار حالات کے باوجود ایسے مقالوں کی تعداد آج بھی حوصلہ شکن ہے جو ایوانِ ادب میں روزن کی مثال ہوں جنہیں کلید گنجینۂ علم کہا جا سکے اور جو ادبی دستاویز کا مرتبہ پا سکیں۔

بات یہ ہے کہ جس طرح پچھلی تین چار دہائیوں تک ہمارے شعراء "نظم" کے صنفی اور فنی تصور سے نابلد تھے اور طبعاً و خلقاً یہ غزل نگار تھے تقریباً یہی صورت ہمارے نئے اور جدید مقالہ نگاروں کی ہے۔ "مقالہ" اور "مضمون" کے امتیاز و افتخار کی بات ان کے لئے جیسے بے معنی بات ہے ــــ اگلے شعراء جس طرح ہم معنی اشعار پر محض ایک سرخی دے کر اس شعری تخلیق کو نظم سمجھ لیتے ہیں۔ اسی طرح کسی سنجیدہ علمی و ادبی موضوع پر مختصر نثری قلم بندی عام طور پر "مقالہ" سے موسوم کر دی جاتی ہے ــــ بے ترتیبی، انتشار خیال، طوالت، رمزیت، اختصار کی افراط تفریط، ارتقائے خیال کا فقدان، غیر واضح زاویہ نظر، نیم پخت و مجہول، مبہم، نارسا اور عامیانہ باتیں، لاحاصل حوالے اور مثالیں، شخصیت کی نمود و نمائش، بے جا مبالغہ آمیزیاں ــــ آج کے مقالوں کی عام روپ رکھا رکھا۔

پنڈت نہرو

امن عالم کے عقیدے سے تھا نہرو جی کو پیار
امن کی خاطر انہوں نے زندگی کر دی نثار
انکے دم سے اہل بھارت کا ہوا رتبہ بلند
ذات اُن کی تھی یقیناً باعثِ صد افتخار
ملک کی عزت کا رہتا تھا انہیں ہر دم خیال
وہ فدائے ملک و ملت تھے وطن کے جاں نثار
پیار کی خوشبوئے دُنیا کو معطر کر دیا
ان کی ہستی واقعی تھی اک شگفتہ لالہ زار
خوش بیاں، شیریں دہن، رنگیں نوا، جادو رقم
اُن کے اوصاف حمیدہ کا نہ تھا کوئی شمار
وہ کسی حالت میں بھی تفریق کے حامی نہ تھے
سب سے یکساں تھا سلوک اُن کا محبت تھا شعار
رہنمائی جو خلوصِ دل سے دنیا کی کریں
ہستیاں ایسی نہیں آتیں جہاں میں بار بار
چپے چپے پر تھا رقصاں انکے دم سے رنگ و نور
فیض سے ان کے گلستان وطن تھا پُر بہار
ہر قدم اُن کا رہا دُنیا میں یکسر کامیاب
وہ تھے میدانِ سیاست کے پُرانے شہسوار
سب کے سب ملکی مسائل اُن کے تھے پیش نظر
جن کو حل کرنے کی خاطر رہتے تھے وہ بے قرار
زندگی سادہ تھی ان کی اور اونچا تھا خیال
وہ تھے ایثار مجسم اور سراپا انکسار
چالبازی اور ریاکاری سے وہ رہتے تھے دُور
انکی ہستی صدق کے انوار سے تھی جلوہ بار
پھول جو پژمردہ تھے وہ مسکرانے لگ گئے
باغ قومی پر انہیں کے دم سے آیا تھا نکھار
کر دیا روشن انہوں نے پھر محبت کا چراغ
نور سے جس کے ہوئی ہے بزم ہستی جلوہ زار

روشن پٹیالوی

دو ہاتھ پانچ کھیت

بالی چوپڑا

راجو کی ماں نے دو چار روٹیاں کات لیں تو کتّو سے کہنے لگی: بیٹا اگر دال پک گئی ہو تو اپنے بھیا کے لئے تھوڑا سا آٹا گوندھ دے۔ راجو کی تو روٹی بہت خوش ہوکر نہیں کھاتا سویرے بھی اس نے مشکل سے آدھی روٹی کھائی تھی بھوک نہیں مجھوک نہیں جب بھی پوچھو یہی بات کہتا ہے۔ نجانے کس چیز کے سہارے جی رہا ہے یہ — کو دال کو دیکھتے ہوئے کہنے لگی "ماں مجھے تو کچھ بیمار کھائی دیتا ہے زیادہ تر چپ چاپ ہی رہتا ہے پہلے تو ایک پل کے لئے بھی چین سے نہیں بیٹھتا تھا۔ پر اب تو صبح سویرے ہی کھیتوں کو نکل جاتا ہے اور شام ڈھلے گھر لوٹتا ہے۔ ماں چاہے نہ مان راجو رات کو بھی جاگتا رہتا ہے۔ نہ جانے کن خیالوں میں ڈوبا رہتا ہے اس کو کوئی نہ کوئی فکر ضرور ہے — "

اور یہ سچ ہے کہ راجو کو ایک نہیں کئی فکر تھے اس کی بھوک ختم ہوگئی تھی اس کا دل بجھ چکا تھا اس کی نیند حرام ہوگئی تھی وہ زیادہ چپ ہی رہتا تھا اس کی آنکھوں کی چمک مدھم پڑ چکی تھی اس کے چہرے کی سرخی پھیکی پڑ چکی تھی وہ کسی گہری سوچ میں ہمیشہ ڈوبا رہتا تھا۔ اس کی آنکھوں کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے وہ ابھی ابھی رویا ہو

راجو کی مرجھائی صورت اور بجھی سی حالت نے گاؤں والوں کو غلط فہمی میں ڈال دیا تھا کہ شاید راجو کو کسی سے پیار ہوگیا ہے۔ اس کے دوست اس کو مذاق ہی مذاق میں مجنوں بھی کہنے لگے۔ مگر کوئی بھی راجو کی خاموشی کے بارے میں کچھ نہ جان سکا۔

راجو کو چنتا کسی ہیرے بچھڑنے کی نہیں بلکہ اپنی ماں کی صحت کی تھی۔ اس کے دل میں جو غم تھے کسی لڑکی کے جھوٹے وعدوں کے نہیں بلکہ اپنی جوان بہن کی شادی کے تھے۔ اس کی نیند حرام تھی کسی کے آنے کے خیال سے نہیں بلکہ شاہ کے قرض کی چبھن سے، وہ قرض جو اس کے باپو نے آج سے ۲۰ برس پہلے لیا۔ وہ قرض جس کو چکانے کے لئے راجو نے اپنی بہن کا بیاہ روک رکھا تھا ماں کا علاج نہ کرا سکا تھا اور اسی قرض نے راجو کی امنگوں کو جوان ہونے سے پہلے ہی مرجھا دیا تھا۔

راجو کے پانچ کھیت شاہ کے پاس گروی پڑے تھے۔ شاہ کو فکر تھی کھیت ہڑپ کرنے کی اور راجو کو چنتا تھی اپنی دھرتی کو شاہ کے کھاتے سے آزاد کرانے کی۔ دونوں ہی اپنی اپنی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ لوگ کہا کرتے۔ یہ تو شیطان اور انسان کا مقابلہ ہے دیکھیں جیت کس کی ہوتی ہے۔ کچھ دنوں بعد راجو نجانے کیا سوچ کر شاہ کی حویلی گیا۔ اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔ شاہ جی میں آپ کے پاس ایک عرض لے کر آیا ہوں۔ اگر آپ مان جائیں تو میں آپ کا احسان جیون بھر نہ بھولوں گا۔" شاہ نے بے پروائی سے جواب دیا "بول کیا کہنا چاہتا ہے تو —" راجو اور بھی نرمی سے بولا — "شاہ جی میری بہن جوان ہے اور شادی کے لئے ایک لڑکا بھی اچھا سا مل گیا ہے مگر اس کے ہاتھ پیلے کرنے کے لئے میرے پاس پیسے نہیں ہیں" شاہ نے بات کاٹتے ہوئے جواب دیا "تو کیا میرے پاس کوئی خزانہ رکھا ہے۔ میں تم لوگوں کی ہر روز کی ضرورت کہاں تک پورا کروں گا —" راجو بولا "میں آپ سے اُدھار مانگنے نہیں آیا بلکہ یہ کہنے آیا ہوں کہ اگر آپ ایک سال کے لئے مجھ سے قرض وصول نہ کریں تو میں اسی رقم سے لڑکی کے ہاتھ پیلے کر دوں گا کیونکہ شادی ہو جانے تو پھر مجھے کوئی فکر نہیں ہم دونوں ماں بیٹے سوکھی روٹی کھا کر آپ کی رقم چکا دیں گے" شاہ نے راجو کی بات سن کر گرگٹ کی طرح کئی رنگ بدلے اور کہنے لگا کیوں بھئی کیا ہمارا مال چوری کا ہے۔ میں تو ایک سال کیا ایک مہینے کے لئے بھی نہیں رک سکتا۔

راجو کے دل پر گہری چوٹ لگی اور وہ اپنے سپنوں کی ارتھی سمیٹ کر حویلی سے باہر نکل آیا — اس دن سے راجو اور بھی چپ رہنے لگا۔ گاؤں والے اس کے چپ کو پیار کا نام دینے لگے۔ اور ماں اسے بیمار سمجھتی مگر کسی کو بھی اس کے اصلی روگ اور دل کے درد کا پتہ نہ چل سکا۔

راجو شام ڈھلے تک اپنی کھیتوں کی منڈیر پر بیٹھا رہتا اور کیاریوں کی طرف

دیکھتا رہتا مگر اُس کے دل کو تسکین اور آنکھوں کو ٹھنڈک کبھی نصیب نہ ہوئی آخر ربیع کی فصل بونے کا وقت آ گیا۔ راجو نے اپنے بیلوں کو ہاتھ کی تھاپ دے کر پچکارا بھگوان کا نام لے کر ہل چلانا شروع کر دیا بیلوں کے گھنگروؤں کی آواز میں راجو نے اپنے لوک گیتوں کی آواز کو شامل کر دیا۔ ہل چلتا گیا پسینہ بہتا گیا اور مٹی مکھن بنتی گئی۔ اُس نے دیسی اور ولایتی کھاد ڈالا۔ بیج چھڑکا اور پلیٹا پھیر دیا۔

فصل نے جنم لیا تو راجو نے گوڑائی کر دی۔ اس کی فصل ناگ کی طرح اُٹھی اور کسی الھڑ جوانی کی طرح جھومنے لگی۔ راجو نے اپنی فصل کو دیکھا تو اُسے یوں لگا جیسے اُس نے زندگی میں پہلی بار نشہ کیا ہو۔

راجو اپنی فصل کو جوں جوں پانی دیتا توں توں اُس کی فصل ہری بھری نکلتی آتی۔ اُس کی فصل نے سارے علاقے میں دھوم مچا دی۔ اب تو راجو خوش تھا۔ اُس کی آنکھوں کی چمک اور چہرے کی رونق لوٹ آئی تھی وہ سوچنے لگا اگر بھگوان نے سب ٹھیک کر دیا تو اس دفعہ شاہ کا اُدھار ضرور چکا دوں گا۔ کمو کے ہاتھ پیلے ہو جائیں گے اور ماں کا علاج کسی امرتسری حکیم سے کراؤں گا۔ وہ مستی میں آ کر گنگنانے لگا۔

جو علاقہ تھا کبھی ساگر بڑا ایک ریت کا
آج نقشہ بن گیا ہے لہلہاتے کھیت کا

راجو دیر تک مینڈھ پر بیٹھا اپنے کھیتوں کی ہریالی کو کسی مندر کے پجاری کی طرح دیکھتا رہتا۔ لمبی لمبی گیہوں کی فصل اُس کو کبھی کبھی بالکل اُس حسینہ کی طرح لگتی جو اپنے گیلے بالوں کو سکھانے کے لئے کھیتوں میں آ گئی ہو۔

ایک دن راجو اپنے بیلوں کے ساتھ بیٹھا دکھ سکھ کی باتیں کر رہا تھا کہ چودھری جی زراعت آفیسر کو لے کر اُس کے کھیتوں میں آ گئے۔ چودھری جی کہنے لگے۔ "راجو تمہاری فصل کی تعریف سُن کر اپنے زراعت انسپکٹر صاحب بھی آ گئے ہیں۔ راجو ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "چودھری جی سب بھگوان کی کرپا ہے۔ ورنہ میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں"

زراعت انسپکٹر ہنسنے لگا اور راجو کی پیٹھ تھپتھپاتا ہوا بولا۔ "راجو ہم تمہاری فصل کے ایک نپے تلے حصے میں سے گیہوں کی بالیاں توڑ کر لے جانا چاہتے ہیں۔ ذرا دیکھیں تو فی ایکڑ کیا پیداوار ہوتی ہے تمہاری فصل کی۔" راجو بولا — "آپ مالک ہیں چاہے ساری بالیاں ہی توڑ کر لے جائیں — اور زراعت والے اپنے حساب سے بالیاں توڑ کر لے گئے۔ راجو لوک گیت گاتا اور بیلوں کو متا متا کرتا ہوا گھر لوٹ آیا —

کچھ دنوں بعد بیساکھی آئی۔ ڈھول بجا کسانوں نے لوک گیت کے ساتھ بھنگڑا لیا اور فصل کی کٹائی شروع ہوئی۔ راجو نے بھی کٹائی کر کے اپنا کھلیان بنا دیا۔ گھر لوٹتے ہوئے راستہ میں اُس نے اپنے خیالوں کی دنیا میں شاہ کا اُدھار چکا دیا کمو کا بیاہ کیا اور ماں کا علاج بھی کسی اچھے حکیم سے کرا لیا۔ اُس نے خیالوں میں ہی اپنے بیلوں کے نئے گھنگرو خریدے اپنے نئے کپڑے بنوائے اور رامو حلوائی کی دکان سے گرم گرم جلیبیاں کھائیں۔ اُس کو لگا جیسے وہ سنسار میں سب سے زیادہ سکھی ہو۔

گھر پہونچا تو ماں اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ کمو نے راجو کو خوش دیکھا تو کہنے لگی۔ بھیا فصل بیچ کر مجھے سونے کے بُندے لے کر دینا نہیں تو میں روٹھ جاؤں گی۔ راجو کو اپنی بہن کی باتیں بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ وہ کمو کی چوٹیا کھینچ کر کہنے لگا۔ کمو اس بار تمہارے لئے سب کچھ آئے گا کپڑے، گہنے اور ایک چھیل چھبیلا دولہا بھی۔

کمو کچھ نہ بولی اور بھیا کے لئے تھالی پروس کر لے آئی۔ راجو ہاتھ منہ دھو کر بیٹھ گیا۔ ابھی اُس نے روٹی کا نوالہ منہ میں ڈالا ہی تھا کہ کچھ گاؤں والے بھاگے بھاگے آئے اور کہنے لگے۔ راجو تمہارے کھلیان کو کسی نے آگ لگا دی ہے یہ سنتے ہی راجو کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ گیا۔ اُس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ دماغ نے چکر کھایا اور وہ بیہوش ہو کر گر گیا۔ بہت دیر بعد جب اس کو ہوش آیا تو وہ بھاگا بھاگا اپنے کھیتوں کو گیا مگر وہاں راکھ کے سوا اب بچا ہی کیا تھا۔ راجو کی اُمنگیں ایک بار پھر کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گئی تھیں۔

سارا گاؤں راجو کے دکھ میں شامل تھا اکیلا راجو نہیں رو رہا تھا شیطان نے انسان کی کمر توڑ دی تھی۔ مگر بڑ کے درخت کے نیچے بیٹھا سادھو بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ جیت انسان کی ہوگی۔ کمو کا پھول جیسا چہرہ رو رو کے مرجھا گیا تھا اور ماں مر مر کے جی رہی تھی۔

راجو اپنے مکان کی چھت پر بیٹھا تھا کہ چودھری بھاگا بھاگا آیا اور کہنے لگا۔ راجو بدھائی ہو۔ چودھری کی بدھائی سُن کر راجو تڑپ اٹھا اور تلملا کر کہنے لگا۔ کیوں چودھری جی کیا کچھ کسر باقی رہ گئی تھی جو جلے پر نمک چھڑکنے آئے ہو۔ چودھری ہنس پڑا اور کہنے لگا تم جو چاہو کہہ سکتے ہو کیونکہ جتنے دکھ تمہیں اٹھانے پڑے ہیں کسی اور کو نہیں مگر اب تمہارے دکھ ہمیشہ کے لئے کٹ جائیں گے۔ راجو تمہارے کھیتوں کی فی ایکڑ پیداوار دیش بھر میں سب سے زیادہ ہوئی ہے اس لئے سرکار نے تمہیں پانچ ہزار روپیہ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ جلدی کرو محکمہ زراعت والے تمہیں دہلی پہنچانا چاہتے ہیں۔

راجو کے چہرے پر کھیتوں کی ہریالی پھر چھا گئی۔ اُس کا دل بلیوں اچھلنے لگا وہ خوشی سے جھومتے ہوئے بولا — چودھری جی بھگوان کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں اور دونوں ہاتھ جوڑ کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔

اے کمال نئی دہلی

رنگ برنگے ڈبوں میں بند گھی میں ملاوٹ
ہوسکتی ہے۔

باسمتی چاولوں کی بوری میں
بہت سی مٹی اور دیگر ایسی ہی فالتو
چیزیں ہوسکتی ہیں۔

اچھے نظر آرہے انڈے اندر سے گندے
نکل سکتے ہیں۔

بہترین مال خریدنے کے لئے

ایگ مارک کی مہر ضرور دیکھئے

تمام ایگ مارک مصنوعات کی لیبل
پر چھپے نمبروں کے مطابق درجہ
بندی کی جاتی ہے۔
بڑھیا اور خالص اشیاء کیلئے
ایگ مارک
مصنوعات ہی خریدیئے۔

AGMARK
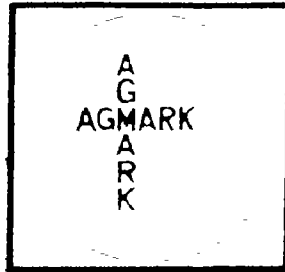
ایگ مارک
چیز کے بڑھیا ہونے کا
ثبوت ہے
پوری جانچ پڑتال کے بعد
یہ گارنٹی دی جاتی ہے

چھٹی حس

سیوک شرما

غیب میں جھانکنے کی خواہش انسان میں ازل سے رہی ہے اور اس تمنا کی تکمیل کے لئے انسان نے کئی قسم کے پاپڑ بیلے ہیں جبکہ اس کے حصول کا بہترین ذریعہ چھٹی حس کے روپ میں خود انسان کے اندر موجود ہے۔

چھٹی حس، حواسِ خمسہ سے بالاتر، انسان کی وہ مخفی صلاحیت ہے جو غیب کے اسرار ظاہر کرتی ہے۔ کچھ ہی برس پہلے چھٹی حس کے بارے میں کچھ کہنا سننا اپنے آپ پر حماقت اور توہم پرستی کا لیبل لگوانے کے مترادف تھا مگر اب تو سائنسی طور پر نہایت ترقی یافتہ ممالک میں سرکاری سطح پر اس سلسلے میں تحقیق اور تجربات کے پروگرام جاری ہیں۔ امریکہ میں ڈیوک یونیورسٹی کے ڈاکٹر جے۔ بی۔ رائن DR. J.B.Rhine اور دوسرے ماہرینِ نفسیات نے چھٹی حس سے متعلق ٹھوس اور گراں قدر تحقیق کی ہے اور روسی سائنس دانوں نے روزکلیشوا نامی روسی خاتون پر، جس میں آنکھوں کے علاوہ ہاتھ کی انگلیوں سے بھی دیکھنے کی صلاحیت ہے آزمائشی تجربات سے سائنسی تحقیق کی دنیا میں نئے باب کا آغاز کیا ہے۔

دنیا کے بارے میں ہماری واقفیت کا دارومدار ہمارے حواسِ خمسہ یعنی دیکھنے، سننے، سونگھنے، چھونے اور چکھنے کی حسوں پر ہے۔ زمانہ حال میں ہمارے آس پاس جو کچھ موجود یا ظاہر ہے اس کا علم ہمیں حواسِ خمسہ کے ذریعہ ہوتا ہے لیکن جو ظاہر نہیں ہے یا جو ابھی مستقبل کے شکم میں ہے وہ ہمارے حواسِ خمسہ کی پہنچ سے باہر ہے۔ لہٰذا اس سے متعلق ہم بالکل بے بہرہ ہیں۔ جو کچھ ہمارے حواسِ خمسہ کی کسوٹی پر پورا نہیں اُترتا اس کے وجود یا حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے ہم تیار نہیں ہوتے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ حقیقت ہمارے علم ہی کی حد تک محدود ہو بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جو کچھ ہمیں معلوم نہیں وہ اس کی نسبت کہیں زیادہ ہے جس کا ہمیں علم ہے۔ نیوٹن کی طرح دنیا کے بڑے سے بڑے مفکروں سائنس دانوں کو زندگی بھر کے مطالعہ اور تحقیق کے بعد یہی کہنا پڑا کہ وہ علم کے بے پایاں سمندر کے کنارے صرف کنکر ہی چن سکے ہیں۔

جہاں پر ہماری پانچوں حسیں بے بس ہو کر رہ جاتی ہیں وہاں سے چھٹی حس کی فرماں روائی شروع ہوتی ہے۔ یہ ہماری چھٹی حس ہے جو غیب یعنی نامعلوم دنیا کے اسرار سے ہمارے لئے پردہ ہٹاتی ہے اور مستقبل میں پیش آنے والے واقعات سے ہمیں آگاہ کرتی ہے۔ مثال کے طور پر مشہور جرمن جنرل رومیل کی زندگی کا یہ واقعہ ہی لیجئے۔

دوسری جنگِ عظیم میں جنرل رومیل ایک بار لیبیا کے صحرا میں اپنے ایک ماتحت افسر کے ساتھ جنگی صورتِ حال کا جائزہ لے رہے تھے۔

دفعتاً جنرل رومیل نے اپنے ساتھی کو بازو سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے کہا۔ "بھاگو یہاں خطرہ ہے" تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ انہیں اپنے پیچھے ایک دھماکہ سنائی دیا۔ پیچھے مڑ کر انہوں نے دیکھا کہ ایک بم عین اس جگہ پر گرا تھا جہاں چند لمحے قبل وہ دونوں کھڑے تھے۔ اگر وہ وہاں سے نہ ہٹتے ہوتے تو دونوں کے پرخچے اڑ گئے ہوتے۔ محض اتفاق؟ ممکن ہے ایسا ہی ہو لیکن انگریز بریگیڈیر ڈیسمنڈ ینگ نے جنرل رومیل کی سوانح حیات میں لکھا ہے کہ جنرل موصوف کی زندگی میں ایسا اتفاق بارہا ہوا کہ انہیں ناگہانی آفت کا عین وقت سے پہلے علم ہو گیا اور وہ موت کا شکار ہونے سے بال بال بچ گئے۔ اس میں ان کی عقل یا ہوشیاری کا دخل نہیں تھا بلکہ یہ کرامات جنرل رومیل کی غیر معمولی طور پر تیز چھٹی حس کی تھی۔

چھٹی حس کیا ہے اس کی صحیح تعریف یا تشریح مشکل ہے اس کا تعلق نہ تو دل سے ہے اور نہ دماغ سے۔ نہ تو اس کا دلیل یا منطق سے کوئی واسطہ ہے اور نہ ہی جذبات سے کوئی سروکار۔ اس لئے اسے کوئی مخصوص تکنیکی نام دینے کی بجائے سمجھنے کی غرض سے اگر ہم اسے اندر کی آواز کہیں تو زیادہ آسان اور بہتر ہوگا۔ اور عام بول چال میں اسے دل کی آواز کے نام سے ہی پکارا جاتا ہے۔ آپ چاہے اسے تحت الشعور کے ساتھ منسلک کر دیں یا روح اور ضمیر کے ساتھ اس کا رشتہ جوڑ دیں، بہرحال یہ اپنے اندر کی آواز ہے جو بڑی غیر مبہم اور واضح ہوتی ہے۔

اس اندر کی آواز یا چھٹی حس کی بنیاد توہمات یا اٹکل پچو قیاس آرائیوں پر نہیں بلکہ ٹھوس اور مسلمہ سائنسی حقائق پر ہے۔ سائنس یہ مانتی ہے کہ ہماری دنیا لہروں کا ایک مجموعہ ہے۔ مسلسل اور متواتر حرکت کرنے والے ذرات پر مشتمل اس دنیا کی ہر جاندار اور غیر جاندار شے سے ہر وقت لہریں یا شعاعیں ابھرتی رہتی ہیں۔ ان میں سے کچھ بلکہ بہت سی، لہریں اس قدر لطیف ہوتی ہیں جنہیں دیکھنے، سننے یا چھو کر محسوس کرنے کی اہلیت انسانی آنکھ، کان یا کھال میں نہیں ہے۔ مثلاً مقناطیس کی جو شعاعیں لوہے کو اپنی طرف کھینچتی ہیں، وہ انسانی آنکھ کو دکھائی نہیں دیتیں لیکن مقناطیسی شعاعوں کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اینسی فالوگرافک میٹر Encephalographic meter آلے کے ذریعے دماغ میں ابھرنے والی خیالات کی لہروں کو ریکارڈ کیا جا چکا ہے۔ اب تو ڈاکٹر کلنر Dr. Kilner نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جس طرح آگ سے گرمی کی شعاعیں نکلتی ہیں اسی طرح ہمارے جسم کے ہر عضو سے ہر وقت لہریں نکلتی رہتی ہیں۔

فضا میں ان گنت لطیف لہریں تیرتی رہتی ہیں۔ ان میں ہماری اپنی دنیا کی ہر شے سے ہر لمحہ نکلنے والی لہریں بھی شامل ہیں۔ گوناگوں قسم کی ان لہروں کے ملاپ یا ٹکراؤ سے فضا میں تغیر و تبدل کے ساتھ ساتھ ہماری دنیا میں بھی ہر لمحہ تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ اگرچہ ہمارے حواس خمسہ ان لہروں کا علم حاصل کرنے سے قاصر ہیں مگر جس طرح روشنی اور آواز کی لہروں کی پہچان کے لئے ہمارے جسم میں آنکھ اور کان جیسے اعضا ہیں اسی طرح قدرت نے لطیف تر لہروں اور ان کے اثرات کو محسوس کرنے کا بندوبست بھی انسانی جسم میں کر رکھا ہے۔ یہ کام ہماری چھٹی حس انجام دیتی ہے۔

ماہرین کے خیال میں انسانی جسم میں چھٹی حس کا اہم ٹھکانہ ریڑھ کی ہڈی کے دونوں طرف بچھے ہوئے اعصابی ریشے ہیں۔ عصبی ریشوں کا یہ سلسلہ جسے Sympatnetic nervous system کہتے ہیں ماحول میں منڈلاتی ہوئی مختلف قسم کی لطیف لہروں اور شعاعوں کا علم ہمارے دماغ تک پہنچاتا ہے اور ہمارا دماغ ایک ایسا ریڈیو ہے جو پیغامات نشر بھی کرتا ہے اور وصول بھی۔

چھٹی حس کا ظہور مختلف صورتوں میں ہوتا ہے۔ مثلاً عام طور سے دکھائی نہ دینے والی اشیاء، جیسے روحوں وغیرہ کا دیکھنا، غیبی آوازیں سننا، دوسروں کے خیالات جاننا اور اپنے خیالات دوسروں تک پہنچانا۔ خواب کے ذریعے مستقبل اور مخفی موجودات کا علم اور اچانک احساس یا خواہ مخواہ آنے والے خیال کے ذریعے غیب کا علم ہونا۔

پہلی نظر میں شاید یہ باتیں شعبدہ بازی یا کالے علم کا تذکرہ معلوم ہوں لیکن ذرا غور کرنے پر یہ واضح ہو جائے گا کہ ہم ایک حقیقی انسانی قوت کا ذکر کر رہے ہیں جو عجیب و غریب اور ناقابل یقین اس لئے لگ رہی ہوگی کیونکہ انسان نے اپنی اس حیرت انگیز صلاحیت کی طرف بہت کم توجہ دی ہے۔

غیبی اشیا دیکھنے یا آوازیں سننے اور دوسروں کے خیالات جاننے یا اپنے خیالات دوسروں تک منتقل کرنے کی اہلیت قدرت کے خاص عطیے کے طور پر خال خال اشخاص ہی میں پائی جاتی ہے لیکن ایسے اشخاص کی تعداد خاصی ہے جنہیں ان کے ساتھ پیش آنے والے اہم واقعات کی پیش آگاہی خواب میں ہو جاتی ہے اور خواہ مخواہ کے خیال یا اچانک احساس کے ذریعے غیبی خیالات کا علم ہونے کی کم و بیش صلاحیت تو قدرت نے ہر انسان کو دے رکھی ہے۔ زیر نظر مضمون کا تعلق خاص طور پر موخر الذکر حالتوں سے ہے۔

لارڈ ڈفرن کا وہ خواب کافی مشہور ہو چکا ہے جس کی وجہ سے وہ موت کے منہ میں جانے سے بچ گئے تھے۔ ہندوستان کا وائسرائے بننے سے پہلے لارڈ ڈفرن فرانس میں انگلستان کے سفیر تھے۔ فرانس میں سفیر کا عہدہ سنبھالنے سے پیشتر وہ آئیرلینڈ میں اپنے ایک دوست کے پاس چند روز قیام کرنے کے لئے گئے۔ دوست

کے ہاں پہلی ہی رات انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص لڑکھڑاتا ہوا اُن کے کمرے میں داخل ہو رہا ہے۔ اس نے اپنی پیٹھ پر ایک بکس اٹھا رکھا تھا جس میں ایک لاش تھی۔ بوجھ کی وجہ سے وہ شخص دوہرا ہو کر چل رہا تھا۔ جب وہ کمرہ پار کر کے باہر نکلنے لگا تو لارڈ ڈفرن نے ہمت کر کے اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلا کر پوچھا "تم کون ہو اور یہ کیا لے جا رہے ہو؟" اس پر اس شخص نے مڑ کر دیکھا تو لارڈ ڈفرن خوف کے مارے دم بخود ہو کر رہ گئے کیونکہ انہوں نے ایسا بھیانک چہرہ اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

کئی برس بعد ایک دن لارڈ ڈفرن پیرس کے گرانڈ ہوٹل میں ایک تقریب میں شرکت کے لئے گئے۔ گیٹ پر خیر مقدم کرنے کے بعد ان کا میزبان انہیں لفٹ کی طرف لے کر چلا۔ لارڈ ڈفرن لفٹ کے اندر داخل ہونے ہی کو تھے کہ ان کی نظر لفٹ چلانے والے ملازم کے چہرے پر پڑی۔ ایک لمحے کے لئے وہ کھڑے کے کھڑے ہی رہ گئے۔ یہ اسی کفن بردار کا خوفناک چہرہ تھا جسے انہوں نے خواب میں دیکھا تھا۔ انہوں نے اپنے سیکریٹری کو، جو لفٹ میں قدم رکھنے والا تھا، ایک طرف کھینچ لیا۔ لفٹ سواریوں سے بھر گئی اور بالائی منزلوں کے لئے روانہ ہو گئی۔ لارڈ ڈفرن تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے منیجر کے کمرے کی طرف چل دیئے۔ حیرانی کے عالم میں ان کا میزبان بھی ان کے پیچھے ہو لیا۔ لارڈ ڈفرن نے منیجر سے پوچھا کہ اس لفٹ کو چلانے والا شخص کون تھا۔ اس سے پیشتر کہ منیجر کوئی جواب دیتا ہوٹل کی عمارت ایک خوفناک دھماکے سے لرز اٹھی۔ لفٹ کا رسّہ ٹوٹ جانے کی وجہ سے لفٹ کا خول دھڑام سے نیچے فرش پر گر گیا تھا۔ لفٹ میں سوار مسافروں میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچ سکا۔

دوسری صبح اس سانحہ کی خبر فرانس اور انگلستان کے اخباروں کی نمایاں سرخی تھی۔ کچھ اخباروں نے اس حادثے کو ایک سیاسی سازش قرار دیا جس کا مقصد لارڈ ڈفرن کو قتل کرنا تھا لیکن کسی کو بھی یہ پتہ نہیں چل سکا کہ لفٹ چلانے والا شخص کون تھا۔؟

بعض اوقات چھٹی حس مہلک حادثوں سے خبردار کرنے کی بجائے ایسے واقعات کی محض اطلاع ہی دیتی ہے۔ امریکہ کے صدر ابراہیم لنکن کا خواب اسی نوعیت کا تھا۔ صدر لنکن کو قتل ہونے سے کچھ دن پہلے اپنی آخری گھڑی کی خبر مل گئی تھی انہوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ وائٹ ہاؤس کے کمروں میں گھوم رہے ہیں۔ تمام عمارت خالی پڑی ہے لیکن ہر ایک کمرے سے سسکیوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔ ایک کمرے میں انہیں کفن میں لپٹی ہوئی ایک لاش دکھائی دی جس کے گرد فوجی پہرے دار چپ چاپ کھڑے تھے لیکن پہرے داروں کے قریب کھڑے دوسرے کچھ لوگ رو رہے تھے۔ صدر لنکن نے پوچھا "وائٹ ہاؤس میں کس کا انتقال ہو گیا ہے؟" جواب ملا "صاحب صدر کا۔ انہیں قتل کر دیا گیا تھا۔"

صبح ہونے پر ابراہیم لنکن نے اپنی اہلیہ اور اپنے قریبی دوست وارڈ لیمن کو یہ خواب سنایا اور کہا کہ اگرچہ یہ محض ایک خواب ہی تھا لیکن اس وقت سے یہ دہشت آمیز خیال ان کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا کہ ان کا وقت اب آ گیا ہے۔

نہ صرف اپنے آپ کے بارے میں بلکہ اپنے عزیزوں، دوستوں یا محض واقف کاروں اور پڑوسیوں تک کے بارے میں اس قسم کے الہامی خواب لوگوں کو اکثر آتے رہتے ہیں۔ کچھ کو تو ان کی روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات خواب میں پہلے سے ہی دکھائی دے جاتے ہیں اور کبھی کبھی تو معمولی واقعات بھی جوں کے توں نظر آ جاتے ہیں۔

چھٹی حس کا کام موت اور مہلک حادثوں جیسے ہولناک واقعات کی اطلاع دینا ہی نہیں ہے بلکہ یہ تو روزمرہ کی زندگی میں ہماری پاسبانی کے فرائض انجام دیتی ہے اور اپنی خاموش لیکن صاف طور پر سمجھ آنے والی آوازیں قدم قدم پر ہماری رہنمائی کے لئے ہمیں قیمتی مشورے دیتی ہے۔ ان مشوروں کو نظرانداز کر کے اگر کوئی کف افسوس ملنا چاہتا ہو تو یہ اور بات ہے۔ یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اپنی چھٹی حس کے اشاروں پر عمل کر کے ہم بہت سی پریشانیوں سے بچ سکتے ہیں۔ ایک عام فہم مثال کے مطابق اگر ہم پانی کے بہاؤ کے ساتھ تیرتے ہیں تو تھوڑی محنت سے ہم کافی فاصلہ تیر کر طے کر سکتے ہیں۔ جبکہ پانی کے بہاؤ کے خلاف تیرنے سے کافی محنت کرنے پر بھی ہم ایک تو مقابلتاً کم فاصلہ طے کر پائیں گے اور دوسرے تھک بھی جائیں گے۔ عین اسی طرح چھٹی حس کے اشاروں کے مطابق چلنے سے راحت اور کامیابی اور خلاف چلنے سے تکلیف اور ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

روزانہ زندگی سے متعلق نیچے دی گئی مثال پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ کس طرح اچانک خیال یا خواہ مخواہ کا احساس ہماری رہنمائی کے لئے مستقبل کی پیش آگاہی کرتا ہے۔

آپ ایک کمرے میں داخل ہوتے ہیں جہاں پر موجود کچھ اشخاص کے ساتھ آپ کا تعارف پہلی بار کرایا جاتا ہے۔ ان میں دو ایک افراد آپ کو کچھ اچھے لگتے ہیں اگرچہ ظاہرا شکل و صورت اور ادا و اطوار کے لحاظ سے ان میں دلآویزی یا دلکشی کا کوئی پہلو دکھائی نہیں دیتا پھر بھی وہ آپ کو اچھے لگ رہے ہیں۔ ان میں آپ کو اپناپن سا محسوس ہوتا ہے۔ اور آپ ان سے مل کر واقعی خوش ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس وہاں پر موجود ایک دو اشخاص آپ کو پسند نہیں آتے۔ کیوں؟ یہ آپ نہیں جانتے۔ لیکن یہ لوگ آپ کو اچھے نہیں لگے۔ ان سے ملتے وقت "آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی"

[illegible] کی بجائے ان اشخاص کی موجودگی [illegible] محسوس کرتے ہیں۔

بعض اوقات ہم مختلف اشخاص کی طرف متضاد عمل کی وجہ شعوری طور پر آپ نہیں جان سکتے۔ دراصل یہ اور ایسا ہوتا ہے کہ آپ کا شعوری فیصلہ تو بعد کی بات ہے لیکن آپ کی چھٹی حس کو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ آئندہ زندگی میں اول الذکر آپ کے دوست یا معاون ثابت ہوں گے اور موخر الذکر مخالف یا دشمن۔ گویا آپ کی چھٹی حس نے مختلف نوعیت کے احساسات کے ذریعے آپ کو یہ جتانے کی کوشش کی کہ مستقبل میں آپ کو ان اشخاص سے کس کس قسم کے رویے کی توقع رکھنی چاہیے۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ احساسات بالکل صحیح ثابت ہوتے ہیں۔ روزانہ زندگی میں چھٹی حس کی کارفرمائی کی ایسی بیسیوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ آپ یقین جانیے کہ آپ کی چھٹی حس کو اتنا کچھ معلوم ہے کہ آپ گمان بھی نہیں کر سکتے۔

چھٹی حس کی تھوڑی بہت صلاحیت تو تقریباً ہر شخص کو میسر ہے لیکن کبھی کبھی بہت سے نادر شاہکار پیدا کرتی ہے کہ عقل دنگ رہ جائے۔ مثال کے طور پر امریکہ کے ایڈگر کیسی EDGAR CAYCE ہی کو لیجئے۔ کیسی ایک معمولی شخص تھا جسے علم طب سے کسی طرح کا دور کا بھی واسطہ نہیں تھا لیکن قدرت نے اسے ایسی خوبی عطا کر رکھی تھی کہ کسی بھی قسم کے مرض میں مبتلا کسی شخص کا نام اور پتہ سن کر وہ اس کی بیماری کی صحیح تشخیص کرنے کے علاوہ اس مرض کو دور کرنے کی بے خطا دوا بھی بتا دیتا۔ ناک کے بالوں سے لے کر پاؤں کے ناخنوں تک کے امراض کے ماہرین کے اس دور میں لاعلاج قرار دیئے گئے دنیا بھر کے ہزاروں مایوس مریض ایڈگر کیسی کی اس خداداد نعمت سے فیضیاب ہوئے۔ ۱۹۴۵ء میں ایڈگر کیسی کی وفات سے گویا دنیا سے لاعلاج اور مایوس مریضوں کا ایک مسیحا اٹھ گیا۔

روسی خاتون روزا کلیشوا Roza Kuleshova بھی اپنی مثال آپ ہے۔ روزا روس میں کوہسار یورال کے علاقے میں [illegible] کے مشہور صنعتی شہر کی باشندہ ہے۔ وہ اس وقت تیس برس کی ہے۔ انسان کیا ہر جاندار میں دیکھنے کا کام آنکھیں ہی کرتی ہیں۔ لیکن روزا کلیشوا کے ہاتھوں کی انگلیوں میں بھی قوت بینائی موجود ہے۔ اپنے ہاتھ کی انگلیوں سے وہ اسی طرح دیکھ سکتی ہے جس طرح عام انسان اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔ [illegible]
[illegible] D.D. PODOTOV [illegible]
[illegible] P.K. ANOKHIN [illegible] اور امریکہ کے
گریگوری رازران Gregory Razran جیسے

ممتاز ترین سائنس دانوں نے ۱۹۶۳ء کے دوران روزا پر سینکڑوں آزمائشی تجربات کے بعد تسلیم کیا ہے۔

۱۹۶۳ء میں امریکہ کے مشہور رسالے لائف انٹرنیشنل کے نامہ نگار باب برگھم Bob Brigham نے روزا سے انٹرویو کیا۔ باب برگھم کی موجودگی میں روزا نے نہ صرف ہاتھ کی انگلیوں بلکہ اپنی کہنی سے اخبار پڑھ کر سنایا۔

ہالینڈ کے پیٹر ہرکوس Peter Hurkos کا ذکر کئے بغیر عجائب روزگار کا تذکرہ ادھورا رہ جائے گا۔ ایک حادثے میں دماغی چوٹ کے باعث ان حضرت کی کوئی ایسی رگ بیدار ہو گئی کہ یہ ولی بن گئے۔ کسی شخص کو دیکھ کر اس کا ماضی اور مستقبل انہیں نظر آنے لگا۔ اس وقت کئی ممالک کی پولیس قاتلوں کا سراغ لگانے کے لئے ہرکوس کی امداد طلب کرتی ہے۔ مقتول کی فوٹو دیکھ کر یہ قاتل کا پورا حلیہ بتا دیتے ہیں اور بعض اوقات نام بھی۔ اور تو اور پیٹر ہرکوس کی آنکھ زمین کی تہ کے نیچے بھی دیکھ سکتی ہے۔ شاید یہ الف لیلیٰ کی کہانی معلوم ہو لیکن یہ بالکل سچ ہے کہ ان دنوں پیٹر ہرکوس صاحب سونے کی ایک بہت بڑی کان سے ملنے والی رائلٹی پر شان سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہرکوس نے سونا تلاش کرنے والی ایک کمپنی کو اس کان کا پتہ بتایا تھا۔

قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ سب کچھ چھٹی حس ہی کی بدولت ہے تو پھر ایسے کرشمے ہم سب میں کیوں رونما نہیں ہوتے۔ اس کی دو وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ جیسے مختلف انسانوں کی جسمانی اور دماغی صلاحیتوں میں فرق ہے اسی طرح چھٹی حس بھی ہر شخص میں یکساں نہیں پائی جاتی۔ بعض اشخاص میں چھٹی حس غیر معمولی طور پر تیز اور بعض میں نسبتاً کم ہوتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر آپ اپنے ایک بازو کو ایک برس کے لئے پلاسٹر آف پیرس میں باندھ دیں اور ہلانا جلانا بالکل بند کر دیں تو ایک برس کے بعد آپ کے چاہنے کے باوجود آپ کا یہ بازو حرکت نہیں کر سکے گا۔ بے کار رہنے سے یہ بازو سوکھ کر مفلوج ہو چکا ہوگا۔ یہی حال چھٹی حس کا ہے جسے بچپن سے ہم نے استعمال کرنے کے بارے میں سوچا ہی نہیں بلکہ اس کے اشاروں کو محض اتفاق یا وہم سمجھ کر ٹالتے رہے ہیں۔

مشاہدے سے ثابت ہوا ہے کہ کسی بھی برس میں [illegible] بائیس اکتوبر سے اٹھائیس نومبر اور بائیس جون سے بائیس جولائی کے درمیان پیدا ہونے والے افراد میں چھٹی حس [illegible] تیز ہوتی ہے۔

اسی طرح [illegible]
[illegible]
[illegible]

شریمتی اندرا گاندھی نے ۱۸ مارچ کو وزیراعظم ہند کے عہدے کا حلف لیا۔ صدر جمہوریہ آپ کو حلف دلا رہے ہیں۔

صدر جمہوریۂ ہند شری وی وی گری پارلیامنٹ کے مشترکہ اجلاس (منعقدہ ۲۳ مارچ) سے خطاب کرنے کے لیے تشریف لے جا رہے ہیں۔ آپ کے آگے (بائیں طرف) نائب صدر ہند شری گوپال سروپ پاٹھک اور (دائیں طرف) لوک سبھا کے سپیکر سردار گوردیال سنگھ ڈھلوں ہیں۔
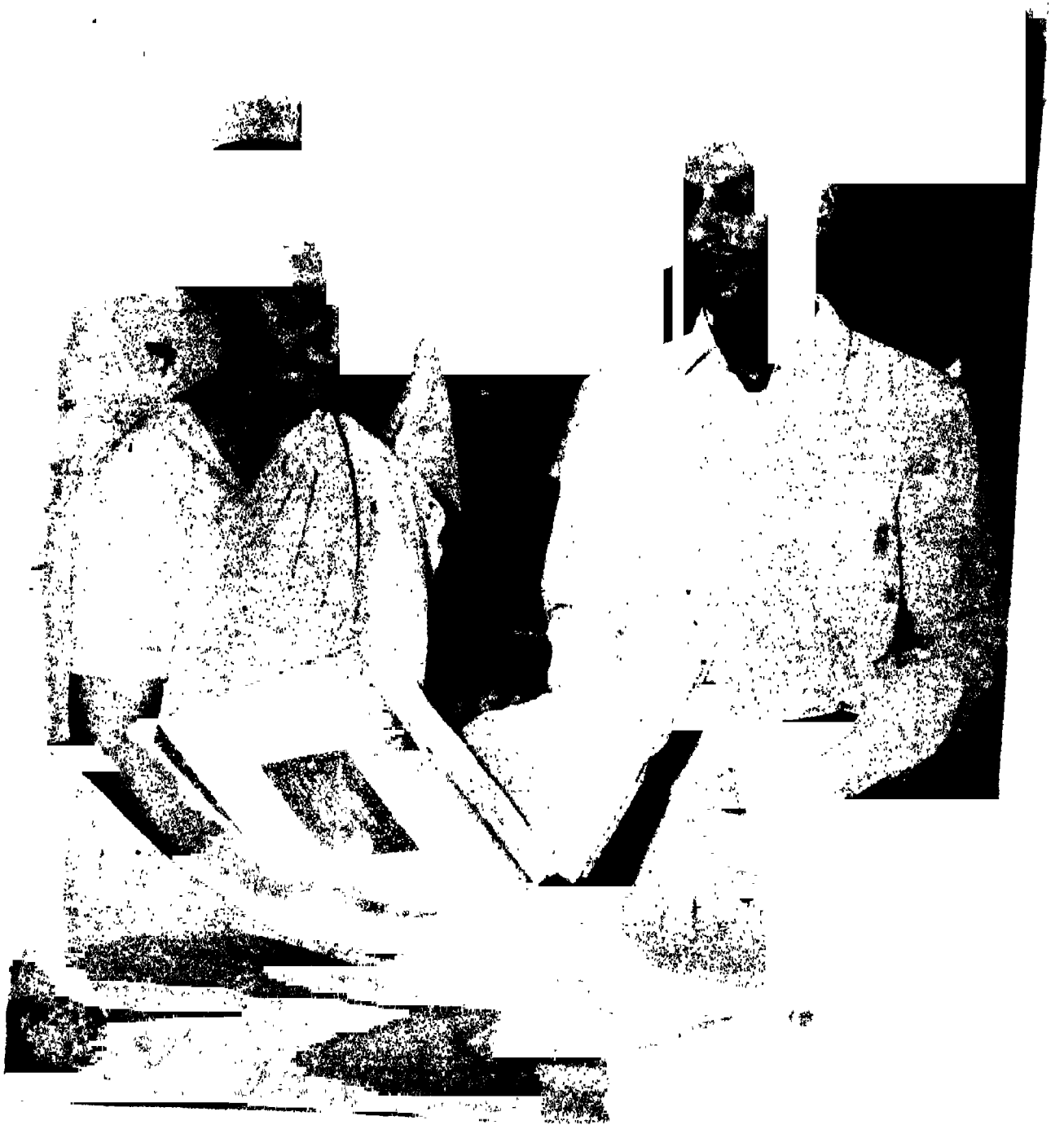
۲۷ مئی ۱۹۷۱ء کو ملک میں شری جواہرلال نہرو کی ساتویں برسی منائی گئی۔ اس دن صبح شانتی ون (دہلی) میں
پرارتھنا سبھا کی گئی جس میں صدر جمہوریۂ ہند شری وی وی گری اور وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے شرکت
کی۔ اُس دن تین مورتی (نئی دہلی) میں بھی شری نہرو کی یاد میں کئی پروگرام منعقد کیے گئے۔ اس موقع پر نابینا
لوگوں کے لیے تیار کی گئی شری نہرو کی سوانح عمری کا اجرا بھی کیا گیا۔
... سوانح عمری کی جلد عطا کر رہی ہیں۔

۲۷ مئی ۱۹۷۱ء کو ملک میں شری جواہر لال نہرو کی ساتویں برسی منائی گئی۔ اس دن صبح شانتی ون (دہلی) میں پرارتھنا سبھا کی گئی جس میں صدر جمہوریۂ ہند شری وی وی گری اور وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے شرکت کی۔ اس دن تین مورتی (نئی دہلی) میں بھی شری نہرو کی یاد میں کئی پروگرام منعقد کئے گئے۔ اس موقع پر نابینا لوگوں کے لئے تیار کی گئی شری نہرو کی سوانح عمری کا اجرا بھی کیا گیا۔

[illegible] کو سوانح عمری کی جلد عطا کر رہی ہیں۔

مضامین اور ترسیلِ زر کا پتہ
[illegible] ایڈیٹر آجکل (اردو) پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی

ماخذات

گزشتہ دنوں وزیر خزانہ شری وائی بی چوان نے پارلیمنٹ میں اقتصادی سروے برائے ۱۹۷۰-۷۱ء پیش کرتے ہوئے بتایا کہ اس سال چوتھے پنجسالہ منصوبہ میں مقرر کئے گئے نشانے کے مطابق قومی آمدنی میں تسلی بخش اضافہ ہوا ہے اور اس کی دو اہم وجوہات زرعی اور صنعتی پیداوار میں اضافہ ہیں۔

سروے کے مطابق پچھلے دو برسوں میں زرعی پیداوار میں اضافہ کی شرح رفتار کافی زیادہ رہی ہے۔ ۱۹۶۹-۷۰ء میں ۶.۵ فی صد کا مجموعی اضافہ ہوا ہے اور ۱۹۷۰-۷۱ء میں بھی کافی تسلی بخش اضافے ہونے کی امید ہے ایک خوش گوار پہلو یہ ہے کہ ۱۹۷۰-۷۱ء میں تقریباً تمام اناجوں کی پیداوار بڑھی ہے —

سروے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ پیداوار میں اس اضافہ کی وجوہ اگرچہ موافق موسمی حالات تھے لیکن نئی حکمت عملی کے پھیلاؤ کے نتیجے کے طور پر بھی پیداوار میں اضافہ ہوا ہے۔ اس سلسلے میں نئی حکمت عملی کو خشک کھیتی باڑی کے علاقوں میں پھیلانے، اہم دالی فصلوں اور دالوں کے لئے زیادہ اناج اگانے والی قسموں کی تلاش اور زمین کی ملکیت کے نظام میں کچھ ضروری تبدیلیاں لانے کے وسائل کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

۱۹۷۰ء کے پہلے چھ مہینوں میں ۱۹۶۹ء کے مماثل اسی عرصے کے مقابلہ میں صنعتی پیداوار کا عدد اعشاریہ ۶.۴ فی صد زیادہ تھا اس کے بعد اضافہ کی رفتار سست پڑ گئی۔ پچھلے برس کے مقابلے میں ۱۹۷۰ء میں سالانہ شرح ترقی کی اوسط کم سے کم پانچ فیصد رہنے کی امید ہے جہاں تک چھوٹے پیمانے کے سیکٹر کا تعلق ہے، ریزرو بنک آف انڈیا نے اندازہ لگایا ہے کہ اس سیکٹر میں ۱۹۶۹-۷۰ء میں نمایاں یعنی ۱۱.۴ فی صد پیداوار بڑھی ہے جبکہ ۱۹۶۸-۶۹ء میں اس سیکٹر کی پیداوار میں ۸.۴ فی صد کا اضافہ ہوا تھا۔ ۱۹۷۰-۷۱ء میں پچھلے برس کے مقابلے میں ترقی کی رفتار میں مزید اضافہ ہونے کا امکان ہے۔

سروے میں بتایا گیا ہے کہ پرائیویٹ سرمایہ کاری کے لئے فضا اچھی نظر آتی ہے اس کا ثبوت حصص بازار میں تیزی سے ملتا ہے۔ چھوٹے پیمانے کے سیکٹر میں سرمایہ کاری اچھی خاصی مقدار میں ہو رہی ہے۔ بنکوں اور دیگر اداروں سے حاصل کئے گئے قرضے اس بات کا ثبوت ہیں۔ بڑے پیمانے کے سیکٹر کا جہاں تک تعلق ہے اس میں سرمایہ کاری میں اضافہ کا ثبوت سرمایہ کے ان اعداد و شمار سے جو حقیقی طور پر قائم کیا جا چکا ہے نیز عوامی معاملات کی طرف توجہ اور انڈسٹریل ڈیولپمنٹ بنک آف انڈیا اور انڈسٹریل فنانس کارپوریشن جیسے قرضہ دینے والے اداروں کی طرف سے منظور اور تقسیم کی گئی امداد میں نمایاں اضافے سے ملتا ہے۔ اس کے علاوہ ۱۹۷۰-۷۱ء میں جتنے صنعتی لائسنس اور اجازت نامے جاری کئے گئے پچھلے برس کے مقابلہ میں ان کی تعداد تقریباً دوگنی ہے۔

علاوہ بریں ۱۹۶۹-۷۰ء کے دوران منظم سیکٹروں میں روزگار کی حالت میں بہتری ہوئی ہے مجموعی طور پر روزگار میں چار لاکھ یا ۴.۴ فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔ پرائیویٹ مینوفیکچرنگ سیکٹر نے پچھلے برس ۶۸ ہزار اشخاص کے مقابلے میں ۱۹۶۹-۷۰ء میں سوا لاکھ فاضل اشخاص کو روزگار مہیا کیا۔

دوسرے منصوبے کے بعد سے پہلی بار بھارت انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ کو مختصر المدت قرضے چکانے کے اہل ہوا ہے چنانچہ ۱۹۷۰-۷۱ء کے خاتمے پر بھارت کے ذمے مذکورہ فنڈ کی کوئی رقم واجب الادا نہیں تھی مزید برآں فنڈ مذکور میں بھارت کے کوٹے میں مزید ۱۹ کروڑ ڈالر کا اضافہ کر دیا گیا ہے اس میں سے چوتھائی حصہ سونے کی صورت میں واجب الادا ہے۔

۱۹۷۰-۷۱ء کے دوران برآمدات میں اضافہ کی شرح ۸ سے ساڑھے آٹھ فی صد تک رہی جبکہ منصوبے میں برآمدات میں سالانہ اضافے کا نشانہ ۷ فیصد رکھا گیا ہے۔

۱۹۷۰-۷۱ء کے دوران غیر ملکی امداد کا حجم بھی گھٹا۔ ۱۹۶۷-۶۸ء کے شروع میں یہ امداد ۱۰۵۴ کروڑ روپے تھی جو ۱۹۷۰-۷۱ء کے شروع میں ۸۲۷ کروڑ روپے رہ گئی۔ ۱۹۷۰-۷۱ء کے دوران اس میں ۱۵۷ کروڑ روپے کی مزید کمی آئی۔

یکم جولائی ۱۹۵۱ء کو جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک کی ترقی و خوش حالی کے پیش نظر کولمبو پلان کا آغاز ہوا تھا لہٰذا اس برس یکم جولائی کو اس سے وابستہ ممالک میں ترقیاتی منصوبے کی بیسویں سالگرہ منائی جا رہی ہے۔ قارئین آج کل کی دلچسپی کے لئے اس سلسلے میں ایک مضمون کولمبو پلان صفحہ ۲۲ پر پیش کیا جا رہا ہے۔ امید ہے پسند کیا جائے گا۔

غبارِ کارواں

(۱۷)

"میں ایک جزیرہ نہیں ہوں"

خواجہ احمد عباس

لوگ کہتے تھے انسان مٹی سے بنا ہے، شیطان آگ سے۔

سائنس داں کہتے ہیں انسان مٹی سے نہیں پانی سے بنا ہے یعنی اس کے بدن میں، اس کے خون میں، اُس کے گوشت اور اُس کی ہڈیوں میں سب چیزوں سے زیادہ حصہ پانی کا ہے۔

لیکن انسان اگر صرف گوشت پوست کا پُتلا ہی نہیں ہے، صرف ایک جاندار (یا جانور) ہی نہیں ہے، اگر اس کی ہستی میں اُس کی عقل کی، اُس کے خیالات اور محسوسات اور جذبات کی بھی کوئی اہمیت ہے تو میں کہوں گا، انسانوں کی تشکیل میں بہت سی سماجی، تاریخی، تمدنی، اور اقتصادی قوتوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔

سب انسانوں میں سے ایک انسان میں بھی ہوں۔

جن شخصیات نے میری تشکیل کی، وہ ایک دو نہیں سینکڑوں، ہزاروں بلکہ شاید کروڑوں ہیں، کیونکہ انسان کی زندگی اپنے ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں اور دوستوں یا نمایاں سیاسی لیڈروں ہی کا اثر نہیں قبول کرتی، اُس کی زندگی اور اُس کے کردار کی تشکیل میں اُس کے تمام ہم قوم اور ہم عصر بھی حصہ لیتے ہیں جو ماحول ایک انسان کی تربیت کرتا ہے، اس میں وہ جسمانی اور نفسیاتی ورثہ تو شامل ہوتا ہی ہے جو اُسے اپنے ماں باپ سے ملتا ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ بدلتے ہوئے سماجی حالات اور سیاسی اور اقتصادی واقعات بھی اُس کے ترکے میں شامل ہو کر ہر انسان کو ملتا ہے چاہے وہ اُسے قبول کرنا چاہے یا نہ چاہے۔ انسانی زندگی داخلیت اور خارجیت دونوں کے تانے بانے سے بنی ہے اور اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا چاہے وہ مارکس کا چیلا ہو یا فرائڈ کا پیرو ہو بھلا کون کہہ سکتا ہے کہ زندگی کی بناوٹ میں نفسیات کا تانا زیادہ اہم ہے یا معاشیات کا بانا۔

اس لیے نہ تو میں ان تمام شخصیات کے نام گِنا سکتا ہوں جنہوں نے میرے کردار اور نقطۂ نظر کی تشکیل کی۔ اُن میں سے بہتوں سے تو میں صرف لاشعوری طور پر متاثر ہوا ہوں گا اور نہ یقین کے ساتھ ان مختلف اثرات کا مول تول کر سکتا ہوں کہ اُن میں سے مقابلتاً کون زیادہ اہم تھے اور کون کم اہم۔ صرف اپنی یاد کی مدھم روشنی میں چند شخصیات اور واقعات کی تلاش کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے میری پچپن سالہ زندگی میں مجھے متاثر کیا اور جن کی نفسیاتی چھاپ میرے شعور اور میرے کردار پر آج تک موجود ہے۔

سب سے پہلی اور میرے بچپن میں سب سے اہم شخصیت جس نے مجھے متاثر کیا وہ میرے نانا خواجہ سجاد حسین مرحوم تھے۔ وہ ہمارے خاندان ہی میں نہیں بلکہ ہمارے سارے قصبے میں سب سے نمایاں ہستی تھے۔ میرے بچپن کی اولین یادیں اُن کی شخصیت سے وابستہ ہیں۔ تیس برس ہوئے کہ جب اسّی برس کی عمر میں انہوں نے وفات پائی لیکن بچپن ہی سے ہم سب بھائی بہن اُن کو بہت بوڑھا سمجھتے تھے حالانکہ اس وقت ان کی عمر پچاس پچپن ہی کی تھی اور ان کی سفید داڑھی پوری طرح سے سفید نہیں ہوئی تھی اور اُن کے گورے چہرے پر جھریوں کا ابھی کوئی نشان نہیں ہوتا لیکن پھر بھی ہمارے ننھے ننھے ذہنوں میں اُن کی شخصیت وقت سے پہلے کی بزرگی کی سی تھی جو اپنی عقل اور دوراندیشی سے انسانی زندگی کے لیے

ہوتے مسئلوں کو سلجھاتا ہے اور خواجہ خضر کی طرح ظلمات کے اندھیرے میں سند باد جہازی کو راستہ بتاتا ہے۔

جب میں چار پانچ برس کی عمر میں گھر کی چار دیواری سے سکول کی دُنیا میں آیا اُس وقت مجھ پر اپنے بابا کی شخصیت کے دوسرے اہم پہلو روشن ہوئے۔ یہ سکول جہاں میں پڑھتا تھا خواجہ الطاف حسین حالی کے نام پر حالی مسلم ہائی سکول کہلاتا تھا اور خواجہ سجاد حسین اس کے بانی، سکریٹری اور کرتا دھرتا تھے۔ ان کی زندگی تمام تر اس سکول کے لیے وقف تھی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ اپنے ہم قوموں میں نئی تعلیم رائج کرنے کے لیے انہوں نے کتنی بڑی قربانیاں کی تھیں۔ ساٹھ برس پہلے وہ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کے پڑھے ہوئے پہلے چار مسلمان نوجوانوں میں تھے جنہوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بی اے کی سند دولت اور اقتدار کی سنہری کنجی سمجھی جاتی تھی۔ یو پی کے گورنر نے چار مسلمان نوجوانوں کو بلا کر کہا کہ گورنمنٹ سروس کے کسی اعلیٰ عہدے کے لیے بھی وہ درخواست دے سکتے ہیں انہیں صرف یہ طے کرنا ہوگا کہ وہ کس محکمے میں کام کرنا چاہتے ہیں۔ سول سروس، فوج، پولیس، جوڈیشری یا تعلیم۔ ایک نے سول سروس کو چنا اور دس برس میں کمشنر کے درجے تک پہنچ گیا جو اُس زمانے میں ہندوستانی سویلین کی معراج تھی۔ دوسرے نے پولیس کا محکمہ چنا اور انسپکٹر جنرل کے عہدے تک ترقی کی، تیسرا جوڈیشری میں گیا اور سیشن جج ہو کر ریٹائر ہوا لیکن سجاد حسین نے وہ محکمہ پسند کیا جو سرکاری ملازمتوں میں ان دنوں سب سے گھٹیا سمجھا جاتا تھا یعنی تعلیم۔ ڈپٹی ایجوکیشنل انسپکٹر سے انسپکٹر ہوئے اور انسپکٹر سے انسپکٹر جنرل مقرر ہونے والے تھے کہ نوکری سے استعفےٰ دے کر پوری تنخواہ پر پنشن لے لی اور جائیداد بیچ کر اس کے روپے سے اپنے قصبے میں سکول چلانے لگے اور اس کے بعد نہ صرف اپنی ساری پنشن بلکہ اپنی ساری باقی عمر اور اپنا تمام وقت اور تمام ہمت اور صحت اس سکول کے چلانے، بڑھانے اور ترقی دینے میں صرف کر دی۔

اپنے نانا کے بعد جس ہستی سے میں اثر پذیر ہوا وہ میرے والد خواجہ غلام السیدین کی تھی۔ اگر بابا کی زندگی ایثار اور خدمتِ قومی کا ایک روشن نمونہ تھی تو ابا (جیسا ہم اپنے والد کو کہتے تھے) کے کردار سے میں نے بچپن ہی میں انسان دوستی اور جمہوریت پسندی کے اُن اصولوں کو سمجھا اور سیکھا جو آخر مجھے اشتراکیت کی سرحد تک لے آئے۔ جس خاندان اور جس ماحول میں میں پیدا ہوا تھا اس میں چھوٹی موٹی زمینداری کی بنیادوں پر کھڑی ہوئی [illegible] تمدن کے کھنڈر دکھائی دیتے

تھے جیسے نسب، شرافت، رذالت، اونچے نیچ خاندان، سید، انصاری، شیخ، مغل اور پٹھان کے امتیازات، شادی بیاہ کی رسوم میں فضول خرچیاں، قبر پرستی، توہم پرستی، تعویذ گنڈے، پیری مریدی، نذر نیاز، عرس اور قوالیاں، مجلسیں اور ماتم۔ اگر میں شروع ہی سے ان اقدار کے غلط اثرات سے محروم یا محفوظ رہا تو اس کی صرف ایک وجہ تھی کہ میرے والد ایک ایسے اسلام کے پیرو تھے جس میں توہمات اور تعصبات دونوں کے لیے جگہ نہیں تھی اور جس کی بنیاد عقل اور انسان دوستی پر تھی۔ پانچ برس کی عمر میں میں نے جمہوریت کا نام بھی نہیں سُنا تھا نہ انسانی برادری کا مسئلہ کسی نے مجھے سمجھایا تھا لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ ایک بار گھر کے ملازم چھوکرے کو (جو میرا ہی ہم عمر تھا) "آؤ" کا [illegible] کہنے کی یہ سزا ملی تھی کہ بارہ گھنٹے تک اندھیرے کمرے میں بند کر دیا گیا تھا۔ نہ کھانا نہ پانی۔ جب تک ہاتھ جوڑ کر اُس ملازم سے معافی نہ مانگی۔

ابا کٹر حد تک سادگی پسند (Puritan) تھے۔ نہ انہیں انگریزی فیشن اچھے لگتے تھے اور نہ وہ ہندوستانی ٹیپ ٹاپ کو ہی پسند کرتے تھے۔ نہ وہ اپنی بیٹیوں کو زیور گہنے بنوا کر دیتے تھے، نہ بیٹے کو انگریزی بلے بال رکھنے دیتے تھے۔ عرس میں جا کر قوالی سننے کو بھی بُرا سمجھتے تھے اور سینما کے ناچ گانوں کو بھی۔ نہ ہمیں چائے پینے کی اجازت تھی نہ پان کھانے کی۔ اُن کی خواہش اور کوشش تھی کہ اُن کی اولاد سادہ اور جفاکش زندگی کی عادی ہو، توہمات اور غیر ضروری رسومات سے آزاد ہو اور تعلیم اور صحت کی طرف پوری توجہ دے۔

اپنے عقیدے میں وہ بہت سخت گیر تھے مگر اُن کے مزاج میں ایک عجیب شگفتگی اور مزاح کی چاشنی تھی جو اُن کی اصول پرستی کو کٹھ مُلاؤں کی سی روکھی پند و نصیحت سے بچائے رکھتی تھی۔ کسی کو پان سے ہونٹ رچائے ہوئے دیکھتے تو سنجیدہ چہرہ بنا کر کہتے "خیریت تو ہے؟ کیا چوٹ لگ گئی ہے کہ منہ سے خون جاری ہے؟" چائے کو بھنگ کہتے تھے لیکن کوئی چائے کا شوقین دوست ملنے آ جاتا تو کہتے "ارے اندر جا کر کہو ایک بھنگڑ آیا ہے اس کے لیے تھوڑی سی بھنگ گھول کر بھیج دیں۔"

ابا جتنے اپنے عقیدوں میں پکے تھے اتنی ہی حد تک آزادیٔ رائے کے حامی بھی تھے۔ آخر میں وہ مسلم کانفرنس میں شامل ہو گئے جو مسلم لیگ کی طرح فرقہ وارانہ جماعت تھی اور میں اس وقت تک کانگریس کو بھی پیچھے چھوڑ کر سوشلزم کی طرف بڑھ رہا تھا لیکن کبھی انہوں نے اپنے اصول مجھ پر زبردستی عائد کرنے کی کوشش نہیں کی۔ سیاسی بحث ضرور کرتے تھے گرما گرمی بھی ہوتی۔

ہو جاتی لیکن جیسی برابر کے دوستوں میں ہوتی ہے۔ ان کے کئی دوستوں نے بار بار انہیں سمجھایا کہ اپنے بیٹے کو انقلابی تحریکوں کا ساتھ دینے سے روکیں لیکن ایک بار بھی مجھ سے یہ نہیں کہا کہ کانگریس اور سوشلسٹ پارٹی کا ساتھ چھوڑ دو۔ دراصل وہ دل ہی دل میں اس بات سے بہت خوش تھے کہ ان کا بیٹا اپنے اصولوں پر اٹل رہنے کی ہمت رکھتا ہے (خواہ وہ اُن اصولوں کو کتنا ہی غلط سمجھتے ہوں۔)

یہ تو ہمیں بچپن ہی سے معلوم تھا کہ ہماری اماں (ہر ماں کی طرح) اپنے بچوں سے بے پناہ محبت کرتی ہیں اور وقتاً فوقتاً ہم اس کا جائز اور ناجائز فائدہ بھی اٹھایا کرتے تھے لیکن اُن کی زندگی کے صرف آخری دنوں میں مجھے اپنی اماں کے کیرکٹر کی مضبوطی، ان کی انسان دوستی اور رواداری کا پورا احساس ہوا۔

جب ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کا بٹوارہ ہوا اس وقت (والد کا انتقال ہو چکا تھا) میری اماں اور بہنیں پانی پت میں تھیں اور میں بمبئی میں۔ جب مغربی پنجاب کے زخم خوردہ ہندو سکھ شرنارتھیوں کے آنے کے بعد پانی پت میں مسلمانوں کا رہنا مشکل ہو گیا اور وہ سب پاکستان ہجرت کی تیاری کرنے لگے تو میری ماں پر بھی دوسرے عزیز، رشتے داروں نے دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ وہ ان کے ساتھ پاکستان چلیں اور مجھے بھی لکھیں کہ میں بمبئی سے کراچی آ جاؤں مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ ہم اپنا وطن نہیں چھوڑیں گے میرے بیٹے نے ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے اور اس فیصلے میں میں اس کے ساتھ ہوں"

فسادات کے بیس بائیس دن انہوں نے پانی پت میں گزارے۔ سات سات دن کا کرفیو لگتا گھر میں چٹنی روٹی کھا کر گزارہ کرنا پڑتا اور پان جو اماں کی زندگی کا اہم جزو تھا روپے میں ایک پتہ نصیب ہوتا جس کے دس چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے وہ دن بھر گزارہ کرتیں۔ پھر ایک ملٹری ٹرک ان سب کو نکالنے کے لئے دلی سے پانی پت بھیجا گیا اور اکتوبر کی رات برقعہ پوش عورتوں کو اپنا وطن اور اپنا گھر چھوڑنا پڑا۔ بیس دن وہ سب دہلی میں رہے تیس آدمی ایک کمرے میں بند اور اس عرصے میں خبر آئی کہ پانی پت میں ہمارے مکان لٹ گئے اور شرنارتھیوں نے اُن پر قبضہ کر لیا ہے۔

ان حالات میں وہ ہوائی جہاز سے بمبئی آئیں۔ زندگی میں پہلی بار جان بچانے کے لئے ہوائی سفر کرنا پڑا لیکن ڈر یہ تھا کہ ان سب باتوں کا اثر ان کے مزاج پر نہ جانے کیسا پڑا ہو گا مگر پہلے الفاظ جو ائرپورٹ پر میں نے ان سے سُنے وہ یہ تھے "بمبئی میں تو اب بیٹے ہوائی جہاز میں سفر کر کے دل کی بڑی آرام کی سواری ہے"

اور اس رات پانی پت اور دلی کے حالات سناتے ہوئے انہوں نے کہا "نہ یہ اچھے، نہ وہ اچھے، نہ مسلمانوں نے کسر اٹھا رکھی ہے نہ ہندوؤں نے اور سکھوں نے سب کے سروں پر خون سوار ہے مگر مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں تو مسلمانوں کو زیادہ الزام دوں گی کہ انہوں نے اپنی حرکتوں سے اسلام کا نام ڈبو دیا"

شخصیات جنہوں نے مجھے متاثر کیا؟ یہ فہرست تو لمبی ہوتی جا رہی ہے کس کس کا نام گناؤں؟ اپنے رشتہ داروں میں ایک اور ہستی کا ذکر کرنا ضروری ہے وہ ہیں میرے چچا زاد بھائی خواجہ غلام السیدین جو گورنمنٹ آف انڈیا کی ایجوکیشنل منسٹری کے سکریٹری تھے لیکن میں بچپن سے آج تک انہیں "بھائی جان" ہی کہتا آیا ہوں میرے خیال میں بچپن میں ہر کسی کا ایک (Ideal) ہوتا ہے اور عام طور سے وہ اس کا بڑا بھائی ہوتا ہے جس کو دیکھ کر بچہ اس کی نقل کرنا چاہتا ہے۔ جیسے کیو میں اگلے آدمی کی نقل و حرکت کی ہم پیروی کرتے ہیں اس طرح بچپن میں لاشعوری طور پر چھوٹا بھائی بڑے بھائی کے نقش قدم پر چلنا چاہتا ہے میرا اپنا کوئی سگا بھائی نہیں تھا اس لئے بچپن سے ہی اپنے چچا زاد بھائیوں ہی کو میں سگا بھائی سمجھتا تھا۔ بھائی جان مجھ سے دس برس بڑے ہیں جب میں پانی پت کے پرائمری اسکول میں پڑھتا تھا تو وہ علی گڑھ یونیورسٹی میں پڑھ رہے تھے چھٹیوں میں جب وہ آتے تو اُن کی موٹی موٹی انگریزی کی کتابوں اور ٹینس کے ریکٹ کا مجھ پر بڑا رعب پڑتا۔ وہ اپنے یونیورسٹی میگزین کے لئے کبھی بیٹھ کر کوئی مضمون لکھتے تو میرا بھی جی چاہتا کہ میرے قلم میں بھی کسی دن ایسی طاقت آ جائے کہ میں یوں بے تکان مضمون لکھ سکوں اور پھر وہ انگلستان پڑھنے گئے اور وہاں سے ان کے خط اور تصویر والے پوسٹ کارڈ آنے لگے تو ہمارے لئے اور بھی دلچسپی اور حیرت و رشک کا سامان ہو گیا۔ لندن، لیڈز، کیمبرج، آکسفورڈ، پیرس، برلن، جینیوا ہم اپنے اٹلس میں ان شہروں کو ڈھونڈنے لگے اور وہاں سے آئی ہوئی تصویروں کو سنبھال کر البم میں لگانے لگے اور دل ہی دل میں سوچتے کیا کوئی دن ایسا بھی آئے گا کہ ہم بھی اس وسیع اور رنگین دنیا کی سیر کر سکیں گے۔

اور پھر وہ ولایت سے واپس آ گئے۔ فرسٹ کلاس ڈگری لے کر۔ اور علی گڑھ میں پروفیسر بھی ہو گئے۔ اس سال علی گڑھ یونیورسٹی کی جوبلی تھی۔ ۱۹۲۵ء کا ذکر ہے اپنے نانا کے ساتھ میں بھی اصرار کر کے علی گڑھ پہنچا۔ یونیورسٹی کی شاندار عمارتوں اور جوبلی کے ہنگاموں کا رعب تو پڑا ہی لیکن سب سے زیادہ رعب پڑا اُس ڈیبیٹ کا جو جوبلی پنڈال میں ہوئی اور جس کے ہیرو ہمارے بھائی جان قرار پائے۔ اگر میں کسی واقعہ کو یاد کروں جس نے میری زندگی پر سب سے گہرا اثر ڈالا ہے تو وہ یہی ڈیبیٹ ہو گی۔

کوئی پانچ ہزار کا مجمع ہو گا۔ اسٹیج پر ہندوستان کے مسلمانوں کے سب

ہی مشہور سیاسی اور غیر سیاسی لیڈر موجود تھے۔ مسٹر محمد علی جناح، سر آغا خاں، سر محمد اقبال، سر علی امام۔ ڈبیٹ کا مضمون تھا کہ "ہندوستان کے مسلمانوں کو قومی سیاست میں دوسری قوموں کے دوش بدوش کام کرنا چاہئے۔ اپنی سیاسی تنظیم علیحدہ نہیں کرنی چاہئے۔" یہ تجویز ہمارے بھائی جان نے پیش کی اور اس کی مخالفت کی اُن تمام مشاہیرین و قائدین نے جو وہاں موجود تھے۔ میں تو اس وقت انگریزی نہیں کے برابر سمجھتا تھا لیکن یہ میں دیکھ سکتا تھا کہ بھائی جان نے تقریر کی تھی۔ اسٹیج کی داہنی طرف سے اور سب بڑے لوگ بول رہے تھے اُن کی مخالف سمت سے۔ جب اُن سب کی تقریریں ختم ہوگئیں تو تجویز پیش کرنے والے نوجوان کو جواب الجواب دینے کا حق دیا گیا۔ اس وقت بھائی جان نے وہ تقریر کی جو علی گڑھ کی تاریخ میں آج تک یادگار ہے اور جس نے میری زندگی کا رُخ موڑ دیا۔ کتنا خلوص اور کتنا جوش تھا اُن کے بیان میں کہ جب اُن کی تقریر ختم ہوئی تو سارا پنڈال تالیوں سے گونج اٹھا اور مسٹر علی امام جنہوں نے تجویز کی مخالفت کی تھی اُٹھے اور اپنے نوجوان حریف کو گلے سے لگا لیا۔ اس کے بعد جب حاضرین کی رائے لی گئی تو کثرت رائے سے تجویز پاس ہوگئی اور میرے دھڑکتے ہوئے دل نے مجھ سے کہا "کتنے قابل ہیں میرے بھائی جان، کتنی اچھی تقریر کی انہوں نے، ایک دن میں بھی اُن جیسا بنوں گا، اُن جیسی تقریریں کروں گا۔ مگر اس کے لئے بہت کچھ پڑھنا پڑے گا، لکھنے اور بولنے کی کوشش کرنی پڑے گی۔ بڑے آدمیوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا. . . مگر میں سب کچھ کروں گا، سب کچھ کروں گا۔"

اور میں جو کبھی انجن ڈرائیور بننے کے خواب دیکھا کرتا تھا، پھر ڈاکٹر بننا چاہتا تھا، پھر جج، پھر ڈپٹی کمشنر، اب صحافی اور مقرر اور سیاست داں بننے کے خواب دیکھنے لگا۔

اُن کے علاوہ وہ شخصیتیں بھی ہیں جن سے میں ہی نہیں میری نسل کے کروڑوں ہندوستانی متاثر ہوئے ہیں اور جن کی چھاپ ہم سب کی زندگی اور کردار پر موجود ہے۔

مہاتما گاندھی جی کو پہلی بار جب میں نے دیکھا تھا اس وقت میری عمر پانچ یا چھ برس کی تھی لیکن اس وقت بھی اُن کی مقناطیسی شخصیت نے مجھے متاثر کیا تھا۔

بھگت سنگھ جس کی شہادت کے دن میں اور میرے بہت سے کالج کے ساتھی اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے جیسے ہمارا سگا بھائی پھانسی پر چڑھا دیا گیا ہو۔

جواہر لال نہرو جن کو کالج کے دنوں میں ہم نوجوانوں کا لیڈر سمجھتے تھے اور جن کی انقلابی اور اشتراکی تقریروں اور تحریروں کا ایک ایک لفظ مجھے یاد ہوتا تھا۔

منشی پریم چند جن کی کتابوں سے میں نے سیکھا کہ ادب میں صرف رومان اور فرار ہی نہیں ہوتا۔ انسانی زندگی کی سچی عکاسی بھی ہوتی ہے اور واقعات؟

پہلا ناقابلِ فراموش واقعہ۔ ۱۹۱۸ء یا ۱۹۱۹ء کا ذکر ہے جب میں صرف چار پانچ برس کا تھا اور پانی پت میں پرائمری اسکول کی پہلی جماعت میں پڑھتا تھا۔ جلیانوالہ باغ کا خونی ڈرامہ کھیلا جا چکا تھا اور تمام پنجاب کی آبادی کو اطاعت اور وفاداری کا سبق پڑھایا جا رہا تھا۔ سڑک اعظم (جو دہلی سے پشاور جاتی ہے) کے کنارے جتنے شہر اور قصبے تھے اُن کے تمام اسکولوں کو حکم ملا کہ اپنے بچوں کو سڑک کے کنارے قطاریں بنا کر کھڑا کریں کیونکہ وہاں سے انگریزی گھوڑ سوار فوج کے رسالے گزرنے والے تھے۔ صبح سویرے سے سہ پہر تک ہم گرمیوں کی دھوپ میں وہاں پر کھڑے رہے۔ کئی بچوں کو لُو لگ گئی۔ ایک بھوک اور دہشت سے بیہوش ہوگیا۔ تب جا کر انگریز فوجیوں کے لال لال چہروں کے درشن ہوئے۔ اس زمانے میں ایٹم بم اور راکٹ تو ایجاد نہیں ہوئے تھے لیکن انگریزی فوج کے پاس جتنے بھی بھیانک ہتھیار تھے وہ سب ہی تو اس جلوس میں ہمارے سامنے سے گزارے گئے۔ توپیں، مشین گنیں، رائفلیں، بندوقیں، پستول، بھالے، تلواریں ہمارے دلوں پر برطانوی سامراج کی ہیبت بٹھانے کے لئے یہ جلوس تین گھنٹے تک سڑک اعظم سے گزرتا رہا اور ہم کھڑے دیکھتے رہے لیکن جس مقصد سے یہ مظاہرہ کیا گیا تھا اُس میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ بچوں کے دلوں میں اس رعب یا خوف سے کہیں زیادہ نفرت بھری ہوئی تھی۔ شام کو جب ہم بھوکے پیاسے نڈھال ہو کر گھر لوٹ رہے تھے تب بچے یا تو ہنس ہنس کر کہہ رہے تھے: "اتنے کیسے لال لال منہ کے انگریز تھے جیسے بندر ہوں بندر" اور یا تحریکِ خلافت اور [illegible] کو آپریشن کے گیت گا رہے تھے۔ جیسے

"کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی
ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو"

اور اس دن ایک چار پانچ برس کے بچے نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ "میں اِن انگریزوں کی سرکاری نوکری نہیں کروں گا" اور اب پچاس برس بعد بھی جب انگریز سرکار ختم ہو چکی ہے اور آزاد ہندوستان کی اپنی قومی حکومت قائم ہو چکی ہے نہ جانے کیوں میں اب بھی سرکاری [illegible] سے گھبراتا ہوں۔

دوسرا ناقابلِ فراموش واقعہ شاید ۱۹۳۲ء کی بات ہے جب میں علی گڑھ

یونیورسٹی کے انٹرمیڈیٹ کالج میں پڑھتا تھا۔ نیا نیا سائیکل چلانے کا شوق ہوا تھا چند دوستوں نے طے کیا کہ سائیکلوں پر آگرے جائیں گے جو علی گڑھ سے کوئی اسّی میل ہے۔ مقصد تو تھی تاج محل کو چاندنی رات میں دیکھنے کی لیکن راستے میں کسی کی سائیکل کا ٹیوب پھٹ گیا اُسے ٹھیک کرنے کے لئے ایک گاؤں میں دوپہر بھر ٹھہرنا پڑا۔ اس گاؤں کی غربت کی تصویر آج تک میرے دل و دماغ پر نقش ہے ٹوٹے پھوٹے کچے مکان، لوگوں کے پھٹے پرانے میلے کچیلے کپڑے جھونپڑوں کے بیچ میں سے بہتا ہوا گندا نالا جس پر کروڑوں مچھر بھنبھنا رہے ننھے دُبلے پتلے سوکھے جسم کے ننگے بچے جو بھیک مانگنے کے لئے ہمارے سامنے ہاتھ پھیلا رہے تھے اور ہر چہرے پر نہ صرف افلاس بلکہ اس سے بھی زیادہ بھیانک ایک عمیق مایوسی کی چھاپ جیسے اُنہیں یقین ہو کہ اُن کی حالت کبھی بہتر نہیں ہو سکتی۔

اُس وقت تک میں نے سوشلزم پر دو چار کتابیں پڑھی تھیں لیکن اُس دن میں قطعی طور پر اشتراکیت پر ایمان لے آیا۔

اگست ۴۲ ۱۹ء میں مہاتما گاندھی کی قیادت میں ہماری جنگِ آزادی کا آخری دَور شروع ہوا اُس زمانے کے دو واقعات نے مجھے ازحد متاثر کیا۔

۸ اگست کو کانگریس نے برطانوی سرکار کو الٹی میٹم دیدیا اُسی رات کو سب لیڈر گرفتار کرلئے گئے۔ اگلے دن اعلان ہوا کہ شیواجی پارک میں ایک عام جلسہ ہوگا جس میں کستوربا گاندھی بھی تقریر کریں گی۔ وہ شام مجھے آج تک یاد ہے۔ پارک کا سارا میدان میدانِ جنگ کا نمونہ بنا ہوا تھا مگر یہ جنگ اس جنگ سے کتنی مختلف تھی جو یورپ میں ہو رہی تھی۔ یہاں ایک طرف لگ بھگ ایک لاکھ نہتے مرد، عورت، بچے، دوسری طرف ہزاروں مسلح پولیس والے اور اُن کے درجنوں انگریز اور اینگلو انڈین افسروں کے پاس ہر قسم کے ہتھیار، لاٹھیاں، بندوقیں، رائفلیں، ریوالور، لاریوں پر چڑھائی ہوئی مشین گنیں اور رُلانے والی گیس کے بم کئی گھنٹے یہ جنگ جاری رہی۔

لاٹھیاں برسائی گئیں، رائفلوں سے فائر کئے گئے، رُلانے والی گیس کے سینکڑوں بم چھوڑے گئے، جن سے چاروں طرف زہریلے بادل چھا گئے جن کے قریب آتے ہی بے اختیار آنکھوں میں مرچیں لگ کر آنسو بہنے لگتے تھے اور انسان تقریباً اندھا ہو جاتا تھا لیکن مجمع نے ہار نہیں مانی۔ اگر ایک جھنڈا بردار لاٹھی کھا کر گر پڑتا تو فوراً دوسرا اُٹھا کر آگے بڑھ جاتا۔ اس کی جگہ دوسرے نے لے لی۔ گیس کا مقابلہ کرنے کے لئے کسی نے یہ نسخہ بتلایا کہ رومال پانی میں بھگو کر چہرے کو ڈھانک دیا جائے تو گیس کا اثر نہیں ہوتا۔ پھر کیا تھا۔ چاروں طرف کی عمارتوں سے عورتیں بالٹیاں لے لے کر نکل پڑیں اور نہتے عوام ایک بار پھر پولیس اور فوج کے مقابلے میں ڈٹ گئے،

جھنڈے لہرائے گئے، پولیس کے باوجود پارک کے کونے کونے میں جلسے ہوئے آزادی کا ریزولیوشن بار بار پڑھا گیا، تقریریں ہوئیں۔ "انقلاب زندہ باد" کے نعرے بلند ہوئے اور ایک لاکھ بمبئی نواسیوں نے اس شام عدم تشدد پر قائم رہتے ہوئے بھی سامراجی پولیس اور فوج کو شکست فاش دی۔

"جنگِ آزادی" یہ دو لفظ تو بچپن سے سنتا آیا تھا۔ سینکڑوں بار اپنی تقریروں اور مضامین میں بھی یہ لفظ دہرائے تھے۔ لیکن اس شام میں نے اپنی آنکھوں سے اس "جنگِ آزادی" کو دیکھا، اور اس میں شرکت کی۔ میری کمر پر بھی لاٹھی کی ایک ضرب لگی۔ زہریلی گیس کے اثر سے میں بھی وقتی طور پر اندھا ہو گیا اور جب لوگوں نے دیکھا کہ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے تو کوئی دو انجانے ہاتھ مجھے سہارا دیتے ہوئے ایک بلڈنگ کی دوسری منزل پر لے گئے اور مرہٹی زبان میں نہ جانے کیا کہہ کر نہ جانے کس کے سپرد کر گئے۔ اس گھر کے کسی فرد نے میرا ہاتھ پکڑ کر پلنگ پر لٹا دیا اور میری آنکھوں پر پانی میں بھیگا ہوا رومال رکھ دیا۔ تھوڑی دیر میں میں نے محسوس کیا کہ آنکھوں کی چرچراہٹ کم ہو رہی ہے۔ رومال ہٹا کر میں نے دیکھنا چاہا تو پہلے تو ہر چیز دھندلی نظر آئی جیسے گیلے شیشے میں سے دیکھ رہا ہوں لیکن جلد ہی آنکھوں کا فوکس ٹھیک ہو گیا، کہ دیکھا کہ دیواروں پر بھگوان کرشن، شیو مہاراج، دیوی لکشمی اور شیواجی کی تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ ایک کونے میں پوجا کی جگہ ہے جہاں مورتی رکھی ہوئی ہے۔ چراغ جل رہے ہیں، پھول بکھرے ہیں اور ایک بوڑھی عورت پوجا کر رہی ہے۔

تیس برس پہلے چھوت چھات کا کافی خیال رکھا جاتا تھا۔ میں اتنے مذہبی پوجا پاٹھ کے ماحول میں ہوں، یہ دیکھ کر میں سٹ پٹا کر اُٹھ بیٹھا۔

پلنگ کی چوں چوں سن کر بڑی بی نے مڑ کر دیکھا، پھر مورتی کی طرف جلدی سے سر جھکا کر پوجا کو بیچ میں چھوڑ کر اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

میرے پاس آکر مرہٹی میں بولیں "کیوں اُٹھ کیوں گیا، بیٹا۔ کچھ دیر آرام کر۔"

میں تھوڑی سی مرہٹی سمجھتا ہوں مگر بول نہیں سکتا، سو میں نے جواب ہندوستانی میں دیا۔ میں نے کہا:-

"نہیں اب میں ٹھیک ہوں۔ رات ہوگئی ہے، اب مجھے جانا چاہئے۔"

"نہیں نہیں پہلے دودھ پی لے" اور یہ کہہ کر وہ اندر گئیں اور ایک تانبے کے گلاس میں گرم گرم دودھ لے کر آئیں۔

میں نے سوچا اتنی مہربان دیوی کے دھرم کو کیوں بھرشٹ کروں، سو میں نے دودھ کا گلاس نہیں لیا اور کہا

"ماں جی میں مسلمان ہوں"

میرا خیال تھا کہ یہ سُن کر وہ سوچ میں تو ضرور پڑ جائیں گی کہ اب مسلمانوں سے کیسے برتاؤ کیا جائے۔ مگر انہوں نے ایک سیکنڈ بھی توقف نہیں کیا اور بولیں

"تو پھر کیا ہوا؟" اور یہ کہہ کر بچے دودھ کا گلاس پکڑا ہی دیا۔

میں نے دودھ کا ایک گھونٹ پی کر کہا "شما کرنا ماں جی۔ میری وجہ سے آپ کی پوجا پوری نہ ہو سکی۔"

اُس بوڑھی، گمنام، شاید اَن پڑھ مرہٹہ خاتون کا جواب سُن کر میں ششدر رہ گیا۔ بولیں۔

"سو کیا ہوا، بیٹا۔ یہ بھی تو پوجا ہی ہے۔"

اور اِس وقت میں نے دیکھا کہ ایک کونے میں گاندھی جی کی تصویر بھی لگی ہوئی ہے اور اس تصویر میں وہ مسکرا رہے ہیں اور اُن کی مسکراہٹ مجھ سے کہہ رہی ہے۔

"دیکھا تم نے۔ انقلاب یوں بھی آتا ہے۔ دھیرے دھیرے دل کے راستے!"

ابھی پندرہ اگست کے نعرے فضا میں گونج ہی رہے تھے کہ شمال مغرب اور شمال مشرق سے فرقہ وارانہ قتل و خون کی خبریں آنے لگیں۔ بمبئی میں بھی فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھ گئی، بہتے راہ چلنے والوں پر قاتلانہ حملے ہونے لگے۔ اس ہولناک زمانے کے کئی واقعات نے مجھے ازحد متاثر کیا اور ان میں سے اکثر کے بارے میں اپنے مضامین اور افسانوں میں لکھ چکا ہوں۔ مگر ایک واقعہ ایسا ہے جس کا میں نے اب تک کسی سے ذکر نہیں کیا۔

شیواجی پارک کے علاقے میں جو چند مسلمان خاندان رہتے تھے وہ سب اپنے اپنے گھر چھوڑ کر "محفوظ مسلم علاقوں" میں چلے گئے۔ صرف میں اور میری بیوی اپنی سمندر کے کنارے والی فلیٹ میں اکیلے رہ گئے۔

چند فرقہ پرست ہندوؤں نے کوشش کی کہ ڈرا دھمکا کر ہمیں بھی مجبور کیا جائے کہ یہ علاقہ چھوڑ دیں۔ لیکن میں نے سوچا اگر شیواجی پارک میں میرے لئے زندہ رہنا ناممکن ہے تو زندہ رہنا ہی بیکار ہے۔ میں وہیں رہا۔ ایک شام کو اندھیرا ہونے کے بعد دادر کے اسٹیشن پر ریل سے اترا تو دیکھا بازار سب اندھیرے اور سنسان ہیں معلوم ہوا کہ قتل کی چند وارداتیں ہو چکی ہیں اس لئے کرفیو نافذ کر دیا گیا ہے اور نو بجے کے بعد کسی کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس وقت تقریباً پونے نو بجے تھے میں نے جلدی جلدی قدم بڑھائے کہ کرفیو کے وقت سے پہلے اپنے گھر پہونچ جاؤں۔

راستے میں دادر کی ایک اندھیری سی گلی میں سے گزر رہا تھا کہ میں نے محسوس کیا کہ کوئی پیچھے چلا آ رہا ہے (میں فطرتاً کوئی بہت بہادر نہیں ہوں، اگر میں اس خطرناک زمانے اور اس خطرناک علاقے میں اندھیرے اُجالے اس طرح اکیلا گھومتا تھا تو اس میں بہادری سے زیادہ ضد کو دخل تھا) میں نے سوچا آج ضرور میری موت آگئی۔ مگر اب تو بھاگنے سے بھی کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ وہ شخص جو بھی تھا مجھ سے چند قدم پیچھے ہی چلا آ رہا تھا مرنا ہے تو پیٹھ میں چھرا کھا کر کیوں مروں۔ یہ سوچ کر میں نے اپنے قدم دھیمے کر دیئے اور جب مجھے محسوس ہوا کہ وہ میرے بالکل قریب آگیا ہے تو میں ایکدم ٹھہر کر مڑا۔ ایک لمحے کے لئے، تو وہ بیچارہ ڈر کر ٹھٹک گیا کہ شاید میں اُس پر حملہ کرنے والا ہوں۔

اس کو اطمینان دلانے کے لئے میں نے پوچھا "کیوں کرفیو لگا ہے کیا؟"

اُس نے کہا۔ "ہاں — نو بجے کا کرفیو ہے اِدھر — مگر شیواجی پارک میں نہیں ہے۔"

اب ہم دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے مگر کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے جا رہے تھے۔

"کیوں بھئی تم کہاں جا رہے ہو؟" میں نے پوچھا

"شیواجی پارک۔ اور تم؟"

"میں بھی شیواجی پارک"

"وہاں رہتے ہو کیا؟"

"ہاں۔"

"کون ہو تم؟ نام کیا ہے تمہارا؟"

میں اس سوال کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ اور اس سوال سے ڈر بھی رہا تھا۔ اب کیا جواب دوں؟ کہوں کہ میرا نام گوپال راؤ ہے یا موہن لال ہے یا ونسنٹ ڈیسائی ہے اور اگر اس نے جرح شروع کر دی اور بھانڈا پھوٹ گیا تو؟ یا یہ کہوں کہ تم کون ہوتے ہو میرا نام پوچھنے والے۔ اس سے تو اسے شبہ کیا یقین ہو جائے گا کہ میں اپنا نام چھپا رہا ہوں۔

سو میں نے کہا "میرا نام ہے احمد عباس۔ خواجہ احمد عباس"

اس نے کہا۔ "تم پیپر میں کام کرتے ہو نا؟"

میں نے کہا: "ہاں بمبئی کرانیکل میں۔"

"اور تم ابھی تک شیواجی پارک میں رہتے ہو؟"

میں نے کہا "ہاں کئی برس سے یہیں رہتے ہیں ہم"

اور اتنے میں ہم پولیس کے سپاہیوں کے ایک گروہ کے قریب سے گزر کر کرفیو کی حدود سے گزر کر شیواجی پارک والی سڑک پر آگئے۔

میرے ہمراہی نے کہا: "میٹنگ میں چل رہے ہو عباس بھائی ؟"
میں نے کہا: "کون سی میٹنگ ؟"
"سورکشن دل بنا رہے ہیں نا. سب شیواجی پارک کے رہنے والے اکٹھے ہونگے"
میں نے کہا: "تو ضرور چلتا ہوں"

سو ہم دونوں اکٹھے اُس جلسے میں داخل ہوئے. سو سوا سو آدمی موجود تھے۔ اور ان میں سے اکثر مجھے جانتے تھے: "آؤ آؤ عباس بھائی." چاروں طرف سے آوازیں آئیں۔

تجویز پیش کی گئی کہ فسادات کی روک تھام کے لئے اور شیواجی پارک کے علاقے میں امن قائم رکھنے کے لئے ایک سورکشن دل (خود حفاظتی دستہ) بنایا جائے. کمیٹی کے ممبروں کا چناؤ ہوا. پہلا ممبر جس کو چنا گیا اس کا نام تھا —— — خواجہ احمد عباس۔

اور جن لوگوں نے میرے نام کی موافقت میں ہاتھ اٹھائے اُن میں وہ آدمی بھی تھا جس کو چند منٹ پہلے میں اپنا قاتل سمجھ رہا تھا۔

میں نے ارادہ کیا کہ جلسہ ختم ہونے کے بعد اس سے ضرور ملوں گا، اس کا نام پتہ پوچھوں گا لیکن جلسے کے خاتمے پر جو بات چیت اور بحث مباحثہ اور افرا تفری ہوتی ہے اس میں وہ کھو گیا اور آج تک مجھے اس کا نام نہیں معلوم ....

مگر اس کے بعد میں بدترین فسادات کے دوران میں بمبئی کے ہر علاقہ میں گھوما، دہلی اور پانی پت گیا، کشمیر گیا جب سارا ہندوستان اور پاکستان نفرت اور غصے اور انتقام کے خونی سیلاب میں ڈوبا ہوا تھا لیکن جہاں کہیں بھی میں گیا خود میں نے تو معمولی انسان ہی دیکھے۔ ہندو، سکھ، مسلمان ۔ نہ مجھے کسی سے خوف ہوا نہ کسی نے مجھ پر حملہ کیا اور مجھے ایسا لگا کہ دراصل یہ فسادات، یہ خون خرابہ، یہ لوٹ مار، یہ مار دھاڑ، اس وقت ہوتی ہے جب تعصب اور نفرت کا اندھیرا چھایا ہوتا ہے اور اس اندھیرے میں ہر راستہ چلتا ایک خونی اور ڈاکو نظر آتا ہے اور ایک دوسرے کا خوف ایک دوسرے پر حملہ کراتا ہے ایک دوسرے کا خون کراتا ہے۔

اپنی یادداشت کے اندھیرے میں اب بھی میں اس گمنام، انجانے ہم راہی کے قدموں کی آواز سنتا ہوں اور جب میں مڑتا ہوں اور ہم آمنے سامنے ہوتے ہیں تو اس کی آواز سنائی دیتی ہے۔

"کون ہو تم ؟ نام کیا ہے تمہارا ؟"

اور میں بے خوفی اور فخر سے جواب دیتا ہوں، احمد عباس. خواجہ احمد عباس جو پچپن برس ہوئے پانی پت میں پیدا ہوا تھا. پانی پت جو اب بھی ہندوستان میں ہے۔ اور میرے نانا تھے خواجہ سجاد حسین جنہوں نے بچوں کی تعلیم کے لئے اپنی ساری دولت، ساری عمر اور ساری طاقت خرچ کر دی، اور میرے والد تھے خواجہ غلام السبطین جنہوں نے مجھے سچ بولنا سکھایا، کسی کے سامنے سر نہ جھکانا سکھایا اور سیاسی اختلافات میں رواداری سکھائی۔ اور میری والدہ تھیں مسرورۃ النساء بیگم جنہوں نے سکول کالج میں تعلیم نہیں پائی تھی نہ کسی سیاسی جلسے میں شریک ہوئی تھیں لیکن جو آخری دم تک اپنے ملک ہندوستان کی وفادار رہیں. . . . . مگر میں اپنے خون کے رشتہ داروں ہی کی اولاد نہیں ہوں میں اپنے ملک اور قوم کی اولاد بھی ہوں. گاندھی اور نہرو کے خاندان میں سے ہوں اور انسانیت اور سوشلزم کے ناتے سے میرے رشتہ دار ساری دنیا میں ہیں — روس میں، امریکہ میں، انگلستان میں، اور چین میں — پھیلے ہوئے ہیں اور جو کچھ ہوتا ہے وہ مجھ پر (اور ہر شخص پر) اثر انداز ہوتا ہے کیونکہ جیسا ایک یوروپین شاعر جان ڈان (John Donne) نے کہا ہے

"کوئی انسان جزیرہ نہیں ہے۔"
"ہر انسان سمندر میں ایک قطرہ ہے"
"ہر انسان زمین کا ایک ذرہ ہے"
"ہر انسان کی موت میری موت ہے، کیونکہ میں اور انسانیت جدا نہیں ہیں —"

. . . . . . اور اسی طرح دن اور مہینے اور برس گزرتے ہیں اور شخصیات اور واقعات کا لامتناہی جلوس گزرتا رہتا ہے اور جس طرح کیمرے کی فلم پر ہر منظر کا عکس (خواہ وہ صاف ہو یا دھندلا) پڑنا ضروری ہے اسی طرح ان واقعات اور شخصیات کا اثر قبول کرنا بھی میرے لئے (اور ہر کسی کے لئے) ضروری ہے ۔ یہ سلسلہ ہر انسان کی پیدائش کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور موت سے پہلے ختم نہیں ہو سکتا۔

شملے کی سیر

عرش ملسیانی

بہارِ شملہ کیا کہوں ؛ ہے سر پہ چرخِ نیلگوں
ہجومِ کہکشاں بھی ہیں ؛ حسیں رواں دواں بھی ہیں
مگر یہ مستقر ہیں کیوں ؛ یہ پُر حذر سفر ہیں کیوں
ہزار ہا چاند دلستاں ؛ ہیں مال پر رواں دواں
بوقتِ شام دیکھئے ؛ اک اژدہام دیکھئے
قدم کہاں کو اُڑ سکے ؛ نظر کہاں کو لڑ سکے
جگہ نہیں کہ چل سکیں ؛ پلٹ کے رُخ بدل سکیں
مچل سکیں، سنبھل سکیں
میں دیکھتا چلا گیا

چھتیں یہ لال لال سی ؛ عبیر سی گلال سی
درخت یہ فلک نما ؛ یہ سائیں سائیں یہ ہوا
یہ دُھوپ چھاؤں کا سماں ؛ یہ زندگی کی داستاں
یہ ریل پیل یہ چھبن ؛ یہ پھول پھل چمن چمن
کھلا ہوا ہے میکدہ ؛ مسرتوں کا موج سا
تمازتوں کی موت ہے ؛ ہوائے گرم فوت ہے
جہنموں کو چھوڑ کر ؛ بہشت میں ہوا گزر
کرامتوں کا یہ اثر
میں دیکھتا چلا گیا

یہ خوشگوار زندگی ؛ یہ پُر بہار زندگی
یہ رنگ کوہسار کے ؛ یہ نغمے جوئبار کے
یہ مہ وشوں کی ٹولیاں ؛ یہ بولیاں یہ ٹھولیاں
فلک نما عمارتیں ؛ سکون کی بشارتیں
بلند ہیں یہ مستقر ؛ ٹھہرے تو کس طرح نظر
ہر اک طرف ہجوم ہے ؛ ہر ایک سمت دھوم ہے
یہ مستِ نازِ زندگی ؛ یہ جاں گدازِ زندگی
یہ حسن سازِ زندگی
میں دیکھتا چلا گیا

نشیب تازگی بھرے ؛ فراز یہ ہرے بھرے
یہ دل فریب گھاٹیاں ؛ یہ بادلوں کے کارواں
یہ کوہ کی بلندیاں ؛ نظر کی دل پسندیاں
یہ رفعتیں یہ پستیاں ؛ یہ بستیوں پہ بستیاں

نمونے قدرتِ حسیں ؛ فلک سے لے کے تا زمیں
درخت دیودار کے ؛ نمونے اک وقار کے
سڑک یہ گھومتی ہوئی ؛ نشے میں جھومتی ہوئی
قدم کو چومتی ہوئی
میں دیکھتا چلا گیا

بوقتِ شب فضاؤں پر ؛ ہے ایک خامشی مگر
عجیب ہے یہ خامشی ؛ مہیب ہے یہ خامشی
خموش شہر کی فضا ؛ خموش اوج کوہ کا
شجر حجر کے سلسلے ؛ رہینِ خواب ہو گئے
یہ طائروں کا شور ہے ؛ یہ زندگی کا زور ہے
نہ میکدوں میں ہاؤ ہو ؛ نہ شور ہائے واشربو
نہ جانے جوئے کوہ کیوں ؛ بجا رہی ہے ارغنوں
یہ اضطراب یہ جنوں
میں دیکھتا چلا گیا

کباب سیخ کے مزے ؛ اُڑا رہے ہیں منچلے
بھٹورے اور پوریاں ؛ بھری ہوئی ہے ہر دکاں
وہ گاہکوں کا زور ہے ؛ کہ اک عجیب شور ہے
جگہ نہیں جہاں ذرا ؛ کھڑے کھڑے ہی ناشتا
پھلوں پہ رنگ روپ ہے ؛ یہ رنگ بھی انوپ ہے
شراب تلخ انگبیں ؛ کہیں جو ہے تو ہے یہیں
کہاں صدا الست کی ؛ کہاں ہے رندِ مست کی
یہ شان بود و ہست کی
میں دیکھتا چلا گیا

مناظر ایسے ہیں کہاں ؛ نہ یہ زمیں نہ آسماں
مشوبرا کی یہ ہوا ؛ یہ بالوگنج کی فضا
یہ جاکھو کی بلندیاں ؛ بلند ارجمندیاں
یہ کفڑی کا مقام ہے ؛ بہت بلند بام ہے
یہ وقتِ برف دیکھئے ؛ تماشے کھیل کود کے
یہ نالدہرا کی فضا ؛ یہ نادرِ کندا خوش نما
ہمالیہ کے سلسلے ؛ فلک سے بس ملے ہوئے
زمین کے یہ حوصلے
میں دیکھتا چلا گیا

جیلانی بانو

پکے کاغذ پر اسٹامپ کہیں نہیں لگا تھا۔

اور یہ بات اتنی بودی تھی — ! اس بات پر قادر صاحب کو بھی یقین نہیں آتا تھا۔

بھئی دُنیا کا قاعدہ ہے کہ ہر بات کا کوئی ثبوت ہوا کرتا ہے۔ چار آدمیوں کی گواہی ضروری ہوتی ہے مگر آج تو قادر صاحب کو ایسا لگ رہا تھا جیسے خود ان کا دل بھی گواہی دینے کو تیار نہ ہو۔

جبھی تو رام پیاری بار بار ان سے کہا کرتی تھی۔

"صاب میں نے ایک غلطی کی ہے کہ کوئی بات کبھی پکے کاغذ پر نہیں لکھوائی۔"

اور قادر صاحب سوچتے۔ جو عورت پکا کاغذ لکھوانا بھول جاتی ہے۔ وہ رنڈی، رکھیل کہلاتی ہے۔ اُسے رام پیاری کی طرح ہر طرف سے دھکے دئے جاتے ہیں۔ اب وہ اپیل کرے تو کون سی عدالت میں، انصاف کرے تو کس برتے پر — ! قادر صاحب خود ہی یہ باتیں سوچتے اور خود ہی پاگل ہوا کئے۔ آج پھر رام پیاری نے وہی بات دُہرائی۔

"میرے پاس تو کوئی بھی ثبوت کسی بات کا نا ہیں ہے" جبھی تو گھسیٹے کے بھائی ہم کو گھر سے نکال رہے ہیں، جبھی تو آج بیگم صاب نے مجھے گالیاں دیں۔

بلکہ قادر صاحب کو تو اس بات کا سرا بھی نہیں ملتا تھا کہ وہ کب رام پیاری کے جھمیلے میں اُلجھے تھے۔

جب قادر صاحب کی شادی ہوئی ہے تو اُن کے ہاں رام پیاری کی ساس پھول وتی کپڑے دھوتی تھی۔ بوڑھی، بدمزاج اور کام چور دھوبن تھی مگر وہ چونکہ قادر صاحب کی والدہ کے زمانے سے اس گھر میں آتی تھی اس لئے بہو بیگم کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ اُسے نکال باہر کریں۔ پھر پھول وتی اچانک مر گئی۔ اب یہ ہونے لگا کہ اس کا آوارہ، ناکارہ، نکھٹو لڑکا گھسیٹا کپڑوں کی گٹھڑی لے کر جاتا تو مہینوں اس کی صورت نظر نہ آتی۔

دلہن بیگم دوسری دھوبن کی تلاش میں تھیں کہ ایک دن گھسیٹا نے خود ہی اس کا انتظام کر دیا۔

وہ پندرہ سولہ برس کی ایک چلبلی شوخ لڑکی کو لے کر آیا کہ اب یہ کپڑے دھوئے گی۔ اتنی پیاری پیاری۔ گوری گوری سی اس کی جوڑی دلہن بیگم کو بہت بھائی۔ سُرخ کپڑوں اور چاندی کے زیوروں میں لپٹی وہ بنی کی مزیدار ڈلی لگ رہی تھی۔

جب وہ صاب کے پاؤں چھونے کو جھکی تو قادر صاحب جھجک کے پیچھے کو ہٹے اور ہنس کر گھسیٹا سے کہا۔

"ارے گھسیٹے میاں، بہو تو تمہاری بہت اچھی ہے۔ ایسی کوئی اور ملے تو ہمارے لئے بھی لا دینا۔"

صاب کے اس مذاق پر گھونگھٹ میں پٹی دلہن بھی کھی کھی کر کے ہنس پڑی تھی۔

مگر اُسے کپڑے دیتے ہوئے سب ڈرے کہ اتنی سی لونڈیا اتنی ذمہ داری کا کام کیسے سنبھال سکے گی؟

پھر اس لڑکی نے بڑے چاؤ سے کپڑے دھونا شروع کئے، جیسے وہ

گھسیٹا اپنے عشق کا اظہار اُن کپڑوں کو چمکا کر ہی کرنا چاہتی ہو۔ ہر کپڑا ابرک سے چم چم کرتا . . . . دودھ کی طرح سفید استری اور کلف سے لیس۔

وہ صاحب کے کپڑے بڑے ادب اور احترام کے ساتھ الگ اٹھا کر دیتی تھی اور بار بار تشویش بھرے لہجے میں دلہن بیگم سے پوچھتی۔

"صاحب ہم پہ کھپا تو نا ہیں ہوت ـــــ ؟"

بعد میں معلوم ہوا گھسیٹا اُس لڑکی کو کہیں سے بھگا کر لایا تھا۔ اپنی برادری میں جھوٹا موٹ مشہور کر دیا ہے کہ رام پیاری بھی ذات کی دھوبن ہے۔ حالانکہ وہ کسی بنئے کی لڑکی تھی۔ پیدائشی دھوبن بننے کے لئے بیچاری رام پیاری کو اپنی کمر توڑنا پڑتی تھی۔ ہاتھ زخمی ہو جاتے اور وہ رو رو کر گھسیٹا سے کہتی تھی کہ میرے ساتھ پھیرے لے کر کہیں دُور جا بسو مجھ سے ای محنت کا کام نہیں ہوتا۔

رام پیاری کے ہاں پہلا بچہ ہوا تو بیگم صاحب نے بچے کو دیکھ کر رام پیاری کی گود کچے چاولوں سے بھری۔ بچے کو نیا کرتا اوڑھا دیا۔ مگر وہ بچہ مر گیا پھر اور ہوئے۔ ہر سال رام پیاری کی گود بھرتی اور بچہ مر جاتا تھا۔

چند ہی برس بعد وہ شرماتی لجاتی بنئے کی ڈلی جیسی میٹھی رام پیاری میوہ بھری ڈالی بن گئی تھی کہ کوئی پھل اُدھر ڈھلکتا، کوئی اِدھر لڑھکتا۔

اب وہ خوب کپڑے پھاڑتی، کھو دیتی۔ اور زیادہ میلے کر کے لاتی اور سب کو قائل کر دیتی تھی، کہ یہ دُھلے ہوئے کپڑے ہیں۔ دلہن بیگم اب خود بھی چار بچوں کو سیانا کر کے تھک سی گئی تھیں۔ اس لئے نئے نئے لوگوں سے انہیں وحشت سی ہوتی تھی۔ اس لئے رام پیاری اس گھر میں کھپتی جاتی۔ حالانکہ دلہن بیگم کا ڈاکٹری میں پڑھنے والا لڑکا جاوید، کالج جانے والا لڑکا ماجد، عاصمہ اور ناظمہ خوب شور مچاتیں کہ اس دھوبن سے کپڑے مت دھلواؤ ـــ قادر صاحب بھی بغیر کلف کے پاجاموں پر صبر کر کے بیٹھ رہتے۔

مگر انہوں نے کبھی رام پیاری کو برطرف کرنے کی تجویز نہیں رکھی تھی بلکہ وہ تو رام پیاری کے آتے ہی حساب کی کاپی لے کر اس کے سامنے جا بیٹھتے اور ہنسی مذاق شروع ہو جاتا۔

"بھئی کپڑے تو تو دھوتی نہیں ہے پھر کرتی کیا ہے دن رات ؟"

"کیا کروں صاحب" وہ گھسیٹا بے چین بھی لینے دے۔" وہ منہ پر گھونگھٹ کھینچ کر بڑی ادا سے کہتی"

"جھوٹی کہیں کی ـــ" قادر صاحب سچ مچ خفا ہو جاتے۔

جس عورت کے بیاہ کو پندرہ برس گزر جائیں تو اس کا میاں کون سے جھمیلوں میں گھسیٹے گا اُسے۔ اور پھر رام پیاری کے چندری میں سے چمکتے جھلکتے ـــ خوبصورت بدن کو دیکھ کر وہ آنکھیں چرا لیتے۔

"کیوں بیچارے گھسیٹے کو بدنام کرتی ہے۔ وہ بیچارا تو بھنگ کے نشے میں پڑا رہتا ہے دن رات۔ تو خوب مزے اڑاتی پھرتی ہے ـ پرسوں کہاں جا رہی تھی ـــ سُرخ چندری اوڑھے ـــ خوب بناؤ سنگار کئے ـــ"

"لو اور سنو دُلہن بیگم ـــ" رام پیاری منہ پر انگلی رکھ کر چلاتی ـــ "جو بھنگ کے نشے میں دن رات پڑا رہے وہ تو ہوا بیچارہ ـــ اور میں دکھیا جو دن رات محنت کروں ہوں۔ سو اُس کے بارے میں یہ کہت ہیں صاحب ـــ ہے بھگوان ـ بڑکوں نے سچ کہا ہے کہ مردوا تو مردوے کی ہی پشتی لے گا۔"

"بس بس بہت ہو چکا ہنسی مذاق ـــ" دلہن بیگم جھنجھلا کے کہتیں۔

"یہ بتا میری وائیل والی ساری کہاں ہے !"

"ہے ہے تو بس جوان مرے پھر اِن کی ساری بیچ ڈالی ـــ اُرتی اُٹھے اس نامراد کی ـــ جب بڑھاپے میں مستی چڑھے تو ایسی ہی مت ماری جائے ہے آدمی کی ـــ" وہ گھسیٹے کو کوستی پیٹتی ہوئی جلدی سے باہر بھاگتی۔"

کسی دن قادر صاحب اُسے چھیڑتے ـــ

"اری رام پیاری کل بڑکو کہہ رہا تھا کہ تجھے گھسیٹا نے خوب پیٹا ـــ ؟"

"آگ لگے اس بڑکو نامراد کی دُکان میں ـــ" وہ غصہ کے مارے بھنا جاتی ـــ "میرا مرد مجھے سو بار مارے کسی کو کیا گرج ہے۔ اور پھر جب اُس نے دو دو جلیبی لا کر کھلائی تھی وہ نہ دیکھا اُس جنم کے اندھے نے ـــ؟"

وہ اترا کے کہتی تو سارے گھر کا ہنسی کے مارے بُرا حال ہو جاتا تھا۔

اب یہ ہوتا کہ شام کے وقت کوئی کام وام تو ہوتا نہیں۔ یوں بھی آدمی جب پچاس برس کا ہو جائے تو کیسی شدید بے کاری آ گھیرتی ہے! قادر صاحب کو اس بے کاری نے ایک عادت ڈال دی تھی۔ بس یہی کہ شام کو ذرا میراثیوں کی گلی تک ٹہل لیتے تھے۔ یا پھر بقول دلہن بیگم کے جب تک وہ میراثیوں کی گلی کا ایک چکر نہ لگا لیتے ان کا کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا۔ میراثیوں کی گلی سے گھر کی طرف لوٹتے وقت وہ بڑکو پان والے کی دکان پر ضرور ٹھہرتے۔ اس دُکان سے ملا ہوا رام پیاری کا گھر تھا۔ کبھی رام پیاری اپنی کوٹھریا کے سامنے بیٹھی چاول بنتی، کبھی اپنے لمبے لمبے بال کھولے بیٹھی جوئیں مارا کرتی تھی لیکن جس دن گھسیٹا اُسے مارا کرتا تھا تو جانے کہاں سے اچانک صاحب آ جاتے اور بیچ بچاؤ کر کے گھسیٹے کو دس پانچ سُنا دیتے تھے۔ کسی دن رام پیاری نظر نہ آتی تو انہیں تشویش ہو جاتی تھی کہ آج اس گھسیٹے کے بچے نے ضرور اس کی ٹھکا

پسلی توڑ دی ہوگی وہ بیچاری اندر چپکی ضرور کراہ رہی ہوگی۔"

ایک دن صبح میراثیوں کی گلی میں بڑا شور مچا۔ معلوم ہوا رات گھسیٹا مر گیا۔ بہت دنوں پہلے ہی ڈاکٹروں نے اُسے بھنگ پینے کو منع کر دیا تھا مگر وہ نہ مانا۔ بلکہ پاس پڑوسی تو کہتے ہیں کہ وہ نہ مانتا تھا تو رام پیاری خود اُسے پلاتی تھی۔ کہتی تھی کہ وہ صرف نشے میں میرا ہو جاتا ہے۔ ہوش میں رہے تو اِدھر اُدھر کی باتیں نکال کر مارنے لگتا ہے۔

ازراہِ ہمدردی قادر صاحب بھی رام پیاری کے گھر تک گئے اور دس پانچ روپے گھسیٹے کی ارتھی اٹھانے کو دے آئیں۔ آخر وہ اُن کا پرانا نمک خوار تھا ـــ

رام پیاری اپنی برادری کی عورتوں میں گھری رو رہی تھی۔ صاب کو دیکھ کر اٹھی اور اُن سے لپٹ گئی۔

"صاب میرا گھسیٹا چلا گئیو۔ ہے ہے صاب میں رانڈ ہو گئی۔ یہ سب بجے کہت ہیں کہ میں اپنی بندیا مٹا دئیوں اپنی چوڑیاں توڑ دئیوں ـــ"

"خبردار جو کسی نے بیچاری کی چوڑیاں توڑیں ـــ" صاب للکارے، یوں بھی وہ رام پیاری کے اچانک لپٹنے سے حواس باختہ سے ہو گئے تھے ـ وہ توان معصوم اور احمق مردوں میں سے تھے جنہوں نے زندگی بھر بیوی کے سوا کسی عورت کو نہ چھوا تھا۔

"دیکھو تم سب سے کہے دیتا ہوں جو کسی نے رام پیاری کی بندیا یا چوڑیوں کو ہاتھ لگایا سنا سمجھ لو کہ وہ مر جائے گی یا پاگل ہو جائے گی۔

اب رام پیاری کے مرنے کا ڈر تھا یا اس کے پاگل ہونے کا کہ دھوبی برادری کی کسی خرانٹ بڑھیا کی پھر ہمت نہ ہوئی کہ رام پیاری کی چوڑیاں چھوتی۔

دو چار دن بعد سب اپنے اپنے گھروں کو سدھارے اور رام پیاری اپنی چوڑیوں اور بندیا سمیت گھر میں اکیلی رہ گئی۔ منت تو وہ جب بھی تنہا ہی کرتی تھی جب بتا کہ گھسیٹا دن رات گھر میں پڑا الا یاں بکے جاتا تھا۔ اکیلے رام پیاری کے مستقبل کی کسی کو فکر نہ تھی۔

ایک بار رات کو تقریباً آٹھ بجے قادر صاحب میراثیوں کی گلی سے گزرے تو دیکھا کہ رام پیاری کے گھر میں اندھیرا ہے۔ اسی دن تو وہ کپڑے لے گئی تھی لیکن کم بخت بتا کر نہیں گئی اپنے کپڑوں کی خیریت معلوم کرنے کے لئے انہوں نے [illegible] تو دیکھا جیسے اندھیرے میں کوئی چیز [illegible]

"ہے بھگوان [illegible] صاب کیوں آئے گیو ـــ"

"اری چراغ کیوں نہیں جلایا! اندھیرے میں ڈر بھی نہیں لگتا تجھے!"

"اب مجھے اپنا آپ کسے دکھانا ہے جو دیپ جلاؤں صاب!" اندھیرے میں اُس کی آواز پھر چیخی۔

"اچھا اچھا ـــ بہت ہو چکا رونا دھونا ـــ چراغ جلایا کر ورنہ پاگل ہو جائے گی روتے روتے۔"

دوسرے روز شام ڈھلی تو جانے کیوں قادر صاحب کے دل میں اندھیرا بڑھنے لگا۔ لوٹ پھر کے دھیان ادھر ہی جاتا کہ جانے رام پیاری نے چراغ جلایا ہے یا نہیں!

کھانا ختم کرنا دو بھر ہو گیا۔ جلدی جلدی حقے کے دو چار کش لگائے۔ پان منہ میں دبا ـــ وہ میراثیوں کی گلی تک ٹہلنے چل دیئے۔

ایک دن بڑکو پان والے نے قادر صاحب کو وہاں کھڑے دیکھا تو کھنکار کے بولا ـــ

"صاب رام پیاری تو آج گنگا پور گئی ہے کیا بات ہے ہمیں بتا دیجئے ہم کہہ دیں گے۔"

"کچھ نہیں اصل میں سالن کم رہتا ہے۔ بیگم کہتی ہیں رام پیاری سے کہہ دینا ـــ لیتی جائے ـــ"

جمعہ کے دن نہانے کے بعد قادر صاحب نے کرتا پہنا تو اگلے تین بٹن غائب تھے ـــ ایک آدھ ہوتا تو صبر کر لیتے۔ غصے کے مارے بھناتے ہوئے پہنچے رام پیاری کے گھر ـــ

"گھسیٹا مر گیا ہے تو کیا ہمارے کپڑوں سے کشتیاں لڑتی ہے۔ ذرا دیکھو تو میرے کرتے کی حالت!"

مگر رام پیاری نے مخصوص دھوبیانہ انداز میں کرتے کو نظر انداز کر کے کہا۔

"ایسے اس ملکو کی چتا کو آگ لگے کہت ہے کہ یہ گھر میرے بیاہ [illegible] میں لوں گا۔ کہت ہے کہ میں گھسیٹا کی رکھیل ہوں۔" صاب آپ ہی کچھ انصاف کرو ہمرے سنگ!"

"مگر تیرے پاس تو بیاہ کا کوئی ثبوت ہوگا ـــ؟"

"آپ بھی کیسی بات کرتے ہیں صاب۔ غریب آدمیوں میں بھی کہیں نکاح کا ثبوت ہے وہ کیا اپنی بات سے پھرتا ہے [illegible]

[illegible]

سوچا۔ بیاہ کے بعد گھسیٹا کے ساتھ چاہے کتنے ہی برسوں رہی ہو مگر

آفاق تقی دہلی

قانون تو اُسے گھسیٹا کی بیوی نہیں مانے گا۔

" مگر سرکار بھی تو تجھے گھسیٹا کی بیوی نہیں مانے گی۔

" بے رام، تو کیا پتا کا نام لکھوانا ضروری تھا؟ " رام پیاری نے بے بسی سے کہا اور پھر دلہے صاحب کے پاؤں پکڑ کے رونے لگی۔

تیس پینتیس برس کی رام پیاری جانے کیوں آج قادر صاحب کو اتنی معصوم سی لگی جیسے وہ اس دن تھی جب پہلی بار گھسیٹا اُسے لے کر آیا تھا۔ انہوں نے گھبرا کے رام پیاری کو اٹھایا تو اُس کے کئی آنسو کرتے پر گر گئے جو صاحب کے ہاتھ میں تھا۔ گھر آنے کے بعد قادر صاحب نے اس کرتے کو خوب مل مل کے دھویا اور پھر کسی کونے میں چھپا آئے جیسے سادا گھر اس کرتے پر چمکتے ہوئے آنسوؤں کو پہچان لے گا۔ رات کو سونے سے پہلے انہوں نے کئی بار ہاتھ دھوئے انہیں کچھ شبہ سا تھا کہ تھوڑی بہت رام پیاری ان کے ہاتھوں کو چپکی نہ رہ گئی ہو۔

مگر ایسا لگتا تھا جیسے رات میں دلہن بیگم نے رام پیاری کی خوشبو اُن میں سونگھ لی تھی کیونکہ صبح ہی انہوں نے اعلان کیا کہ اب رام پیاری کے بجائے کوئی دوسرا دھوبی سلے گا، وہ کپڑے بہت خراب دھونے لگی ہے۔

رام پیاری کپڑے لینے آئی تو دو کپڑے اور کم تھے۔ اُسے یقین تھا کہ اب دلہن بیگم بہت غصے میں آئیں گی اس لئے وہ فوراً صاب سے ہنسی مذاق میں لگ گئی اور بڑے ناز سے بولی کہ مجھے دس روپے اُدھار دیدو۔ قادر صاحب حسبِ عادت رام پیاری کو دیکھتے ہی کپڑوں کی گٹھڑی کے پاس آ بیٹھے تھے فوراً اٹھ کر اندر گئے اور دس روپے لا کر رام پیاری کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

بس پھر تو اللہ دے اور بندہ لے۔ جانے کب سے رکا ہوا بندھ ٹوٹ گیا اور دلہن بیگم غصّے کے مارے آپے سے باہر ہو گئیں۔ رام پیاری کو ہزار ہزار سنائیں کہ اس نے بڑے صاب سے پیسے کیوں مانگے؛ آج سے اس کا گھر میں آنا بند — دنیا جہان کی چرب زبان رام پیاری کو بھی جیسے سکتہ سا ہو گیا تھا — وہ گردن جھکائے سیڑھیوں پر بیٹھی روتی رہی۔

" یہ شور ہے بابا اپنے بھونے سونے کے آگے۔ ہمارے گھر میں سیانے لڑکے ہیں یہاں اپنی ادائیں مت دکھاؤ۔"

معاملہ بڑھتے دیکھ کر قادر صاحب کمرے میں چلے گئے سب سے زیادہ شرمندگی انہیں اس بات سے تھی کہ بیگم نے ان سے ایک لفظ نہ کہا — وہ پاندان کھولے کھٹا کھٹ چھالیہ کی ڈلیاں کترتی رہیں۔ کتھے کی پیالی ہونے میں گھونٹے لے رہی تھیں جیسے چونے کے ساتھ دبنے ابھر رہے تھے ڈوب رہے تھے۔

" آج تمہیں کیا ہو گیا ہے امّی — اتنی زور زور سے چلا رہی ہو۔"

جاوید شیو کرتے کرتے کمرے سے باہر چلا آیا۔

" کیا کروں، تم سب کی عزت کے لئے چلا رہی ہوں۔ ہمارا میل دھونے والی دو کوڑی کی دھوبن ہمارے منہ پر کالک لگائے بیٹھی ہے۔" دلہن بیگم جیسے آج سہاگ کہنے پر تُلی بیٹھی تھیں۔

قادر صاحب کا سر کچھ اور نیچے جھک گیا۔ کئی بار اُن کا جی چاہا کہ اٹھ کر بیگم کو ڈانٹ دیں۔ آج اُن کی اتنی جرأت ہو گئی تھی کہ اس طرح قادر صاحب پر الزام لگائیں مگر نہ جانے کیوں کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑتی۔ اور پھر وہ اپنی صفائی میں آخر کیا کہتے! بقول رام پیاری — کوئی ثبوت تو تھا ہی نہیں کسی بات کا۔

اچانک کتھے کی چمچی اُن کے ہاتھ سے چھوٹ کر سفید پاجامے پر گر گئی — وہ چونک پڑے، مَل مَل کر کتھے کے دھبے چھڑانے کی کوشش کی تو وہ اور پھیل گئے۔ وہ پریشان ہو گئے مگر اب اس داغ کو کیسے چھپائیں! اس دن گھر میں بڑا سناٹا سا رہا۔ حد ہو گئی کہ آج ماجد نے چلا چلا کے فلمی گانے نہیں گائے۔ ناظمہ نے پھر سر پہ بالوں کی ٹوکری سی سجائی مگر دلہن بیگم نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ قادر صاحب آفس جانے کے لئے اُٹھے تو بیگم نے رخصتی پان دیا نہ خدا حافظ کہا اور وہ شادی کے بعد پہلی بار اپنے گھر سے غیروں کی طرح رخصت ہوئے۔

البتہ شام کو کھانے کے بعد انہوں نے ٹہلنے کی عادت نہ چھوڑی۔ برکو کی دکان تک پہنچے تھے کہ سامنے جانے کہاں سے اچانک ماجد آ کھڑا ہوا۔

" رام پیاری گھر میں نہیں ہے۔" اس نے اطلاع دی تو قادر صاحب پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ وہ نومبر کی خنکی میں پسینے پسینے ہو گئے مگر فوراً سنبھل کر بولے —

" لیکن اب کیا کام ہے رام پیاری سے تمہیں۔ آج تمہاری امّی نے اس کا حساب کتاب ختم کر دیا ہے!" اور وہ فوراً برکو سے ایک بڑھیا پان بنانے کی فرمائش کرنے لگے۔

" مجھے تو کوئی کام نہیں ہے۔" ماجد گھبرا گیا اور آگے چل دیا۔

دوسرے دن قادر صاحب کے سر میں خوب درد ہونے لگا۔ آفس سے جلدی اٹھ گئے۔ بس اسٹینڈ سے گھر کی طرف جا رہے تھے کہ برکو پان والے کی دکان پر نظر گئی۔

سامنے ہی رام پیاری بیٹھی نظر آئی۔ اپنے دروازے میں بیٹھی جیسے کسی کی راہ تک رہی ہو۔ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے جانے کیا سوچ رہی تھی — سڑک بالکل خاموش تھی۔ برکو بھی دکان بند کر کے کہیں چلا گیا تھا مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ قادر صاحب اب طے کر چکے تھے کہ رام پیاری کے گھر

بھی نہیں جائیں گے۔ آخر ان کی بھی کوئی پوزیشن ہے۔ عزت ہے۔ اور پچاس سے بچل چکے ہیں۔ کیا اب یہی کام رہ گیا ہے کہ ان کی بیوی اپنے جوان بچوں کے سامنے ایک ادنیٰ دھوبن کا نام لے کر انہیں ذلیل کریں۔

پھر خیال آیا کہ بیگم نے رام پیاری کو گھر میں آنے سے تو منع کر دیا ہے مگر یہ نہیں کہا کہ اس کا حساب کتاب بھی ختم کر دیں یہ بھی کوئی انصاف ہے؟

انہیں دیکھ کر رام پیاری چونک پڑی اور سلام کر کے خوف بھری آواز میں بولی۔

"کیا بات ہے؟"

پتہ نہیں کیوں قادر صاحب پر بھی لرزہ سا چڑھ رہا تھا۔ اس لئے وہ رام پیاری کو ایک طرف ہٹا کر کوٹھری میں چلے گئے۔ جہاں سخت بدبو پھیلی تھی۔ میلے کپڑوں کی چھپاند۔ گوبر کی سڑاند اور جانے کا ہے کی ناگوار بو پھیلی تھی۔ پوری کوٹھریا بھری تھی کاٹھ کباڑ سے۔

"میں یہ کہنے آیا تھا۔" ٹوٹی ہوئی کھاٹ پر بیٹھ کر انہوں نے غور سے رام پیاری کو دیکھا۔

شاید وہ رات بھر روتی رہی تھی کیونکہ اس کے چہرے پر بڑی سوہنی سی اداسی تھی چہرہ سرخ بھبھوکا ہو رہا تھا۔ آنکھیں سوجی سوجی سی تھیں۔

"تمہارا حساب کتاب کیا ہے: کچھ نہیں معلوم ہے۔"

"میں کیا جانوں ―" وہ ان کے پاؤں کے پاس آبیٹھی اور جوتوں کے تسمے چھوتے ہوئے بولی۔

"میں نے تو کبھی کاغذ پر لکھوایا ہی نہیں کچھ۔ جو جس کے جی میں آیا دیدیا۔"

وہ پھر رونے لگی۔

"مگر میں ― میں تمہارا ― قرض دار ― اچھا تم اطمینان رکھو ― میں تمہاری پائی پائی ادا کر دوں گا۔"

اور وہ جھک کر پہلی بار رام پیاری کا حساب بے باق کرنے لگے ―

غزل

جب سے شگفتہ پیاس کا صحرا ہوا ہوں میں
اڑتی ہوئی گھٹاؤں کا سایہ ہوا ہوں میں

آئینہ دیکھتا ہوں تو یہ سوچتا ہوں میں
ایسا کبھی نہ تھا، یہ بھلا کیا ہوا ہوں میں

کیا پوچھتے ہو مجھ سے، کیوں چپ سا ہوا ہوں میں
اپنے سلگتے جسم میں بجھتا رہا ہوں میں

پہنچے گا کون گرد تخیل کو اب مری
برسوں ترے خیال میں سوچا گیا ہوں میں

اڑتا ہوں آتی جاتی ہواؤں کے ساتھ ساتھ
ٹوٹا ہو پیڑ سے جو وہ پتہ ہوا ہوں میں

اے دوست! پڑھ کبھی تو ترے دل کی کتاب پر
اپنے لہو کی بوند سے لکھا ہوا ہوں میں

میں آئینہ ہوں خواب کا، پلکوں پہ تھام لے
اب ٹوٹنے کا وقت ہے ڈرنے لگا ہوں میں

تم جانتے ہو، پہلے تو میں خشک جل نہ تھا
تنہائیوں کے خوف سے پتھرا گیا ہوں میں

پھیلا ہوں میں زمان و مکاں کی حدوں سے دور
جب سے خود اپنے آپ میں سمٹا ہوا ہوں میں

گونجے گا خامشی کا یہ گنبد بھی ایک روز
تحت الشعور میں ابھی سویا پڑا ہوں میں

اس دم جلالتوں سے میں مانوس تھا، کہ اب
آیا ہوں روشنی میں تو اندھا ہوا ہوں میں

جب سے کیا ہے اس نے مرے جسم کو اختیار
جس پر یقین نہ آئے، وہ قصہ ہوا ہوں میں

سوچا تو ہوگا تو نے بھی خلوت میں بار ہا
کیوں تیری خواہشوں کا تقاضا رہا ہوں میں

بن کر ہزار بار کسی لمس کا لباس
برسوں قبا سے جسم پہ پہنا گیا ہوں میں

بکھرا ہوا تھا کب سے تخلیق کی میں آگ
اب یہ غزل کہی ہے تو یکجا ہوا ہوں میں

آزاد! جب سے [illegible] ہوا، یہ حال ہے
سردی میں پربتوں کا سویا ہوا ہوں میں

[illegible]

جدید ایران

دنیا کے مشہور مصنف ایران کی ایک مرکزی حیثیت ہے ایرانی دانشوروں نے اپنی ذہانت اور فطانت، مینا کاری اور شاہکاری اور اپنی لطافت و ظرافت سے دنیا کے علم و تصوف اور مشاہدے کو متاثر اور مسحور کیا ہے یہی وہ حسین سرزمین ہے جہاں حافظ و خیام نے شراب و شاہد کے نغمے چھیڑے۔ فردوسی نے رستم و سہراب کی داستان سنائی۔ سعدی نے انسانیت کا زیر و بم سمجھایا اور رومی نے عرفان و تصوف کی باریکیاں بتائیں۔ یہیں کی سرزمین سے بو علی سینا اور فارابی اٹھے جن کی فلسفیانہ عرق ریزیوں نے مشرق و مغرب کے فلاسفہ کو پانی پانی کر دیا اور یہیں کی مٹی میں غزالی اور رازی دفن ہیں جن کے اخلاقی اور اصلاحی افکار نے بھٹکے ہوئے معاشرہ کو امید کی کرن دکھائی۔ ساحرالموت نے اسی سرزمین پر اپنی شعبدہ کاری کی جنت بنائی اور یہیں باب اللہ اور بہاء اللہ نے پیغمبری کے دعوے کئے۔

ایشیا کے سینے میں ایران دل کی طرح دھڑکتا ہے اور البرز و دماوند کی برف پوش چوٹیاں اور بحر خزر کی نیلگوں گہرائیاں ایک طرف ایرانی جنت کی نعمتیں ہیں تو دوسری طرف دشت کویر اور دشت لوط کی پہنائیاں وہاں کی لعنت بھی ہیں۔ کبھی ایران کا دارالخلافہ اصفہان نصف جہان تھا اور شیراز کا گلگشت مصلیٰ جنت الماویٰ سے زیادہ وقیع تھا۔ اس جنت میں جو آیا، کھو گیا۔ اس پاک زمین کی مٹی جسے نصیب ہوئی وہ اُسے آنکھوں سے لگا کر یہیں کا ہو رہا۔ یونانیوں نے یہاں قدم رکھا تو یہاں کی رومانیت میں یونان کا جمال بھول گئے۔ مسلمان یہاں پہنچے تو بغداد اور دمشق سے آنکھیں موند لیں۔ ترک یہاں آن کر معشوق بن گئے۔ چنگیزی اور تاتاری تمدن اور ثقافت کی سرپرستی فرمانے لگے۔ ایران نے دنیائے تمدن کو جو کچھ دیا ہے اس کا حد و حصر تقریباً ناممکن ہے۔

یہاں کی بے پناہ دلکشی یہاں کی فطری بوقلمونی اور یہاں کے باشندوں کی رنگا رنگی میں ہے۔ جدید ایران مہذب ترین افراد اور قدیم ترین قبائل کا ایک حسین شیرازہ ہے۔ یہاں کے بہت سے قبائل آج بھی اپنے قوانین کی سختی سے پابند ہیں۔ ایران میں تقریباً ۲۹ لاکھ قبائلی رہتے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ شہر کی طرف آ رہے ہیں اور اپنے قدیم مرکز سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ قدیم قبائل میں سب سے مشہور کرد قبیلہ ہے جو شمال مغرب میں آباد ہے۔ کردستان کے جنوب میں لر قبیلہ آباد ہے جس کے نام پر وہ صوبہ لرستان کہلاتا ہے۔ اُن کی زبان لری کہلاتی ہے اور اس کا شمار ایران کی قدیم ترین بولیوں میں کیا جاتا ہے۔ بختیاری اور بلوچ قبیلے اپنی بے پناہ بہادری کے لئے مشہور ہیں۔ اوّل الذکر نے ایران کی سیاست میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ شمال مشرق میں افشار اور ترکمان قبیلے آباد ہیں۔ نادر شاہ اوّل الذکر قبیلہ کا فرد تھا۔ ترکمان قبیلہ کا بہت بڑا حصہ دریائے اترک کے اس پار سوویت یونین میں رہتا ہے۔
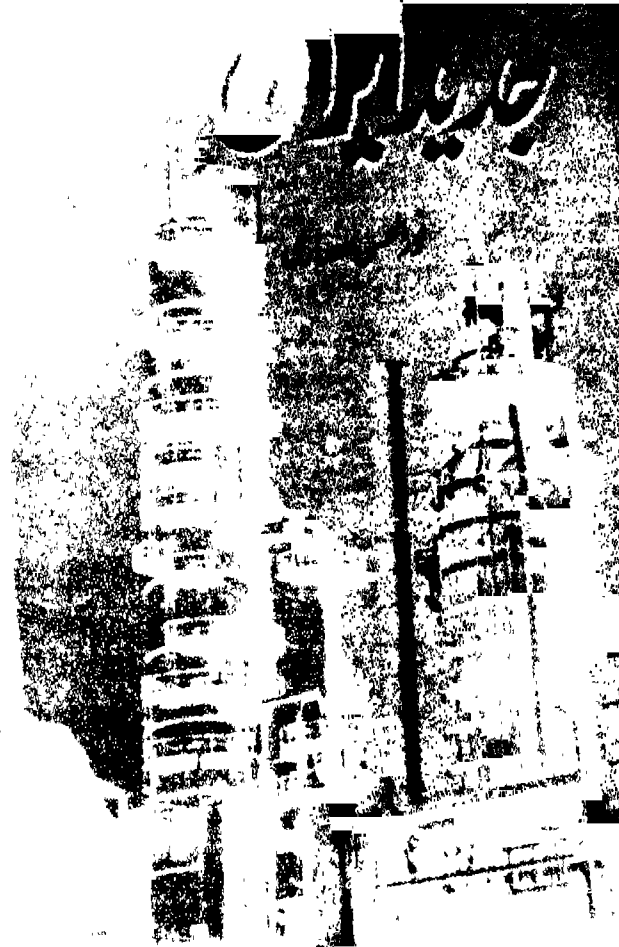
ان قبائل کے علاوہ اور بھی دلچسپ قومیتیں ہیں۔ ایک طرف آرمینیا کے عیسائی ہیں تو دوسری طرف قدیم زردشتی اور بھولے بھٹکے یہودی۔ تیل کے کاروبار کی بدولت امریکہ اور برطانیہ کے لوگوں کی کافی تعداد یہاں بس گئی ہے۔ تجارت پر پارسی اور یہودی اور موٹر کے کام پر سکھ چھائے ہوئے ہیں۔

ایران صدیوں سے انقلاب کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ بعض ایرانی سلاطین

تیل صاف کرنے کا کارخانہ — تہران

کی آمد کو بھی عرب حملہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ تیرہویں صدی کے آغاز میں چنگیز اور ہلاکو نے ایران کو قیامت زار بنا دیا اور چودہویں صدی کے اواخر میں تاتاریوں نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ ان دونوں حملوں میں ایران راکھ اور خاک کا ڈھیر ہو گیا۔ منہدم محلوں کی جگہ انسانی کھوپڑیوں کے مینار تعمیر کئے گئے۔ حسینوں کے چمن بوم و کرگس کا وطن بن گئے۔ صفوی دور پر امن اور پر سکون رہا۔ ایران میں پہلی بار ایرانیوں کی حکومت ہوئی۔ اس کے بعد نادر شاہ افشار ایران کے تخت پر جلوہ افروز ہوا لیکن۔ وہ نادر جو دہلی پر عذاب بن کر نازل ہوا تھا ایرانی آزادی کا محافظ اور ایرانی قوم کا عظیم ہیرو ہے۔ قاچاری دور ایران کا سب سے بدقسمت دور ہے کیونکہ اب ایران پر جو تباہی آئی وہ خود ایرانیوں کے ہاتھوں آئی تھی۔ ایران بیرونی طاقتوں کی تجربہ گاہ بن گیا۔ روسیوں اور انگریزوں نے ایران کو مال غنیمت کی طرح بانٹ لیا۔ شمالی حصہ پر روس قابض ہو گیا اور جنوبی حصہ کو انگریز نوچتے رہے۔ احمد شاہ قاچار کٹھ پتلی بن کر رہ گیا۔ آخرکار ۱۹۲۱ء میں ایران کے حریت پسندوں نے رضا شاہ پہلوی کی قیادت میں علم انقلاب بلند کیا اور مرکزی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔

ایران کا دور جدید درحقیقت رضا شاہ مرحوم کے عہد سے شروع ہوتا ہے اب ایرانی قوم نے صحیح معنوں میں آنکھ کھولی اور کروٹ بدلی۔ رضا شاہ میں فوجی عزیمت بھی تھی اور عمرانی بصیرت بھی۔ ان میں بہادری اور شرافت کا حسین امتزاج بھی تھا وہ مشرقی اقدار کے قائل اور مغربی نعمتوں کے قدردان تھے۔ انہوں نے بہت جلد یہ محسوس کر لیا کہ ایرانی معاشرہ کے ناسور کہاں کہاں رِس رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے قومی عزم اور اخلاقی جرأت کے ساتھ بے باک قدم اٹھائے مگر وہ اپنے انقلابی پروگرام میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکے۔ دوسری جنگ عظیم میں بڑی طاقتوں کے آگے انہیں سرنگوں ہونا پڑا اور حالات سے مجبور ہو کر ۱۹۴۱ء میں وہ اپنے بیٹے محمد رضا شاہ پہلوی موجودہ فرماں روائے ایران کے حق میں تخت سے دست بردار ہو گئے۔

ایران کا رقبہ چھ لاکھ اسی ہزار مربع میل ہے اور آبادی تقریباً ڈھائی کروڑ افراد پر مشتمل ہے۔ ہندوستان کی طرح ایران میں بھی آبادی کا ۷۰ حصہ دیہاتوں میں رہتا ہے۔ ایران کی بیشتر آبادی ملک کے چاروں طرف سرحدی پٹیوں پر آباد ہے۔ بیچ کا وسیع علاقہ دشت کویر اور دشت لوت پر محیط ہے۔ اس وسیع و عریض صحرا میں کہیں کہیں نخلستان کی شادابی نظر آجاتی ہے لیکن ان صحراؤں کے علاوہ ایران کا زرخیز اور آباد علاقہ ہرے بھرے درختوں اور رنگ برنگ پھولوں سے لبریز ہے۔ قدرت نے ایران کو نفیس ترین پھولوں سے نوازا ہے۔ لالہ صحرائی سے لے کر نرگس شہلا تک ہر پھول دامن دل کھینچتا ہے۔ دنیا کے کسی ادب میں گلہائے رنگا

آرام گاہ — حافظ شیرازی

رنگ کا اتنا ذکر نہیں ہے جتنا فارسی ادب میں۔ اور یہ محض فارسی شعراء کی خیال آرائی نہیں ہے بلکہ موسم بہار میں ایک ایک چپہ دامان گل فروش معلوم ہوتا ہے۔ سرو و شمشاد تو اور جگہ بھی ہوتے ہیں مگر شیراز کے قرب و جوار میں جو سرو ناز ہوتا ہے اس کی خوبصورتی اور تناسب کا یہ عالم ہے کہ "قد دلبر" کی اس سے عمدہ تشبیہ ممکن نہیں۔

ہندوستان کی طرح ایران بھی بنیادی طور پر ایک زراعتی ملک ہے۔ لیکن ہمارے یہاں آب پاشی کا جو معقول انتظام ہے ایرانی کاشت کاری اس سے بڑی حد تک محروم ہے۔ جنوب مغرب میں دریائے کارون کے علاوہ پورے ملک میں کوئی بڑا دریا نہیں ہے۔ یہ بھی بڑی عجیب بات ہے کہ ایران کے لوگ عموماً تیراکی اور پانی سے بہت ڈرتے ہیں اور زوردار بارش کو سیل سے تعبیر کرتے ہیں۔ حافظ جب ہندوستان کے سفر کے لئے جہاز پر سوار ہونے آئے تو سمندر دیکھ کر ڈر گئے اور یہ شعر کہتے ہوئے شیراز واپس ہو گئے۔

چہ آسان می نمود اوّل غم دریا ببوی سود
غلط کردم کہ این طوفان بصد گوہر نمی ارزد

شہنشاہ ایران نے جنوری ۱۹۶۳ء میں جب انقلاب سفید کا آغاز کیا تو سب سے زیادہ زور زرعی اصلاحات پر دیا گیا۔ ایران میں تمام زمین پر (بشمول جنگلات)

تقریباً ایک ہزار خاندانوں کا قبضہ تھا یعنی ایک ہزار زمیندار حکومت کے سیاہ و سفید کے مالک تھے کسان کو کرایہ پر زمین دی جاتی تھی اور ذرا سی بات پر اسے بے دخل کر دیا جاتا تھا چنانچہ زمینداری کو ختم کرنے کے لے سب سے پہلے شہنشاہ نے اپنی ذاتی اراضی کاشت کاروں میں تقسیم کی اور انہیں اس کا حق ملکیت دیا اس کے بعد سارے ملک سے زمینداری کا خاتمہ کیا گیا۔ چراگاہیں اور جنگلات سرکاری ملکیت میں لے لی گئیں اور زمین کاشت کاروں کی ملکیت میں دیدی گئی۔

ایران میں زیادہ تر گیہوں، جو اور چاول کی کاشت ہوتی ہے لیکن آب پاشی کی دقت اور افتادہ زمین کی فراوانی سے ایران غذائی معاملہ میں خود کفیل نہیں ہے گیہوں اور چاول کی بڑی مقدار درآمد کی جاتی ہے پچھلے چند سالوں سے حکومت کپاس اور گنے کی کاشت پر زیادہ زور دے رہی ہے اس کی وجہ سے بھی گیہوں وغیرہ کی پیداوار میں خاص اضافہ نہیں ہوا ہے۔ اب حکومت نے اصلاح آراضی کے لے ایک خاص فوجی دستہ مقرر کیا ہے اور جگہ جگہ بند بنا کر آب پاشی کا بہتر انتظام کیا جا رہا ہے۔ گاؤں والوں کی بہتری کے لئے ایک اہم کام یہ ہوا ہے کہ پنچایت راج کے نمونے پر عوامی عدالتیں قائم کی گئی ہیں تاکہ گاؤں کے لوگ اپنے نزاعی معاملات کا فیصلہ خود ہی کر سکیں۔ اور شہر کی کچہری کے جھگڑے سے محفوظ رہیں۔

ایران ہمیشہ سے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے اور ملک کے کونے کونے سے علم و ادب کے نغمے پھوٹتے رہے ہیں مگر علم کا یہ فیض صرف شہروں تک محدود ہے۔ دُور افتادہ دیہات اور خانہ بدوش قبایل آج بھی علم کی دولت سے محروم ہیں۔ اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ دیہات کے ۸۰ فیصد لوگ ناخواندہ ہیں۔ ناخواندگی کو ختم کرنے کے لیے انقلاب سفید کے زیر اہتمام ایک بہت مفید اسکیم بروئے کار لائی گئی ہے جس کی پیروی اگر ہندوستان میں بھی کی جائے تو کم سے کم خرچ پر چند سالوں میں ہمارے یہاں سے بھی ناخواندگی دور ہوسکتی ہے۔ ایران میں سپاہ دانش کے نام سے ایک دستے کی تشکیل کی گئی ہے۔ یہ دستہ یونی ورسٹی کے فارغ التحصیل طلبہ پر مشتمل ہے اس دستے کے افراد کو کسی دُور افتادہ گاؤں میں متعین کیا جاتا ہے جہاں وہ دیہات کے باشندوں کو لکھنا پڑھنا اور صاف ستھری زندگی گزارنا سکھاتا ہے اس طرح امید کی جاتی ہے کہ پورے ملک سے چند سال کے اندر ناخواندگی دُور ہو جائے گی۔
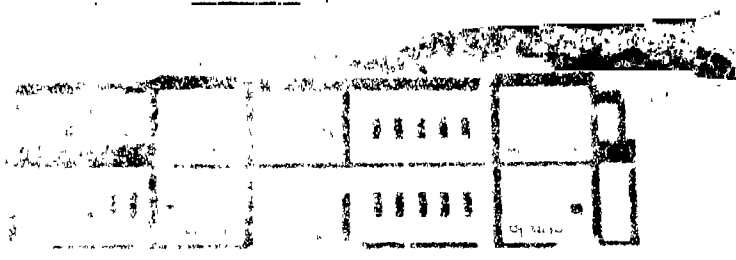
اس وقت ایران میں سات دانش گاہیں (یونی ورسٹی) ہیں۔ دو مزید دانش گاہیں جلد ہی کھولی جائیں گی سب سے قدیم اور بڑی دانش گاہ تہران ہے جس میں تقریباً سولہ ہزار طلبا زیر تعلیم ہیں۔ یہ دانش گاہ ۱۹۳۴ء میں قائم کی گئی تھی ایران کی بیشتر عظیم شخصیتیں کسی نہ کسی حیثیت سے تہران یونی ورسٹی سے وابستہ رہی ہیں۔ پورے ملک کے تقریباً پچاس فیصد طلبہ اسی یونی ورسٹی میں تعلیم پاتے ہیں طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر ۱۹۶۰ء میں تہران میں ایک دوسری یونی ورسٹی دانش گاہ ملی کے نام سے قائم کی گئی ہے جس میں فلسفہ اور ادبیات کے بجائے سماجی علوم طب اور سائنس کی تعلیم پر زیادہ زور ہے۔ دارالخلافہ کے علاوہ صوبوں میں جو دانش گاہیں ہیں اُن میں سب سے قریب آذربائیجان کی راجدھانی تبریز کی یونی ورسٹی ہے۔ تبریز یونی ورسٹی کا ایک بڑا دارالاشاعت بھی ہے جو اب تک ایک سو سے زیادہ سائنس کی کتابیں چھاپ چکا ہے یہاں دو ہزار سے زائد طلبہ تعلیم پاتے ہیں تبریز یونی ورسٹی میں دو خاص انسٹی ٹیوٹ کام کر رہے ہیں۔ ایک تاریخ اور کلچر کا ادارہ ہے اور دوسرا میڈیکل ریسرچ کا۔

شیراز کی پہلوی یونی ورسٹی۔ تہران یونی ورسٹی کے بعد دوسری حیثیت رکھتی ہے اس کے وائس چانسلر ڈاکٹر لطف علی صورت گر غالب کے صد سالہ جشن میں ہندوستان تشریف لائے تھے۔ ابھی حال ہی اُن کا انتقال ہوگیا ہے۔ صورت گر فارسی اور انگریزی کے بہت عمدہ نقاد تھے۔ ان کی انگریز بیوی نے ایرانیوں کے بارے میں جو کتاب لکھی ہے وہ میرے خیال میں غیر ملکیوں کی کتابوں میں سب سے عمدہ اور دلچسپ ہے اس کتاب کا عنوان ہے "I Sing In Wilderness" شیراز یونی ورسٹی میں ادبیات اور سائنس علوم کے تمام شعبے ہیں۔ شیراز یونی ورسٹی سے تھوڑے فاصلے پر ساسانیوں کا دیوان دارالخلافہ تخت جمشید ہے۔ شہنشاہ اور یونی ورسٹی کے ذمہ دار حضرات کی کوشش ہے کہ شیراز یونی ورسٹی

شعبہ جغرافیہ — تہران یونیورسٹی

سا کیمپس اتنا شاندار تعمیر کیا جائے کہ وہ اپنی شان و شوکت میں تخت جمشید کی عظمت رفتہ کا صحیح آئینہ دار ہو چنانچہ اس مقصد کے لئے ایک ارب روپیہ منظور کیا گیا ہے جسے ایک طویل عرصہ میں خرچ کیا جائے گا۔

خراسان کے دارالخلافہ مشہد، خوزستان کی راجدھانی اہواز اور مرکزی ایران کے شہر اصفہان میں بھی یونی ورسٹیاں ہیں۔ ان میں مشہد یونی ورسٹی ادب اور مذہبیات کی تعلیم کے لیے ممتاز ہے۔ مشہد ایران کا سب سے مقدس شہر ہے اور خراسان فارسی ادب اور ایرانی ثقافت کا قدیم ترین مرکز ہے۔ فردوسی، بوعلی سینا، محقق طوسی، خیام اور نہ جانے کتنے عبقری اسی سرزمین کی مٹی سے اٹھے۔ مشہد یونی ورسٹی خراسان کے ممتاز علماء و فضلاء کے جشن مناتی ہے۔ ابھی حال میں جعفر طوسی اور ابوالفضل بیہقی کے جشن منائے گئے جس میں ہندوستان کے دانشوروں نے بھی شرکت کی۔

یوں تو ایران بالطبع ادب اور ثقافت کی طرف مائل ہوتا ہے اور انہیں علوم کی تحصیل کرتا ہے مگر حکومت ٹیکنیکل ٹریننگ پر بہت زور دے رہی ہے۔ آبادان میں ایران کی قومی آئل کمپنی کے اشتراک سے ایک کالج قائم کیا گیا ہے جس میں آئل انجینئرنگ کی تربیت دی جاتی ہے مگر آج بھی تیل کی صنعت میں انجینیروں کی بڑی تعداد انگریزوں اور امریکیوں پر مشتمل ہے۔

ایران کی سب سے بڑی دولت تیل ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ایران کی سیاست بڑی حد تک تیل کے ارد گرد گھومتی ہے۔ مغربی ایشیا کے دیگر ممالک کی طرح ایران میں بھی تیل کی بڑی حد تک اجارہ داری برطانیہ اور امریکہ کے ہاتھ میں تھی ۱۹۵۱ء میں مصدق نے تیل کو قومی ملکیت قرار دیا

اس کے بعد جو سیاسی داؤ پیچ شروع ہوا اس میں پہلے شاہ کو ملک چھوڑنا پڑا اور پھر مصدق ہمیشہ کے لیے نظر بند کر دیئے گئے لیکن ایرانی حکمرانوں نے یہ بہر حال محسوس کر لیا کہ تیل کی صنعت کو قومی ملکیت میں لئے بغیر چارہ نہیں ہے۔ آخرکار ایک سرکاری ادارہ نیشنل ایرانین آئل کمپنی کے نام سے قائم کیا گیا۔ تیل کی آمدنی کا ۵۰ فیصد منافع اس کمپنی کے ذریعہ ایرانی عوام کو ملتا ہے اور غیر ملکی کمپنیاں صرف ۲۵ فیصد منافع کی حقدار ہیں۔ ۱۹۶۶ء کے اعداد و شمار کے مطابق تیل سے ایران کو ۲۰۲ء۱۹۲ ملین پونڈ کی آمدنی ہوئی جب کہ ۱۹۵۱ء میں یہ آمدنی صرف سات ملین تھی۔

تیل کے بعد حکومت ایران چینی اور کپڑے کی صنعت کو بڑھا رہی ہے۔ اس وقت ایران میں کپڑے کی کل ملیں ہیں لیکن ان کی پیداوار کوئی خاص اہم نہیں ہے۔ تمام سرکاری فیکٹریوں میں مزدوروں کے حصص مخصوص کر دیئے گئے ہیں تاکہ دست دولت آفریں دولت سے محروم نہ رہے۔ روس کے اشتراک سے اصفہان میں فولاد کی پہلی فیکٹری قائم کی گئی ہے۔ پچھلے چند سالوں میں ایران اور روس کے تعلقات بہت بہتر ہوئے ہیں۔ ایران سے روس کو ایندھن گیس کی برآمد بھی کی جا رہی ہے۔

ایران دراصل دستکاری کا مرکز ہے۔ ایران کے قالین شہرۂ آفاق ہیں اندازہ ہے کہ ایران کے پچاس لاکھ افراد اپنی روزی قالین کے ذریعہ کماتے ہیں۔ اصفہان کے رنگین ٹائل اور برتنوں کی نقاشی بے مثال ہے۔ شیراز اور اصفہان میں چاندی کا بہترین کام ہوتا ہے۔ لکڑی پر کندہ کاری کا کام بھی یہاں کے فنکاروں کا شاہکار ہے۔ ہمدان اور قم میں مٹی اور چینی کے سبک اور نفیس برتن بنتے ہیں۔ خراسان کے سنگ تراش پتھر پر شاعری کرتے ہیں۔

ایران کا سرکاری مذہب اثنا عشری شیعیت ہے مگر جنوبی ایران کے عرب، مغرب میں کرد اور مشرق میں بلوچ سنی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اب ملک سے شیعہ سنی کی وبا تقریباً ختم ہو چکی ہے۔ درحقیقت قومیت کے احساس کے ساتھ ساتھ ایران میں زردشتیت یعنی ایران باستان کا عشق بڑھتا جا رہا ہے۔ ایک ترقی یافتہ ایرانی میں زردشتیت کے تمام عقائد پائے جاتے ہیں۔ پھر بھی عوام میں مذہبیت باقی ہے۔ ہر شہر میں کسی نہ کسی امام زادہ کا مزار ہے۔ جہاں ہفتہ میں لوگ ایک دن مراد مانگنے جمع ہو جاتے ہیں۔ مشہد کے مقدس شہر میں جمعرات کو اجتماع

یہی ملک کا معیاری لہجہ ہے۔ خراسانی اور آذربائیجانی لہجے اس سے مختلف ہیں۔

ایران کا سب سے خوبصورت اور بڑا شہر دارالخلافہ تہران ہے۔ یہاں کے ہوٹل اور کلب، تفریح گاہیں اور رقص گاہیں، کالج اور یونیورسٹی اور مغربی ہیں، سب کے سب مغرب کے رنگ میں ڈوبے ہیں۔ یہاں دولت اور عیش کی ریل پیل ہے۔ فیشن کی بیباکی آنکھوں کو چکا چوند کرتی ہے۔ تاجر اور اعلیٰ عہدہ داروں کی آمدنی بہت زیادہ ہے۔ سارے ملک کے دانشور یہیں رہنا پسند کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تہران ایران کی جان ہے۔ تہران کے بعد شیراز سے ایرانیوں کو سب سے زیادہ لگاؤ ہے۔ شیراز کی فضا میں ایک خاص رومانیت ہے۔ شیراز کی شراب اور سرو و ناز پورے ایران میں مشہور ہیں۔ شیراز کے پاس ہی قدیم ساسانی سلطنت کا مرحوم دارالخلافہ تخت جمشید ہے جسے دیکھ کر ایرانی رو پڑتے ہیں۔

ایرانی بہت ذکی الحس اور رقیق القلب ہوتے ہیں۔ محفل شعر میں بھی واہ واہ کرنے کے بجائے آنکھیں بند کر کے جھومتے ہیں اور اچھے اشعار پر رونے لگتے ہیں۔ ایران میں مشاعرے کا کوئی رواج نہیں، مخصوص نشستیں ہوتی ہیں۔ اب اس بات کی کوشش کی جا رہی ہے کہ پبلک مشاعرے کو رائج کیا جائے۔

مصدق کے انقلاب اور شاہ کی بحالی کے بعد جنوری ۱۹۶۳ء میں "انقلاب سفید" کا نفاذ کیا گیا۔ انقلاب سفید سماجی اصلاحات کا مجموعہ ہے۔ اس کی پوری تفصیل خود شہنشاہ نے انقلاب سفید کے نام سے فارسی میں لکھی ہے۔

انقلاب سفید کے نفاذ کے بعد زمینداروں اور ملاؤں نے حکومت کی سخت مخالفت کی لیکن جب استصواب رائے کے بعد عوام نے اس کے حق میں فیصلہ کر دیا تو وہ خاموش ہو گئے۔ انقلاب سفید نو دفعات پر مشتمل ہے۔ جس میں زمینداری کا اختتام، سپاہ دانش کی تشکیل اور عورتوں کو ووٹ دینے

ٹیلی ویژن کا کارخانہ

ہوتا ہے جہاں امام علی بن موسیٰ الرضا کا مزار ہے۔ قم اور کاشان بھی مذہبی ماحول کے لیے مشہور ہیں۔ شیعہ اور سنی کے علاوہ مسلمانوں کا ایک اور فرقہ بہائی بہت اہم ہے۔ بہائی حضرت بہاء اللہ کو اپنا پیغمبر مانتے ہیں۔ پچھلی صدی میں انہوں نے ایران کی حکومت کے لیے خاصا درد سر کا سامان مہیا کیا ہے۔ اب بہائیوں کا مرکز مکمل ایران سے امریکہ منتقل ہو چکا ہے۔

ایران کی عام اور سرکاری زبان فارسی ہے مگر آذربائیجان میں ترکی، کردستان میں کردی، ترکستان میں ترکی، سیستان میں بلوچی اور جنوب ایران کے ساحل پر عربی بولی جاتی ہے۔ جدید فارسی کا لب و لہجہ ایک عام ہندوستانی فارسی داں کے لیے خاصا وقت طلب ہے۔ جدید ایرانی لہجے میں واؤ مجہول، یائے مجہول اور نون غنہ کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ جو نون سے پہلے جو الف آتا ہے اسے [illegible] سے بدل کر بولتے ہیں۔ مثلاً ان کو اون، خانہ کو خونہ وغیرہ [illegible] ست کی بجائے [illegible] کا استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً [illegible] کے بجائے [illegible] بولیں گے۔ بعض مرتبہ تو جملہ [illegible] جاتا ہے کہ [illegible] مشکل ہو جاتا ہے۔ مثلاً [illegible] (اصل [illegible]) [illegible] تہران کا ہے اور [illegible]

[illegible]

احتشام اختر

ٹھہرے پانی میں نہاں ایک حسیں خواب بھی ہے
اُس کی جھیل میں عکس ہوئے مہتاب بھی ہے

دشتِ احساس کے تپتے ہوئے ویرانے میں
تیری یادوں کا ہے اک پیڑ جو شاداب بھی ہے

پار کرنا بڑا مشکل ہے کہ یہ بحرِ ہوس
کہیں گہرا ہے بہت اور کہیں پایاب بھی ہے

اُس کی تصویر میں آنکھوں میں بسا لوں کہ یہ تحفے
اک ارزاں سہی میرے لئے نایاب بھی ہے

یوں تو لگتا ہے سمندر بڑا خاموش مگر
اس کے سینے میں نہاں کرب کا سیلاب بھی ہے

پیاس تم اپنی بجھا لو پیاسے ہو مگر
یہ کنواں پیاس کا گہرا بھی ہے پایاب بھی ہے

[illegible]
اپنی آنکھوں [illegible]

حامد حسین حامد

مرا حریف مری خواہشوں کا پیکر تھا
اسی لئے تو ہر اک آئینہ مکدر تھا

تمام رنگِ معانی سے بے خبر نکلا
یہ حرفِ شوق شہنشاہِ ہفت کشور تھا

مرے بدن میں خلش کے ببول بوتا رہا
زمینِ خواب بہ آراستہ جو بستر تھا

کوئی بھی خواہش اظہار لب کشا نہ ہوئی
اگرچہ حرف و حکایت کا ایک دفتر تھا

پھر اس میں ڈوبنے والوں کو کیا قباحت تھی
خود اپنی ذات میں قطرہ اگر سمندر تھا

ہر ایک بات اثر کھو چکی تو بالآخر
ہمارے ہاتھ میں سر پھوڑنے کو پتھر تھا

ٹھہر سکے نہ کسی جا پہ ایک لمحے کو
تمہارے پاؤں میں حامد بھنور کا چکر تھا

دَور آفریدی

تجھ سے بہتر کون ہوگا خود ادا نا آشنا
دن تری آنکھوں کی چاندنی، شام سحر آشنا

میں نے صحرا میں نے جنگل میں نے دیکھیں بستیاں
وحشتِ دل کہتی پھری ہے کون کس کا آشنا

زندگی کا حسن جس کو ہم سمجھتے تھے وہی
زندگی کا زخم نکلا وہ سراپا آشنا

دن کا سورج مر چکا ہے رات کا مہتاب بھی
اور تنہا پھر رہا ہے زندگی کا آشنا

جانے پھر کب زندگی کو حسن کا تحفہ ملے
جانے پھر کب روبرو ہو وہ مرا آشنا

ہوائیں بڑی ٹھنڈی اور تیز بہہ رہی تھیں۔ اور ابھی ابھی کچھ ہی دیر میں طوفان بادوباراں آیا ہی چاہتا ہے . . . ہر طرف زرد سوکھے پتوں کا ایک ڈھیر ہے۔ کوئی آن میں اب درخت بھی گرا ہی چاہتے ہیں۔ اور میں نے انھیں حالتوں میں اس چہرے کی تلاش کے لیے شاہراہ پر اپنا سفر جاری کیا۔ میں شاہراہ پر چلتا رہا . . .

شاہراہ جو آگے بھی جاتی تھی۔

شاہراہ جو پیچھے بھی جاتی تھی

آگے بھی پیچھے تھا . . .

پیچھے بھی آگے تھا۔

اور میں شاہراہ پر چلتا رہا —

آگے بھی . . . . پیچھے بھی . . . . دونوں کے درمیان —

جہاں شاہراہ ختم ہو جاتی ہے . . . . اس سے آگے کیا ہے . . . ؟ اس سے آگے کیا ہے ؟ . . . اس سے آگے بھی کچھ ہونا چاہیے

اماں کے آگے صرف ایک ہی سوال — پیسہ — پیسہ . . .

اماں بھی عجیب ہیں . . .

[illegible]

ابلتے ہیں . . . اماں دوزخ میں جائیں گی

لیکن اُن سے پہلے وہ خود اس شاہراہ پر چل پڑے جو آگے جا کر جنت اور جہنم کو جاتی تھی . . . ابا کہتے تھے جس حال میں رہو خوش رہو۔

اماں تمہاری تو بہت اچھی ہوتی ہے ؟ (یہ دس سالہ پرویز ہے)

جاڑا اب آہستہ آہستہ ختم ہوتا جا رہا تھا . . . . .

یہ پرویز بھی کتنا شریر ہے شاہدہ یک بیک کھلکھلا کر ہنس پڑیں . . .

اور ہنستی ہی رہیں . . . . ہنستے ہنستے ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔

وہ انھیں پونچھتی جاتیں اور ہنستی جاتیں —

کچھ دیر بعد اماں بھی ان کا ساتھ دینے لگیں . . . .

میں شاہراہ پر چلتا رہا جنون کی منزلیں طے کرتا ہوا . . . .

مگر وہ چہرہ ؟ میں نے آسمان کی طرف دیکھا — کوئی ستارا میری رہنمائی نہیں کر رہا تھا — !!!

مسیح — ؟

مسیح — ؟؟

مسیح — ؟؟؟

اندھے اور گہرے کنویں میں صدیوں کا قید مینڈک کب سے اُچھل کود رہا تھا . . . .

آداب —

آداب . . . آداب .

کہاں —

یہ آتما شخص ہے . . . یوں تو بڑا خوش طبع ہے . . . . مگر جب کبھی جوش میں آتا ہے تو بے اختیار باتیں کیے جاتا ہے . . . رکنے کا نام ہی نہیں لیتا . . . . اس وقت بھی وہ جوش ہی میں تھا۔ اور بے اختیار باتیں کیے جا رہا تھا . . . . مختلف قسم کی باتیں . . . . اس مختصر سے عرصے میں اس نے کئی موضوع بدل ڈالے تھے . . . . اسے موضوع بدلنے میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ بولتے بولتے وہ تھک گیا تو اُٹھ کر جانے لگا — لیکن جاتے جاتے اس نے جھک کر مجھ سے بڑے ہی رازدارانہ لہجے میں دھیرے سے کہا کہ . . .

بچے — جانتے ہو جب زندگی کی باہیں تنگ ہو جاتی ہیں تو عقل و شعور کا وجود ان تنگ باہوں میں جکڑ جایا کرتا ہے . . . .

وہ چلا گیا —

میں اُسے دیکھتا رہا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میں نے سوچا زندگی کی باہیں تنگ ہوتی ہی کیوں ہیں .... ؟
کیوں ہوتی ہیں تنگ ...... ؟
لیکن —

جواب کمزور ہے .... ؟
جواب ڈر کر سوال سے سامنا نہیں کرنا چاہتا ہے .... ؟؟؟
" ارے سنو ! سنو —

میں نے پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھا — آگے کی طرف اسلام چلا آ رہا تھا۔
" یہ اسلام بھی عجیب آدمی ہے .... لوگ کہتے ہیں کہ نام ہے اسلام اور کام ہیں چھی چھی .... پتہ نہیں لوگوں کے اس چھی چھی .... میں کیا نہاں ہے ؟"
آتے ہی اس نے شکایت کی کہ تین بار کہہ چکا ہوں — اب تک تم نے بچے اُس مڈل اسکول میں (جس کے ہیڈ ماسٹر سے میرے تعلقات ہیں) چپڑاسی کی درخواست تک نہیں دی — کمال کرتے ہو۔ بھٹکنے سے تو اچھا ہے — میں نے اُسے حیرت سے دیکھا ....
وہ بگڑ کر چلا گیا ....
اُف یہ کاریں بھی تیز رفتاری سے نکل جاتی ہیں ....
اگر سواریاں پیدل ہی چلیں — تو کیا فائدہ .... ؟
اندھے گہرے کنوئیں کا مینڈک تھک ہار کر اب خاموش ہو چکا تھا ...
اماں خاموش خاموش رہنے لگی تھیں —
شاہدہ کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔
نسرین بڑی تیز اور ذہین ہے — آخر چودہ کی ہو بھی تو گئی —
اماں اُسے ہمیشہ قرآن شریف حدیث اور دیگر مذہبی کتابیں پڑھنے کی تلقین کیا کرتی تھیں .... اور وہ بھی ان کتابوں کو پڑھ پڑھ کر اماں سے بڑی تیز تیز گرم گرم بحثیں کیا کرتی —

میں نے شاہ راہ پر اپنا سفر اور بھی تیزی سے شروع کر دیا تھا ....
میں نے آسمان کی طرف دیکھا — آسمان پر بے شمار ستارے تھے مگر ان میں سے کوئی میرے ساتھ نہیں چل رہا تھا۔
"کہاں ہے مسیح ابن مریم — ؟
میں نے پیچھے کی طرف گردن آگے تھام کر دیکھا — ایک لمبی سنسان سڑک پڑی تھی — ... تھا ان کیوں کیوں ایک دھواں سا اٹھتا اور فضا میں تحلیل ہو جاتا —

یاسین بیگ کی عجیب سی عادت تھی .... وہ تو چپ چاپ اور جب تک بیٹھا رہتا چپ ہی رہتا ... لیکن جب جانے لگتا تو کوئی ایسی بات کہہ جاتا جیسے یہی بات کہنے کے لئے اب تک بیٹھا تھا — اس کی یہ پہلی اور آخری بات بڑی ہی عجیب ہوتی — ایک بار اُس نے مجھ سے کہا تھا کہ ... اس نے اس دن اور اَنس کو پہلی بار اس دنیا میں جنم دیا تھا — جس دن جس گھڑی اسے یہ شعور ہوا تھا کہ وہ اس دنیا میں عورت کے بغیر نہیں رہ سکتا ہے اور یہ کہ اسی دن اس نے اپنے پہلے وجود کو قتل کر دیا تھا۔ اور پھر اس نے کہا تھا — عورت جو دنیا کے تمام مردوں کو آگ بنا دینا چاہتی ہے تاکہ اس آگ سے اپنے جسم کی بھوک جلا کر اپنے اندر کے اندھکار کو ختم کر دے —

میں شاہراہ پر آگے کی طرف چلتا رہا۔ لیکن وہ چہرہ ....
وہ بضد تھا کہ موچی کو موچی سمجھو — اس کے خلاف کئی تھے — میں بھی — وہ بھی تو آدمی ہے —
نہیں — موچی صرف موچی ہے —
اس کا دعویٰ تھا —
میرے گھر میں مذہب کا دور دورہ ہے۔
میں مذہب کی گود میں پلا ہوں ... اُسے فخر تھا ....
میرے گھر میں کسی نے نیچی ذات والے کو عزت نہیں دی ....
موچی۔ موچی ہے۔
دھوبی۔ دھوبی ہے
درزی۔ درزی ہے
لیکن میں خاموش رہا ....
میں نے کسی بات کا برا نہیں مانا ہے ... مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اس کا کوئی قصور نہیں ہوتا جو کڑوی بات کہتا ہے —
لیکن ہاں میں نے زندگی میں صرف ایک شخص کی بات کا برا مانا ہے ... وہ جانے کہاں چلا گیا .. بغیر کچھ کہے — میں نے اس دوران اسے کافی تلاش کیا — اگر وہ رہتا تو شاید اتنی دشواری سفر میں پیش نہ آتی —
وہ ہر وقت میرے ساتھ ہی رہا کرتا تھا ... میرے گھر میں ہوتا بھی تھا — اماں اُسے بے حد مانتی تھیں .... اس نے ایک بار اماں سے کہا تھا ...
" بچے بڑی بھوک لگی ہے۔ روٹی جلدی دیجئے اماں "
" جس دن اس نے یہ بات کہی تھی۔ اس دن سے مہینوں میں نے اس سے گفتگو تک نہیں کی تھی — وہ آتے نظر نماز کرتا رہا ....

سڑک

اس کی کشادگی سے مجھے کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں آسمان اور زمینوں کے درمیان لٹکا ہوا ہوں خلاؤں میں معلق.....

میں اس شاہراہ پر چلتے چلتے اکتا سا گیا تھا —

میں نے آگے کی طرف دیکھا — آگے بہت آگے تھا۔

اچانک ایک دن میں نے شاہراہ کے کنارے جو مجھ سے کھو گیا تھا — پڑا پایا..... بالکل خستہ حال، نیم جان، آنکھیں نقاہت سے بند — میں نے اسے جھنجھوڑ کر بیدار کیا — وہ بمشکل اپنی پلکیں جھپکانے میں کامیاب ہوا — میں نے اسے سہارا دے کر بٹھایا — اس نے مجھے پہچاننے میں دیر نہ کی اور میرے سینے سے لگ کر رونے لگا۔ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے اسے تسلی دی۔ اور جو کچھ میرے پاس تھا اس میں سے اسے کھانے کو دیا — جب فارغ ہوا تو طبیعت قدرے سنبھلی لیکن پھر بھی وہ اس قابل نہ تھا کہ اپنے پیروں چل سکے۔ میں نے احتیاط سے کاندھے پر لادا — اور پھر چل پڑا۔

ابھی اگلا قدم اٹھایا ہی تھا کہ اس نے کہا — میں آگے بہت آگے جا چکا ہوں اب اس شاہراہ پر آگے جانے سے کوئی فائدہ نہیں — میری سنو اور اس طرف کو چل پڑو، اگرچہ یہ سمت دشوار گزار ہے مجھے یقین تھا کہ تم ایک دن یہاں سے ضرور گزرو گے۔ تب ہم دونوں اس دشوار گزار راستے کو مل کر عبور کریں گے۔

اور دوسری سمت ایک پتلا سا اونچا نیچا پگڈنڈی نما راستہ تھا — جس کے دونوں جانب دُور تک خاردار جھاڑیاں تھیں اور دونوں جانب کی جھاڑیاں کچھ اوپر جا کر ایک دوسرے سے اس طرح مل گئی تھیں کہ گزرنا سہل نہیں تھا — میں ہچکچا کر پیچھے کی طرف مڑا — میرا مڑنا تھا کہ وہ میرے کاندھے سے کود پڑا اور نقاہت کے باوجود بھی میرا بازو پکڑ کر آگے کی طرف کھینچا.....

جب کافی دور چلنے کے بعد جھاڑیوں کا سلسلہ ختم ہوا تو ہمارے جسم لہولہان ہو چکے تھے اور جسم سے خون تیزی سے خارج ہو رہا تھا اور پھر یہ پگڈنڈی آہستہ آہستہ چوڑی ہوتی گئی اور پھر آگے جا کر ایک سڑک کی شکل اختیار کر گئی..... میں نے اپنے آپ کو کافی ہلکا محسوس کیا — کافی ہلکا — میرے قدموں کے آگے آگے ستاروں کا ایک ہجوم تھا۔ شاہراہ کافی روشن تھی۔ اور جلد ہی مجھے وہ پھر وہیں مل گیا.....

میرے سینے پہ، جو ہے خاک آلود
کتنی صدیوں سے رواں ہیں۔ یونہی
عورتیں بچے، جوان اور بوڑھے
فکر و احساس میں غلطاں، پیچاں
کوئی بیتے ہوئے لمحوں پہ ملول!
کوئی فردا کے تصور میں مگن
کوئی امروز کے غم میں بے حال
وصل کے سائے میں کوئی شاداب
ہجر کی دھوپ میں کوئی مغموم
میں تو سب کے گزرتے ہیں لوگ
شادیانے بھی سنا کرتا ہوں
سب کے غم ہیں مرے سینے میں نہاں
سب کی خوشیوں کا امیں بھی ہوں میں
روزِ اوّل سے ہوں یونہی پامال
ٹھوکریں سہتا ہوں سب کی پھر بھی
سب کو منزل کا پتہ دیتا ہوں

کچھ اور اسد تخلص کے بارے میں (۲)

استدراک

کچھ دن ہوئے میرے محترم کرم فرما ڈاکٹر گیان چند نے ازراہِ کرم اُردو نامہ کا ۴۴واں شمارہ عنایت فرمایا جس میں سید قدرت نقوی کا مضمون "نو دریافت دیوانِ غالب کا سنِ کتابت" جس میں سید موصوف نے علمِ ہیئت کو بنیاد بنایا ہے۔ یہی دیکھوں اور جس کی روشنی میں اپنے مضمون میں اگر چاہوں تو ضروری ترمیم کروں چنانچہ مذکورہ مضمون کا بغور و باستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ میرے مضمون میں ترمیم کی گنجائش نہیں لیکن سید قدرت نقوی کے مضمون پر دو چار نقطے لکھنے کی ضرورت ہے خصوصاً اس لئے کہ میرے مضمون میں نو دریافت دیوان کی تاریخ کتابت کے بارے میں اب تک بیان کئے گئے مختلف نظریات و بیانات کا اعادہ ہو جائے تاکہ آئندہ اس موضوع پر قلم اٹھانے والے کے سامنے تمام حقائق موجود ہوں اور اس خیال سے کہ زیرِ نظر مضمون میں فلاں نظریئے یا خیال کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، کوئی صاحب جزوی اور ادھوری باتوں پر خامہ فرسائی کر کے اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ یہاں اس امر کا اعتراف کر لینا مناسب ہوگا کہ میں علمِ ہیئت اور نجوم دونوں سے نابلد ہوں چنانچہ ہیئت سے متعلق سید قدرت نقوی کے بیانات کو عام فہم اور منطق کی کسوٹی پر پرکھا گیا ہے چنانچہ اس میں تکنیکی نکتہ نظر سے خلل ہو سکتا ہے اور ہیئت والوں کو میرے دلائل سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن میری گزارش یہ ہے کہ میرے دلائل کو خالص علمی اور عقلی نظر سے دیکھا جائے اور اگر اس کے بعد بھی کوئی صاحب انہیں غلط سمجھیں تو انہیں اس کا حق ہوگا اور میں ان صاحب یا صاحبان کا ممنون ہوں گا جو مجھے میری غلطیوں سے آگاہ فرمائیں گے۔

اُردو نامہ ۴۴ بابت جون تا ستمبر ۱۹۷۰ء کے شمارے میں سید قدرت نقوی نے نو دریافت دیوانِ غالب کی تاریخ کتابت کی تعیین میں علمِ ہیئت کے علاوہ بھی کئی طرح سے اظہارِ خیال فرمایا ہے۔ ان میں ضروری باتوں کا جائزہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلے مخطوطے کی تاریخ کتابت کی آخری حد متعین کرتے ہوئے نقوی صاحب نے "لعل خاں" والی یادداشت کو بنیاد بنایا ہے جو زیرِ بحث مخطوطے کے ورق ۱۴ الف پر موجود ہے۔ اس ضمن میں نقوی صاحب کی دلیل یہ ہے۔

> "اس یادداشت کے درمیان میں ہونے کی صرف ایک وجہ ہو سکتی ہے کہ یہ صفحہ زیرِ عمل تھا، لعل خاں کی ملازمت کا معاملہ طے ہو گیا تو یہیں لکھ دیا گیا۔ اب زیرِ عمل ہونے کی دو صورتیں ہیں کہ یا تو یہ صفحہ لکھا جا رہا تھا یا کسی اور دیوان سے نقل ہو رہا تھا۔ لکھا جاتا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ یادداشت یکم صفر کی ہے اور ترقیمہ ۱۶ رجب کا ہے۔ مدت ایک سال ساڑھے پانچ مہینے کی بنتی ہے۔ صفحات کل ۵۴ ہوتے ہیں۔ اتنی طویل مدت میں ۵۴ صفحات کا لکھا جانا قرینِ قیاس نہیں۔ اب صرف یہی صورت باقی ہے کہ یہ صفحہ نقل کیا جا رہا تھا۔" (ص ۳۲)

نقوی صاحب کی مندرجہ دلیل خاصی مضبوط ہے اور بظاہر اس سے اختلاف کی گنجائش نہیں نکل سکتی لیکن یہ کیسے معلوم ہے کہ جس وقت ورق ۱۴ الف لکھا جا رہا تھا اور لعل خاں کی ملازمت کا معاملہ طے ہو گیا اور مذکورہ یادداشت لکھی گئی اس کے بعد کیا حالات پیش آئے اور نقل یا کتابت کا کام کتنے عرصے تک ملتوی رہا۔

نقوی صاحب نے نثار احمد فاروقی کے طریقۂ تعیینِ تاریخ کتابت پر اعتراض کیا ہے جب نے اس ضمن میں نثار صاحب کے مراسلے تو پڑھے تھے لیکن نقوش غالب نمبر جس میں یہ دیوان شائع ہوا ہے اس کا مقدمہ نہیں دیکھا تھا نقوی صاحب کا اعتراض دیکھنے کے بعد اسے بھی دیکھا تو نثار صاحب کا بیان واقعی عجیب معلوم ہوا۔ نثار صاحب کا بیان یہ ہے:۔

"اب دیکھنا یہ چاہئے کہ تقویم ہجری و عیسوی کی رُو سے ۱۴ رجب کس سال منگل کے دن واقع ہوئی تھی۔ تقویم کا حساب بتاتا ہے کہ ۱۲۳۱ھ میں ۱۴ رجب کو بدھ کا دن تھا واقعی تاریخ اور اس حساب میں ایک دن کا فرق، رویت کی وجہ سے رہ جاتا ہے۔ اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ ۱۲۳۱ھ میں رجب کا چاند ۲۹ جمادی الثانیہ کو نظر آیا تھا تو ۱۴ رجب کو سہ شنبہ ہی پڑتا ہے۔ ۱۲۳۱ھ میں غالب کی عمر ۱۹ سال ہوتی ہے اور انہوں نے اپنی شاعری کے آغاز اور جمع دیوان کے بارے میں جو شہادتیں چھوڑی ہیں ان سے اس سنہ کو تسلیم کرنے میں کوئی تناقض یا تضاد نہیں ہے۔

اگر ۱۲۳۱ھ والے حساب کو از راہِ احتیاط نہ بھی مانا جائے، (اور بظاہر ہمیں کوئی مانع نظر نہیں آتا) تو اتنا بالکل بدیہی ہے کہ غالب کا یہ دیوان صفر ۱۲۳۵ھ سے پہلے لکھا گیا ہے اور اس کی کتابت کا زمانہ ۱۲۳۱ھ سے ۱۲۳۵ھ کے مابین کوئی سال ہو سکتا ہے۔" (نقوش ص ۱۶)

نثار صاحب کا مندرجہ ذیل بیان ان کے پہلے بیانات سے (جو مراسلوں کی شکل میں شائع ہوئے) میل نہیں کھاتا۔ یہاں عجیب تر بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ مخطوطے کی تاریخ کتابت طے کرتے ہوئے ان کی نظر سب سے پہلے ۱۲۳۱ھ پر ہی کیوں پڑی اور عجیب تر یہ کہ جب تقویم کی رُو سے ایک دن کا فرق تھا تو بھی انہوں نے اسی کو ترجیح کیوں دی اس کا صرف ایک ہی مطلب ہے کہ ان کے ذہن میں یہ تاریخ پہلے سے موجود تھی (عرشی صاحب پہلے ہی یہ تاریخ طے کر چکے تھے) ہوا یوں ہوگا کہ جب نثار صاحب نے تقویم دیکھی تو انہیں ۱۲۳۳ھ میں (سہواً) ۱۴ رجب کو منگل کا دن دکھائی دیا تھا لیکن مولانا عرشی کے مضمون مطبوعہ آج کل جولائی ۱۹۷۰ء کے بعد انہوں نے اپنی رائے بدل دی اور اس کے بعد بغیر تقویم پر نظر ڈالے وہ اپنے ایک دن کے فرق والے بیان کو دہراتے رہے، ورنہ اگر وہ تقویم پر نظر ڈالتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ ۱۲۳۱ھ میں ایک دن کا فرق تو ہے لیکن ان کے بیان سے مختلف ہے یعنی انجمن کی مطبوعہ تقویم میں یہ پیر کا دن ہے اور بدھ کا نزول کشوری تقویم میں مولانا عرشی و عرفی زادہ صاحبان منگل بتاتے ہیں۔ پھر یہ شبہ کا دن اس تقویم میں تھا، نثار صاحب کا یہ جملہ کہ "تقویم کا حساب بتاتا ہے" اشارہ کرتا ہے کہ ان کے پیش نظر انجمن والی ہی تقویم تھی کیونکہ اس میں صرف مہینے کا پہلا دن دیا ہوا ہے اور بقیہ کا حساب لگانا پڑتا ہے۔ یہاں یہ امر بھی پیش نظر رہے کہ اب تک جتنے سنہ گنوائے گئے ہیں ان سب میں رجب کا چاند ۲۹ جمادی الثانیہ ہی کو نظر آیا تھا۔ اگر نثار صاحب نے تقویم کو بغور دیکھا ہوتا تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ غالب کی پیدائش ۱۲۱۲ھ سے کر آئندہ پچاس برسوں تک ہر برس میں جمادی الثانیہ ۲۹ ہی دن پر مشتمل تھا۔ ان حالات کی روشنی میں ان کا یہ کہنا کہ "اگر رجب کا چاند ۲۹ جمادی الثانیہ کو نظر آیا ہو" نہ صرف عجیب معلوم ہوتا ہے بلکہ اس امر کا ثبوت بھی ہے کہ نقوش میں دیوانِ غالب پر مقدمہ لکھتے ہوئے انہوں نے کسی تقویم سے مدد نہیں لی بلکہ اپنی اور دوسروں کی گزشتہ تحریروں کی بنیاد پر جو کچھ ان کے حافظے میں محفوظ تھا۔ انہوں نے اس پر اعتماد کیا۔

اب نقوی صاحب کے علم ہیئت کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ نقوی صاحب نے اپنے مضمون کی ابتدا ان الفاظ سے کی ہے۔

"دیوانِ غالب کے نو دریافت مخطوطے کی تاریخ و سن کتابت کے سلسلے میں اہلِ علم و تحقیق اختلاف رائے رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان حضرات نے قیاس سے کام لیا ہے یا جنتریوں سے مدد لی اور تاریخ یوم و کتابت کی تطبیق اس سنہ سے کر دی جو جنتریوں نے بتا دیا لیکن ان کے پاس حتمی اور قطعی سن متعین کرنے کا کوئی اور طریقہ نہیں تھا۔ یہ اتفاق ہے کہ جنتری میں مندرج تاریخ و یوم میں اختلاف واقع نہیں ہوا۔" (ص ۳۱)

نقوی صاحب کا یہ بیان درست نہیں کہ جنتری میں تاریخ و یوم میں اختلاف واقع نہیں ہوا یا تو انہوں نے اس سلسلے میں لکھے گئے مضامین نہیں دیکھے یا مختلف جنتریوں کی ورق گردانی نہیں کی۔ اگر جنتریوں میں اختلاف نہیں تھا تو اس سلسلے میں خامہ فرسائی کر کے اپنا وقت اور انرجی ضائع کرنے کا کیا جواز تھا۔ ظاہر ہے کہ نقوی صاحب کا مقصد اپنی معلومات ہیئت کی دھاک بٹھانا نہیں بلکہ ایک نزاعی تحقیقی مسئلے کا حل پیش کرنا ہے۔ اگر اہلِ علم و تحقیق سنہ اور یوم کی تطبیق جنتری سے نہ کرتے تو کیا کرتے؟ کیا ادب کے محقق کے لئے ضروری ہے کہ وہ نجوم اور ہیئت کا بھی ماہر ہو! اگر وہ ان علوم سے واقف ہے تو یہ اس کی بڑائی ہے لیکن اگر ناواقف ہے تو یہ اس کی کوتاہی نہیں ہے اور اس ناواقفیت کے لئے اس کی تحقیقی و تنقیدی صلاحیتوں پر حرف رکھنا ناانصافی ہے۔ ہیئت اور نجوم دونوں سائنٹفک علوم ہیں اور دونوں کی بنیاد ریاضی پر ہے۔ دونوں فلکیات یعنی سیاروں کی گردش سے بحث کرتے ہیں۔

ہیئت محدود ہے اور نجوم قدرے وسیع، اس لیے کہ نجوم سیاروں کی گردش کے علاوہ اُن کے اثرات کا تعین بھی کرتی ہے۔ تاہم گردش کے حساب میں دونوں میں اختلاف نہیں ہونا چاہئے اور اگر ایسا ہے تو تقویم جو نجوم ہی کی نمائندہ ہے کی فراہم کردہ معلومات کو نامعتبر قرار دینے کا کوئی جواز نہیں۔ نقوی صاحب نے غالب کی تاریخ پیدائش کے سلسلے میں کہا ہے کہ "میں نے اس سلسلے میں مفصل لکھا تھا اور ثابت کیا تھا کہ ۱۲۱۲ھ صحیح سن ولادت ہے" (ص ۳۵ اُردو نامہ) لیکن حساب پھر حساب ہے، اس میں ہر آدمی سے غلطی ہو سکتی ہے۔ میری نظر سے نقوی صاحب کا مبینہ مضمون نہیں گزرا لیکن جو قاعدہ انہوں نے تعین تاریخ کتابت کے سلسلے میں اپنایا ہے میں نے اسی طریقے پر مرزا کی تاریخ پیدائش ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کو عیسوی سنہ سے مطابق کیا تو دو دن کا فرق آیا یعنی یہ تاریخ مطابق ہوتی ہے ۲۹ دسمبر ۱۷۹۷ء کے نہ کہ ۲۷ دسمبر کے جیسا کہ مشہور ہے۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ضرب تقسیم میں غلطی نہیں کی۔ نقوی صاحب کے مبینہ قاعدے میں ہر جگہ دو رقوم مستقل ہیں جو شاید سنہ عیسوی اور ہجری کے آغاز سے تعلق رکھتی ہیں مثلاً ۵۷۷،۲ اور ۶۲۱، ہجری اور عیسوی سنین کا وہ فرق معلوم ہوتا ہے جو ابتدا میں تھا (عام طور سے یہ فرق ۶۲۲ سال مانا جاتا ہے۔ زیادہ قطعیت اور صحت کے لئے شاید اہل بیت اعشاریہ بڑھا رکھے ہیں لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسور اعشاریہ آخری نتائج پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ خود نقوی صاحب نے ایک جگہ ۵۷۷،۲ و ۶۲۱ھ کے بجائے ۵۷۷ و ۶۲۱ سے حساب لگایا ہے اور نتیجہ وہی نکالا ہے جو اول الذکر رقم سے حساب لگانے کی صورت میں برآمد کرتے (حالانکہ اصولاً یہ لغزش ہی ہے) مقصد اس بحث سے یہ ہے کہ نقوی کا لگایا ہوا حساب ہر جگہ درست نہیں اس میں ایک سے دو دن تک کا فرق آسکتا ہے اور آتا ہے۔ جیسا کہ آگے ظاہر ہوگا۔ صحیح نتائج تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ نقوی صاحب اپنے حساب پر غور فرمائیں۔ ممکن ہے اب ان کی نظر اس لغزش تک پہونچ جائے جو پہلے حساب لگاتے وقت اُن سے سرزد ہوئی تھی۔ اب نقوی صاحب کا حساب ملاحظہ ہو۔

اس ضمن میں اُن کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ عیسوی تاریخ کو ہجری تاریخ سے مطابق کرنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ بنیاد تاریخ ہجری کو بنانا چاہئے کیونکہ ترقیمے میں ہجری تاریخ اور دن دیا ہے۔ بجائے یہ معلوم کرنے کے کہ ۱۴ رجب کو کیا دن تھا وہ گیارہ جون کا دن معلوم کرتے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ مولانا عرشی نے ۱۴ رجب ۱۲۳۱ھ کو ۱۱ جون ۱۸۱۶ء لکھا تھا چنانچہ نقوی صاحب یہ فرض کرکے چلے ہیں کہ ۱۴ رجب ۱۱ جون کے مطابق ہے غالباً اسی لئے انہوں نے نثار احمد فاروقی پر بھی اعتراض کیا ہے کہ انہوں نے ہجری تاریخ کے مطابق عیسوی تاریخ نہیں لکھی

۱۲۳۱ھ کو ۵ ۱۸۱ء سے مطابق آنے تک نقوی صاحب کا حساب درست ہے۔ ان کے حساب سے یکم محرم ۱۲۳۱ھ تک آغاز ۱۸۱۵ء کے بعد گزرنے والے دنوں کی تعداد ۳۳۶،۸۰۱۵۶۰ ہوتی ہے۔ اعشاریہ کے بعد (دہنی طرف کے) اعداد کو شمار نہیں کیا گیا۔ گویا یکم محرم تک گزرنے والے دنوں کی تعداد ۳۳۶ ہوتی۔ انگریزی سال ۳۶۵ دن کا ہوتا ہے۔ ۳۶۵-۳۳۶=۲۹ دن۔ پورا سال گزرنے میں صرف ۲۹ دن باقی رہے۔ نقوی صاحب رقمطراز ہیں: "۳۳۶،۸۰۱۵۶۰ ایام سنین رواں جو یکم محرم تک گزرے۔ اس طرح ۲ دسمبر ۱۸۱۵ء کو یکم محرم ۱۲۳۱ھ واقع ہوئی"۔ (ص ۳۵) یہ درست ہے لیکن اس کے بعد کا حساب غلط ہے۔ یہاں سے غالباً ہیئت اور نجوم دونوں سے کام لیا گیا ہے۔ ۲ دسمبر ۱۸۱۵ء یا یکم محرم ۱۲۳۱ھ کو یک شنبہ یعنی اتوار تھا۔ یکم محرم سے ۱۴ رجب تک معمولی حساب کی رُو سے شمار کیا جائے تو ۱۹۱ دن ہوتے ہیں اور اس طرح ۱۴ رجب کو دوشنبہ ہوگا اور یہ مطابق ہوگا ۱۰ جون ۱۸۱۶ء کے لیکن نقوی صاحب نے ۱۱ جون تک ۱۹۲ دن شمار کئے اور ۱۴ رجب کو اس سے مطابق کرنے کے لئے ہجری ایام کی تفصیل میں ایک دن کا اضافہ کر لیا۔ یہ بات ان کے پیش کردہ نقشے سے ظاہر ہوگی۔ ملاحظہ ہو

"۱۴ رجب تک ایام کی تفصیل مع تفصیل ایام عیسوی درج ذیل ہے۔

ہجری مہینہ	ایام	سنہ	عیسوی مہینہ	ایام	سنہ
محرم	۳۰	۱۲۳۱ھ	دسمبر	۲۹	۱۸۱۵ء
صفر	۲۹	〃	جنوری	۳۱	۱۸۱۶ء
ربیع الاول	۳۰	〃	فروری	۲۹	〃
ربیع الآخر	۲۹	〃	مارچ	۳۱	〃
جمادی الاول	۳۰	〃	اپریل	۳۰	〃
جمادی الآخر	۳۰	〃	مئی	۳۱	〃
رجب	۱۴	〃	جون	۱۱	〃
کل ایام	۱۹۲			۱۹۲	

نقوی صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ آخر علم ہیئت کے کون سے قاعدے کی رُو سے انہوں نے جمادی الاول اور جمادی الآخر دونوں مہینوں میں تیس تیس دن شمار کئے ہیں یہ کہنا تو غلط ہے کہ انہوں نے اپنے حساب میں تقویم سے مدد نہ لی ہوگی۔ خود ۱۱ جون سے مطابقت ہی اس بات کا ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ ایام یا مہ کی تفصیل معلوم کرنے کے لئے تقویم کی مدد ناگزیر ہے۔ تقویم سے مدد لینے کا ایک اور ثبوت یہ بھی ہے کہ انہوں نے نسخۂ حمیدیہ کی اصل مخطوطہ بھوپال کے ترقیمے میں دی ہوئی تاریخ ۵ صفر ۱۲۳۷ھ کی تطبیق جمعہ ۲ نومبر ۱۸۲۱ء سے کی ہے اور لکھا ہے (یکم نومبر جمعرات ۱۸۲۱ء ہونا چاہئے) اگر یہ سنہ بھی تقویم سے مطابق کیا گیا ہے تو وہ تقویم نامعتبر ہے اور اگر علم ہیئت سے

معلوم ہوتا ہے تو اس حساب کی صحت مشکوک ہے۔ ہجری مہینوں کا انحصار رویت ہلال پر بتایا جاتا ہے (پھر بھی سال میں ہمیشہ تقریباً ۳۵۵ ہی دن ہوتے ہیں) لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔ چاند کی گردش معین ہے اس میں فرق واقع نہیں ہو سکتا پھر رویت کو کس خانے میں فٹ کیا جائے۔ یہ تو ممکن ہے کہ کسی خاص دن اور خاص مقام پہ چاند نظر نہ آئے اور دوسرے مقام پر نظر آجائے (اس کا تعلق اس مقام کے ارتفاع یا (ALTITUDE) سے معلوم ہوتا ہے) کیا اس صورت میں دونوں مقامات پر تاریخیں اور دن مختلف ہوں گے؟ شاید ایسا ہی ہو، لیکن آج سائنس نے جدید آلات فراہم کر دیئے ہیں جن کی مدد سے ہر مقام پر چاند کا دیکھ لیا جانا ممکن ہے۔ رویت ہلال کی مذہبی اہمیت سے قطع نظر اگر خالص سائنسی نکتۂ نظر سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ چونکہ چاند کی گردش معین ہے اس لئے یہ ناممکن ہے کہ ایک سال کسی خاص مہینے کا چاند ۲۹ویں دن دیکھا جائے اور دوسرے سال اسی مہینے کا چاند تیسویں دن نظر آئے۔ تھوڑی دیر کو رویت ہلال ہی کو بنیاد مان لیا جائے تو بھی نقوی صاحب کو یہ بتانا چاہئے تھا کہ انہوں نے جمادی الاول اور جمادی الآخر ۱۲۳۱ھ میں رویت ہلال کا پتہ کس طرح لگایا۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اہل علم نے ایسے قاعدے بنائے ہوں گے جن کی مدد سے کسی بھی گزشتہ یا آئندہ سنہ میں مختلف مہینوں میں رویت ہلال کے وقوع کا دن معلوم کیا جا سکے (اور یہ تبھی ممکن ہے جب چاند کی گردش معین ہو) ایسے ایک قاعدے کا علم مجھے ہوا ہے (یہاں قاعدے کی تفاصیل فراہم کرنا نہ ضروری ہے نہ مفید، اس لئے اس سے صرف نظر کیا جاتا ہے)۔ نقوی صاحب نے جیسا کہ دکھایا جا چکا ہے جمادی الآخر میں بجائے ۲۹ کے ۳۰ دن شمار کئے ہیں — جو غلط ہیں۔ اگر کسی تقویم پر نظر ڈال جائے تو یہ بھرم کھل جائے گا۔ انجمن ترقی اردو نے ۱۹۳۹ء میں جو تقویم شائع کی اس میں سنہ ایک ہجری سے پندرہ سو ہجری یعنی ڈیڑھ ہزار برس کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان ۱۵۰۰ برسوں میں کسی ایک سال بھی جمادی الآخر میں ۳۰ دن نہیں دکھائے گئے، آخر کیوں؟ اس لئے کہ سائنسی اعتبار سے یہی درست ہے۔ خود نقوی صاحب نے ۱۲۳۱ھ میں ۳۰ اور ۱۲۳۶ھ کے اسی مہینے میں ۲۹ دن شمار کئے ہیں۔ سائنسی منطق سے قطع نظر، زیادہ کثیر خیالات کے لوگوں سے اطمینان کے لئے میں نے تمتی پترک (اس کا تفصیلی تعارف مضمون میں کروایا جا چکا ہے) کی ورق گردانی شروع کی اور ادھر اُدھر سے کئی سال کے نقشے دیکھ ڈالے لیکن ہر جگہ ماہ مذکور میں ۲۹ ہی دن ملے۔ زیادہ وضاحت کے لئے میں نے غالب کے سال پیدائش ۱۲۱۲ھ سے لے کر پچاس سال ادھر تک ہر سال میں جمادی الآخر پر نظر ڈالی سوائے ایک سال ۱۲۱۴ھ کے کہیں بھی جمادی الآخر میں تیس دن نظر نہ آئے اور اس سال میں بھی یہ خصوصیت ہے کہ جمادی الاول میں بجائے تیس کے ۲۹ دن درج ہیں گویا حساب برابر ہے۔ ضابطۂ ہلالیہ کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ میں نے ان ۵۰ برسوں میں اس ضابطے کی رو سے حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ ہر مرتبہ جمادی الآخر ۲۹ دن پر مشتمل تھا۔ اور ۱۲۱۴ھ میں تمتی پترک میں جو فرق تھا وہ درست نہیں۔ انجمن کی تقویم بھی میرے خیال کی تائید کرتی نظر آتی ہے۔ اس حساب کتاب کے دوران ایک اور انکشاف بھی ہوا کہ کسی خاص مہینے کی کسی خاص تاریخ کو پڑنے والا دن ٹھیک آٹھ سال بعد اس تاریخ کو دوبارہ واقع ہوگا۔ اس کی تصدیق معمولی سی محنت سے کی جا سکتی ہے کوئی تقویم اٹھا لیجیے، تصدیق ہو جائے گی مثال کے طور پر تمتی پترک میں یکم صفر ۱۰۵۴ھ کو شنبے کا دن تھا اور ہر آٹھ سال بعد بھی یکم صفر یعنی ۱۰۶۲، ۱۰۷۰، ۱۰۷۸، ۱۰۸۶، ۱۰۹۴ وغیرہ شنبے ہی کو پڑی۔

مختصر یہ کہ نقوی صاحب نے ۱۲۳۱ھ میں جمادی الثانی کے ۳۰ دن غلط شمار کئے ہیں اصلاً یہ ۲۹ ہیں۔ اس طرح ۱۲۳۱ھ میں ۱۲ رجب کو پیر کا دن آتا ہے نہ کہ منگل۔ ۱۲۳۶ھ میں اُن کا شمار درست ہے۔ اس لئے ۱۴ رجب کو منگل کا دن آتا ہے۔ نقوی صاحب نے جنتری میں ۱۲۲۸ھ (یہ نہیں بتایا گیا کہ کس جنتری میں، یہ انجمن کی شائع کردہ جنتری بھی ہو سکتی ہے) میں ۱۴ رجب کو منگل کا دن دیکھا لیکن علم ہیئت کی رُو سے وہ اس تاریخ کو جمعرات بتاتے ہیں جو ظاہر ہے کہ درست نہیں اگر انہوں نے سابقہ تاریخوں کی طرح اس سال کا بھی تفصیلی عمل اور حل لکھا ہوتا تو بتایا جا سکتا ہے کہ انہیں شمار میں کہاں سہو ہوا ہے لیکن تفصیلی عمل کی عدم موجودگی میں یہ ممکن نہیں۔ اگر ۱۲۳۶ھ میں وہ ۱۴ رجب کو منگل کا دن مانتے ہیں تو ۸ سال کے وقفے سے دیکھیں تو انہیں معلوم ہوگا کہ جس تقویم نے ۱۲۳۶ھ میں منگل کا دن لکھا ہے (اور اُن کا اپنا قاعدہ اس کی تصدیق کرتا ہے) اسی میں ۱۲۲۸ھ میں بھی یہی دن ہوگا اسی طرح ۱۲۲۰ کو بھی منگل ہوگا اور اگر آگے کی طرف آگے بڑھیں تو ۱۲۴۴، ۱۲۵۲، ۶۰، ۶۸، ۷۶، ۱۲۸۴ سب میں ۱۴ رجب کو منگل کا دن آئے گا۔ (۱۲۸۵ھ میں غالب فوت ہو گئے تھے لہٰذا ۱۲۸۴ سے آگے دیکھنے کی ضرورت نہیں) کسی بھی صحیح تقویم سے اس کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔

نقوی صاحب نے عیار الشعرا اور عمدۂ منتخبہ میں غالب کے ذکر کی موجودگی سے بھی بحث کی ہے۔ لیکن چونکہ ان کی بحث ایک دوسرے ہی زاویے سے ہے اس لئے اس سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ ان تذکروں سے بحث ہم پہلے ہی کر چکے ہیں اس لئے اس کو طول دینا غیر ضروری ہے۔

ایک آخری بات اور ۳۰ مئی ۱۹۷۱ء کے ہماری زبان میں محمد انصار اللہ صاحب نے اپنا ایک مضمون مراسلات کے تحت شائع کیا ہے۔ مضمون کا آخر پھیرا ہے۔

"بعض دوستوں کا کہنا ہے کہ ۱۲۲۶ھ، ۱۲۳۰ھ، ۱۲۳۱ھ، ۱۲۳۳ھ، ۱۲۳۶ھ
میں کسی نہ کسی سال ۱۴ رجب کو سہ شنبہ کا دن ضرور ہوگا اب لے
مجھے چاہیے کہ میں اُن سے کسی سال میں مخطوطے کا لکھا جانا تسلیم
کروں۔ میں اپنے پچھلے مراسلوں میں ایک سے زائد بار یہ عرض کر چکا
ہوں کہ میرے نزدیک (۱) مخطوطہ بخط غالب نہیں ہے (۲) اس
کے ۱۲۳۶ھ سے پہلے لکھے جانے کا کوئی امکان نہیں اس لیے میں
اس بحث کو غیر ضروری سمجھتا ہوں"۔ (ہماری زبان ص ۲)

یہ نہیں معلوم کہ کن دوستوں نے نظر صاحب کو یہ مشورہ دیا لیکن انتہائی غیر معقول مشورہ ہے اگر وہ یہ مشورہ دیتے کہ آپ مذکورہ سنین میں تحقیق کر کے دیکھیں کہ ۱۴ رجب کو سہ شنبے کا دن ہے یا نہیں اور پھر اس کے پیش نظر اپنے نتائج اخذ کریں تو کچھ بات بھی تھی اس کے علاوہ ان میں ۱۲۳۰ھ اور ۱۲۳۶ھ کے علاوہ کسی بھی سنہ میں منگل کا دن مذکورہ تاریخ کو نہیں پڑتا۔ اچھا ہے کہ نظر صاحب نے ان سہل نگار دوستوں کے مشورے پر عمل نہیں کیا۔ فی الحال مجھے اس سے بحث نہیں کہ مخطوطہ بخط غالب ہے کہ نہیں (اس کے حق میں اور خلاف بہت سی دلیلیں دی جا سکتی ہیں) اس وقت نظر صاحب کی توجہ ان کے دوسرے قول کی طرف دلانا چاہتا ہوں۔ اُن کا کہنا ہے کہ مخطوطہ ۱۲۳۷ھ سے پہلے کسی طرح نہیں لکھا گیا (لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ ۱۲۳۷ھ کے بعد کب لکھا گیا؟ کیا محقق کا کام شک کرنا ہے اور حقائق کی چھان بین کر کے صحیح نتائج اخذ کرنا نہیں؟) لیکن انہیں یہ تو ماننا ہی پڑے گا (بشرطیکہ وہ ترقیمے کی عبارت کو جعلی اور فرضی نہ سمجھیں) کہ یہ مخطوطہ بخط غیر ہو یا بخط غالب ۱۴ رجب بروز سہ شنبہ بعد دوپہر مکمل ہوا۔ ۱۲۳۶ھ تک کے امکانات پر نظر صاحب غور کرنے کو تیار نہیں بلکہ انہوں نے ۱۲۳۷ھ سے پہلے کے امکانات رد کر دیئے ہیں۔ بعد کے امکانات کے لیے کچھ میں عرض کرتا ہوں۔ نظر صاحب غور فرمائیں۔ ۱۴ رجب کو سہ شنبہ ۱۲۳۶ھ کے بعد ۱۲۴۴ھ میں پڑے گا جب غالب کلکتہ میں تھے اور نظر صاحب کو اس پر اصرار نہیں کہ یہ مخطوطہ کلکتہ میں تیار ہوا۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہاں جو کلام کا انتخاب کیا گیا تھا جب کہ مخطوطے گل رعنا کے نام سے نہ صرف مل چکے ہیں بلکہ ایک شائع بھی ہو چکا ہے۔ دوسری بار مذکورہ تاریخ کو سہ شنبہ ۱۲۵۲ھ میں پڑے گا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب غالب کلکتہ سے آ کر انتہائی پریشان اور مایوس کن حالات سے دوچار ہیں۔ قرض خواہوں کے ڈر سے دن میں گھر سے نہیں نکلتے رات کے اندھیرے میں نکلتے ہیں اور حکام سے مل کر لوٹ آتے ہیں۔ ولیم فریزر قتل ہو چکے ہیں۔ نواب شمس الدین احمد خاں کا ایک ملازم کریم خاں گرفتار ہو چکا ہے۔ خود شمس الدین احمد خاں پر پابندی ہے اور غالب پر ان کے خلاف مجسٹریٹ کے کان بھرنے کا الزام ہے۔ آخر اکتوبر ۱۸۳۵ء میں شمس الدین احمد خاں کو پھانسی دے دی جاتی ہے۔ ۱۲۵۲ھ کا آغاز ۱۸ اپریل ۱۸۳۶ء سے ہوتا ہے (اسی دن نواب شمس الدین احمد خاں قتل کے الزام میں گرفتار ہوئے تھے) کیا ان ایام پریشانی میں غالب نے یہ مخطوطہ لکھا یا لکھوایا؟ کیا اس وقت تک وہ بیدل سے اتنے ہی متاثر رہے تھے اپنے بچپن کے زمانے میں؟ اس کے بعد یہ دن ۱۲۶۰ھ میں پڑے گا لیکن کیا اپنے پہلے دیوان کی اشاعت کے کم و بیش پانچ سال بعد طباعت دیوان اُردو اول ایڈیشن رمضان/شوال ۱۲۵۵ھ مطبع سید الاخبار (جس کے مقدمے کی رو سے وہ اس سے باہر پائے جانے والے کلام کو اپنا کلام کہنے سے بھی منکر تھے) یہ مخطوطہ لکھ یا لکھوا سکتے تھے؟ اب یہ جناب انصار اللہ صاحب پر منحصر ہے کہ وہ ان میں سے کس برس میں اس مخطوطے کی کتابت ہونا تسلیم کرتے ہیں۔

فخر رضوی

ایک میدان سا آتا ہے نظر گھر اپنا
چند بادل ہیں، کوئی چھت ہے نہ چھپر اپنا

گیند کی طرح پلٹ آئے گا پتھر اپنا
پھینکنے والے بچا پہلے ذرا سر اپنا

میں بہت غور سے ہر روز تکا کرتا ہوں
اپنے ہاتھوں کی لکیریں ہیں مقدر اپنا

اب تو آواز سے پہچان سکو گے چہرہ
جانے کس وقت بدل لے کوئی تیور اپنا

جو بھی بادل تھے اُڑا لے گئی ساتھ اپنے ہوا
دیر تک جلتا رہا دھوپ میں پیکر اپنا

لمحے سے قتل ہوا کرتا ہے لمحہ رضوی
ہم بھی دیکھیں گے کسی روز یہ منظر اپنا

افرادِ تمثیل :-

مجاہد	ایک نوجوان
نجمہ	مجاہد کی بیوی
شہاب	مجاہد کا دوست

منظر :-

ایک درمیانی طبقے کے مکان کا کمرہ جو مکان کے بالائی حصے میں ہے بظاہر ڈرائنگ روم ہے مگر کسی مہمان کے آجانے پر گیسٹ روم میں تبدیل کر دیا جاتا ہے صبح کا وقت ہے۔ نجمہ میز پر بکھرے ہوئے سامان کو ترتیب سے رکھ رہی ہے کچھ دیر بعد مجاہد کمرے میں آتا ہے نجمہ نظریں اٹھا کر اسے دیکھتی ہے اور پھر اپنے کام میں مشغول ہو جاتی ہے۔ مجاہد سگریٹ جلا کر کھڑکی کے پاس جاتا ہے اور کمرے کی طرف منہ کر کے کھڑکی سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو کر خاموشی سے نجمہ کو کام کرتے ہوئے دیکھتا رہتا ہے۔ نجمہ میز پر سامان کو ترتیب دیکر میز پر رکھی ہوئی اپنی تصویر اٹھاتی ہے اسے غور سے دیکھتی ہے اور پھر کپڑے سے صاف کر کے اسی جگہ پر رکھ دیتی ہے کچھ دیر خاموشی رہتی ہے پھر مجاہد سگریٹ کا دھواں چھوڑ کر

مجاہد: شہاب کہاں چلا گیا ؟

نجمہ :- ابھی ابھی تو یہیں تھے نہانے گئے ہیں

مجاہد :- چائے تیار کی ؟

نجمہ :- (اپنے کام میں مشغول رہتے ہوئے) چائے تو کب کی تیار ہے وہ نہا کر تو آجائیں (کچھ دیر خاموش رہ کر) وہ آج جانے کا کہہ رہے تھے۔

مجاہد: اچھا ۔۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر سوچتے ہوئے) وہ جب سے یہاں آیا ہے کچھ خاموش اور ڈسٹرب سا ہے۔ (نجمہ خاموشی سے اپنے کام میں مشغول رہتی ہے مجاہد سگریٹ کا کش لے کر) تم بھی مجھے کچھ پریشان نظر آ رہی ہو۔

نجمہ :- (مڑ کر مجاہد کو دیکھتی ہے۔ کچھ دیر خاموش رہ کر) ایسی تو کوئی بات نہیں ہے (نجمہ پھر اپنے کام میں مشغول ہو جاتی ہے۔ مجاہد تپائی کے پاس جا کر ایش ٹرے میں سگریٹ ڈالتا ہے جس کا دھواں ایش ٹرے سے نکلتا رہتا ہے۔ مجاہد پھر کھڑکی کے پاس جا کر اسے کھولتا ہے اور پردہ ہٹا دیتا ہے۔ پھر نجمہ کی طرف دیکھ کر جو چارپائی پر بستر برابر کر رہی ہے)

مجاہد :- مگر نجمہ ۔۔ (سوچتے ہوئے) خیر ۔۔ (چند سیکنڈ رک کر) کوئی بات ضرور ہے جو تم کھوئی کھوئی سی ہو۔

نجمہ :- (اسی طرح کام میں مشغول رہتے ہوئے) کوئی بات بھی ہو۔ (چند سیکنڈ رک کر مجاہد کو دیکھ کر) کچھ مصروفیت بڑھ گئی ہے اس لئے تھکاوٹ ہو جاتی ہے

مجاہد :- (سوچتے ہوئے) تم تو اسے پہلے سے جانتی ہوگی۔

نجمہ :- ہاں اکثر انور بھائی اور ۔۔ ثاقب صاحب اُن کا ذکر کیا کرتے تھے۔

مجاہد :- ثاقب بھائی ! ۔۔ تم ثاقب بھائی کو بھی جانتی ہو۔

نجمہ :- ہاں ۔ انور بھائی کے دوست تھے اور ہمارے یہاں آیا جایا کرتے تھے

(مجاہد خاموش رہتا ہے اور دوسری سگریٹ جلاتا ہے۔ نجمہ دروازے کی طرف جاتے ہوئے) اب تو نہا چکے ہوں گے چائے لے آؤں۔

(مجاہد خاموش رہتا ہے نجمہ دروازے کے پاس پہنچتی ہے کہ شہاب کمرے میں آتا ہے۔ نجمہ خاموشی سے کمرے سے چلی جاتی ہے۔ شہاب ڈریسنگ ٹیبل کے پاس جا کر بال برابر کرتا ہے اور نجمہ کی تصویر کو غور سے دیکھتا

اس دوران مجاہد برابر شہاب کو دیکھتا رہتا ہے۔ شہاب بال سنوار کر پلٹتا ہے تو مجاہد کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے اس طرح شرما جاتا ہے جیسے چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہو۔ مجاہد کچھ دیر خاموش رہتا ہے پھر مسکرا کر)

مجاہد: یہ شادی سے پہلے کی تصویر ہے۔ اب بیگم صاحبہ کچھ موٹی ہوتی جا رہی ہیں۔ (شہاب خاموش رہتا ہے۔ مجاہد سگریٹ کا لمبا سا کش لے کر) تم نے شادی سے پہلے کبھی تو دیکھا ہوگا۔

شہاب: کسے ؟ نجمہ بھابی کو ؟ نہیں میں نے نہیں دیکھا۔

مجاہد: (کچھ دیر خاموش رہ کر مسکراتے ہوئے) وہ تو تم کو پہلے سے جانتی ہیں۔

شہاب: جانتی ہونگی۔ ثاقب بھائی کا اُن کے یہاں آنا جانا تھا مگر — (کچھ دیر خاموشی سے سوچتا رہتا ہے پھر آہستہ سے) یہ تصویر شادی سے پہلے کی ہے۔

مجاہد: ہاں — (ہنس کر) اُن کے آنے سے پہلے یہ تصویر میرے پاس آگئی تھی — تمہیں شک کیوں ہے ؟

شہاب: شک ؟ نہیں — شک کیوں ہونے لگا مگر یہ تصویر — (خاموش ہو جاتا ہے مجاہد سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا رہتا ہے۔ شہاب کچھ دیر خاموش رہ کر) میں نے یہ تصویر پہلے بھی کہیں دیکھی ہے۔

فرور دیکھی ہوگی۔ (ہنستا ہے۔ شہاب حیرت سے اُسے دیکھتا ہے) پھر اس میں شک، حیرت یا پریشانی کی کونسی بات ہے۔ (چند سیکنڈ خاموش رہ کر) ممکن ہے کبھی تمہاری نظر نجمہ ہی پر پڑ گئی ہو۔

شہاب: نہیں میں نے پہلے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔ ایک دو مرتبہ ان کے گھر ضرور گیا مگر باہر ہی سے واپس آگیا (کچھ دیر رک کر سوچتے ہوئے) یہ تصویر میرے لئے عجیب کامپلیکس بنتی جا رہی ہے۔

مجاہد: کیسا کامپلیکس ؟

شہاب: عجیب سا۔ جس روز سے یہاں آیا ہوں برابر سوچ رہا ہوں کہ یہ تصویر کہاں دیکھی ہے مگر یاد نہیں آ رہا۔ جانے میری یادداشت کو کیا ہو گیا ہے ؟

مجاہد: (ہنستے ہوئے) تو پھر مارو گولی۔

نجمہ: (کمرے میں آتے ہوئے) کسے گولی ماری جا رہی ہے۔

مجاہد: (ہنس کر تصویر کی طرف اشارہ کرکے) آپ کی اس تصویر کو

نجمہ: (چائے کا سامان میز پر رکھتے ہوئے) میری تصویر کو ! (مڑ کر تصویر کو دیکھتے ہوئے) کیوں ؟ اس بیچاری نے بھلا کونسا قصور کر دیا ؟

مجاہد: (مسکراتے ہوئے) اس نے شہاب کو اس کامپلیکس میں مبتلا کر دیا ہے کہ وہ اپنی یادداشت کھوتا جا رہا ہے۔

نجمہ: یادداشت کھوتے جا رہے ہیں ! — وہ کیسے ؟

مجاہد: اُسے یہ یاد نہیں آ رہا ہے کہ اس نے یہ تصویر اور کہاں دیکھی ہے (نجمہ نظریں اٹھا کر مجاہد کو دیکھتی ہے مگر خاموش رہتی ہے اور ایک کرسی پر بیٹھ کر چائے بنانے لگتی ہے۔ مجاہد اس کے پاس دوسری کرسی پر بیٹھ کر شہاب سے) ارے آؤ بھئی (مسکرا کر) تصویر کے بارے میں پھر کبھی سوچ لینا اور پھر اس تصویر کے بارے میں سوچنا بھی کیا۔ (ہنستے ہوئے) اب تو اصل تصویر ہی تمہارے سامنے ہے (شہاب خاموشی سے آکر ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے مجاہد ایک پلیٹ میں مٹھائی دے کر اس کی طرف اشارہ کرکے) یہ کس سلسلے میں ہے ؟

نجمہ: (چائے کی پیالی شہاب کے سامنے رکھتے ہوئے) سلمیٰ تو کوئی نہیں آصفہ بیگم کی لڑکی کا رشتہ طے ہوا ہے، انہوں نے بھیجی تھی۔

مجاہد: اچھا (پلیٹ میں سے مٹھائی منہ میں رکھتے ہوئے) کہاں طے ہوا ؟

نجمہ: کوئی انجینئر ہے مگر سنا ہے ابھی بے روزگار ہے۔

مجاہد: چلو ایک دن بارو زگار بھی ہو جائے گا۔ (ایک دم جیسے کچھ یاد آ جانے پر شہاب کی طرف دیکھ کر) میں تمہاری بہن کی شادی میں نہ آ سکا مجھے بہت افسوس ہوا۔

شہاب: تمہارا بہت انتظار رہا۔ تمہارے نہ آنے پر امی کو بھی بہت دکھ ہوا۔

مجاہد: پروگرام بالکل طے تھا (نجمہ کی طرف اشارہ کرکے) مگر عین موقع پر آپ کو بیمار پڑ جانے کا شوق چرا گیا اور مجھے مجبور ہو جانا پڑا۔

شہاب: اگر تم آ جاتے تو مجھے بڑا سہارا مل جاتا۔ اکیلے ہی وہ دوڑ بھاگ کرنا پڑی کہ دل ہی جانتا ہے۔

مجاہد: مجھے یقین تھا کہ تم ضرور ناراض ہوگے مگر کیا بتاؤں کیسی مجبوری آن پڑی تھی۔ انہیں تنہا چھوڑ نہیں سکتا تھا (ہنس کر) مگر یقین کر لو تمہاری شادی میں نہیں کروں گا۔ (شہاب پیالی میز پر رکھ کر کھڑا ہوتا ہے۔ مجاہد اُسے دیکھ کر) کیوں خیریت تو ہے ؟

شہاب: پروفیسر خان سے ملنا ہے میرے اوپر ہمیشہ مہربان رہا کرتے تھے۔

مجاہد: اچھا تو ابھی تک ان سے ملاقات نہیں ہوئی

شہاب: دو مرتبہ اُن کے گھر جا چکا ہوں مگر ملاقات نہ ہو سکی۔ سوچا آج صبح ہی ان کو پکڑ لیا جائے

مجاہد: نیچے ڈاکٹر صاحب کے کلینک سے فون کر لینا (مسکرا کر) یاد ہے ہم انہیں پروفیسر خان کہا کرتے تھے کیا کہا تھا ذرا جناب جلد کب اچھا کر جائیں اور تمہیں وہ میل کی پسند کرتا پڑے — (شہاب خاموشی سے کمرے سے چلا جاتا

کچھ دیر خاموش رہتی ہے (پھر مجاہد مسکرا کر) جھوٹ بولنا بھی ایک آرٹ ہے۔ بھئے شادی میں نہ جانے کا بہانہ بنانے میں کیسی الجھن ہو رہی تھی کہ دل ہی جانتا ہے۔

نجمہ: اس میں جھوٹ کی کونسی بات تھی۔

مجاہد: اور سچائی کونسی تھی۔ جانے تمہیں وہاں جانے میں کونسی قباحت تھی۔

نجمہ: بس میرا جی نہیں چاہ رہا تھا۔

مجاہد: اس لئے پچھلے تمام شور کرتی رہیں۔ بہانے بناتی رہیں پھر عین وقت پر بیمار پڑگئیں (کچھ دیر خاموش رہتا ہے (سگریٹ جلا کر اس کا دھواں ہوا میں چھوڑتے ہوئے) اب میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم اس کے آنے سے خوش نہیں ہو۔

نجمہ: آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں خوش نہیں ہوں۔

مجاہد: دیکھ تو رہا ہوں کہ تم نے اپنے اوپر ایک ناخوشگوار موڈ طاری کر رکھا ہے (نجمہ نظریں اٹھا کر مجاہد کو دیکھتی ہے کچھ بولنا چاہتی ہے مگر پھر خاموش رہ کر چائے کے برتن کشتی میں رکھنے لگتی ہے (مجاہد کچھ دیر خاموش رہ کر) کیا شہاب کبھی تمہارے ہاں آیا جایا کرتا تھا۔

نجمہ: (غور سے مجاہد کو دیکھ کر) ایک دو مرتبہ ثاقب صاحب کے کسی کام سے آئے تھے مگر باہر ہی سے واپس چلے گئے تھے۔ میں کبھی اُن کے سامنے نہیں آئی ہاں اندر بھائی خود اُن کی تعریف کیا کرتے تھے۔

(مجاہد خاموش رہتا ہے۔ نجمہ چائے کے برتن اٹھا کر دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہے۔ مجاہد سگریٹ کے دو چار کش لیتا ہے پھر آہستہ آہستہ ڈریسنگ ٹیبل کے پاس جا کر غیر ضروری طور پر اپنے بالوں میں کنگھا کرتا ہے۔ چند سیکنڈ نجمہ کی تصویر دیکھتا رہتا ہے پھر مڑ کر سیٹی بجاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھتا ہے کہ شہاب کمرے میں آتا ہے (مجاہد شہاب کو دیکھ کر)

مجاہد: کیوں پروفیسر خان سے ملے نہیں گئے۔

شہاب: میں نے فون کیا تو معلوم ہوا۔ وہ کل شام کہیں باہر چلے گئے ہیں۔

مجاہد: میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ اُن کا ملنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

شہاب: مجھے اُن سے ملاقات نہ ہونے کا ہمیشہ افسوس رہے گا۔

مجاہد: ایک دو دن میں واپس آجائیں گے پھر ملاقات کر لینا

شہاب: مگر مجھے آج واپس جانا ہے

مجاہد: ایسی جلدی بھی کیا ہے ابھی نجمہ بھی کہہ رہی تھی کہ تم واپس جانے کے لئے پر تول رہے ہو۔

شہاب: آٹھ دن ہوگئے ہیں — اور —

مجاہد: کہاں کا غضب ہوگیا۔

شہاب: غضب تو نہیں ہو امی جی پریشان ہوں گی۔ ویسے بھی دو چار دن کا کہہ کر آیا تھا۔ (نجمہ پان لے کر کمرے میں آتی ہے) اب پورے گھر کی دیکھ بھال بھی میرے ہی ذمہ ہے۔

(مجاہد اس طرح خاموش رہتا ہے جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ شہاب پھر غیر اختیاری طور پر تصویر کو دیکھنے لگتا ہے مگر مجاہد اس طرف دھیان نہیں دیتا۔ نجمہ ضرور شہاب کے اس طرح تصویر دیکھنے سے کچھ بے چین سی نظر آتی ہے۔ پھر کچھ اس انداز سے جیسے وہ شہاب کی توجہ تصویر کی طرف سے ہٹانا چاہتی ہو۔)

نجمہ: شہاب صاحب۔ ابھی تو آپ کو چند دن اور ٹھہرنا ہی پڑے گا۔

شہاب: (ایک دم چونک کر) جی: — (پھر خود پر قابو پا کر) نجمہ بھابی مجھے! میں ضرور ٹھہر جاتا مگر . . . .

نجمہ: (بات کاٹ کر) کیا آپ کو یہاں کوئی تکلیف ہے۔

شہاب: کیسی باتیں کرتی ہیں آپ۔ اگر آپ لوگوں کے یہاں تکلیف ہوگی تو پھر آرام کہاں ملے گا۔

نجمہ: (مسکرا کر) بھئی انہیں — (مجاہد کی طرف اشارہ کرکے) یہ شکایت ہے کہ میں آپ کی خاطر پورے طور پر نہیں کر رہی ہوں۔ خدا کی قسم اگر آپ یوں چلے گئے تو یہ تمام زندگی طعنے دیں گے۔

شہاب: (ہنس کر) کیوں صاحب۔ (مجاہد کی طرف دیکھ کر) آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ بھابی میری خاطر نہیں کر رہی ہیں۔

مجاہد: اس لئے کہ تم جب سے یہاں آئے ہو اُداس اور خاموش ہو۔

شہاب: (ہنس کر) تم خالص انسان ہو یا تھوڑے بہت چنندہ بھی۔ (ایک دم سنجیدہ ہو کر) مجاہد بخدا ثاقب بھائی کی بے وقت موت نے جانے کیوں مجھے اس قدر اداس کر دیا ہے کسی بات میں دل ہی نہیں لگتا تھا آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ پہلے تو انہیں پی جانے کی کوشش کرتا ہے پھر رومال سے پونچھ کر) اب میں ہنستا بھی ہوں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہنسی کا مذاق اڑا رہا ہوں۔

(ماحول ایک دم سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر خاموشی ماحول پر چھائی رہتی ہے۔ کچھ دیر بعد مجاہد)

مجاہد: ثاقب بھائی کی موت اس قدر غیر متوقع تھی کہ یقین ہی نہیں آتا کہ اس قدر ہنس مکھ اور زندہ دل انسان مر بھی سکتا ہے (کچھ دیر خاموش رہ کر) سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔

شہاب: (سوچتے ہوئے) ہاں مجھے تو ابھی تک [illegible]

محسوس ہوتا ہے کہ میرے پاس کھڑے کہہ رہے ہیں۔ "شہاب تم بہت نالائق ہو۔"

مجاہد :۔ ان کے نالائق کہنے میں کس قدر خلوص ہوتا تھا ۔ حالانکہ انہوں نے نالائق کبھی اس کے معنوں میں استعمال نہیں کیا (کچھ دیر خاموش رہ کر) پتہ نہیں چلا کہ انہیں بیماری کیا تھی ؟

شہاب :۔ بس تمہاری شادی سے واپس آئے تو اداس کھوئے کھوئے ، اور کمزور نظر آئے۔ ہم نے سوچا شاید تھکاوٹ ہے۔ پھر بخار آیا معمولی سا اور یہ معمولی بخار موت کا پیغام بن گیا۔ (نجمہ کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں شہاب نجمہ کی طرف دیکھ کر) ارے بھابی آپ ــــ (بات ٹالنے کے انداز میں مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے) میں بھی کہاں کا موضوع لے کر بیٹھ گیا۔

(نجمہ ایک دم ہچکیوں سے رونے لگتی ہے۔ شہاب اور مجاہد ایک دم پریشان ہو جاتے ہیں۔ مجاہد نجمہ کو دیکھ کر)

مجاہد :۔ ارے نجمہ تمہیں کیا ہو گیا ؟

نجمہ :۔ (اپنی ہچکیوں پر قابو پا کر آنسو پونچھتے ہوئے) کچھ نہیں (کچھ دیر رک کر) مجھے انور بھائی کا خیال آگیا تھا وہ بھی ثاقب صاحب کی موت سے اس قدر متاثر ہوئے تھے کہ ہم لوگ سوچنے لگے تھے کہ خدانخواستہ انہیں کچھ نہ ہو جائے۔

شہاب :۔ ثاقب بھائی کی موت سے یہ احساس پہلی مرتبہ ہوا کہ انسان کی کچھ ذمہ داریاں بھی ہیں (خلا میں گھورتے ہوئے) ایک مرتبہ امی نے مجھے سبزی لانے کو بازار بھیج دیا اور مجھے کالج پہنچنے میں دیر ہو گئی تو بہت ناراض ہوئے اور کہنے لگے ایسے نالائق کیا میں مر گیا تھا، جو تو بازار چلا گیا اور آج مجاہد پھر وہ مر گئے اب مجھے روز ہی سبزی خریدنے بازار جانا پڑتا ہے۔

مجاہد :۔ شہاب کبھی کبھی انسان دوسروں کو یوں بھی دھوکا دیتا ہے (ٹھنڈی سانس بھر کر) دوسروں کو نالائق کہنے والا خود ہی نالائقی کا ثبوت دے کر ہم سے جدا ہو گیا۔

(کچھ دیر مکمل خاموشی رہتی ہے۔ پھر مجاہد آہستہ آہستہ دروازے کی طرف اٹھتا ہے۔ شہاب اسے جاتا ہوا دیکھ کر)

[illegible]

[illegible] جیسے ہی ... کو فون کر لوں۔

[illegible]

مجاہد :۔ (بات کاٹ کر) نہیں شہاب ابھی تم نہیں جا سکتے (کچھ دیر جھجک کر) مگر اب پھر تم نے جانے کے لئے کہا تو مجھے دکھ ہوگا۔ (دروازے پر دستک) کون صاحب ہیں ؟

(دروازہ کھول کر باہر چلا جاتا ہے۔ نجمہ آہستہ آہستہ کھڑکی کے پاس جاتی ہے اور باہر دیکھنے لگتی ہے۔ شہاب کچھ دیر خاموش اپنی جگہ پر کھڑا رہتا ہے پھر اس کی نظر نجمہ کی تصویر پر پڑ جاتی ہے۔ چند سیکنڈ اسے دیکھتا ہے مگر ذرا ہی طنزیہ طور پر مسکرا کر اپنے سر کو اس طرح جھٹکتا ہے جیسے کسی خیال کو اپنے دماغ سے نکالنے کی کوشش کر رہا ہو کہ مجاہد کمرے میں واپس آتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں کاغذ ہے۔ نجمہ مڑ کر سوالیہ نظروں سے مجاہد کو دیکھتی ہے مگر مجاہد خاموش رہتا ہے۔ نجمہ کچھ دیر خاموش رہ کر۔)

نجمہ :۔ کون تھا ؟

مجاہد :۔ (انتہائی طنز اور نفرت سے) ملک الموت۔ (نجمہ اور شہاب دونوں خاموش رہتے ہیں مگر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہیں مجاہد کچھ دیر بعد ٹھنڈی سانس بھر کر) میری چھٹی کینسل کر دی گئی ہے۔ اور مجھے کل ہی ایک انکوائری کرنے باہر جانا ہے۔

نجمہ :۔ مگر یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ انکوائری کوئی دوسرا شخص بھی کر سکتا ہے۔

مجاہد :۔ (طنزیہ) کیسے کر سکتا ہے ابھی تو میاں مجاہد زندہ و سلامت ہیں۔ کچھ دیر کمرے میں ٹہلتا رہتا ہے پھر شہاب کی طرف دیکھ کر) شہاب ! میں آفس فون کرتا ہوں کہ کسی دوسرے کو انکوائری کے لئے بھیج دیا جائے اگر انہوں نے اتفاق نہیں کیا تو تمہیں دو چار روز تو ٹھہرنا ہی پڑے گا۔

شہاب :۔ مگر مجاہد ــــ

مجاہد :۔ (بات کاٹ کر) یہاں نجمہ تو رہے گی تمہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ ویسے بھی یہ تنہائی میں گھبراتی ہیں۔

شہاب :۔ سوال تکلیف کا نہیں ہے بلکہ ــــ

مجاہد :۔ تو پھر سوال کیا ہے۔ دیکھو مجھے یہ تکلف بازی پسند نہیں۔ آخر تم خود کو اس گھر میں غیر کیوں سمجھ رہے ہو۔

شہاب :۔ غیر کیوں سمجھنے لگا (سوچتے ہوئے) مجھے امی کا خیال ہے وہ پریشان ہو رہی ہوں گی۔

مجاہد :۔ انہیں تار دے دو کہ ابھی تم چند دن اور نہیں آ سکتے۔

شہاب :۔ مگر اب میرا گھر پہنچنا بے حد ضروری ہے گھر پر کوئی نہیں ہے۔ امی کو کس قدر تکلیف ہو رہی ہوگی۔

مجاہد :- وہ چار دن کا گیا ہے (مسکرا کر) اور اتنی تنی بات تو جانتی ہی ہیں کہ مہمان آتا اپنی مرضی سے ہے اور جاتا میزبان کی مرضی سے ہے۔

شہاب :- اور جب تم یہاں نہیں ہوگے تو میں پڑا پڑا بھی کیا کروں گا۔

مجاہد :- (ہنس کر جس میں طنز کا احساس ہوتا ہے) کیوں، نجمہ کو کیا اس قدر اَن سوشل سمجھے ہو کہ وہ تمہیں گھاس بھی نہیں ڈالیں گی (شہاب مشکوک نظروں سے مجاہد کو دیکھتا ہے۔ مجاہد اس پر دھیان نہ دے کر) اچھا میں تمہیں ایک کام بتلائے دیتا ہوں (شہاب خاموش رہتا ہے مگر سوالیہ نظروں سے مجاہد کو دیکھتا ہے۔ مجاہد نجمہ کی تصویر کی طرف اشارہ کرکے) تم ریسرچ کر ڈالنا کہ یہ تصویر تم نے کہاں دیکھی ہے۔

نجمہ :- (غور سے مجاہد کو دیکھتی ہے پھر آہستہ سے) اگر امی وہاں تنہا ہیں تو آپ کو اصرار نہیں کرنا چاہئے۔

مجاہد :- ارے واہ گویا میرا اس پر کوئی حق ہی نہیں ہے۔

نجمہ :- مگر حق کا یہ مطلب تو نہیں کہ ـــ

مجاہد (بات کاٹ کر) حق کا مطلب سب کچھ ہے۔

شہاب :- مگر اب میں ہر حالت میں واپس چلا جانا چاہتا ہوں۔ تم میری پوزیشن کو نہیں سمجھ رہے ہو۔

مجاہد :- میں سب پوزیشن سمجھ رہا ہوں (دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے) اچھا پہلے مجھے فون کر لینے دو۔

(شہاب خاموش رہتا ہے۔ مجاہد کمرے سے چلا جاتا ہے۔ شہاب آہستہ آہستہ کھڑکی کے پاس جاکر باہر دیکھنے لگتا ہے۔ نجمہ کچھ دیر خاموش کھڑی سوچتی رہتی ہے پھر تپائی پر رکھے خاصدان پر پڑتی ہے)

نجمہ :- ارے آپ نے پان نہیں کھایا۔

شہاب :- (مڑکر نجمہ کو دیکھتے ہوئے) جی ـــ

نجمہ :- آپ نے پان نہیں کھایا (شہاب خاموش رہتا ہے۔ نجمہ خاصدان اٹھا کر شہاب کے پاس آتے ہوئے) کیا بات ہے آپ ایک دم خاموش کیوں ہوگئے۔

شہاب :- (کھوئے انداز میں) کوئی بات نہیں۔ (خاصدان سے پان نکال کر منہ میں رکھتا ہے اور پھر سوچتے ہوئے) شاید میں نے یہاں آکر غلطی کی ہے نجمہ بھابی۔

نجمہ :- (حیرت سے) کیوں

شہاب :- (مڑکر کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے) مجاہد کا یہی رویہ سمجھ میں نہیں آرہا، اب مجھے واپس چلا جانا چاہئے۔ دیکھئے نا ـــ

(شہاب کہتے کہتے خاموش ہوجاتا ہے۔ نجمہ سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھتی ہے مگر شہاب خاموش رہتا ہے۔ نجمہ کچھ دیر خاموش رہ کر)

نجمہ :- شہاب صاحب ـــ

(شہاب سوالیہ نظروں سے نجمہ کو دیکھتا ہے مگر نجمہ خاموش رہتی ہے مگر اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں جنہیں وہ اپنے پلو سے پونچھتی ہے۔ شہاب کچھ حیرت زدہ اور کچھ پریشان نظر آتا ہے پھر آہستہ سے)

شہاب :- نجمہ بھابی ـــ (کچھ دیر خاموش رہتا ہے۔ نجمہ خاصدان تپائی پر رکھتی ہے پھر سنگھار میز پر رکھی ہوئی اپنی تصویر کو دیکھتی ہے) کیا بات ہے نجمہ بھابی

نجمہ :- (کچھ دیر خاموشی سے اپنی تصویر کو دیکھتی رہتی ہے پھر مڑ کر شہاب کو دیکھ کر) اس طرح کی ایک تصویر اور بھی تھی۔

شہاب :- ایک تصویر اور تھی !؟

نجمہ :- ہاں ـــ اور وہ تصویر ـــ ثاقب صاحب کے پاس تھی۔

شہاب :- (انتہائی حیرت سے) ثاقب بھائی کے پاس !

نجمہ :- ہاں۔ انہوں نے مجھ سے مانگ لی تھی۔

شہاب :- (سوچتے ہوئے) تو کیا یہ تصویر میں نے انہی کے پاس دیکھی تھی مگر انہوں نے کیوں مانگ لی تھی ـــ (نجمہ خاموش رہتی ہے) تو کیا وہ ـــ میرا مطلب ہے کہ ـــ نجمہ بھابی کیا وہ ـــ

نجمہ :- (پھر آنکھوں میں آنسو بھر کر) میں تو عورت تھی شہاب میاں ـــ ـــ مگر وہ ـــ وہ بھی خاموش رہے اور میں ـــ

شہاب :- مگر وہ خاموش رہے۔ کیا اس قدر بزدل تھے کہ ـــ

نجمہ :- نہیں وہ سوچتے رہے کہ کہیں نور بھائی یہ نہ سوچیں کہ گھر سے ملنے کی اجازت دے کر انہوں نے غلطی کی۔ کہیں نور بھائی یہ نہ سوچیں کہ ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچی ہے اور بس وہ خاموش رہے ـــ حالانکہ نور بھائی خود ـــ (ہچکیوں سے رونے لگتی ہے۔ شہاب حیرت زدہ خاموش کھڑا رہتا ہے۔ کچھ دیر بعد اپنی ہچکیوں پر قابو پاکر آنسو پونچھتے ہوئے) آپ مجھ پر ایک احسان کیجئے (شہاب کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انتہائی الجھن میں مبتلا ہوچکا ہے مگر خاموشی سے سوالیہ نظروں سے نجمہ کو دیکھتا رہتا ہے۔ نجمہ کچھ دیر خاموش رہ کر) آپ یہ وہ تصویر [illegible] کر دیجئے۔

(کمرے میں آتے ہوئے) کہ انہیں تصویر کی بات بتا دی ہے۔ (نجمہ [illegible]

(شہاب دونوں مڑ کر مجاہد کو دیکھتے ہیں جو بڑے معنی خیز انداز میں مسکرا رہا ہے نجمہ اور شہاب دونوں خاموش رہتے ہیں۔ مجاہد آگے بڑھتے ہوئے) ہاں بھئی کونسی تصویر منائی کی جا رہی ہے۔ (شہاب کی نظریں غیر اختیاری طور پر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی ہوئی تصویر کی طرف اٹھ جاتی ہیں۔ مجاہد اس کی نظروں کا پیچھا کرتے ہوئے) اس تصویر کو کیوں۔

شہاب :۔ (کچھ دیر خاموش رہ کر) اس کی وہ کاپی جو میرے گھر پر ہے۔

مجاہد :۔ اچھا، تمہارے گھر پر — (طنزیہ) مگر کیوں ہے۔

نجمہ :۔ (اپنے آنسو پونچھتے ہوئے) میری شادی سے پہلے اس کی ایک کاپی آپ کو اور دوسری ثاقب صاحب کو بھیجی گئی تھی — مگر — مگر —

(خاموش ہو جاتی ہے۔ مجاہد اور شہاب حیرت سے نجمہ کو دیکھنے لگتے ہیں۔)

●●

محمد یعقوب اسلم

کبھی ساغر، کبھی مینا، کبھی صہبا سمجھتے ہیں
ترے دیوانے آنکھوں کو تری کیا کیا سمجھتے ہیں

مٹا کر مجھ کو کہتے ہیں حیاتِ جاوداں دے دی
وہ ہر اک بات کے مفہوم کو الٹا سمجھتے ہیں

جنوں نے نیک و بد کا فرق کچھ رکھا نہیں باقی
ہم اپنے گھر کو بھی تو آج کل صحرا سمجھتے ہیں

کچھ ایسے زخم بھی کھائے ہیں ہم نے ہنستے ہنستے
بھری محفل میں اپنے آپ کو تنہا سمجھتے ہیں

جنونِ حسرت کا وہ چھایا ہے لوگوں کے دماغوں پر
یہ کعبہ کو بھی اپنی نقشِ فرسودہ سمجھتے ہیں

یہ جب چڑھنے پہ آئے گا نہ جانے کیا نام رکھے گا
ہم ان اشکوں کے ہر قطرے کو اک دریا سمجھتے ہیں

تعجب کیا ہے اسلم چاند تارے پھول برسائیں
ترے ہر بول کو جب فن کا شہ پارہ سمجھتے ہیں

کولمبو پلان

نریندر رشمی

یہ ماضی بعید کا قصہ نہیں ابھی چند برس پہلے کی بات ہے جنوب اور جنوب مشرقی ایشیا کے بیشتر ممالک آزادی کی جدوجہد میں اُلجھے ہوئے تھے۔ پھر حالات کی صورت بدلی۔ ان ممالک کے عوام کی کوششیں بارآور ہوئیں۔ ملک آزاد ہوئے لیکن یہ ان ممالک کے مصائب کا نقطۂ اختتام نہیں تھا۔ اسے ایک زیادہ کڑی جدوجہد کے آغاز سے تعبیر کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ انہیں یہ جدوجہد کرنا تھی غریبی کا صدیوں پرانا جُوا گردن سے اُتار پھینکنے کے لئے، ناخواندگی کے اندھیروں کو دُور کرنے کے لئے، اپنے عوام کا معیارِ زندگی بلند کرنے کے لئے، ملک کو خوشحال اور قوم کو جدید، ترقی پذیر اور خوشحال بنانے کے لئے۔

اس مرحلے پر ایک عجیب صورت دیکھنے میں آئی۔ پیش منظر بالکل بدل گیا تھا۔ غیر ملکی حکمراں جو کل تک ان ملکوں کے لئے شمشیرِ برہنہ تھے، آج دستِ مسیحا بن گئے تھے۔ جنوب اور جنوب مشرقی ایشیا میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی تھی۔ اس وسیع و عریض خطے میں نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہو چکا تھا۔ یہ خطہ دُنیا کے کُل رقبے کے چھٹے حصے کے برابر ہے۔ ماضی قریب تک دُنیا کے ایک چوتھائی لوگ اس خطے میں آباد تھے۔ اس خطے میں بڑی پُرامن انقلابی تبدیلیاں واقع ہونے لگی تھیں۔ یہ تبدیلیاں اُن کوششوں کا محض ایک حصہ تھیں جو اس خطے کے ممالک غریبی کی دلدل سے نکلنے اور اپنے عوام کے معیارِ زندگی کو بلند بنانے کے لئے کر رہے تھے۔ ان کوششوں کا ایک نمایاں پہلو بھی تھا — یہ پہلو امداد باہمی کا تھا۔ اس خطے کے ممالک نہ صرف ایک دوسرے کی بلکہ ایشیا کی اقتصادی ترقی کے پروگراموں میں مدد و معاون تھے۔ یہی نہیں، اس کارِ تعمیر میں انہیں اس خطے کے باہر کے ممالک کی امداد بھی حاصل تھی۔ بہرصورت ان ممالک میں جاپان اور نیوزی لینڈ کے ماہرین مقامی طور پر بنی یا امریکہ و برطانیہ سے منگائی گئی مشینوں پر اپنے مقامی ساتھی کارکنوں کے ساتھ مصروفِ کار تھے۔ اسی بات کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ مختلف ملکوں، مختلف روایتوں اور مختلف نسلوں کے لوگ مختلف ذرائع سے دستیاب ساز و سامان کے ساتھ، باہمی امداد سے ایک اور صرف ایک مقصد کے لئے اپنی کوششوں کو بروئے کار لا رہے تھے اور وہ مقصد تھا۔ ایشیا کے اس وسیع و عریض حصے کے کروڑوں عوام کی زندگی کو بہتر بنانا۔

اس مرحلے پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے: آخر یہ صورتِ حال کیسے پیدا ہوئی۔ یہ عطیہ تھا کولمبو پلان کا۔ کولمبو پلان کیا ہے؟ اس کا دائرہ کار اور مقاصد کیا ہیں؟ ان مقاصد کو یہ پلان کیونکر حاصل کر رہا ہے؟ کون سے اور کتنے ملک اس پلان کے ممبر ہیں۔ اس کے ممبر ممالک کو کیا اور کتنا فائدہ پہونچا ہے اور پہونچ رہا ہے؟ نیز اس کا طریقِ کار کیا ہے؟ ان سب سوالوں کے جواب دینے سے پہلے اس پلان کی نوعیت، آغاز اور ارتقاء کے بارے میں عرض کر دینا زیادہ مناسب ہوگا۔

کولمبو پلان اقتصادی ترقی کا ایک اجتماعی تصور ہے۔ اس پلان کے ممبر ممالک اپنی کوششوں اور ساتھی ممبروں کے تعاون سے اس تصور کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کولمبو پلان بین الاقوامی امداد باہمی کا مظہر ہے، متعدد منفرد خصوصیات کا حامل ہے۔ اول، یہ کہ ممبر ملکوں کے دیئے ہوئے امدادی رقمیں کسی مرکزی فنڈ میں نہیں ڈالی جاتیں۔ دوم، یہ کہ امداد کی نوعیت اور صورت باہمی بات چیت سے طے کی جاتی ہے۔ امداد پانے والا ملک پہلے اپنی ضرورت متعین کر لیتا ہے اور پھر اُن ضروریات کی تکمیل کے لئے امداد دینے والے ملک سے چاہتا ہے۔ سوم اس پلان کی شروع سے ایک نمایاں خصوصیت یہ رہی ہے کہ امداد اور مساوات کے تصور کو مقدم سمجھا گیا ہے۔ ابتداً متعدد ممالک کی معاونت کا نظریہ اپنایا گیا تھا، لیکن اب دو فریقوں کے درمیان امداد و معاونت کا طریقہ مسلمہ ہے۔ کولمبو پلان کوئی بین الاقوامی ترقیاتی تنظیم نہیں۔ اس کی حیثیت ایک ساتھی کی ہے۔ دو طرفہ کارروائی نیز متعلقہ عوام کی حسیات اور اقتدار کے باہمی احترام نے کولمبو پلان کو مقبول بنانے میں بڑی مدد دی ہے۔

اس کی مقبولیت کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ اور وہ ہے اس پلان کا علاقائی ہونا یعنی اس علاقے کا ہر ملک اس پلان کا ممبر ہے۔ ممکن ہے آج یہ بات کچھ نیا

دکھائی نہ دے لیکن زمانی پس منظر میں اس کی اہمیت سے انکار بڑا مشکل ہوگا۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی کے اوائل میں اس خطے کے بہت سارے ممالک بڑی طاقتوں سے نئی نئی آزاد ہوئے تھے اپنی غیر جانب داری کی پالیسی پر عمل کرنا چاہتے تھے ایسے میں ان سب ممالک کا یہ اشتراک پلان کے تصور کی درستی و راستی کی ایک واضح علامت ہے۔ اس کی پشت پر دوستی اور خیرسگالی کا جذبہ کارفرما تھا۔ اس میں کسی قسم کے دباؤ یا کھینچ تان کو روا نہ رکھا گیا تھا۔

کولمبو پلان کا کوئی مافوق قومی حاکم نہیں۔ سچ پوچھئے تو صحیح معنوں میں یہ پلان بھی نہیں۔ یہ اپنے ایشیائی ممبروں کے قومی منصوبوں کا مجموعہ ہے۔ کوئی ملک اپنے حالات کی روشنی میں اپنی ضرورتوں اور نشانوں کا تعین کیسے کرتا ہے یہ اس میں قطعی مخل نہیں ہوتا۔ نہ کوئی پابندی عائد کی جاتی ہے نہ جانچ اور معائنہ ہوتا ہے۔ اور نہ حساب ہی طلب کیا جاتا ہے۔ اس کے جلسوں میں ممبر ملکوں کی منصوبہ بندی یا اقتصادی ترقی کے بارے میں کوئی فیصلے صادر نہیں کئے جاتے بس ایسی فضا پیدا کی جاتی ہے جس میں کوئی ملک کسی ایک یا زیادہ ملکوں سے اپنی ضرورتوں کے مطابق امداد کا طالب ہوتا ہے۔ یہ تنظیم ایسی فضا اور متعلقہ عناصر کو سازگار بنانے میں ہاتھ بٹاتی ہے۔ یہ مقصد دوستی، غیر رسمی بات چیت اور رابطے کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک بات اور بھی توجہ چاہتی ہے۔ وہ یہ کہ بیرونی امداد اگرچہ اہم ہوتی ہے، لیکن وہ ایک ملک کے ترقیاتی اخراجات کے محض ایک حصے کو پورا کر پاتی ہے۔ یہ ترقیاتی اخراجات بڑے کثیر ہوتے ہیں یہ مختلف ملکوں میں مختلف ہوتے ہیں۔ بیرونی امداد محض تکملہ ہوتی ہے ترقیاتی اخراجات کا بڑا حصہ تو قومی حکومتوں کو ادا کرنا ہوتا ہے۔

اس سے پہلے کہ کولمبو پلان کے دائرہ کار اور تنظیمی امور کا جائزہ لیا جائے۔ اس کی ابتدا کے بارے میں کچھ باتیں بتا دینا مفید ہوگا۔ اس پلان کی تشکیل کا خیال دولت مشترکہ کے وزراء خارجہ کی کانفرنس میں پیدا ہوا تھا۔ یہ کانفرنس جنوری ۱۹۵۰ء میں کولمبو میں ہوئی تھی۔ اس میں شریک وزراء خارجہ میں ایک سمجھوتہ ہوا جس کے مطابق بعد کو سڈنی (آسٹریلیا) میں اور اسی برس لندن میں ہوئی میٹنگ میں، ایک مشاورتی کمیٹی بنائی گئی۔ تکنیکی امداد باہمی پہلی بار اس پلان کے تحت مارچ ۱۹۵۰ء میں دی گئی۔ اور جولائی ۱۹۵۱ء میں جب پلان پر پوری طرح عمل ہونے لگا تو شرط یہ ہے امداد کی جانے لگی اور قومی ترقیاتی منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا جانے لگا۔

دھیرے دھیرے لوگوں کا پلان میں اعتماد بڑھا۔ اس کی امکانی صلاحیتوں کا ادراک پیدا ہوا۔ اس کے ممبروں کی تعداد بڑھی۔ نہ صرف اس خطے کے مزید ملک اس کے ممبر بنے، بلکہ خطے سے باہر کے ممالک نے زیادہ تعداد میں اس کی ممبری قبول کی۔ ۱۹۵۰ء میں دولت مشترکہ کے کل سات ممالک اس کے ممبر تھے، آج اس کے ممبروں کی تعداد ۲۴ ہے۔ ان میں ۱۶ ملک ایسے ہیں جو دولت مشترکہ سے متعلق نہیں۔ اب یہ پلان جنوب اور جنوب مشرقی ایشیا کی حدود کا پابند نہیں ہے۔ اب یہ مغرب میں ایران سے لے کر مشرق میں فلپائن تک اور شمال میں جمہوریہ کوریا سے لے کر جنوب میں انڈونیشیا تک کے علاقے کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اس خطے کی آبادی ۱۱۶۹۹ لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی ذکر کیا، ۲۴ ملک کولمبو پلان کے ممبر ہیں۔ یہ ملک ہیں:

خطے میں: افغانستان، بھوٹان، برما، سیلون، بھارت، انڈونیشیا ایران، کمیر جمہوریہ، جمہوریہ کوریا، لاؤس، ملائشیا، جمہوریہ مال دیویز، نیپال پاکستان، فلپائن، سنگاپور، تھائی لینڈ اور جمہوریہ ویٹ نام۔

خطے سے باہر: آسٹریلیا، برطانیہ، کینیڈا، جاپان، نیوزی لینڈ اور امریکہ۔

اب کچھ باتیں کولمبو پلان کے دائرہ کار کے بارے میں۔ اس سلسلے میں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ کولمبو پلان کا امدادی پروگرام سماجی اقتصادی ترقی کے سبھی شعبوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ یہ امدادی پروگرام امداد باہمی سے عبارت ہے یہی وجہ ہے کہ ہر ملک اپنی صلاحیت، ترقی کی حالت اور مالی وسیلوں کے مطابق دوسرے ملکوں کی مدد کرتا ہے۔ اس پلان کے تحت امداد سرمائے کی صورت میں دی جاتی ہے اور تکنیکی تعاون کی صورت میں بھی۔ جن ملکوں نے ان دونوں صورتوں میں پلان کے ممبر ممالک کو مدد دی ہے، ان میں، آسٹریلیا، برطانیہ، کینیڈا، جاپان، نیوزی لینڈ اور امریکہ شامل ہیں۔ اس خطے کے جن ملکوں نے ایک سے زیادہ ملکوں کو تکنیکی امداد دی، ان میں برما، سیلون، بھارت، انڈونیشیا، جمہوریہ کوریا، ملائشیا، پاکستان، فلپائن، سنگاپور اور تھائی لینڈ شامل ہیں۔

تنظیمی طور پر کولمبو پلان اپنے تین اداروں کے ذریعے خدمات انجام دیتا ہے۔ پہلا ادارہ مشاورتی مجلس ہے۔ پالیسی وضع کرنے والی یہ اعلیٰ جماعت ممبر حکومتوں کے وزیروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس مجلس کی میٹنگ ہر برس کسی ممبر ملک کی راجدھانی میں ہوتی ہے۔ اس مجلس کا کام اس خطے کی ترقی کا جائزہ لینا، خصوصیت کا اندازہ کرنا، نیز اس بات کا تعین کرنا ہے کہ سرمایہ و تکنیکی معاونت کی صورت میں دستیاب بین الاقوامی تعاون سے قومی وسیلوں میں موجودگی کو کیسے مدد کیا اور ترقی کی رفتار کو بڑھایا جا سکتا ہے۔

دوسرا ادارہ کولمبو پلان کونسل ہے۔ یہ تکنیکی امداد باہمی سے متعلق ہے اس

کی باقاعدہ میٹنگیں کولمبو میں ہوتی ہیں۔ یہ کونسل کولمبو پلان ممالک کے نمائندوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ کونسل سرمایہ کی صورت میں دی جانے والی امداد کے سوال سے کوئی بحث نہیں کرتی۔ اس کا کام صرف اس خطے میں تکنیکی امداد کو بڑھاوا دینا اور مربوط بنانا ہے۔

تیسرا ادارہ کولمبو پلان بیورو ہے۔ پانچ فرائض کی ادائیگی اس بیورو کے ذمہ ہے۔ یہ مشاورتی مجلس کی میٹنگوں میں شرکت کرتا ہے۔ کونسل کی خدمت انجام دیتا ہے۔ اس خطے میں دی جانے والی ساری تکنیکی امداد کا حساب رکھتا ہے۔ تربیت کے بین علاقائی پروگرام بناتا ہے اور پلان کے بارے میں معلومات فراہم کرتا ہے۔

اس پلان کی میعادِ کار ابتداً چھ برس تھی بعد میں اسے بڑھا دیا گیا اور یہ ۶۱-۱۹۵۷ء، ۶۶-۱۹۶۱ء، ۷۱-۱۹۶۶ء اور ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۶ء کر دی گئی مزید توسیع کا مسئلہ ۱۹۷۴ء میں زیرِ غور آئے گا۔

یہ امداد ایک سرکار دوسری سرکار کو دیتی ہے۔ غیر سرکاری ادارے بھی امداد پا سکتے ہیں لیکن انہیں امداد کے لئے درخواست اپنی حکومت کی وساطت سے کرنا ہوتی ہے۔ یہ امداد دو صورتوں میں دی جاتی ہے۔

قومی ترقیاتی پروجیکٹوں، اشیا بشمول اناج کیمیاوی کھادوں، عام استعمال کی چیزوں، خاص آلات بشمول مشینوں، کھیتی اور لیبارٹری کے سامان، موٹر گاڑیوں وغیرہ کے لئے عطیوں یا قرضوں کی صورت میں مالی امداد۔ دوسری صورت تکنیکی امداد باہمی کی ہے۔ یہ امداد ماہرین اور ٹیکنیشنوں کی خدمات، بیرونی ملکوں میں مختلف میدانوں میں، اعلیٰ ٹیکنالوجی کے مطالعے کی سہولیات، تربیت، تحقیق اور بین علاقائی تربیت کے لئے درکار خاص ساز و سامان کی فراہمی کے ذریعے بہم پہنچائی جاتی ہے۔

مختلف صورتوں میں دی جانے والی امداد سے صاف ظاہر ہے کہ کولمبو پلان ممبر ملکوں کی سماجی، اقتصادی زندگی کے سبھی شعبوں کو ترقی دینا چاہتا ہے۔ کولمبو پلان کی بدولت جنوب اور جنوب مشرقی ایشیائی ملکوں نے زراعت کے شعبے میں سبز انقلاب کی صورت میں جو نمایاں کامیابی حاصل کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اسی طرح کولمبو پلان، ممبر ملکوں کی مجموعی ترقی کے پیشِ نظر صنعتوں کی ترقی، انسانی فلاح، تعلیم، صحت، نقل و حمل، رسل و رسائل، پانی و بجلی کی بہم رسانی اور شکتی کے صحیح صحیح استعمال کو اپنا مطمحِ نظر بنائے ہوئے ہے۔ اس سلسلے میں دو امور خاص توجہ چاہتے ہیں۔ اول، تربیت ہے۔ زراعتی اور صنعتی پیداوار بڑھانے اور دوسرے شعبوں میں ہونے والی ترقیوں کے ہم دوش رہنے کے لئے کارکنوں کا جدید ترین فنون اور فن کے جدید ترین طریقوں کا ماہر ہونا ضروری ہے۔ یہ امر تربیت کے بغیر ممکن نہیں۔ کولمبو پلان کے ممبر ممالک اپنے کارکنوں کو دوسرے ملکوں میں بھیج کر اور تربیت کے مشترکہ مراکز میں بھیج کر سہولیات سے خوب خوب استفادہ کرتے ہیں۔ گزشتہ ۱۹ برسوں میں ۵۶۱۸ افراد کو تربیتی سہولتیں خطے کے اندر ہی مہیا کی گئیں۔ یہ کولمبو پلان کے تحت تربیتی پروگرام کے نشانے کا ۶ء۸۰ فی صد ہے۔

جن ملکوں نے سب سے زیادہ افراد کو تربیتی سہولتیں مہیا کیں ان میں بھارت کا نام سرِ فہرست ہے۔ ایسے دوسرے ملکوں میں کوریا، سنگاپور، پاکستان، ملائشیا، سیلون اور فلپائن شامل ہیں۔ کولمبو پلان کے تحت، ممبر ملکوں کے افراد کو خطے سے باہر کے کسی ملک میں بھی تربیت حاصل کرنے کی سہولتیں مہیا کی جاتی ہیں۔

ان ترقیاتی پروگراموں سے جڑا ہوا ایک خاص مسئلہ آبادی کا ہے۔ اس خطے کی اب آبادی ۱۱۶۱۹ لاکھ ہے شرحِ پیدائش ۵ء۲ فی صد سالانہ ہے۔ اس تیز رفتار شرحِ پیدائش سے ۲۸ برس کے عرصے میں اس خطے کی آبادی دوگنی ہو جائے گی۔ ایسے میں ظاہر ہے آبادی میں اضافے کی روک تھام کے بغیر تمام ترقیاتی پروجیکٹ اگر سرے چڑھ بھی گئے تو بھی مفید ثابت نہ ہوں گے۔ اسی امر کے پیشِ نظر کولمبو پلان کے ممبر ممالک خاندانی منصوبہ بندی کی پالیسی پر بڑی شدت سے عمل کر رہے ہیں۔ اس کام میں کولمبو پلان بھی موثر ڈھنگ سے ہاتھ بٹا رہا ہے۔

اس سے پہلے کہ اس پلان کے آغاز سے مختلف ممالک کی جانب سے دی گئی امداد کا ذکر کیا جائے، ایک نظر ان تعمیری اور ترقیاتی کاموں پر ڈالنی مناسب اور مفید مطلب ہوگی، جو گزشتہ عرصے میں کولمبو پلان کے ممبر ممالک میں ہوئے ہیں۔ آیئے شروعات بھارت سے کریں۔ مغربی بنگال میں درگاپور کے مقام پر بنا فولاد کا کارخانہ کولمبو پلان کی کامیابی کا منہ بولتا نمونہ ہے اس کارخانے کے لگ بھگ دو سو انجینئروں اور ٹیکنیشنوں نے برطانیہ میں تربیت پائی تھی۔ اس کارخانے کے لئے آسٹریلیا اور امریکہ نے بھی امداد دی تھی۔ ریاست مدراس کا سب سے بڑا الیٹن کنڈہ پن بجلی پروجیکٹ، ہیراکڈ باندھ، ہاپڑ میں بنا جدید ڈھنگ کا اناج گودام وغیرہ کولمبو پلان کی کامیاب کارکردگی کی علامتیں ہیں۔ اسی طرح پاکستان کا وارسک پن بجلی پروجیکٹ، گنگا کوبدک پروجیکٹ، ٹھٹہ ریڈیو سٹیشن، ہزارہ پک سیمنٹ فیکٹری، تھائی لینڈ کی ایسٹ ویسٹ شاہراہ، انڈونیشیا میں ... کے مقام پر بنی ہوابازی کی اکادمی، نیپال میں بیرگنج کے مقام پر تلاوا بیرنا ... سیلون میں گل اویا ریزروائر، کیسل بیگ باندھ، ملایا کا لائنگ کیسل باندھ

برقی اسٹیشن، غلپاتن میں سوتی کپڑے کا کارخانہ اس کی صرف چند مثالیں ہیں۔

ٹیکنیکل امداد کے تحت ہر ملک نے ایک دوسرے کو جو ساز و سامان دیا اور ماہرین کی خدمات مہیا کیں، اس سے بھی ان ملکوں کی مجموعی ترقی میں اضافہ ہوا ہے مثلاً کینیڈا نے بھارت کو کینسر کے علاج کے لئے تھیراٹرون مہیا کیا۔ برطانیہ اور امریکہ نے نیویلی تھنا پنٹ پروجیکٹ کے لئے ساز و سامان دیا۔ آسٹریلیا نے سیلون کو ایکس رے کا سامان، برطانیہ نے لاوس کو گشتی طبی دواخانہ، برطانیہ اور آسٹریلیا نے غلپاتن یونی ورسٹی کو کتابیں، برطانیہ نے نیپال کو ڈیزل انجن، امریکہ نے ایشیاؤں کی نیکلاؤ آف میڈیسن کو خوردبینیں مہیا کیں۔ اس ضمن میں ایسی ہی اور بھی بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

آئیے اب ایک نظر اس امداد پر ڈالیں جو کولمبو پلان کے مختلف ممبروں نے اس خطے کی مجموعی ترقی کے لئے دی۔

کولمبو پلان کے آغاز سے اب تک ۳۰۰ کھرب امریکی ڈالر کی امداد دی جا چکی ہے۔ اس میں ٹکنیکل امداد، سرمایہ کی امداد اور اشیاء وغیرہ شامل ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں ۳۴ کھرب امریکی ڈالر کی امداد دی گئی تھی جن ملکوں نے امداد کا ایک بڑا حصہ ادا کیا۔ وہ حسب ذیل ہیں۔

آسٹریلیا۔ ۲۰۳۱ لاکھ آسٹریلیائی ڈالر — ۱۹۶۹ء میں اخراجات ۲۲۴ لاکھ آسٹریلیائی ڈالر، برطانیہ: پلان کے آغاز سے ۱۹۶۹ء کے آخر تک اخراجات: ۱۷۶۷۰ لاکھ امریکی ڈالر؛ ۱۹۶۹ء میں اخراجات ۱۳۲۲ء۷ لاکھ امریکی ڈالر، کینیڈا: کل اخراجات ۹۱۹۰ لاکھ امریکی ڈالر؛ ۱۹۶۹ء میں دی گئی امداد ۱۳۴۶ء۷ لاکھ امریکی ڈالر؛ جاپان: ۱۹۶۹ء کے آخر تک کے اخراجات: ۲۴۸۵۱ لاکھ امریکی ڈالر؛ ۱۹۶۹ء میں اخراجات ۷۲۹۰ لاکھ امریکی ڈالر؛ نیوزی لینڈ: پلان کے آغاز سے اخراجات ۳۷۰ لاکھ نیوزی لینڈ ڈالر۔ حسب معمول سب سے زیادہ امداد امریکہ نے دی ہے۔ ۱۹۷۰ء کے آخر تک امریکی امداد کی کل مالیت ۲۵۱۳۰۰ لاکھ ڈالر تھی۔ ۱۹۷۰ء میں اس کا خرچ ۷۰۰۰ لاکھ ڈالر رہا۔

کولمبو پلان کے علاقائی ممبروں میں سب سے زیادہ امداد بھارت نے دی ہے۔ اس ضمن میں اس کا نام حسب سابق سر فہرست ہے۔ پلان کے آغاز سے جون ۱۹۶۹ء تک بھارت نے اس خطے کے ممبروں کو ۳۴۶ لاکھ روپے کی ٹکنیکل امداد دی۔ اس رقم میں سے ۱۴۱ لاکھ روپے تربیت پانے والوں پر ۲۰۵ لاکھ روپے بھارتی ماہرین کی خدمات فراہم کرنے پر (نیپال کو چھوڑ کر) اور ۱۳۰ لاکھ روپے کی مالیت کے آلات و دیگر ساز و سامان کے عطیات پیش کئے گئے۔

کولمبو پلان کے آغاز سے بھارت میں پلان کے ممبر ملکوں کے ۱۷۲۴ افراد کو تربیت دی گئی۔ نیز ۱۵ بھارتی ماہرین کی خدمات مہیا کی گئیں۔ بھارت میکونگ پروجیکٹ میں بھی امداد دے رہا ہے۔

اپنے دو پڑوسی ملکوں نیپال اور بھوٹان کو بھارت نے جو امداد دی اسے خاص طور پر سراہا جاتا ہے۔ مثلاً نیپال کو لیجئے۔ مارچ ۱۹۶۹ء تک بھارت نے نیپال کو ۵۰۷ء۲ لاکھ روپے کی امداد دی تھی۔ اس میں ۱۱۰۰ لاکھ روپے کی وہ امداد بھی شامل ہے جو نیپال کو ۱۹۶۸-۶۹ء (اپریل-مارچ) میں دی گئی تھی۔ نیپال نے اس بھارتی امداد سے نیپال میں سڑکیں اور پل تعمیر کرائے ہیں۔ نیز بجلی و سینچائی کی سہولتوں کو بہتر بنایا ہے۔

اسی طرح بھارت سرکار نے بھوٹان کے دوسرے و تیسرے پانچ سالہ منصوبوں کے لئے ۲۴۷ لاکھ روپے کی امداد دی۔ دوسرے پلان کے لئے مدد دینے کے علاوہ بھارت سرکار نے بھوٹان کو سڑکیں بنانے، رسل و رسائل کی سہولتیں مہیا کرنے، ملیریا کی بیخ کنی وغیرہ کے لئے بھی امداد دی ہے۔ نیز بھوٹانی طلبا کو بھارت میں تعلیم پانے کے لئے وظائف بھی دیئے ہیں۔

آج کی ہر لحظہ سکڑتی ہوئی دنیا میں حب بقا اور ارتقاء کا معاملہ کسی ایک ملک یا قوم کا مسئلہ نہیں، دنیا کی تمام اقوام اور تمام ملکوں کا مسئلہ بن گیا ہے ایسے میں کولمبو پلان جیسی تنظیمیں ایک محفوظ مستقبل کی بصیرت اور بشارت دیتی ہیں۔

غزل

دل میں جھانکا تو تمنا کا خرابہ نکلا
میں جسے شہر سمجھتا تھا وہ صحرا نکلا

لوگ ہمراہ لئے پھرتے ہیں یادوں کے ہجوم
ڈھونڈنے پر بھی کوئی شخص نہ تنہا نکلا

مجھ سے پوچھو کہ سمندر کی حقیقت کیا ہے
اس کی وسعت کو سمیٹا ہے تو قطرا نکلا

تیری آنکھوں میں کوئی عکس تھا مبہم مبہم
غور سے دیکھا تو وہ میرا ہی چہرا نکلا

تم کو دیکھا تو کہا دل نے کہ دیکھا ہے کہیں
اور سوچا تو کسی یاد کا رشتہ نکلا

خشت دیوار (شعری مجموعہ) مصنف: زبیر رضوی

زبیر رضوی کا یہ دوسرا شعری مجموعہ اُن کے ادبی سفر میں ایک ارتقائی مرحلے کا آئینہ دار ہے۔ اس مرحلے میں روایت اور رومان کی دھند ایک حد تک چھٹی ہے نیز موجبہ غالب رجحانات کو اختیار کرنے کی خارجی خواہش اور کوشش قریب قریب مفقود ہوئی ہے۔ یہ تبدیلی زبیر صاحب کی غزلوں میں کم اور نظموں میں زیادہ نمایاں ہے۔

زبیر رضوی کی نظمیں دیہی ماضی اور شہری حال کی کشاکش، شہری طریقۂ زندگی ماحول میں موجود متضاد، معاون اور مخالف عناصر کے درمیان تطابقت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے شخص کی تصویریں ہیں۔ یہ مرقع ہیں بدلے ہوئے حالات میں، بدلے ہوئے رویوں کے۔ ان سے دیہی ذہن کی سادگی اور شہری انداز و اطوار کی پرکاری آئینہ ہے۔ یہ دونوں بذاتِ خود ان کا مقصود یا منتہا نہیں۔ ان کا مقصود اور منتہا دیہی ذہن کی سادگی میں موجود پرکاری اور شہری انداز و اطوار کی پرکاری میں موجود سادگی ہے۔ بے وجود اور ممیز کو ممکن اور گوارا بنانے والی رومانی خوش فہمی بھی اُن کے ایسے ہی رویے کا پتہ دیتی ہے لیکن زبیر صاحب کی نظموں میں یہ دیہی خصوصیت کوئی اوڑھی ہوئی شے معلوم نہیں ہوتی اور پھر انہوں نے محض اسی کو اپنا شیوۂ گفتار بھی نہیں بنایا۔ وجہ یہ کہ ماضی اور حال سے اُن کا تعلق محض جذباتی نہیں۔ وہ ایک ہوش مندی کا حامل ہے۔ ان کے نزدیک ماضی کے اقدار نہ تمام تر صالح ہیں اور نہ حال تمام تر سنہرا اور سازگار۔ اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لئے زبیر صاحب نے رویوں اور کیفیتوں کے تضاد کو سخن کا وسیلہ بنایا ہے۔ ان کا یہ انداز اپنے اندر بالواسطہ طنز کی ایک دودھاری کیفیت رکھتا ہے۔ اُن کا طنز غیر محسوس ہے اور چونکہ یہ مقصود بالذات نہیں، اس لئے لطیف اور موثر ہے۔

زبیر صاحب کی نظموں میں خیال کی رَو یعنی فطری لیکن کسی قدر بے ربطی کے ساتھ سوچتے ہوئے شخص کی خودکلامی و ہم کلامی کا بالواسطہ انداز پایا جاتا ہے۔ اس سے اُن کی نظموں میں ایک ڈرامائی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ اس سے ان کی نظموں کی اثر انگیزی بڑھی ہے۔ اس اثر انگیزی میں اضافے کا ایک دوسرا سبب اُن کی نظموں میں پائی جانے والی محسوس اور غیر محسوس استفہامیہ کیفیت ہے۔ یہی کیفیات ایک اعتدال۔ خودی اور خودسری کے ایک گوارا امتزاج کا پتہ دیتی ہیں جو ادھر زبیر صاحب کے شعری کردار اور رویے میں پیدا ہو چلا ہے۔ اسی اعتدال کی بدولت وہ حالات سے فرار نہیں چاہتے۔ یہ بات الگ کہ وہ حالات سے مجارت کی سکت نہیں رکھتے۔ ہاں اس کی خواہش اُن کے یہاں البتہ موجود ہے۔ یہی اعتدال ہے جو جاننے اور

چاہے جھنے کی کامیاب خواہش کو بھی تکمیل کا سزاوار نہیں ہونے دیتا کہ اس کے
نزدیک اپنی ہی نہیں اوروں کی خوشی بھی مقدم ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں
تعلقات میں سرمستی و سرشاری نہیں ایک محرومی ہے جو کہ ایک عجیب احساس
کو جنم دیتی ہے۔ یہ محرومی اطوار میں شائستگی، اور حالات اور عوامل سے بہرحال مطابقت
بنائے رکھنے کی کوشش کا نتیجہ ہے۔

خشت دیوار میں علاوہ نظموں کے غزلیں بھی شامل ہیں۔ لب و لہجہ،
بالواسطہ اسلوب الفاظوں کے پرتکلف استعمال، ترکیبوں، تشبیہوں، علامتوں اور
استعاروں کے اعتبار سے زبیر صاحب کی غزل، غزل کی روایت سے زیادہ قریب
ہے لیکن جہاں جہاں وہ روایت سے پہلو بچا پائے ہیں وہاں وہاں انہوں
نے اچھے اور نئے شعر تخلیق کئے ہیں۔ ایسے اشعار میں محسوسات کا نیا پن خاص
طور سے متوجہ کرتا ہے۔ جو خصوصیات اور کیفیات زبیر صاحب کی نظموں میں
پائی جاتی ہیں ان کے عکس اور نقش زبیر صاحب کی غزلوں میں بھی دیکھے جا سکتے
ہیں لیکن ان کی غزلیں بحیثیت مجموعی روایتی ہیں، تاہم ان کے بدلتے ہوئے [illegible]
کا پتہ دیتی ہیں

[illegible] کے ۸۸ صفحات پر مشتمل یہ مجموعہ مکتبہ صبا، عیدگاہ، معظم جاہی مارکیٹ
حیدرآباد نے سلیقے سے شائع کیا ہے۔ قیمت چار روپے ہے۔

اکائی (شعری مجموعہ) مصنف :- بشیر بدر

جدید نظم کی عام مقبولیت کے اس دور میں بشیر بدر کی غزلوں کا پہلا مجموعہ اکائی فوراً
اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ محض اس لئے نہیں کہ یہ مجموعہ غزلیات کا ہے بلکہ اس لئے بھی کہ بشیر
بدر ہمارے اُن معدودے چند شعراء میں سے ہیں جنہوں نے اُردو غزل کو جدید حس سے
روشناس کرایا اور اُسے ایک نیا رنگ و آہنگ دینے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔

آج اُردو غزل کا شاعر نظم اور نئی نظم کے شاعر سے اپنے موضوعات، فکری
ماحول کارفرما رجحانات کے اظہار کے اعتبار سے مختلف نہیں ہے اور اس امر کی
بڑی اچھی مثال بشیر بدر کی غزلیں ہیں۔ بشیر بدر کی غزلیں ایک سوچتے ہوئے ذہن کی
تخلیق ہیں یہی وجہ ہے کہ اُن کے اشعار میں ہمیں استفہام اور استعجاب کی ایک
محسوس اور اکثر اوقات ایک غیر محسوس کیفیت ملتی ہے جو اپنے اندر طنز کا ایک
عجیب لطف رکھتی ہے۔

موجودہ مشینی دور کی تیز رفتاری اس کے ردِ عمل میں پیدا ہوا [illegible] کے
تضادات، لاتعلقی، بے حسی، تنہائی، بچی اور علمی مسئلوں چھوٹی بڑی خوشیوں خواب

[illegible]

ناک خواہشوں اور ان سے متصادم تلخ حقیقتوں کا بڑا موثر اظہار ہمیں بشیر بدر کے ہاں
ملتا ہے۔ اُن کی غزلوں میں سانس لینے والا ہمارے معاشرے کا فرد نہ یکسر
ذہن ہے اور نہ سراسر جذبات۔ حالات کے نرم گرم نے اُسے سرد پختہ کار بنا دیا ہے۔
وہ مایوسی میں منہ نہیں بسورتا اور خوشی میں جامے سے باہر نہیں ہوتا۔ اعتدال اُس
کا خاصا اور خوبی ہے اور ایسے ہی اعتدال میں لایا ہوا شدتِ احساس بشیر بدر کی
غزلوں کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ بشیر بدر کی غزلوں کی ایک دوسری خصوصیت
اُن کا کلاسیکی رچاؤ، صدور شائستہ اور غنائی لب و لہجہ ہے۔ اُن کی غزلوں کی
زبان، تشبیہیں، علامتیں اور استعارے یکسر نئے نہیں۔ تاہم یہ پُرانے بھی نہیں
اُن کے انداز نظر، مشاہدات اور محسوسات نے کلاسیکی رچاؤ، لب و لہجہ کی شائستگی
اور غنائیت کے ساتھ اظہار کے جو پیرائے اختیار کئے ہیں، وہ شاعر کی جدید
حس کی بدولت فی الواقع ایک دوسرے کی توسیع کا باعث بنے ہیں اور اس
تنگنائے کے نئے امکانات کا پتہ دیتے ہیں۔ بشیر بدر کی غزلوں میں یہ امر متوجہ
ہی نہیں کرتا چونکاتا بھی ہے۔

بشیر بدر اشیاء اور عوامل پر نظر کرنے کا ایک اپنا انداز رکھتے ہیں۔ ان کی شاعری
کی نمایاں خصوصیت نفسیاتی پس منظر کے ساتھ جدید ذہن، محسوسات کا نیا پن
اور مشاہدے کی ندرت ہے اور یہی وہ خصوصیت ہے جو اُن کی انفرادیت کو
نمایاں کرتی اور اُنہیں منفرد بناتی ہے۔ بشیر بدر کی غزلوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے
کہ انہوں نے لفظوں کو محض لفظ سمجھ کر نہیں بلکہ اظہار کا وسیلہ سمجھ کر برتا ہے
اور یہی وجہ ہے کہ اُن کی غزلوں کے بیشتر اچھے اشعار نظم جیسی تفصیل نہ رکھتے ہوئے
بھی نظم جیسی رمزیت، وسعت اور معنویت رکھتے ہیں۔

اکائی میں ہمیں بعض غزلیں ایسی بھی ملتی ہیں جو پہلی نظر میں سطحی جدیدیت کی
مثال دکھائی دیتی ہیں۔ اس کا احساس ہمیں اشعار میں موجود بے حد مانوس علامتوں
اور اُن کے اظہار کے لئے استعمال کئے گئے کسی قدر نامانوس لفظوں سے ہوتا
ہے یہاں ہمیں ایک بات اور بھی متوجہ کرتی ہے۔ وہ یہ کہ نئی شاعری کے ایک نام
نہاد لوازمہ یعنی کھردرے لب و لہجے کو بشیر بدر نے عیب ہی جانا ہے ہنر نہیں سمجھا
تاہم ان غزلوں کی نوعیت مختلف ہے۔ یہ کسی فیشن یا تقلید میں نہیں کہی گئیں۔ یہ
آج کی بدلتی ہوئی قدروں اور رویوں کے تئیں شاعر کے ردِ عمل کا کہیں سادہ اور
کہیں پیچیدہ اظہار ہیں۔ اُن کی پشت پر جو تخلیقی ذہن کارفرما ہے وہ تجریدی مصوری
کے نقاش کی طرح حقیقتوں کو نہیں خصوصیتوں کو پیشِ نظر رکھے اور مقدم سمجھے ہوئے
ہے۔ ایسے میں ظاہر ہے معانی اور معنویت کا قدرے اُلجھا ہونا لازمی ہے۔ تاہم
بشیر بدر کی اس نوع کی غزلوں میں ایسا ابہام نہیں جو افکار کو فلسفہ اور اشعار کو

چیستاں بنا دے۔ ان کی ایسی غزلوں کے اچھے اشعار اپنے اندر ایک گہری معنوی صفت اور معنی کی توسیع کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ایسی غزلیں بشیر بدر کے بدلتے ہوئے شعری رویوں کا البتہ پتہ دیتی ہیں۔ گو ایسی غزلوں کی نوعیت تجرباتی ہے۔ تاہم بشیر بدر جیسے کلاسیکی رچاؤ، نیا ذہن اور جدید حس رکھنے والے شاعر سے ایسے تجربوں اور مستقبل میں مزید بہتر غزل کی توقع کچھ بے جا نہ ہوگی۔

مختصراً اکائی ہماری غزلیہ شاعری میں ایک اچھا اضافہ ہے۔

سائز ۱۸ × ۲۲۔ صفحات: ۱۱۲، قیمت: ۴ روپے

ملنے کا پتہ: اکادیمی اینڈ یونیورسٹی بک اسٹال، بڑا بازار — علی گڑھ۔ یوپی

لفظوں کا پل (شعری مجموعہ) مصنفہ: ندا فاضلی

۱۹۶۰ء کے بعد کے نمایاں شاعروں میں ندا فاضلی اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ اُن کی شاعری کا رنگ آہنگ انفرادی اور انداز تمثیلی ہے۔ یہ اشیاء کو ذی جان اور گویا بنانے اور خصوصیات کو شخص کرنے سے عبارت ہے۔ اس میں اُن کا اثر انگیز لب و لہجہ بہت معاون ثابت ہوا ہے جو اُن کی نظموں میں سانس لینے والی فضا کی طرح سادہ، بے تصنع اور نیا نیا ہے۔

ندا فاضلی اپنے مختصر سے دیباچے میں لکھتے ہیں: — "لیکن اس کے بعد نہ جانے کیا ہوا — جو ہاتھ میں لے، جو سر جھکائے واپس آیا تھا وہ میں نہیں تھا۔ کوئی اور تھا مجھ جیسا ہی۔ وہ بالکل اکیلا تھا، اس کا نہ کوئی گھر تھا، نہ شہر تھا اور نہ رشتے دار تھے۔ کاغذ پر نہ جانے لکیریں کب بدل گئی تھیں۔ وہ اکیلا آدمی آج بھی اسی طرح اکیلا اکیلا بھٹک رہا ہے۔ رات کے بھیانک اندھیروں میں، جس گھر کو اس سے چھین لیا گیا تھا، اُسے وہ آج تک ڈھونڈ رہا ہے۔۔۔"

غالباً یہ گھر کے لئے اُن کی شدید کسک کا نتیجہ ہے کہ اُن کے مشاہدات کا مرکز و محور بیشتر گھر آنگن، اس کے متعلقات، گھر گرہستی کے رشتے ناتے، باپ بچے، ماں بیٹے، بہن بھائی کے تعلقات ہیں، اور اسی مناسبت سے انہوں نے اپنے محسوسات چھوٹی بڑی خواہشوں اور خوشیوں، چھوٹے بڑے واقعات، شیریں، تلخ یادوں اور صورتِ حال میں موجود کیفیات کے اظہار کے لئے گھر آنگن اور اس کے متعلقات کو ہی وسیلہ بنایا ہے۔ ندا نے اپنی نظموں کی خالق وہی فضا ہوتی ہے جو برتنوں، شیشے کے گلے، چہکے، چاپائی کے بان، صحن میں بچی بچھا، زمین کی چھت، نالی کے کنارے، منال، چک، آنگن کے جامن، کجالی اور دن میں بنی کلائی، چوکا باسن، کرنے، چکی، پیپے، چوپال، نیم، برگد، پیپل جیسے عام اور بظاہر معمولی مظاہر اور عوامل سے مرتب کی ہے۔ ندا نے ان عوامل اور مظاہر کو ایک شاعر کی طرح برتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے بنائے ہوئے نقش زندہ اور ٹھیٹھ دل کش دکھائی پڑتے ہیں۔ صرف یہی نہیں کہ ندا نے رویوں میں تبدیلی، اقدار کی فرسودگی، ماضی سے روابط کے انہدام، شہری طرزِ زندگی، حالات کی ستم ظریفیوں اور اُن میں مضمر طنز کے اظہار کے لئے بھی، بنیادی طور پر انہیں وسیلوں سے کام لیا ہے۔ جس کش مکش اور کرب کا اظہار ندا کی نظموں میں ہوا ہے، وہ ہمارے معاشرے کے عام انسان کا حصہ ہے۔ یہ اظہار ایک حد تک بے تعلق سا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس میں چبھن تو پاتے ہیں، کاٹ کی کیفیت محسوس نہیں کرتے، اور غالباً یہ نتیجہ ہے، آج کے مشینی دور کی تیز روی سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش میں رکنے اور سوچنے کے مواقع نہ ملنے کا۔

ندا فاضلی کی شاعری بنیادی طور پر اسلوب کی شاعری ہے۔ اُن کا اسلوب بڑا دل کش ہے۔ وہ نظموں سے چھوٹی چھوٹی تصویریں بنانے اور مختلف چھوٹی چھوٹی تصویروں کو مربوط کر کے ایک بڑی تصویر مکمل کرنے کا فن خوب جانتے ہیں۔ "بھور"، "سردی"، "چھوٹے شہر کی رات"، "ایک دن"، "سحر" اور "شام" جیسی نظمیں اس کی اچھی مثالیں ہیں۔

ندا فاضلی نے اپنی نظموں میں جہاں گھر آنگن، اس کے متعلقات، گھر گرہستی کے رشتوں اور تعلقات کو موضوع اور سخن کا وسیلہ بنایا ہے، وہاں جنس کو اس دائرے سے باہر نہیں رکھا۔ جنسی جذبے نے اظہار کی جو شائستہ صورتیں ندا کی نظموں میں پائی ہیں وہ فی الواقع انہیں کا حصہ ہیں۔ وہ طبیعت کے اضطراب، اضطراری، فطری مگر بے ربط افعال کو گھر آنگن کے متعلقات یعنی کس کر آٹا گوندھنے، آنگن لیپنے وغیرہ جیسے قریبی وسیلوں سے سادگی اور سچائی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ایسے اضطراری افعال میں جو رمزیت مضمر ہے، وہ کبھی اور اس کی دونوں کا بخوبی احاطہ کرتی اور ایک اپنا لطف رکھتی ہے۔ "دو سہیلیاں"، "دیوار کے پیچھے" جیسی نظمیں اس ضمن میں مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں۔

نظموں کے پل میں نظموں کے علاوہ غزلیں اور گیت بھی شامل ہیں۔ ندا کی غزلیں محسوسات کا نیا پن لئے ہوئے ہیں۔ ان میں بالعموم مزاج کی ایک سی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اس سے اِن کی غزلوں میں نظم کا سا تاثر پیدا ہو گیا ہے۔ جہاں تک گیتوں کا تعلق ہے، ندا ہمارے ان معدودے چند شعراء میں سے ہیں جنہوں نے اس صنف پر خاطر خواہ توجہ کی، اور موضوع کے اعتبار سے اُسے نظم کی سی وسعت دی ہے۔

یہ مجموعہ نیو راسٹرس پبلی کیشنز، بمبئی ۵۰ نے شائع کیا ہے۔ ۲۲ × ۱۸ کے ۱۱۲ صفحات پر مشتمل اس مجموعے کے دام تین روپے پچاس پیسے ہیں۔

"لاہور کا جو ذکر کیا" (آپ بیتی) مصنف: گوپال متل

یہ اُردو کے مشہور شاعر، ادیب اور صحافی گوپال متل صاحب کی آپ بیتی ہے، جسے مکتبہ تحریک، ۲۵ انصاری مارکیٹ دریا گنج، دہلی ۶ نے شائع کیا ہے۔

۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۷ء تک کے عرصے پر محیط یہ آپ بیتی بیسویں صدی کے چوتھے اور بڑی حد تک پانچویں دہے کی ادبی تاریخ ہے لیکن ادبی تاریخ متل صاحب کا براہِ راست یا بالواسطہ مقصد و موضوع نہیں۔ انہوں نے اس عہد کے تمام نقش و نقوش اور عکس اپنی ذات کے آئینے میں دیکھے اور دکھائے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی تاریخ میں عام طور پر جو قباحتیں خشک اور غیر اہم حالات و حقائق کے بے تعلق، بے ربط اور طول طویل بیانات کی صورت میں پائی جاتی ہیں وہ اس آپ بیتی میں کہیں نظر نہیں آتیں۔

متل صاحب کا مطمحِ نظر بغیر معروضی ہے اور چونکہ انہوں نے اپنے آپ کو اپنے زمانی پس منظر سے الگ کر کے نہیں دیکھا اس لئے اس میں جگ بیتی کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ یہ جگ بیتی لاہور کی ہے۔ یہ تذکرہ ہے: لاہور کے ادبی حالات و کوائف کا، صحافتی سرگرمیوں اور مقامی و ملک کی سیاسی کشاکش کا۔ یہ تعارف ہے، لاہور کے اُردو ادیبوں، صحافیوں اور سیاسی کارکنوں کا۔ یہ تنقید اور تجزیہ ہے: ان کے رویوں، روابط، باہمی چپقلشوں اور ستم ظریفیوں کا بیک وقت تعارف، تذکرہ، تجزیہ اور تنقید کی یہ خوبیاں اور خصوصیتیں مطمحِ نظر کی معروضیت اور اندازِ سخن کی بے باکی کی دین ہیں اور یہی وہ اجزاء ہیں جو باہم ہو کر اس کتاب کو اُردو کے بیشتر سوانحی ادب سے میز کرتے ہیں۔

متل صاحب کو زبان و بیان پر جو دسترس حاصل ہے وہ دیدنی ہے۔ ان کا اسلوبِ نگارش، موثر، تازہ و دلکش ہے۔

$\frac{20\times30}{16}$ کے ۱۶۵ صفحات پر مشتمل یہ کتاب صاف ستھری شائع ہوئی ہے۔

مجلد، سرورق گرد پوش، قیمت: ۶ روپے

"کربل کتھا کا لسانی مطالعہ"

مصنفین: ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر خلیق انجم

کربل کتھا کا شمار اُردو کی اولین نثری تصانیف میں ہوتا ہے۔ یہ کمال الدین حسین بن علی واعظ کاشفی کی کتاب روضۃ الشہدا کا آزاد ترجمہ ہے۔ اس ترجمہ کی اہمیت اس اعتبار سے بھی ہے کہ اس کے زمانۂ تصنیف کا صحیح صحیح تعین ہو چکا ہے۔ فضلی نے یہ ترجمہ ۱۷۳۲-۱۷۳۳ء میں کیا اور اس پر نظر ثانی ۱۷۴۸-۱۷۵۰ء میں کی۔ فضلی اپنی معلومات اور اب تک دستیاب معلومات کے مطابق یہ پہلی کتاب ہے جو شمالی ہند میں، فارسی سے اُردو میں ترجمہ ہوئی۔ گو فضلی نے یہ ترجمہ کسی ادبی مقصد سے نہیں بلکہ مذہبی ضرورت سے مجلسوں میں سنانے کے لئے کیا تھا تاہم اُردو کے تاریخی لسانی مطالعے، اُردو نثر کی ابتدا اور اُردو زبان کے ارتقاء کے سلسلے میں اُردو کا یہ قدیم ترین نثری نمونہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

اُردو زبان اپنے صوتیاتی ڈھانچے اور صرف و نحو کے اعتبار سے دہلی کے شمال مشرق میں بولی جانے والی کھڑی بولی کے بہت قریب ہے۔ تاہم دہلی کے نواح میں بولی جانے والی دوسری زبانوں، برج بھاشا، پنجابی اور ہریانی کی بعض خصوصیات بھی اس میں شامل ہو گئی ہیں۔

کربل کتھا کا یہ لسانی مطالعہ اس امر پر اچھی روشنی ڈالتا ہے کہ اس عہد میں بولی جانے والی زبان صوتی، صرفی، نحوی، ذخیرہ الفاظ اور املا کے اعتبار سے آج بولی جانے والی اُردو زبان سے کیسے اور کتنی مختلف تھی۔ نیز اس نے اس تعلق سے، کھڑی بولی، برج بھاشا، پنجابی اور ہریانی کی کن مختلف خصوصیات کو اپنایا یا قبول کیا۔ نیز یہ کہ کون سے عربی فارسی الفاظ اپنے اصل یا بدلے ہوئے معانی کے ساتھ اس زبان میں بار پا گئے، کون سے الفاظ کو چلن نصیب ہوا، کون سے الفاظ، ترکیبیں اور محاورے متروک ہو گئے۔

اس کتاب میں مصنفین نے کربل کتھا کی زبان کا تمام متعلقہ پہلوؤں سے بڑا سیر حاصل مطالعہ کیا ہے۔ اس لسانی مطالعے کی افادیت طالب علموں اور لسانیات کے محققوں کے لئے مسلم ہے۔ تاہم اُردو کے عام ادب کے قاری کے لئے بھی یہ کتاب اس اعتبار سے دلچسپی کا باعث ہوگی کہ اُردو زبان میں ادھر دو سو برس کے عرصے میں کیسی اور کیا کیا تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔

سائز $\frac{20\times30}{16}$، صفحات: ۱۷۰، قیمت ۴ روپے

ناشر: مکتبہ شاہراہ، اُردو بازار، دہلی-۶

(راج نرائن راز)

تنقید اور انداز نظر

ڈاکٹر سیدہ جعفر کے ۱۱ مضامین پر مشتمل مجموعے کا نام ہے جسے نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔

ڈاکٹر سیدہ جعفر اُردو کی معروف محقق اور ناقد ہیں اور دکنی ادب سے متعلق کئی قابلِ قدر کتابوں کی مصنف ہیں۔

زیر نظر مجموعے میں پہلا مضمون تنقید اور انداز نظر اہمیت کا حامل ہے جس میں تمام اہم تنقیدی رجحانات کا جائزہ لیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ کسی مخصوص مکتبِ تنقید سے تعلق رکھنے والا ناقد کن خصوصیات کا حامل ہوگا۔ دوسرے مضامین میں دکنی غزل گوئی ایک اچھا مضمون ہے لیکن دیگر مضامین وقتی نوعیت کے ہیں اور طالب علموں کی ضرورتوں کو مدنظر رکھ کر لکھے گئے ہیں۔

اس وقت جب کہ اُردو ادب سے دلچسپی کم ہوتی جا رہی ہے ایسے مضامین ایک عام قاری کو ادب کے بعض اہم پہلوؤں سے روشناس کرانے میں مدد دیتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اُردو کے بعض اہم اساتذہ مثلاً قائم احسان کے اسکول کے دیگر شعرا کا از سرِ نو جائزہ لیا جائے اور جدید تنقید کے اصولوں پر ان کو پرکھا جائے محض اتنا کہنا کافی نہیں ہے کہ وہ اپنی معاشرت کے نمائندے اور اس کے عکاس تھے۔ ہمیں امید ہے کہ تنقید اور اندازِ نظر کو دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

بنگال کا اُردو ادب

انیسویں صدی میں بنگال کا اُردو ادب پروفیسر جاوید نہال کی ڈی لٹ کا مقالہ ہے جو محنت اور کاوش سے لکھا گیا ہے بنگال ایک ایسا علاقہ سمجھا جاتا رہا ہے جسے اُردو کے مرکز کی حیثیت سے کم جانا جاتا ہے لیکن کلکتہ کو اُردو کی تشکیل اور ارتقا میں فورٹ ولیم کالج اور پھر انگریزی سرکار کے صدر مقام ہونے کی وجہ نیز بعض ادیبوں اور ادب دوستوں کی آماجگاہ ہونے کی وجہ سے بڑی نمایاں حیثیت حاصل ہے فورٹ ولیم کالج کی خدمات تو منظرِ عام پر آچکی ہیں لیکن بنگال کے دوسرے اہم مرکزوں اور شخصیتوں پر خاطر خواہ روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ پروفیسر جاوید نہال کی یہ کتاب ایک اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے اور اس کتاب کی اشاعت سے اُردو کے تقریباً تمام اہم مرکزوں کا جائزہ مکمل ہو جاتا ہے امید ہے کہ دوسری جلد کی اشاعت کے بعد جس کا مصنف نے وعدہ کیا ہے بنگال میں اُردو کی ایک مکمل اور مبسوط تاریخ مکمل ہو جائے گی۔

کتاب ڈیمی سائز کے ۲۰۰ سو صفحات پر مشتمل ہے اور قیمت ۱۵ روپے ہے۔ ادارۂ اُردو رائٹرس گلڈ ۱/۸۱ فیرس لین ۱۱ اسرار منزل کلکتہ۔ ۱۲ سے مل سکتی ہے

مجلّہ سیفیہ (سیفیہ کالج بھوپال میگزین) غالب نمبر

نگراں: عبدالقوی دسنوی ، مدیر: امتین سید

علم و ادب کا ذوق بھوپال کی قدیم روایت ہے اس کے فرماں رواؤں نے علما و شعرا کی سرپرستی ہی نہیں کی بلکہ خود بھی علم و ادب میں ممتاز شخصیت کے مالک رہے ہیں۔ ماضی سے قطع نظر بازاروں اور درس گاہوں کا رخ کیجئے تو وہی علمی و ادبی فضا ملے گی۔ اسی بھوپال میں سیفیہ کالج بھی ہے جس نے اُردو ادب کے معیار اور ذوق کو برقرار رکھا ہے۔ مجلّہ سیفیہ اس کی نمایندہ مثال ہے۔ اس وقت مجلّہ کا غالب نمبر ہمارے سامنے ہے جو ایک طرف اپنی طباعت کے اعتبار سے ممتاز ہے اور دوسری طرف مضامین کے لحاظ سے خاصے کی چیز ہے۔ مدیر نے اس کو حسنِ سلیقہ سے ترتیب دے کر اور بلند تر کر دیا۔ اس زمانے میں اگرچہ غالب پر متعدد عمدہ نمبر شائع ہو چکے ہیں مگر مجلّہ سیفیہ نے ان میں اپنی انفرادیت کو قائم رکھا ہے۔ اس میں کئی اساتذہ اور طلبہ کے مضامین اور غالبیات سے متعلق سات نظمیں ہیں۔ اساتذہ اور ادیبوں کے مضامین تو قابلِ قدر ہونا چاہئیں۔ مگر لائقِ مبارک باد یہ امر ہے کہ اس میں طلبہ کا حصہ نمایاں بھی ہے اور قابلِ قدر بھی۔ ذہنوں کی یہ تربیت ہم کو نہ اُردو سے مایوس کر سکتی ہے اور نہ ادب کی طرف سے مضطرب کر سکتی ہے۔ یہ ادارہ قابلِ مبارک باد ہے اور اُمید ہے کہ وہ اپنی اس روایت کو قائم رکھے گا۔

(ادارہ)

سکھ انجن (قبل ۱۶۳۵ء)

مصنف: ڈاکٹر سیدہ جعفر، ریڈر شعبۂ اُردو جامعہ عثمانیہ

ناشر: لطف الدولہ، ریسرچ انسٹی ٹیوٹ حیدرآباد - ۲۷

قیمت درج نہیں۔

دکن میں ابتدائی اُردو زبان دکنی کو عوام و خواص میں یکساں طور پر فروغ دینے کے سلسلے میں مذہبی رہنماؤں اور اولیائے کرام نے بڑا اہم کردار ادا کیا ہے ان کے ارشادات و ہدایات کا سلسلہ تقریری اور تحریری دونوں طرح سے جاری رہا۔ اس لئے ابتدائی دور کی تحریروں اور نگارشات کی نوعیت کم و بیش مذہبی ہی رہی ہے۔ علمی، ادبی اور لسانی اہمیت رکھنے والے ایسے ملفوظات اور ایسی تصانیف میں شاہ ابوالحسن کی عارفانہ رنگ اور تمثیلی انداز کی مثنوی "سکھ انجن" بھی ایک ہے جو ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کو لطف الدولہ اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی ایما پر دکن کی ممتاز محقق، استاد و ڈاکٹر سیدہ جعفر ریڈر شعبۂ اُردو، جامعہ عثمانیہ نے بڑی محنت و کاوش سے ترتیب دے کر حیدرآباد کی شرافت، رواداری، وسیع النظری اور خلوص کے علمبردار مہدی نواز جنگ مرحوم کے نام بڑے دلچسپ پیرائے میں معنون کیا ہے جنہوں نے مرنے کے بعد بھی اپنی آنکھوں کے دان سے ایک پیدائشی اندھے نام دیو کی تاریک زندگی میں نئی جوت جلائی ہے۔ ساتھ ہی ۱۱۹ صفحات پر محیط ایک مفصل اور جامع مقالہ میں مصنف کے حالاتِ زندگی، مسائلِ تصوف اور تصنیف کے ادبی اور لسانی پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ اور تاریخی و تحقیقی شواہد سے بھی مدلل بحث کی ہے۔ ہر صفحے پر بر بنائے [illegible] دکنی لفظ کے معنی حاشیہ پر دے دیے گئے ہیں۔ جس سے پڑھنے اور سمجھنے والوں کو بڑی مدد ملتی ہے۔

ڈاکٹر سیدہ جعفر کے اضافوں سے سکھ انجن میں شاہ ابوالحسن

صرف
5 پیسے
خرچ کرکے
آپ
اپنے کنبے
کو
محدود رکھنے
کی طاقت
حاصل کرسکتے ہیں

بچوں کی پیدائش میں وقفہ کیلئے

فی زمانہ بچوں کی پیدائش اتفاق کی بات نہیں۔ یہ آپ کے اختیار میں ہے۔ نرودھ استعمال کرنے سے آپ کے بچہ تبھی ہوگا جب آپ چاہیں گے، اتفاق سے نہیں۔

بچہ اور ماں کی صحت کیلئے

ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ بچے کو شروع کے تین برسوں میں زیادہ توجہ درکار ہوتی ہے۔ پھر بچے کی پیدائش کے بعد ماں کو اپنی صحت بحال کرنے میں بھی وقت لگتا ہے۔ نرودھ استعمال کرکے آپ اگلے بچے کی پیدائش ملتوی کرسکتے ہیں۔

نرودھ (کنڈوم) اعلیٰ کوالٹی کے ربڑ سے بنتا ہے۔ دنیا بھر میں لوگ اسے استعمال کرتے ہیں، کیونکہ یہ فیملی پلاننگ کا آسان، دلچسپ طریقہ ہے۔ اس کے استعمال سے صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا۔

نرودھ ہر جگہ ملتا ہے۔ پروویژن اسٹور، کریانہ فروش، کیمسٹ، جنرل مرچنٹ، پان فروش وغیرہ کی دکانوں پر بکتا ہے۔

سونا ہی سونا

"زمین بھرپور فصل دیتی ہے.... کسان کہتا ہے" دھرتی سونا اُگلتی ہے"

اب مُلک کے اکثر حصّوں میں فصلیں لہلہاتی ہیں.... قحط کے لئے مشہور چند علاقے بھی آج ہرے بھرے ہوگئے ہیں.... ہر طرف سنہری دانوں کے انبار لگے ہیں..... مٹی سونا بن گئی ہے۔

اچھی فصل کی وجہ کچھ بھی سہی.... بہتر بیج، زیادہ کھاد، زیادہ پمپ یا کھیتی باڑی کے بہتر طریقے.....

حقیقت یہ ہے کہ دو برس کی خشک سالی کے بعد ہم نے اتنا اناج پیدا کیا جتنا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

اسے سبز انقلاب کہیے یا کچھ اور.... گزشتہ برس مُلک میں دس کروڑ ٹن سے زائد اناج پیدا ہوا.... 1950ء سے دُگنا۔

ہم آگے بڑھ رہے ہیں.... سائنس کی مدد سے....

آج، کل سے کہیں بہتر ہے*

کام کیجیے

کل، آج سے بھی بڑھ کر ہوگا

* "آج کا بھارت" کتابچہ کی مُفت کاپی کے لئے ڈی۔اے۔وی۔پی، پی۔ٹی۔آئی۔ بلڈنگ، پارلیمنٹ اسٹریٹ۔ نئی دہلی۔۱ کو لکھیے۔

davp 71/39

Vol. 29 No. 12 AJKAL (Monthly) July 1970

Edited and Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi.

سونا ہی سونا

زمین بھرپور فصل دیتی ہے .... کسان کہتا ہے "دھرتی سونا اگلتی ہے"

اب ملک کے اکثر حصّوں میں فصلیں لہلہاتی ہیں .... قحط کے لئے مشہور چند علاقے بھی آج ہرے بھرے ہو گئے ہیں .... ہر طرف سنہری دانوں کے انبار لگے ہیں .... مٹی سونا بن گئی ہے

اچھی فصل کی وجہ کچھ ہی سہی .... بہتر بیج، زیادہ کھاد، زیادہ پمپ یا کھیتی باڑی کے بہتر طریقے ....

حقیقت یہ ہے کہ دو برس کی خشک سالی کے بعد ہم نے اتنا اناج پیدا کیا جتنا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

اسے سبز انقلاب کہیئے یا کچھ اور .... گذشتہ برس ملک میں دس کروڑ ٹن سے زائد اناج پیدا ہوا .... 1950ء سے دگنا۔

ہم آگے بڑھ رہے ہیں .... سائنس کی مدد سے ....

آج، کل سے کہیں بہتر ہے ❋

کام کیجیے

کل، آج سے بھی بڑھ کر ہوگا

❋ "آج کا بھارت" کتابچہ کی مفت کاپی کے لئے ڈی-اے-وی-پی، پی-ٹی-آئی- بلڈنگ پارلیمنٹ اسٹریٹ- نئی دہلی-۱ کو لکھیئے۔

davp 71/39

Vol. 29 No. 12 AJKAL (Monthly) July 1970

Edited and Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi.